اعلیحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ

کے پچیس سالہ عہد فرمانروائی کے جشن سیمیں

کی تقریب میں سلسلۂ ادبیات اردو کی ناچیز نذر عقیدت

مرقع سخن

جلد دوم

یعنی

حیدرآباد کے پچاس ممتاز شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ

مدیر عمومی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مطبوعہ

مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

۱۹۳۷ء

سلسلۂ ادبیات اردو

مرتبین

مولوی محمد عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی	استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ
مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی	استاد اردو ״ ״
مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ایم۔ اے	استاد شعبۂ دینیات ״
مولوی محمد نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل	مددگار دفتر دیوانی و مال و ملکی وغیرہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی	مدیر عمومی سلسلۂ ادبیات اردو

سلسلۂ ادبیاتِ اردو

مطبوعات

کتاب		مصنف / مرتب
۱۔ ورڈزورتھ اور اس کی شاعری (حیات اور کلام پر تنقیدی نظر)	از	مولوی میر حسن صاحب ایم اے۔ سابق مدیر مجلۂ عثمانیہ و سابق صدر انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ
۲۔ یوسف ہندی قید فرنگ میں (یعنی واقعات قید غالب)	″	مولوی محمد ابن حسن [illegible] بی۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ)
۳۔ ہوش کے ناخن (ایک سماجی ڈرامہ)	″	مولوی میر حسن صاحب ایم اے سابق مدیر مجلۂ عثمانیہ مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے سابق نائب مدیر مجلۂ عثمانیہ
۴۔ ٹیگور اور اس کی شاعری	″	مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے سابق نائب مدیر مجلۂ عثمانیہ
۵۔ مرقع سخن جلد اول	یعنی	حیدرآباد کے پچیس ممتاز شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ جو جامعہ عثمانیہ کے پندرہ اہل قلم سپوتوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے
۶۔ بادۂ سخن انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل	مرتبہ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے، پی ایچ ڈی
۷۔ کیف سخن انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی	″	″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″
۸۔ سراج سخن انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی	″	پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے، ال ال۔ بی
۹۔ ایمان سخن انتخاب کلام شیر محمد خاں ایمان	″	مولوی سید محمد صاحب ایم۔ اے
۱۰۔ متاع سخن انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	″	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے، پی ایچ ڈی

سلسلۂ ادبیاتِ اردو
زیرِ طبع یا زیرِ ترتیب کتابیں

کتاب		مصنف
۱۔ دکن میں مرثیہ نگاری	از	مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ام۔اے عثمانیہ سابق مدیر مجلہ عثمانیہ و صدر بزمِ اردو
۲۔ شمس الامرا کی اردو خدمات	؍؍	نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر بی۔اے سابق صدر بزمِ اردو
۳۔ سروجنی نائیڈو کی شاعری	؍؍	مولوی میر سکندر علی صاحب وجد بی۔اے سابق صدر بزمِ اردو
۴۔ مرقع مشاہیرِ دکن	زیرِ ترتیب	مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام۔اے، ال ال۔بی
۵۔ اردو کی طربیہ شاعری	از	مولوی مرزا سرفراز علی صاحب بی۔اے سابق مدیر الموسی و مجلہ عثمانیہ
۶۔ تاریخ ادبیات عربی	؍؍	مولوی سید ابو الفضل العباس صاحب ام۔اے معتمد دائرہ علمیہ جامعہ عثمانیہ
۷۔ تاریخ ادبیات انگریزی	؍؍	مولوی میر حسن صاحب ام۔اے سابق صدر انجمن اتحاد و مدیر مجلہ عثمانیہ
۸۔ تاریخ ادبیات فرانسیسی	؍؍	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔اے، پی ایچ ڈی
۹۔ تاریخ ادبیات المانی	؍؍	مولوی میر حسن صاحب سابق صدر انجمن اتحاد و مدیر مجلہ عثمانیہ
۱۰۔ تاریخ ادبیات اردو	؍؍	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔اے، پی ایچ۔ڈی
۱۱۔ تاریخ ادبیات ہندی	؍؍	مولوی عبد القادر صاحب سروری ام۔اے، ال ال۔بی
۱۲۔ اردو شاعری میں ہندوستانی عنصر	؍؍	صاحبزادہ، مولوی میر محمد علی خاں صاحب میکش
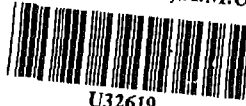
جلد دوم

فہرست مندرجات

مضامین و تصاویر

فہرست مندرجات مرقع سخن جلد دوم

تقریب

دوسرا دور (۱۲۰۰ھ سے ۱۲۲۵ھ تک)

صفحات ۵۹ تا ۹۶

تیسرا دور (۱۲۲۵ھ سے ۱۳۰۰ھ تک)

صفحات ۹۵ تا ۱۴۰

چوتھا دور (۱۳۰۰ھ سے ۱۳۳۰ھ تک)

صفحات ۱۴۱ تا ۲۶۰

پانچواں دور (۱۳۰۰ھ سے ۱۳۵۵ھ تک)

صفحات ۲۶۱ تا ۳۷۸

تمہید ـــــ ۲۶۱ تا ۲۶۲

چھٹا دور (نوجوان شعراء)

صفحات ۳۷۹ تا ۴۱۶

اشاریہ

مرتبہ

صاحبزادہ میر اشرف علی خاں صاحب

فہرست تصاویر مرقع سخن جلد دوم

اعلیحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ

جلد دوم

ترتیب

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مدیر عمومی

سلسلۂ ادبیات اردو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعلیحضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے عہد میمنت مہد کے گذشتہ چھبیس سالوں میں حیدرآباد میں انفرادی یا اجتماعی طور پر اُردو زبان اور علم و ادب کی جو قابل قدر خدمتیں انجام دی گئی ہیں، ان میں سلسلۂ ادبیاتِ اُردو نے بھی اپنی محدود بساط کے مطابق حصہ لیا ہے۔ اسکو قائم ہوئے یہ پانچواں سال ہے۔ اس اثناء میں وہ دس کتابیں شائع کرچکا ہے اور متعدد کتابیں زیر ترتیب و طباعت ہیں۔ اس نے نوجوانوں میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کرنے میں خاطرخواہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اہل ذوق اس کی مساعی سے بخوبی واقف ہیں اور ملک اور بیرون ملک کے رسائل و اخبارات اسکی مطبوعات پر بہت افزا تبصرے لکھتے رہے ہیں۔

یہ سلسلہ محض دورِ عثمانی کی برکات کا ایک ادنیٰ مظہر ہے۔ اسلئے اعلیحضرت سلطان العلوم کے دورِ حکومت کے بہجت افزا موقع پر ضروری تھا کہ یہ بھی نذرِ عقیدت پیش کرتا۔ اعلیحضرت بندگان عالی کا ذوقِ ادب اور شعر و سخن سے شغف محتاج بیان نہیں ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس آپ کی علم نوازی کی ایک لازوال مثال ہے۔ مہمات سلطنت کے ساتھ ساتھ آپ بہ نفس نفیس سخن وری اور علم پروری میں بھی شایان شان دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ کا فارسی اور اُردو کلام صحیح معنوں میں ملک الکلام ہے۔ اردو شعر و سخن کی تاریخ میں آپ کا نام زرین حروف میں چمکتا رہیگا۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر "سلسلۂ ادبیاتِ اُردو" حیدرآباد کے ممتاز شعرائے آصفیہ کا باتصویر تذکرہ "مرقع سخن" مرتب کرکے اعلیحضرت کے پچیس سالہ دورِ حکمرانی و سخن پروری کے جشن سیمیں میں حصہ لے رہا ہے۔ چنانچہ اسکی پہلی جلد گذشتہ سال جشن سیمیں کی تاریخوں میں شائع ہوچکی ہے۔

مرقع سخن کی پہلی جلد میں اعلیحضرت سلطان العلوم کی پچیس سالہ جوبلی کی مناسبت سے حیدرآباد کے صرف پچیس شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام شائع کیا گیا اور اب دوسری جلد میں اور پچاس شاعروں کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام درج ہے۔ اور اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں التزام کیا گیا ہے کہ خانوادۂ آصفی کے ان جملہ ارکین کے

پر جداگانہ مضامین لکھے جائیں جنھوں نے اُردو شعر و سخن کی سرپرستی کی اور فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی اپنا کلام یادگار چھوڑا۔ چنانچہ اس کتاب کے آئندہ صفحات میں حضرت آصف جاہ اول نواب ناصر جنگ شہید، حضرت غفران مکان آصف جاہ سادس، اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع اور شہزادگان والاشان نواب اعظم جاہ بہادر اعظم اور نواب معظم جاہ بہادر شجیع نیز طبقہ صاحبزادگان میں صاحبزادہ آصف یاور الملک وزیر صاحبزادہ میر جہاں دار علیخاں وفائی، صاحبزادہ میر معین الدین علیخاں شباب اور صاحبزادہ میر آفتاب علیخاں مہر کے حالات اور کلام کے نمونے شامل کئے جارہے ہیں۔

شاہی خاندان کے علاوہ امرائے اعظام میں نواب معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ آسمان جاہی نواب لطف الدولہ مرحوم امیر پائیگاہ خورشید جاہی، نواب حسام الملک خانخاناں آصفی مرحوم اور صوفیائے کرام میں حضرت شاہ خاموش، حضرت آغا داؤد، حضرت امیر حمزہ اور حضرت عبدالقدیر صدیقی حسرت کے حالات زندگی اور نمونہ کلام بھی درج کیا جارہا ہے۔

سلاطین آصفیہ کے زیر سایہ گذشتہ سوا دو سو سال کی مدت میں سینکڑوں بلند پایہ شاعر حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور سینکڑوں ہی بیرون ملک سے ان علم پرور فرمانرواؤں اور انکے سخن دوست امراء کی سرپرستی شعر و سخن سے مستفید ہونے کی خاطر حیدرآباد آئے ان سب کے کلام اور حالات پر ایک ہی جگہ تبصرہ نہیں کیا جاسکتا اسلئے اس مرقع کی پہلی جلد میں صرف پچیس شاعروں سے متعلق ایک پہلی قسط پیش کی گئی تھی اور وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر ان کی کماحقہ قدر کی گئی تو متعاقب اسکے دوسرے حصص بھی نظر عام پر آسکینگے جن میں حیدرآبادی شعراء کے علاوہ شمالی ہند کے ایسے شاعروں کے نمونہ کلام اور حالات درج ہونگے جنھیں قدردانی کی شہرت حیدرآباد لے آئی اور جو یہیں کے ہو رہے اس طرح دکن کی اردو شاعری کی ایک مکمل تاریخ اور یہاں کے باکمال شاعروں کا ایک مبسوط تذکرہ مرتب ہوجائیگا۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ مرقع سخن کی پہلی جلد کی خاطر خواہ قدر کی گئی اور ممالک محروسہ کے علاوہ شمالی ہند کے اخبارات و رسائل نے بھی اس پر ہمت افزا تبصرے شائع کئے۔ حکومت کی طرف سے بھی اس کام کو قابل ہمت افزائی سمجھا گیا۔ اور ملک کے علم دوست امراء نے بھی سلسلہ کی طرف خاطر خواہ توجہ مبذول کی جس کی بناء پر ہم ایفائے عہد کے قابل ہوسکے چنانچہ مرقع سخن کی دوسری جلد شائع کی جارہی ہے جس میں پہلی جلد سے دوگنی تعداد میں یعنے پچاس شاعروں کے حالات اور نمونہ جات کلام پیش ہیں۔

جس طرح مرقع سخن جلد اول کی تقریب میں لکھا گیا ہے کہ حیدرآباد کی اُردو شاعری فطرتی طور پر دو جداجدا حصوں میں

تقسیم ہوجاتی ہے۔ پہلا حصہ عہد قطب شاہی کی شعری پیداوار پر مشتمل ہے اور دوسرے میں عہد آصفجاہی کے گنجینہ ہائے شعر و سخن شامل ہیں۔ پہلے حصہ کی نسبت اس وقت تک متعدد کتابوں (مثلاً اُردوئے قدیم' اردو شہ پارے' محبوب الزمن' دکن میں اردو' یورپ میں دکنی مخطوطات' اور جواہر سخن) میں تفصیلی معلومات درج ہیں ان میں اول الذکر دو کتابیں تو قطب شاہی اُردو شعر و شاعری کی ایک حد تک مکمل تاریخیں ہیں لیکن عہد آصفیہ کی کوئی ایسی مبسوط تاریخ موجود نہیں ہے جو محض اس عہد کی اُردو شاعری کی مکمل اور مبسوط تاریخ سمجھی جاسکے۔ اگرچہ متذکرہ کتابوں اور مختلف رسالوں میں اس زمانے کے اکثر شاعروں کے حالات اور کلام کے نمونے شائع ہوئے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی عہد آصفیہ کے شعر و سخن کی مکمل تاریخ نہیں۔

مرقع سخن کی پہلی جلد میں عہد آصفیہ کی اُردو شاعری کو اس کی مختلف خصوصیات اور زبان و خیال کے رجحانات کے اعتبار سے پانچ جداگانہ ادوار پر منقسم کیا گیا تھا لیکن اس جلد میں پانچویں دور کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے کیونکہ اعلیحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم کے عہد مسعود میں حیدرآباد میں علم و فضل اور شعر و سخن نے اس قدر نشو و نما حاصل کی کہ یہاں کے نوجوانوں میں علم و عمل کا سچا ذوق پیدا ہوگیا ہے اور ملک میں بیسیوں نوجوان شاعر موجود ہیں جن کا کلام ابھی سے ظاہر کرتا ہے کہ وہ مستقبل میں اُردو شعر و سخن کی تاریخ میں ایک اچھی جگہ حاصل کریں گے۔ خود خانوادۂ شاہی کے جملہ نونہال بھی ذوق شعر و سخن سے بہرہ مند ہیں۔ ولی عہد سلطنت ہز ہائینس والاشان جنرل نواب اعظم جاہ بہادر اعظم شہزادۂ برار اور ان کے برادر حقیقی شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر شجیع دونوں کو شعر و سخن کا ذوق سلیم ورثہ میں ملا ہے اور موخر الذکر نے تو ایک دیوان بھی مرتب کرلیا ہے۔ ان امور کے لحاظ سے مرقع سخن کی اس جلد میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

عہد آصفیہ کی اُردو شاعری کا پہلا دور سنہ ۱۱۵۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک قرار پاتا ہے یہ دور خانوادۂ آصفی کے پہلے تین حکمرانوں حضرت آصف جاہ اول نواب ناصر جنگ شہید اور نواب آصف جاہ ثانی کی علمی سرپرستیوں سے فیض یاب ہوا ہے۔ اس عہد کے پچاس سے زیادہ شعراء کا پتہ چلا ہے جن میں اکثر اورنگ آبادی ہیں لیکن بعد میں سنہ ۱۱۸۴ھ سے جب حیدرآباد سلطنت آصفیہ کا دار الحکومت قرار پایا تو علمی چہل پہل اور شعر و سخن کی سرگرمیاں بھی یہیں منتقل ہوگئیں اور اس طرح سے آل قطب شاہیہ کے بعد یعنی سنہ ۱۰۹۸ھ سے اس قدیم دار السلطنۃ کے جو علمی و ادبی سرچشمے رکے پڑے تھے اب پھر سے جاری ہوگئے۔

اس دَور کے متعدد شعراء اساتذۂ فن سمجھے جاتے ہیں ان میں سے اکثروں کے اردو دیوان، مثنویاں، مرثیے اور قصیدے اس وقت موجود ہیں مگران سب پر اجمالی طور پر بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کیلئے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے۔ مرقع سخن کی پہلی جلد میں اس دور کے چار شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام درج کیا گیا ہے اور اس جلد میں بھی اور چار شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام پیش کیا جارہا ہے۔

عہد آصفیہ میں اردو شاعری کا دوسرا دَور ۱۲۰۰ھ سے ۱۲۲۵ھ تک کے درمیانی زمانہ پر مشتمل ہے۔ اس دَور میں حضرت آصف جاہ ثانی اور حضرت آصف جاہ ثالث کے علاوہ وزرائے سلطنت ارسطو جاہ اور میر عالم نے حیدرآباد میں شعروسخن کی خاص سرپرستی کی ہے جس کا شہرہ سن کر اسی زمانہ میں اقصائے ہندوستان سے باکمال شعراء کی دکن میں آمد شروع ہوئی خود حیدرآباد میں اس وقت متعدد باکمال شعرائے اردو موجود تھے جن میں سے چار کا ذکر پہلی جلد میں اور چار کا اس جلد میں کیا گیا ہے۔

تیسرا دَور حضرت آصف جاہ ثالث، نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع اور نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس اور ان کے وزراء اور امراء مثلاً مہاراجہ چندولال شاداں اور نواب فخر الدینخاں شمس الامراء اور انکے فرزندوں کی بے نظیر سرپرستیوں سے فیض یاب ہوا۔ یہ دراصل حضرت فیض اور ان کے تلامذہ کا عہد تھا۔ اس دور سے متعلق جلد اول میں چھ اور اس جلد میں سات جملہ تیرہ شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام درج کیا گیا ہے۔

اس وقت حیدرآباد میں متعدد ایسے باکمال شعراء بھی موجود تھے جو یہاں کی قدردانی سخن سے مستفید ہونے کیلئے دور دراز مقامات سے آتے رہے اور جن میں سے بعض تو یہیں رہ گئے اور حیدرآباد کو اپنا وطن قرار دے لیا۔ یہ پچھتر سال اردو شاعری کے عہد زرین سمجھے جاسکتے ہیں کیونکہ اسی زمانہ میں دکن کے علاوہ شمالی ہند میں بھی اعلیٰ پایہ کے اساتذہ سخن موجود تھے۔

چوتھا دَور ۱۲۷۵ھ سے ۱۳۲۰ھ تک قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ دَور بھی عہد ماضی کے مانند نہایت درخشاں رہا۔ حضرت غفران مکان آصف جاہ سادس ادب نواز اور شعروسخن کے قدردان ہونے کے علاوہ خود بھی شاعر تھے۔ یوں تو شمالی ہند کے شاعروں کی آمد ورفت کا سلسلہ پہلے سے قائم ہوچکا تھا۔ اس دور میں اس میل جول کا شاعری پر بھی اچھا اثر پڑا سب کا رجحان ذوق سلیم اور صحیح شاعری کی طرف تھا۔ ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا اور متفقہ طور پر اصلاح زبان کی طرف خاص توجہ رہی۔ رفتہ رفتہ متروکات کی بنیاد مضبوط ہوتی گئی اور اسلوب زبان بھی بدل گیا۔ مرقع سخن کی پہلی جلد میں

اس دور کے چھ شاعروں اور اس جلد میں سولہ جملہ بائیس شاعروں کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔

پانچواں دور (۱۳۳۰ھ سے ۱۳۵۵ھ) درحقیقت دکن کی اردو سرپرستی کا تابناک عہد ہے۔ سلطان العلوم آصف جاہ سابع خود بلند پایہ شاعر اور قدردان سخن ہیں۔ جملہ شہزادگان والاشان اور امرائے سلطنت شعر و سخن کے اچھے ذوق سے بہرہ مند ہیں۔ اس وقت حیدرآباد میں سیکڑوں اردو شاعر موجود ہیں لیکن اس مرقع کی پہلی جلد میں پانچ اور اس جلد میں پندرہ جملہ بیس شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے۔ اور اس دور کے جن شعراء کی عمر چالیس سال سے کم ہے ان کیلئے ایک نیا دور قائم کیا گیا ہے۔

چھٹا دور اصل میں عہد عثمانی کے نوجوان شعراء پر مشتمل ہے اور مرقع سخن کی اسی جلد میں پہلی دفعہ قائم کیا گیا ہے۔ اس دور کی تمہید میں ولیعہد سلطنت ہز ہائینس والاشان جنرل نواب میر حمایت علیخاں اعظم جاہ بہادر اعظم شہزادۂ برار کی ایک غزل بھی پیش کی گئی ہے اور اس دور میں آپ کے حقیقی بھائی شہزادۂ والاشان جنرل نواب میر شجاعت علی خاں معظم جاہ بہادر شجیع اور دیگر تین شعراء کے حالات اور کلام کے نمونے درج ہیں۔

ان ہی متذکرہ چھ ادوار پر مرقع سخن کی دوسری جلد مبنی ہے اس میں بھی ہر دور ایک تمہید سے شروع ہوتا ہے جس میں اس عہد کے قدردانان سخن کے نام، شاعری کی خصوصیات اور مشہور شاعروں کی فہرست درج ہے۔ حیدرآبادی شعراء کے ان شاعروں کے نام بھی درج کئے گئے ہیں جو اس زمانے میں باہر سے حیدرآباد آئے اور ہر تمہید کے آخر میں شمالی ہند کے ان مشہور اساتذہ سخن کے نام بھی لکھ دیئے گئے ہیں جو اس دور کے شعرائے حیدرآباد کے معاصر تھے۔ اس صراحت سے مرقع سخن کی ہر جلد کے مطالعہ کرنے والوں کو اردو کے ان تمام شاعروں کے متعلق تاریخ وار علم حاصل ہوگا جنہوں نے گزشتہ سوا دو سو سال میں اپنی مسلسل خدمات اور گراں بہا کارناموں کی وجہ سے زبان اردو کو دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ بنا دیا۔

اس مرقع میں بھی ان شاعروں کی تصویروں کے علاوہ جن کا تذکرہ درج کیا گیا ہے ہر دور کے قدردانان شعر و سخن یعنی سلاطین آصفیہ، وزراء اور امراء کی تصاویر بھی درج ہیں۔ نیز ہر دور کے بعض معاصر شعراء کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ اس دفعہ بھی تصاویر کی فراہمی اور طباعت کے انتظامات میں خاص کوشش کرنی پڑی ہے۔ سلسلہ مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب خیابانی۔ اے کا

شکر گزار ہے کہ انہوں نے اس بارے میں سلسلہ کی مدد کی اور تقریباً جملہ تصاویر انہی کے اہتمام سے تیار ہوئی اور چھپی ہیں۔

اس مرقع کے جملہ مضمون نگار بھی جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ یا متعلم ہیں اور سلسلہ ادبیات اردو کے ممد و معاون۔ اس دفعہ بھی مضامین میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر شاعر کے سوانح زندگی کے ساتھ اس کا تھوڑا بہت کلام بھی پیش کیا جائے تاکہ دکن کے گذشتہ دو سو سال کے اردو شاعروں کا ہر رنگ کا کلام پیش نظر ہو جائے۔

شاعروں اور مضمون نگاروں کے انتخاب میں خاص احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام کو فراہم کرنا معمولی کام نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بعض شاعروں کے متعلق جیسا چاہیئے نہیں لکھا جا سکا اور بعض شاعر محض قلت مواد یا فراہمی معلومات و کلام میں ناکامی کی وجہ سے شریک نہیں کئے جا سکے مگر ان کے نام ہر دور کی تمہید میں درج ہیں۔

جلد اول کی طرح اس مرقع میں بھی شاعروں کے حالات اور کلام کی فراہمی میں ممکنہ ذرائع سے استفادہ کیا گیا ہے اور مضامین کو تحقیقی طرز سے زیادہ ادبی رنگ میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ ان ہی شاعروں سے متعلق مزید تحقیق و تفتیش کے بعد اور معلومات حاصل ہو سکیں اور ان کے کلام کے ایسے مجموعے بھی مل سکیں جو اس وقت تک دستیاب نہ ہو سکے۔ یہ بعد میں کام کرنے اور دکن کی اردو شاعری سے ذوق رکھنے والوں کا کام ہے کہ وہ ان ابتدائی یک گونہ تعارفی کوششوں سے متاثر ہوں اور انہیں سے ہر شاعر پر ایک جداگانہ کتاب مرتب کریں۔

اس تقریب کے ختم پر مرقع سخن کی دونوں جلدوں یعنی حیدرآباد کے مختصر ممتاز شعرائے دور آصفیہ کی تاریخ وار فہرست بھی درج کر دی گئی ہے تاکہ ہر شاعر کے زمانۂ حیات اور ان کے آپس کے تقدم و تاخر کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

اس جلد کی تیاری اور طباعت کے سلسلے میں اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ یہ اہم کام سرانجام نہ پا سکتا اگر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز، مولوی سید محمد صاحب، مولوی میر سعادت علی رضوی صاحب عام امور میں سلسلہ کا ہاتھ نہ بٹاتے۔ نواب کریم الدین خاں صاحب اور بھندر راج صاحب سکسینہ کا شکریہ ضروری ہے کہ ان دونوں نے بعض شاعروں کے حالات اور کلام کی فراہمی میں مدیر عمومی کی مدد کی۔ صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش نے اس جلد کی ترتیب و طباعت کے سلسلہ میں مدیر عمومی کا بہت سا کام آسان کر دیا۔ سلسلہ ان اصحاب کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

مرقع سخن کی اس دوسری جلد کے پیش کرتے وقت اس حقیقت حال کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس دوران میں سلسلہ ادبیات اردو کی

سرگرمیوں میں اتنی وسعت ہوگئی ہے کہ اسکے مطبوعات کو حسب ذیل چھ عنوانوں کے تحت تقسیم کرکے باضابطہ کام کا آغاز کردیا گیا ہے۔

۱ ۔ **سوانح اور تذکرے**۔ اس عنوان کے ضمن میں چار کتابیں ورڈز ورتھ اور اسکی شاعری ٹیگور اور اسکی شاعری اور مرقع سخن کی دونوں جلدیں شامل ہیں۔ انکے علاوہ دکن کے اردو نثر نگاروں کا ایک تذکرہ اور مرقع مشاہیر دکن بھی زیر ترتیب ہے۔

۲ ۔ **ادبی تحقیق و تنقید**۔ اس سلسلہ کی ایک چھوٹی سی کتاب یوسف ہندی نقید فرنگ میں شائع ہو چکی ہے اور دیگر کتابوں مثلاً شمس الامرا کی اردو خدمات، اردو ادب میں ہندوستانی عنصر، اردو کی طربیہ شاعری وغیرہ کے مسودے تکمیل پا رہے ہیں۔

۳ ۔ **قدیم و جدید شعرائے دکن کے کلام کے مجموعے یا منتخبات**۔ اس سلسلہ میں شاہ سراج اورنگ آبادی۔ شیر محمد خاں ایمان، ڈاکٹر احمد حسین مائل، سید ضیاء الدین حسن کیفی اور نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے کلام کے انتخابات، سراج سخن، ایمان سخن، بادہ سخن، کیف سخن اور متاع سخن شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح چند اور ممتاز شعرا کے انتخابات کئے جا رہے ہیں جو موقع بہ موقع کتابی صورت میں شائع ہوتے رہینگے۔ قدیم اساتذہ سخن کے منتخب کلام کے علاوہ ملک کے نوجوان شعرا کے مجموعے بھی شائع کئے جائینگے

۴ ۔ **افسانے، ڈرامے اور ناول**۔ اس عنوان کے تحت ایک ڈرامہ شوکت ناخن شائع ہو چکا ہے اور دیگر کتابیں بھی شائع ہونگی۔

۵ ۔ **تاریخ ادب**۔ اس سلسلہ میں دنیا کی بارہ زبانوں کی ادبیات کی اجمالی تاریخیں شائع کیجائینگی جن میں سے دو یعنی تاریخ ادبیات انگریزی اور تاریخ ادبیات عربی اسوقت تیار ہیں اور دیگر زبانوں کی ادبیات کی تاریخیں زیر ترتیب ہیں۔

۶ ۔ **تاریخ و جغرافیہ**۔ اس عنوان کے تحت عام تاریخی کتب کے علاوہ خاص کر دکن کی مستند تاریخیں اور دکن کا تاریخی جغرافیہ زیر ترتیب ہے اور توقع ہے کہ اس سلسلہ کی بعض اہم کتابیں جلد شائع ہو سکیں گی۔

اس وسیع نظام العمل کو پیش نظر رکھکر سلسلۂ ادبیات اردو کا نام ادارۂ ادبیات اردو قرار دیا گیا ہے اور اس ادارہ کی طرف سے ایک ماہوار علمی اور ادبی رسالہ بھی جاری کیا جائیگا جس کے ذریعہ سے اس امر کی کوشش کی جائیگی کہ حیدرآباد میں علم و فضل اور ادبیات عالیہ کا ایک پر فضا ماحول پیدا کر دیا جائے۔ اور اردو زبان و ادب کے صحیح ذوق اور نوجوانوں کے علمی و ادبی شغف میں ترقی ہو۔

۱۲ مئی ۱۹۳۷ء
یکم ربیع الاول ۱۳۵۶ھ

سید محی الدین قادری زور
مدیر عمومی

مجموعی فہرست

مرقع سخن کی دونوں جلدوں

یعنے حیدرآباد دکن کے چھتیس ممتاز شعرائے دور آصفیہ

کی

تاریخ وار فہرست

مجموعی فہرست

اس فہرست میں ان تمام شاعروں کے نام تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جن کا تذکرہ اور نمونہ کلام مرقع سخن کی دو جلدوں میں مختلف ادوار کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اسکے مطالعہ سے دکن کے گذشتہ دو صدیوں کے بلند پایہ شعرائے اُردو کے زمانہ اور ان کے تقدم و تاخر کا علم ہو سکے گا۔

۱۱	ایمان	شیر محمد خاں	تا ۱۲۲۰ھ	جلد اول	صفحات ۷۵ تا ۸۲
۱۲	سالم	قاضی محمد کرم بخش فاروقی	قریب ۱۲۱۰ھ	جلد دوم	״ ۸۳ تا ۸۸
۱۳	آشفتہ	خواجہ ابوطالب خاں	۱۱۶۵ھ تا	״	״ ۸۹ تا ۹۴
۱۴	چیندا	ماہ لقا بائی	تا ۱۲۴۰ھ	جلد اول	״ ۸۳ تا ۱۰۴
۱۵	قیس	محمد صدیق	تا ۱۲۳۰ھ	״	״ ۱۰۵ تا ۱۲۰
۱۶	شاداں	مہاراجہ چندو لال	۱۱۷۵ تا ۱۲۶۱ھ	״	״ ۱۲۱ تا ۱۳۰
۱۷	فیض	میر شمس الدین محمد	۱۱۹۵ تا ۱۲۸۳ھ	״	״ ۱۳۳ تا ۱۴۶
۱۸	خاموش	خواجہ سید شاہ معین الدینؒ	۱۲۰۴ تا ۱۲۸۸ھ	جلد دوم	״ ۹۷ تا ۱۰۰
۱۹	تمیز	نواب بدر الدین خاں معظم الملک	۱۲۲۰ تا ۱۲۶۹ھ	جلد اول	״ ۱۴۷ تا ۱۶۳
۲۰	صاف	میر حیات الدین محمد	تا ۱۲۸۹ھ	جلد دوم	״ ۱۰۷ تا ۱۱۰
۲۱	باقی	گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت	۱۲۴۴ تا ۱۳۱۴ھ	جلد اول	״ ۱۶۳ تا ۱۷۶
۲۲	مزاج	حکیم محمد مظفر الدین خاں	۱۲۳۱ تا ۱۳۲۸ھ	جلد دوم	״ ۱۰۱ تا ۱۰۶
۲۳	رمز	سدانند جوگی بہاری لال	۱۲۴۰ تا ۱۳۲۵ھ	״	״ ۱۱۱ تا ۱۲۰
۲۴	عصر	میر احمد علی	۱۲۴۵ تا ۱۳۲۳ھ	جلد اول	״ ۱۷۷ تا ۱۹۴
۲۵	فیاض	محمد فیاض الدین خاں مشرف جنگ	۱۲۵۰ تا ۱۳۲۸ھ	״	״ ۱۹۵ تا ۲۱۴
۲۶	صحو	آغا محمد داؤد	۱۲۵۳ تا ۱۳۲۴ھ	جلد دوم	״ ۱۲۱ تا ۱۲۶
۲۷	ناجی	میر اصغر حسین	۱۲۵۶ تا ۱۳۳۰ھ	جلد اول	״ ۲۱۵ تا ۲۲۸
۲۸	اشہر	مرزا غلام سجاد	۱۲۵۶ تا ۱۳۳۱ھ	جلد دوم	״ ۱۲۷ تا ۱۳۴
۲۹	پاس	محمد حفیظ الدین	۱۲۶۰ تا ۱۳۲۳ھ	״	״ ۱۳۵ تا ۱۴۰

۳۰	وزیر	صاحبزادہ میر وزیر علی خاں آصف یاور الملک	۱۲۲۸ تا ۱۳۲۹ھ	جلد دوم	صفحات ۱۵۳ تا ۱۵۰
۳۱	واصل	احمد اللہ	۱۲۷۰ تا ۱۳۳۶ھ	"	" ۱۵۱ تا ۱۶۰
۳۲	آصفی	نواب میر اسد علی خاں حسام الملک	۱۲۷۱ تا ۱۳۵۳ھ	"	" ۱۶۱ تا ۱۷۶
۳۳	مائل	ڈاکٹر احمد حسین	۱۲۷۴ تا ۱۳۳۲ھ	جلد اول	" ۲۳۱ تا ۲۴۴
۳۴	حمزہ	شمس الدین محمد امیر حمزہ	۱۲۷۶ تا ۱۳۳۷ھ	جلد دوم	" ۱۷۷ تا ۱۸۸
۳۵	مہدی	نواب سید محمد مہدی خاں	۱۲۷۷ تا ۱۳۴۰ھ	"	" ۱۸۹ تا ۱۹۶
۳۶	دل	اشرف الحکماء نواب محمد حمید خاں لقمان الدولہ	۱۲۷۷ تا ۱۳۴۰ھ	"	" ۱۹۷ تا ۲۰۲
۳۷	ولا	شمس العلماء احمد عبد العزیز نواب عزیز جنگ	۱۲۷۷ تا ۱۳۴۴ھ	"	" ۲۰۳ تا ۲۱۰
۳۸	توفیق	سید جلال الدین	۱۲۸۱ تا ۱۳۳۹ھ	جلد اول	" ۲۴۵ تا ۲۵۶
۳۹	شاد	مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت	۱۲۸۱ھ	"	" ۲۶۵ تا ۲۸۰
۴۰	نامی	محمد عبد الغفور خاں	۱۲۸۲ھ	جلد دوم	" ۲۱۱ تا ۲۱۶
۴۱	آصف	اعلیحضرت میر محبوب علیخاں غفران مکاں	۱۲۸۳ تا ۱۳۲۹ھ	"	" ۱۴۵ تا ۱۵۲
۴۲	الم	ڈاکٹر میر مہدی حسین	۱۲۸۳ھ	"	" ۲۱۷ تا ۲۲۶
۴۳	قادر	قادر حسین	۱۲۸۶ تا ۱۳۵۱	"	" ۲۲۷ تا ۲۳۲
۴۴	واصفی	سید عبد الصمد	۱۲۸۸ھ	"	" ۲۳۳ تا ۲۳۸
۴۵	حسرت	محمد عبد القدیر صدیقی	۱۲۸۸ھ	"	" ۲۳۹ تا ۲۴۴
۴۶	اطہر	سید اعظم اللہ حسینی	۱۲۸۹ھ	"	" ۲۴۵ تا ۲۵۰
۴۷	عزیز	محمد عزیز الدین خاں عزیز یار جنگ	۱۲۹۰ھ	جلد اول	" ۲۸۱ تا ۲۹۶
۴۸	وفائی	صاحبزادہ میر جہاندار علی خاں	۱۲۹۱ھ	"	" ۲۵۱ تا ۲۵۶

۴۹ شباب	صاحبزادہ میر معین الدین علی خاں	۱۲۹۶ھ	جلد دوم صفحات ۲۵۷ تا ۲۶۰
۵۰ کیفی	سید رضی الدین حسن	۱۲۹۷ تا ۱۳۳۰ھ	جلد اول ،، ۲۵۷ تا ۲۶۴
۵۱ رسا	غلام مصطفےٰ		،، ،، ۲۹۷ تا ۳۰۴
۵۲ ذہین	سید غلام مصطفےٰ	۱۲۹۹ تا ۱۳۴۹ھ	جلد دوم ،، ۳۰۵ تا ۳۱۲
۵۳ مسرور	میر محمد علی		جلد اول ،، ۳۰۷ تا ۳۲۰
۵۴ صغیر	محمد حبیب الدین	۱۳۰۰ھ	،، ،، ۳۲۱ تا ۳۳۴
۵۵ تصور	سید علی نواز	۱۳۰۰ھ	جلد دوم ،، ۲۹۹ تا ۳۰۴
۵۶ آزاد	گورسرن بلی	۱۳۰۰ھ	،، ،، ۳۱۳ تا ۳۱۸
۵۷ جعفر	مرزا علی جعفر	۱۳۰۰ تا ۱۳۴۴ھ	،، ،، ۳۱۹ تا ۳۲۶
۵۸ ابر	غلام دستگیر	۱۳۰۱ھ	،، ،، ۳۲۷ تا ۳۳۰
۵۹ وفا	محمد حبیب اللہ	۱۳۰۱ھ	،، ،، ۳۳۱ تا ۳۳۸
۶۰ عثمان	اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ	۱۳۰۲ھ	،، ،، ۲۶۳ تا ۲۷۴
۶۱ امجد	سید احمد حسین	۱۳۰۲ھ	جلد اول ،، ۳۳۵ تا ۳۵۲
۶۲ سعید	میر تراب علی خاں تراب یار جنگ	۱۳۰۲ھ	،، ،، ۳۵۳ تا ۳۵۸
۶۳ شہید	میر مہدی علی شہید یار جنگ	۱۳۰۲ھ	جلد دوم ،، ۳۳۹ تا ۳۴۴
۶۴ لطف	محمد لطف الدین خاں لطف الدولہ	۱۳۰۳ تا ۱۳۵۶ھ	،، ،، ۲۷۵ تا ۲۸۰
۶۵ مہر	صاحبزادہ آفتاب علی خاں	۱۳۰۳	،، ،، ۳۴۵ تا ۳۵۴
۶۶ آزاد	سید محمد حسین	۱۳۰۵	،، ،، ۳۵۵ تا ۳۶۰

۶۷	معین	نواب محمد معین الدین خاں معین الدولہ	۱۳۰۸ھ	جلد دوم	صفحات ۲۸۱ تا ۲۹۲
۶۸	عالی	راجہ نرسنگھ بہادر	۱۳۰۸ھ	"	" ۲۹۳ تا ۲۹۸
۶۹	نیر	قاضی محمد منیر الدین	۱۳۰۸ھ	"	" ۳۶۱ تا ۳۶۶
۷۰	صفی	محمد بہبود علی	۱۳۱۰ھ	جلد اول	" ۳۵۹ تا ۳۷۴
۷۱	محبوب	راجہ محبوب راج	۱۳۱۲ تا ۱۳۴۸ھ	جلد دوم	" ۳۶۷ تا ۳۷۸
۷۲	اقدس	محمد عباس حسین	۱۳۲۱ تا ۱۳۴۸ھ	"	" ۴۰۱ تا ۴۱۰
۷۳	کاظم	نواب میر کاظم علیخاں		"	" ۳۸۹ تا ۴۰۰
۷۴	لمعہ	میر عباس علی خاں		"	" ۴۱۱ تا ۴۱۶
۷۵	شجیع	شہزادۂ والاشان نواب معظم جاہ بہادر	۱۳۲۰ھ	"	" ۳۸۱ تا ۳۸۸

نواب میر قمرالدین خان فتح جنگ نظام الملک آصفجاہ اول
نواب ناصر جنگ شہید ناصر

حیدر آباد پرنٹنگ ورکس

مرقّعِ سخن

جلد دوم

پہلا دور

سنہ ۱۱۵۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک

دور آصفیہ میں دکن کی اُردو شاعری کا پہلا دور خانوادۂ آصفی کے پہلے تین حکمرانوں یعنی نواب میر قمر الدین خاں نظام الملک آصف جاہ اول، نواب ناصر جنگ شہید اور نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی علمی و ادبی سرپرستیوں سے سیراب ہوا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان تینوں کو علم و فضل اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق تھا، اور یہ وہ دولت ہے جو آج تک دودمانِ آصفی کے ورثہ میں چلی آرہی ہے۔

آصف جاہ اول خود شاعر بھی تھے آصف اور شاکر تخلص تھا مشہور فارسی شاعر بیدل سے مشورہ کرتے تھے۔ فارسی دیوان چھپ چکا ہے۔ اردو کلام کے وافر نمونے دستیاب نہیں ہیں تو۔ ریاض حسنی اور گل عجائب دونوں تذکرے دکن میں لکھے گئے تھے اور ان میں حضرت آصف کا یہ اُردو شعر بطور نمونہ درج ہے۔

گالی نہ کہو کوئی مرے دلبر کو حسد سے ۔۔۔ مجھ دل کے گلے میں یہ دعا ہیکلی ہے

حضرت آصف جاہ اول نے سنہ ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی گویا یہ دور گیارہ سال تک انکی سخن نوازیوں سے مستفید ہوتا رہا نواب ناصر جنگ شہید اگرچہ اپنے والد کے بعد تین چار سال تک حکمران رہے اور سنہ ۱۱۶۴ھ میں شہادت پائی۔ لیکن وہ ابتدا ہی سے اردو فارسی شاعروں کے بڑے سرپرست تھے اور انکی بارگاہ اہل علم و فضل کا ماویٰ و ملجا تھی۔ ان کے

ایک سے زیادہ دیوان موجود ہیں اور انکی سخن فہمی اور علمی دلچسپی کے واقعات سے اس عہد کے تذکرے معمور ہیں۔ وہ اُردو کے بھی اچھے شاعر تھے چنانچہ متعدد تذکروں مثلاً ریاض حسنی، چمنستان شعراء، طبقات شعراء اور مختلف بیاضوں وغیرہ میں انکے اردو شعر نظر سے گذرتے ہیں

چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

نین تیرے شکار کرتے ہیں — دل ہمارا فگار کرتے ہیں

خوب روجب سنگار کرتے ہیں — آرسی پر بہار کرتے ہیں

کسی بیدادسوں چمن میں آج — پھول سارے پکار کرتے ہیں

اہل دل گریۂ ندامت سیں — سیر ابر بہار کرتے ہیں

چشم بد دور دلبریں سارے — اپنے ناصر کوں پیار کرتے ہیں

یار خورشید جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا — ذرہ ذرہ میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

اے کبوتر جا کے کہہ یوسف کو گو ہر سے نکل — چاہ سے تیرے زلیخا ہو گئی ہے باؤلی

روز بد میں کس سے ہے یارو رفاقت کی اُمید — گر زوال آتا ہے ٹل جاتا ہے سایہ ساتھ سے

حضرت ناصر کے بعد ۱۱۶۴ھ سے ۱۲۰۰ھ تک یہ دور حضرت نظام علی خاں آصفجاہ ثانی اور انکے امراء اور وزراء کی سرپرستیوں میں پھلتا پھولتا رہا۔ اُس دور کے (۵۰) سے زیادہ اُردو شاعروں کا پتہ چلا ہے جن میں اکثر اورنگ آبادی ہیں۔ لیکن بعد میں جب ۱۱۸۴ھ میں اورنگ آباد کی جگہ حیدرآباد سلطنت آصفیہ کا دار الحکومت قرار پایا تو علمی چہل پہل اور شعر و سخن کی سرگرمیاں بھی یہیں منتقل ہو گئیں۔ اور اُس طرح سے زوال قطب شاہیہ (۱۰۹۸ھ) کے بعد سے اس قطب شاہی دار الخلافہ کے جو علمی و ادبی سرچشمے رکے پڑے تھے پھر سے جاری ہو گئے۔

اس دور کے مشہور شعراء اساتذۂ فن سمجھے جاتے ہیں ان میں سے اکثروں کے اُردو دیوان، مثنویاں، مرثیے اور قصیدے اس وقت موجود ہیں مگر ان سب پر اجمالی طور پر بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کیلئے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے۔ مرقع سخن کی پہلی جلد میں اس دور کے چار شاعروں، شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی، نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ درگاہ

میر نوازش علی خاں شیدا اور شاہ تجلی علی تجلی کے حالات اور نمونہ کلام شائع ہو چکا ہے اور اس جلد میں اور چار شاعروں مرزا داؤد داؤد اورنگ آبادی، مرزا علی نقی نقد علی خاں ایجاد، بالاجی تر مبک نائک ذرہ اور مرزا جمال اللہ عشق کے کلام و حیات پر مضامین شامل ہیں ان آٹھ شاعروں کے دیگر معاصرین یہ ہیں۔ محمد ماہ محرم (متوفی ۱۱۶۶ھ) نور الدین علی خاں رنگین (۱۱۷۰ھ) میر عاشق علیخاں ایما (۱۱۷۲ھ) میر مرتضیٰ مہدی (۱۱۷۴ھ) کنہیا لال مہا سنگھ حقیر (۱۱۷۷ھ) مہر علی مہر (۱۱۷۸ھ) مرزا مغل مکتر (۱۱۸۰ھ) مرزا عطا ضیا (۱۱۸۳ھ) شاہ فضل اللہ فضلی (۱۱۸۴ھ) منور الدولہ یار (۱۱۸۵ھ) خواجہ ابو البرکات خاں عشرت (۱۱۸۷ھ) مغنیر خاں عمر (۱۱۸۷ھ) میر حفیظ اللہ واحد (۱۱۸۷ھ) میر فخر الدین فخر (۱۱۹۰ھ) میر عبد الحی خاں صمصام الملک صارم (۱۱۹۲ھ) شیخ احمد مظفر (۱۱۹۴ھ) لال چند رنگین (۱۱۹۵ھ) سرشتی رائے لالہ (۱۲۰۰ھ) الفت خاں مبتلا (۱۲۰۰ھ) مرزا محمدی بیگ مرزا (۱۲۰۱ھ) شیخ ظہور الدین نادر (۱۲۰۱ھ) موہن لال مہتاب (۱۲۰۲ھ) لالہ جے کشن بے جان اور محمد بیگ رضا۔ ان سب کے کلام کے نمونے مختلف تاریخوں اور تذکروں مثلاً گل عجائب، ریاض حسنی، گلشن بے خار، گلزار آصفیہ، چمنستان شعراء، محبوب الزمن، دکن میں اردو تذکرہ شعراء اورنگ آباد وغیرہ میں موجود ہیں۔

اس دور میں جو شاعر باہر سے دکن میں آئے اُن میں میر غلام علی آزاد، غلام علی خاں راشد، ملا باقر شہید، نور العین واقف، عبد الحکیم حاکم اور عبد القادر سامی وغیرہ خاص کر قابل ذکر ہیں جو نواب ناصر جنگ شہید اور بعد میں نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کی سرپرستی سے مستفید ہوئے۔

اس زمانہ میں شمالی ہند میں شیخ شرف الدین مضمون (۱۱۵۸ھ) نجم الدین علی خاں آبرو (۱۱۶۱ھ) انعام اللہ خاں یقین (قبل ۱۱۷۰ھ) اشرف علی خاں فغاں (۱۱۸۶ھ) مرزا جان جاناں مظہر (۱۱۹۴ھ) محمد رفیع سودا (۱۱۹۵ھ) خواجہ میر درد (۱۱۹۹ھ) میر حسن (۱۲۰۱ھ) شیخ ظہور الدین حاتم (۱۲۰۷ھ) اور انکے معاصرین تاباں، یکرنگ، احسن اور بیدار وغیرہ اردو کے مشہور شعراء تھے۔

داؤد

مرزا داؤد اورنگ آبادی

سنہ ۱۱۰۰ ہجری تا سنہ ۱۱۶۸ ہجری

از سیّد اشفاق حسین صاحب بی۔ اے

حضرت آصف جاہ اول کا دورِ حکومت ہے، اورنگ آباد دلہن بنا ہوا ہے غلام علی آزاد کے اس "بیت الامن" میں شعر و سخن کی دیوی نے ایک ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ گلی گلی کوچہ کوچہ اس کی رنگینیوں سے مسحور اور گھر گھر اسکے چرچے ہیں۔ دکن کی سرزمین سے جو آفتاب شاعری طلوع ہوا تھا، اسکی روشنی نے جب ہزاروں میل دور کی دنیا کو جگمگا دیا تو اس مطلعِ انوار کا کیا حال ہوگا جہاں سے یہ کرنیں پھوٹی تھیں!

مولوی شیخ چاند نے اپنے مضمون "اورنگ آباد اور اُردو شاعری" میں داؤد کو دوسرے دور کے شعرا میں گنایا ہے۔ اورنگ آباد کی شاعری کا پہلا دور ولی سے شروع ہوکر ولی ہی پر ختم ہوتا ہے، یہ زمانہ عالمگیری راج کا ہے اورنگ آباد کی شاعری کا دوسرا دور آصف جاہ اول کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے، داؤد، سراج، سامی اور عاجز اس دور کے ممتاز شعرا ہیں۔

آصف جاہ اول سے لیکر نواب صلابت جنگ کے عہد کے خاتمہ تک اورنگ آباد ہی شاہانِ آصفیہ کا پایۂ تخت رہا۔ عالمگیری دور کی رونق اور چہل پہل کے بعد آصفی دور میں اورنگ آباد کی زندگی نے پھر ایک بار سنبھالا لیا۔ شاہانِ آصفیہ کے اس ابتدائی دورِ حکومت میں اسے قابلِ رشک زندگی نصیب ہوئی، کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں اورنگ آباد کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس زمانہ کی رونق اور چہل پہل کا کیا عالم ہوگا! خود فرمانرواؤں کو اس سے عشق تھا، نواب ناصر جنگ شہید نے اورنگ آباد کی تعریف میں قطعہ لکھا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

دل شکار خجستہ بنیاد است　　بیقرار خجستہ بنیاد است

دلربا تر ز کاکل خوباں　　شب تار خجستہ بنیاد است

مگر تھوڑی ہی مدت بعد خجستہ بنیاد کی دلربائی کو زمانہ کی نظر لگ گئی۔ اور پھر یہ شہر ایسا اجڑا کہ آجتک نہ بس سکا۔ غرض داؤد نے جب آنکھ کھولی تو فضا شعر و شاعری کے ہنگاموں سے معمور تھی۔ یوں کہنا چاہئے کہ داؤد شعر کی گود میں پل کر جوان ہوئے۔ ولی اپنے نغمے الاپے ہی جا رہے تھے کہ انہوں نے شاعری شروع کی اور ولی ہی کے تتبع میں شعر کہنے کو فخر جانا۔ کہتے ہیں۔

کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کو سن کر　　تجھ طبع میں داؤد ولی کا اثر آیا

حق نے بعد از ولی مجھے داؤد　　صوبہ شاعری بحال کیا

بس ہے تجھے مصرعہ ولی داؤد　　کہ تجھ کو شور قیامت سے بے نیاز کیا

ولی کے بعد اردو شاعری شمال اور دکن میں عام ہو چکی تھی، داؤد کے زمانہ ہی میں بہت سے حریف اس میدان میں اتر آئے تھے، مگر داؤد، سراج کے سوا کسی کو اپنا مقابل نہیں سمجھتے۔ ایک شعر میں سراج پر اس طرح چوٹ کی ہے۔　　جب سے روشن ہے مجھ سخن کا شمع　　رشک سیتیں سراج جلتا ہے

ایک جگہ یوں کہا ہے۔

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعراں لیکن　　داؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

داؤد خوش آواز تھے۔ مشاعرہ میں جب غزل پڑھتے تو لوگ ان کی آواز کی دلکشی پر جھوم جھوم جاتے۔ پرگو نہیں تھے مگر جو کچھ بھی کہا ہے خوب کہا ہے۔ دیوان میں صرف پانچسو اشعار ہیں، ان کے دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو میں موجود ہے۔

ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام کے متعلق بڑی اچھی رائیں ظاہر کی ہیں۔ شفیق لکھتے ہیں

"شاعر بیست ادا بند و موجد خیالات ارجمند شکر بیانی از سخنش پیدا و خوش الحانی

از نامش ہویدا است"۔

ریاض حسینی میں اس طرح لکھا ہے۔ "گل باغ امکان شہود، میرزا داؤد نشو ونما یافتہ آب و بادِ فرحت نژاد خجستہ بنیاد است خاک قالب الفاظ را آتش معنی رنگین تاب دادہ بتلافی عناصر الفاظ و اشکال حروف چنین صورت می بندد ــ"

داؤد نے ۱۱۶۸ھ میں وفات پائی، شفیق نے تاریخ کہی۔

بلبل گلزار معنی طوطیٔ رنگیں بیاں　　از غم آباد جہاں بگذشت چون تیر از کماں

مصرع تاریخ نوتش گفت ازمن ہاتفے　　کہ "برفتہ میرزا داؤد از فانی جہاں"

"ولی کے یہاں طرز حال کی اردو زبان ابتدائی منزلوں میں ہے، مگر اس دوسرے دور میں زبان نے خاص ترقی کر لی، وسعت اور صفائی کے ساتھ ساتھ اظہار خیال میں بھی بے ساختہ پن آ گیا، ادائے مطلب میں کچھ بانکپن بھی پایا جاتا ہے۔ ولی کے خیال اور مضمون کا ساتھ اسکی زبان نہیں دیتی تھی اسلئے اس کے اشعار میں تصنع کا دہوکہ ہوتا ہے لیکن اس دور میں زبان اتنی قوی ہوگئی ہے کہ مضمون اور خیال کی دیانتداری سے ترجمانی کر سکے۔ لفظ، ترکیب، استعارہ تشبیہ ہر چیز میں اس دور کے شعرا نے ترقی کی۔ محاورات اور تلمیحات کا اچھا خاصہ التزام کیا۔ فارسی تلمیحات کے ساتھ ملکی اور مقامی تلمیحات کو بھی رواج دیا۔ غرض زبان میں صفائی و وسعت، اسالیب بیان میں تنوع اور خیال میں بلندی اور پاکیزگی اس دور کے خاص خصوصیات ہیں۔"

داؤد کی اس غزل سے زبان کی صفائی۔ بندش کی پاکیزگی اور خیال کی بلندی کا اظہار ہوگا۔

انتظاری میں ترے نامہ کی خواب آتا نہیں　　بھیجتا ہوں آہ کا قاصد جواب آتا نہیں

بیقراری کیوں نہ ہو دل کو مرے سیماب وار　　تجھ جدائی کا مجھے اے شوخ تاب آتا نہیں

کیوں نہ ہو تجھ چشم کا مخمور بیمار بے حجاب　　جام مے جس نے پیا اسکو حجاب آتا نہیں

کیونکہ سیر چاندنی کرنے کو نکلا وہ صنم　　دیکھنے مہ کا تماشہ آفتاب آتا نہیں

تجھ ہم آغوشی میں ہے آرام جاں داؤد کو　　گرچہ موئے بستر مخمل تو خواب آتا نہیں

ایک غزل کے تین شعر ہیں ۔

مرا احوال چشم یار سے پوچھ　　حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

مرے حال پریشاں کی حقیقت　　صنم کے زلف کے ہر تار سے پوچھ

مری ہر اک صدائے آہ کا پیچ　　صنم کے چہرۂ بلدار سے پوچھ

اسلوب بیان کتنا سادہ اور زبان کتنی صاف ہو گئی ہے۔ متقدمین صنعت لفظی و معنوی کا خاص طور پر التزام کرتے تھے، داؤد کے یہاں بھی صنائع و بدائع کی کمی نہیں تاہم ہر جگہ سادگی کو ملحوظ رکھا ہے۔

جب سوں کیا لباس وہ گل پیرہن ہرا　　یکبارگی دکھا کے جھپ عاشق کا من ہرا

مسند ہے اہل دل کو بساط زمیں کا فرش　　ہے بے ریا کو بوئے ریا نقش بوریا

اور کہتے ہیں ۔

کرامت وعدۂ کل جان من عشاق بیکل سے　　جو آپی کل سے بیکل ہے اسے کیا کام ہے کل سے

صنعت ایہام میں دو شعر کہے ہیں ۔

ہے شراب و کباب و فصل بہا　　کوئی اس وقت میں پیالا دو

زرگر آب مجھ سے زرگری مت کر　　بھاؤ بتلا شتاب سونے کا

تشبیہوں اور استعاروں میں بھی وہی سادگی موجود ہے ۔

یہ خط سبز نہیں رخ پہ صنم کے آغاز　　مور نے ملک سلیماں کو تسخیر کیا

گلبدن ہنستا ہے مجھ رونے کو دیکھ　　خندۂ گل گریۂ شبنم ہوا

نہیں سنبلا کے داغ ہیں تجھ مکھ پہ اے صنم　　آئینہ تجھ جمال کا جوہر نما ہوا

کیونکہ نہیں سیر چاندنی کرنے کو نکلے وہ صنم　　دیکھنے مہ کا تماشا آفتاب آتا نہیں

داؔود نے ان اشعار میں محاوروں کو کس خوبی سے استعمال کیا ہے۔

دلِ پُر خوں مرا بزنگِ حنا — لے لیا گلبدن نے ہاتھوں ہات

دست رنگیں کو دیکھ کر تیرے — رنگ مہندی چھپا ہے پاتوں پات

اور شعرا کی طرح داؔود کا اشہب فکر بھی میدان محبت میں دوڑتا رہتا ہے۔ ایک آدھ شعر کبھی پند و نصیحت میں کہہ لیا تو کہہ لیا ورنہ ہمیشہ 'حدیث دل کی تفسیروں' ہی سے اپنے تخیل کی جنتیں آباد کرتے رہتے ہیں۔ ماحول کی رنگینی ان کے کلام میں جابجا جھلکتی ہے ایک دو شعر پند و نصیحت میں بھی کہے ہیں۔

تیمم اس کا ان کے وضو کرنے سے افضل ہے — کیا ہے جن نے حاصل خاکساری کی عبادت کو

اے زاہداں اٹھاؤ جبیں کو زمین سے — جو سرنوشت ہے اسے کاں لگ مٹاؤگے

پھر اسکے بعد عشق و عاشقی سے متعلق اُن کی طبع رسا نے خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ شعر ہے۔

کہتے ہیں عاشقاں یہ مرا حال دیکھ کر — شاید تو دل دیا ہے کسی بیوفا کے ہاتھ

الفاظ سادہ ہیں، مگر اظہار جذبات کیلئے اتنا موثر انداز بیان اختیار کیا ہے کہ دوسرے مصرعہ کو بے اختیار پھر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور پھر کہتے ہیں۔

آتش عشق سوں تری جل جل — دل ہوا دل ہوا کباب کباب

جب کوئی آگ میں جلتا ہے تو وہ بے اختیار ہو کر اپنی مصیبت کا اظہار کر دیتا ہے۔ اس بے اختیارانہ انداز نے داؔود کے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔ ان کے حریف سرؔاج کا شعر ہے۔

جلنا تڑپ تڑپ کر مرنا سلک سلک کر — فریاد! ایک جی ہے کس کس خرابیوں میں

داؔود کی معنی آفرینی اور حسن بندش بھی ملاحظہ کیجئے۔

ہوا ہے ابر گریاں دیکھ میری چشم گریاں کو — پڑا ہے شور دریا میں مرے اس اشک جاری کا

دست رنگیں کو دیکھ کر تیرے — رنگ مہندی چھپا ہے پاتوں پات

ولی کا شعر ہے۔ اے دل شتاب چل کہ تماشہ کی بات ہے بیٹھا ہے آفتاب نکل ماہتاب میں

داؤد کہتے ہیں۔ دیکھ تیرے لبوں کا رنگ مسی چشمۂ خضر پہ پڑا ظلمات

دیکھ کر خط سبز کو تیرے تھا شرابی سو سبزہ پوش ہوا

یہ جام چشم مست جسے تم دکھاؤگے تا حشر اسکو ہوش سے اسکے بھلاؤگے

جس بوستاں میں وہ گل رخسار ہوئے گا بلبل بہار سیتی بیزار ہوئے گا

نقش محراب کیوں نہ ہو زاہد وہ مرا میرزا لمنازی ہے

مثل سرمہ کئے ہیں چادر چشم خوبرو ہیں جہاں تلک کالے

صنم نے کھول کے جب زلف کو دراز کیا ہمارے حال پریشاں کا راز دار کیا

عدو ل کیوں نہ کرے وعدۂ ہم آغوشی کیا ہے شوخ نے بر میں قبائے نافرماں

داؤد ہو نے حشر میں جوں لالہ سرخ رو بس داغ مجکو آل محمد کے داغ کا

جب خیال یار میں کرتا ہوں دل بیار دل دل مرا ہو مجھ سیں بیگانہ شتاب آتا نہیں

اس شکر لب سوں میسر کیوں نہ ہو بوسہ مجھے چشمۂ حیواں سیں کس کے ہات آب آتا نہیں

ایجاد

مرزا علی نقی نقد علیخاں دُرِ بہا

وفات ۱۱۸۵ ہجری

از میر سعادت علی صاحب رضوی ایم اے

مرزا علی نقی نام۔ نقد علیخاں خطاب اور ایجاد تخلص تھا۔ ہمدانی الاصل قوم قاچار سے تھے۔ ان کے باپ آصفجاہ اول کے عہد میں دکن آئے۔ اُن کے علم و فضل کا لحاظ کر کے آصفجاہ بہادر نے انہیں حیدرآباد کی خدمت دیوانی پر مقرر فرمایا جس کو انہوں نے جفاکشی اور دیانتداری سے تاحیات انجام دیا۔ ابتداءً برہان پور کو اپنا وطن قرار دیا تھا جہاں ایجاد پیدا ہوئے۔ آصفجاہ اول نے چندروز ایجاد کو اپنی مصاحبت میں رکھا اسکے بعد اپنے لشکر کی کوتوالی پر متعین فرمایا۔ کوتوالی سے فیلخانہ شاہی کی داروغگی سرفراز ہوئی۔ کچھ دن بعد حیدرآباد کی کروڑگیری کی خدمت بھی انکے سپرد رہی جب ۱۱۶۴ھ میں انکے والد نے وفات پائی تو نواب ناصر جنگ شہید نے خدمت دیوانی حیدرآباد پر ایجاد کو مقرر فرمایا اور خطاب موروثی نقد علیخاں سے سرفراز کیا۔ اس خدمت پر ایجاد تازندگی مامور رہے۔ اپنے باپ کی طرح دیانت اور جفاکشی سے ملک و مالک کی خدمت کی۔ ان کے عہد وزارت میں رعایا خوشحال اور بادشاہ ان سے خوش رہے۔ سنہ وفات متحقق نہیں لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۸۵ھ میں انہوں نے رحلت کی۔ پہلے حیدرآباد میں ان کی نعش امانت رکھی گئی بعد میں ان کے ورثا نے کربلائے معلیٰ روانہ کردی اور وہاں دفن ہوئے۔ ایجاد کے تین لڑکے تھے۔ علی نقی خاں انصاف۔ مہدی علیخاں نیر۔ باقر علیخاں افسر۔ تینوں صاحب دیوان اور اچھے شاعر تھے اور سرکاری ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔

ایجاد نے تکمیل علوم و فنون کے بعد شاعری کے میدان میں قدم رکھا اور اپنے باپ کو کلام دکھانے لگے۔

طبیعت فطرتاً شاعری کی طرف مائل تھی بہت جلد اس فن میں کمال حاصل کر لیا اور اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگا۔ معنی آفرینی۔ نازک خیالی۔ اور محاورہ بندی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ میر غلام علی آزاد۔ واقف۔ لچھمی نرائن شفیق۔ مہربان وغیرہ ایجاد کو ایک بلند پایہ شاعر مانتے تھے۔ نثر میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ مقفیٰ عبارت اور رنگین فقرہ لکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میر غلام علی آزاد کو (جن سے دوستانہ مراسم تھے اور باہم مراسلت ہوتی تھی) ایک رقعہ لکھا تھا جس کے ہر ایک جملہ سے "میر غلام علی آزاد" کے بحساب جمل اعداد (۱۴۴۴) نکلتے ہیں چند جملے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں :۔

"شاہ عالی عتبۂ کشور آزادی۔ اعلیٰ مراتب اقلیم والانژادی۔ سید صحیح النسب میمنت صفات۔ دلکش کلام رفیع الدرجات۔ شمع النفات وسلوک۔ چراغ انجمن ملوک۔ عزّت خاندان کرام۔ فخر مجموع اعالی بلگرام۔"

اگرچہ ان کی مادری زبان فارسی تھی اور فارسی زیادہ کہتے اور لکھتے تھے لیکن اُردو میں بھی بہت کچھ طبع کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ غزل۔ قصیدہ۔ منقبت۔ مناجات سب کچھ کہا اور خوب کہا۔ ان کا کلیات جو اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے کتبخانہ نواب سالارجنگ بہادر میں محفوظ ہے۔ اسی کلیات سے ہر صنف سخن کے منتخب نمونے پیش کئے جاتے ہیں :۔

غزلیات

میں گلِ بوستانِ معنی ہوں بلبلِ گلستانِ معنی ہوں
یہ قلمرو مجھی سے ہے آباد پادشاہِ جہانِ معنی ہوں
ہر سخن پر قلم مرا جاری ناظمِ حکمرانِ معنی ہوں
مرے مطلع ہیں آفتابِ سخن مشرقِ آسمانِ معنی ہوں
مت زبانی کہو مجھے معنی میں سخن میں زبانِ معنی ہوں
قابلیت کے نونہالوں میں سروِ موزوں بیانِ معنی ہوں

صورت ایجاد ہوں مضامیں کا جسم الفاظ و جان معنی ہوں

(۲)

بن دل کے داغ عشق کا دعویٰ اگر کہیں محضر بغیر مہر نہیں معتبر کہیں

خوناب اشک میں مرے آنکھوں کے سامنے بہتا پھرے ہی دل کہیں لختِ جگر کہیں

حسن اسکا میں تو کیا کہوں یوسف بھی اے عزیز دیکھا نہوگا خواب میں ایسا بشر کہیں

ہر چند کی نگہہ نے مری موشگافیاں آئی نہیں نظر مجھے اسکی کمر کہیں

(۳)

تماشا تھا اگر اب باغ میں ہوتا وہ یار اپنا خجل کرتا ہر اک گل کو دکھا کے نو بہار اپنا

مری آنکھوں میں ہر اک پھول کانٹا سا کھٹکتا ہے مجھے جب یاد آتا ہے چمن میں گلعذار اپنا

تمھارے ہاتھ میں ہے آرسی کی آبرو دیکھو بہر صورت تم اس سے رُخ نہ بدلو یہ ہمارا کہنا

تکلف بر طرف ایجاد کو پوچھو مرے پیارے انیسِ غم گسار اپنا رفیقِ جانثار اپنا

(۴)

دُور رہوں اب پھر وطن سے دشتِ غربت کی قسم میں بیاباں گرد ہوں مجنوں کی تربت کی قسم

رام ہوتا میں کسی کا میں غزالوں کی طرح دل بھڑکتا ہے مرا عالم سے وحشت کی قسم

میکدہ میں کون رکھتا عزتِ پیرِ مغاں گر نہ دیتی دخترِ رز اپنی حُرمت کی قسم

میں جدا تجھ سے نہ ہونگا تو بھی دل میرا نہ توڑ مجھکو الفت کی قسم تجھکو مروت کی قسم

تیرے دشمن سے اگر منہ پر ملا تو کیا ہوا دل سے تیرا دوست ہوں مجھکو محبت کی قسم

دل دہی میں سب سے تو ایجاد کو ممتاز رکھ اے کرم فرما تجھے اب تیری ہمت کی قسم

(۵)

جس طرح ہے عندلیبوں کو گلستاں کا تلاش مجھکو بھی اس طرح سے ہے سیرِ خوباں کا تلاش

جس کے لب کے گفتگو سے شور ہیں آوے جنوں میرے داغِ دل کو ہے ایسے نمکداں کا تلاش

ہے ترے یاقوت لب کا اس قدر شہرہ کہ آج جوہری کو بھی نہیں لعلِ بدخشاں کا تلاش

اہل دل ہیں جستجو میں رات دن ایجاد کی ان عزیزوں کو ہے اکثر ایسے مہماں کا تلاش

مجلس وہ بیٹھیے کہ جہاں امتیاز ہو — اخلاص اس سے رکھو جو مخلص نواز ہو

ٹیڑھوں سے ٹیڑھے ہو کے ملاقات کیجیے — سیدھے ہو ملیے اس سے جو کوئی راست باز ہو

شعر اسکے آگے پڑھیے جو فہم سخن رکھے — معنی کہیے اس سے جو معنی طراز ہو

پہلو اسی کے بیٹھیے جو دلبری کرے — باتیں اسی سے کیجیے جو ہمدرد و راز ہو

ہم دل جلوں کی بات وہ سمجھے جو شمع سا — روشن بیان محفل سوز و گداز ہو

ایجاد کے جو ہات کا طرہ کرو قبول — وہ اپنے ہمسروں میں نپٹ سرفراز ہو

پند و نصائح

روح انسان آدمیت ہے — خلق خوش جان قابلیت ہے

جس میں یہ دو صفت نہیں اسمیں — جاہلیت ہے یا خریت ہے

نخوت انسان کو مناسب نئیں — نخوت ابلیس کی طویت ہے

دور رہتا ہے رحمت حق سے — جسکے تئیں زحمت انیت ہے

فعل شیطاں سے اجتناب کرے — آدمی کو اگر حمیت ہے

موذیوں کا غریب ہو ملنا — یہ بھی اک قسم کی اذیت ہے

جتنے اعضا ہیں تابع دل ہیں — دل ہے سلطان بدن رعیت ہے

معتبر زاہدی و رندی نئیں — معتبر سب عمل میں نیت ہے

جس نے خالق طرف رجوع کیا — خلق میں اس کی مرجعیت ہے

خیر تیری اسی میں ہے ایجاد — حق تعالی کی جو مشیت ہے

اس مختصر سے انتخاب ہی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ایجاد کے خصوصیات شاعری کیا ہیں۔ کلیات میں ردیف وار غزلیں اور قصائد ہیں۔ مناسبتی الفاظ تقریباً ہر شعر میں بلاتکلف آجاتے ہیں طبیعت کی روانی

اور زبان کا خیال ان الفاظ کو تعقید سے پاک کر دیتا ہے۔ پڑھتے ہوئے گراں نہیں معلوم ہوتے۔ ایجاد بہت پرگو شاعر تھے۔ مشکل قافیہ اور ردیف میں بھی انہوں نے اسی رنگ کی غزلیں کہی ہیں اور کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انھیں اپنا مطلب واضح کرنے میں کوئی دقّت محسوس ہوئی ہو۔ پھر لطف یہ کہ سلاست بھی موجود ہے۔ انکے کلیات میں اردو غزلیں بہت کم ہیں۔ البتہ قصائد اور منقبت میں ان کی فکر بلند تیز گامیاں دکھاتی ہے ذیل میں ہم قصیدہ منقبت اور مناجات کا انتخاب پیش کرتے ہیں:—

منقبت۔

خوش کیا مجکوں عطائے منقبت — جان و دل میرا فدائے منقبت

دامنِ آلِ عبا ہے میرے ہاتھ — جب سے پہنا ہوں قبائے منقبت

میں کسی کی مدح ممکن نئیں کروں — مجکوں واجب ہے ثنائے منقبت

ہو رہا ہوں سونے روپے سیں غنی — جب سیں سیکھا کیمیائے منقبت

فخر ہے مجکوں سلاطیں پر کہ ہوں — شاہ مرداں کا گدائے منقبت

نیں پسند ایجاد کے تئیں شعر میں — کوئی موزوں اب سوائے منقبت

قصیدہ

پھر میں نہ جانوں کیا ہے زمانہ کا اقتضا — دل جس کا دیکھئے تو ہے اس عصر میں خفا

فکروں میں چور منعم و درویش ہیں سبھی — اندوہ میں تمام ہیں کیا شاہ کیا گدا

ملتا نہیں ہے شربتِ دینار ایک دام — بیمار احتیاج کی مفقود ہے دوا

اس فتنہ زمانہ واس روزگار بیں — اے دل توں اعتقاد میں اپنے خلل نہ لا

والی ہمارا شاہ ولایت پناہ ہے — جو ہمکوں آبروسیں ہر اک دور میں رکھا

وہ پنجہ یداللہ و یاقوت کان فیض — سائل کو جب نماز میں انگشتری دیا

اس کون خدا ولیّکم اللہ یاد کر — بھیجا ہے اپنے پیار سیں تشریف انّما

مت کہہ نصیر یوں ساعلی کو خدا ولیک — وہ نیں جدا خدا سیں خدا اس سیں نیں جدا

بن دوستی علی کی نہیں طاعتیں قبول وہ ہے امام مفترض الطّاعہ خلق کا
نقد علی کوں اپنے خزانہ سیں یا علی لاکھہ اشرفی کا گنج لگا کے کرو عطا
ایمان و تندرستی و توفیق و دل خوشی یہ چاروں پنجتن کے تصدق سیں دیو سدا
ہے ابتدا سیں اس کوں شہادت کی آرزو مدفون کربلا میں کرو وقت انتہا

قصیدہ

دار دنیا ہے منزل فانی اس کا اصل بنا ہے ویرانی اس عمارت کا ہے فنا معمار اس بنا کا ہے حادثہ بانی
ابتدا رنج و آبرو ریزی انتہا حسرت و پشیمانی جو کریں گھر خراب عالم کا ان کی کرتی ہے خانسامانی
روٹی اسکے جگر کے ٹکڑے ہیں خون دل اسکے گھر کا ہے پانی اہل دنیا کی بھی یہی ہے سزا سلب ہے انسے روح انسانی
اب تو مجھکو جنون گھیرا ہے میرا سودا کیا ہے طغیانی دل میں آتا ہے چھوڑ بستی کو جا کے مجنوں سا ہو بیابانی
تخت صحرا لئے بے نیازی پر جا کروں میں جلوس سلطانی فقر کے تئیں وزیر اعظم کر دیوں توکل کو میر سامانی
یہ ارادہ مرزونسے سن کے کہا حیف دانا سے ایسی نادانی فضل حق سے تو اہل معنی ہے تجھکو ہے رتبۂ سخندانی
وجد کرتے ترا سخن سن کر ہوتے گر انوری و خاقانی کہہ قصیدہ امام پنجم کا کر شروع انکی منقبت خوانی
خسرو دیں محمّد باقر مظہر جود و لطف یزدانی سایہ ذات حق ہے انکی ذات خلق پر ہیں وہ ظل سبحانی
ان کے نانا محمّد عربی ان کے دادا علی عمرانی انکا چہرہ ہے سورۂ والشمس والقمر ہے انہوں کی پیشانی
ہے انھوں کی زباں لسان اللہ نطق ان کا کلام ربانی فخر سے جبرئیل کرتا ہے ان کے بیت الشرف کی دربانی
وہ اگر چاہیں حق سے کہہ بخشیں مور کو رتبۂ سلیمانی یا امام محمّد باقر تم ہو اصل علوم فرقانی
جیوں ہے ایجاد پر غلامی ختم ختم تم پر ہے صاحب احسانی اے سحاب کرم کرو جلدی اپنے سائل اوپر درافشانی

ایجاد کے قصائد طویل ہیں۔ تمہید ہر قصیدہ کی یا تو بہاریہ ہوتی ہے یا زمانہ کی شکایت پر منطبق۔ اشعار میں غضب کی روانی ہے۔ کہیں پستی و بلندی نہیں ایک ہی رنگ میں ابتدا سے آخر تک انکے قصائد نظر آتے ہیں۔ تمام قصیدے مدح اہلبیت میں ہیں اور انکا دعویٰ بھی یہی ہے کہ بجز مدح اہلبیت کے انہوں نے کسی اور کی

مدح نہیں کی۔ مدح گوئی اور منقبت کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھیں کوئی نہ کوئی بہانہ اپنے شوق کی تکمیل کا مل ہی جاتا تھا چنانچہ ان کی چار پانچ مدحیہ نظموں کا عنوان 'مولا کا دستر خوان' بھی ہے (حضرت علی علیہ السلام کے نام سے ایک نیاز جو عموماً اہل تشیع کے یہاں ہوتی ہے) جس میں اس دستر خوان کی اور اسکے لوازمات کے نشانات کی جو بطور سند قبولیت ہوا کرتے ہیں مدح کی گئی ہے۔ یہ خصوصیت شاید ہی کسی مدح گو شاعر کے کلام میں دستیاب ہو۔ ہماری حد تحقیق میں تو یہ ایک بالکل نئی چیز نظر آتی ہے۔

مناجاتیں بھی اسی رنگ کی ہیں۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ایجاد کے قصائد پر تفصیلی نظر ڈالی جائے لیکن اتنا ضرور کہا جائیگا کہ اگر قصائد کے معیار کے لحاظ سے ایجاد کو دکن کا سودا کہا جائے تو مبالغہ نہیں۔ کیونکہ ایجاد سے پہلے دکن میں اس قسم کے قصائد عہد قطب شاہیہ میں لکھے گئے تھے مگر انکی زبان بہت قدیم ہے۔ ایجاد کے کلیات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے فارسی ہو یا اُردو قصائد ہی زیادہ لکھے ہیں اور قصیدہ گوئی ہی انکا مطمح نظر معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ایجاد کو 'عہد آصفجاہی کا پہلا قصیدہ گو شاعر' کہیں تو زیادہ موزوں ہوگا۔

فارسی میں ایجاد نے مرثیے بھی کہے ہیں لیکن اردو میں کوئی مرثیہ نہیں ملا۔ اسلئے ہم یہاں کوئی نمونہ اس صنف سخن کا پیش نہیں کر سکتے۔ البتہ جو قصیدہ ایجاد نے امام حسین کی مدح میں لکھا ہے اسکی تمہید میں مجملاً واقعہ کربلا کا ذکر ہے جسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں :—

کوئی جی نہیں ہے خوش دل کوئی دل نہیں ہے بےغم — گویا کہ ان دنوں میں ماتم سرا ہے عالم
عالم تمام غم میں رہویں تو کچھ عجب نئیں — تاریخ اول سال ہے غرۂ محرم
جس چاند میں جناب حضرت حسین مظلوم — کے سیں کربلا کو جا کر کئے ہیں مخیم
جب کربلا میں پہنچے وہ سرور شہیداں — مارے یزیدیوں نے بیعت کا قول برہم
نو روز تک رکھا ہے آل نبی کو پیاسا — واں ابن سعد ملعون لشکر کو لا فرا ہم
اس قوم بےحیا کوں وہ حجت الٰہی — اول کئے انہوں کے نامے دکھا کے ملزم

الزام پاکے پھر بھی قتل و محار بے پر　　باندھے کمر ستم سیں سارے گروہ ظلم

لشکر میں زور بازو عباس کا علم تھا　　اون کو کیئے سرافراز حضرت نے دے کے پرچم

قاسم کی کتخدائی قسمت میں تھی دلہن کی　　یہ شادی اس غمی میں جلوہ کئے بہت کم

حضرت علی اکبر پیش از علی اصغر　　باپ آگے پا شہادت پہنچے بخدمت عم

اصغر کا حلق سوکھا بن دودھ ہو رہا تھا　　ناوک کیا عدو کا لوہو سیں اسکو ترنم

وہ سرورِ شہیداں دیکھے کوئی رہا نیں　　آخر کیئے شہادت اپنے اوپر مُسلّم

اس معرکہ ستم میں اس رزم پر الم میں　　سرور کا کوئی نیں تھا یار و رفیق و ہمدم

تھے دو ہزار کچھ کم زخم اس جناب اوپر　　لیکن سبھی جراحت تھے پیش رو مقدم

وہاں ذوالجناح پر سیں حضرت اتر کے بیٹھے　　پامژدۂ شہادت ہوا رجعی کے ملہم

شمر لعین بے دیں جو کافری کیا ہے　　یا سامع المراثی وَالْعَنْ عَلَیْہِ وَاُفْہَمْ

نزدیک تھا گرے چرخ روئے زمیں کے اوپر　　کچھ دور بھی نہیں تھا پشت زمین ہوئی خم

اب لگ بھی آسماں ہے خونِ شفق سیں گریاں　　محشر تلک رہیگا روئے زمیں پہ ماتم

ان چند اشعار میں مختصر طور پر واقعہ کربلا کا جو ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایجاد فارسی کی طرح اُردو میں بھی مرثیہ کہنے کی قابلیت رکھتے تھے کیونکہ ان اشعار میں اظہار واقعہ کے ساتھ ساتھ مرثیت بھی ہے۔ اور یہی دکنی مرثیوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔

ذرہ

بالاجی ترمبک نائک

سنہ ۱۱۵۰ھ تا سنہ ۱۲۰۰ھ

از محمد اکبر الدین صاحب صدیقی

بالاجی ترمبک نائک نام اور تخلص ذرہ تھا۔ کسی تذکرہ نگار نے ذرہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اسلئے ان کے حالات ابتک پردۂ اخفا میں رہے۔ ذرہ نے اپنی کلیات میں اپنے ممدوحوں کی تعریف میں چند اشعار لکھدئے ہیں اور بعض مشہور ہستیوں کی وفات یا شادی یا پیدائش کی تاریخیں بھی لکھدی ہیں ان میں سے ان کی زندگی کے بھی کچھ حالات معلوم ہوجاتے ہیں۔ کتبخانہ آصفیہ میں ان کا ایک کلیات خود انکا قلمی محفوظ ہے۔ اس میں ایک تاریخ ۱۱۶۲ ہے اور اس سے پہلے کی تاریخ ان کی کلیات میں نہیں ملتی اور آخری تاریخ ۱۱۹۲ھ ہے جو شاہ اقدس کی وفات پر لکھی گئی ہے۔ اسلئے ان کی شاعری کا دور ۱۱۵۰ھ سے ۱۲۰۰ تک قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ان کے سال ولادت اور وفات کا صحیح علم نہ ہوسکا۔

ذرہ کے وطن کے متعلق ان کے اس شعر سے :-

غلغلہ تیرے شعر کا ذرہ   اس دکھن سے ہے چو کدھن میں آج

استنباط کیا جاسکتا ہے کہ قلمرو سلطنت آصفیہ ہی کے کسی علاقہ سے ان کے خاندان کا تعلق رہا ہے اور یہ نواب نظام علیخاں آصف جاہ ثانی کا دور حکومت تھا۔ برار سے ارکاٹ اور اس کے جنوب تک کا علاقہ دکن میں شامل تھا اور حکومت بھی آصف جاہی تھی۔

ذرہ نے برہان پور کے بعض مشہور ہستیوں کی تعریف میں اور ان کی وفات پر تاریخی قطعات کہے ہیں "در وصف شیخ اسمٰعیل صاحب" کے عنوان کے تحت ایک شعر یہ ہے۔

شیخ اسمٰعیل آمد مقتدائے اہل دیں پیشوائے رہرواں صادقین کاملیں

اور دوسری ایک رباعی اسی کے نیچے ہے۔

تم کو مسکن شہر برہاں پور ہوے تم سے روشن شہر برہاں پور ہوے

تم سے ہو ہر گل گلِ باغ ارم تم سے گلشن شہر برہاں پور ہوے

مصنف تاریخ برہان پور مولوی شیخ اسمٰعیل کی یوں تعریف کرتا ہے۔

"اپنے زمانہ میں فرد بے نظیر تھے کتب نایاب ان کے پاس تھیں۔ برہان پور میں کوئی عالم ان کے برابر اس وقت نہ تھا حکیم لاثانی مولوی محمد اسحاق کے برادر خرد تھے"

حکیم عبدالسلام عرف حکیم چھمّو کی تعریف میں ذرہ کا یہ قطعہ ہے۔

رکن اعظم دین روشن را نظام سیّد برحق حکیم عبدالسّلام

جبہہ نورانیت ترکیب اصحاب رسول مقبل و مقبول خوش طاعاتش پیش حق قبول

مغفر و مغفور منظور جناب کبریا خاص خوان رحمت حق بر سرش شد نزول

مصنف "تاریخ برہان پور" حکیم عبدالسلام کے متعلق لکھتا ہے۔

"عالم فاضل، حافظ قرآن مجید جامع علوم منقول و معقول تھے علم حکمت میں ارسطوئے زماں بلکہ فلاطون دوراں تھے تشخیص و تجویز و معالجہ امراض میں لاثانی تھے۔ نواب غازی الدین خاں فرزند آصف جاہ اول .... ان کے کمالات حکمت کے معتقد ہو گئے تھے...... حکیم ممدوح نے اپنے نسخہائے مجربات کی کتاب مسمّٰی قرابادین سلامی تصنیف کی تھی"۔

ان اصحاب کی تعریف کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذرہ صاحب کمال کے جویا تھے اور برہان پور سے غالباً کچھ نہ کچھ تعلق بھی ضرور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اورنگ آباد میں انہوں نے منتقل سکونت اختیار کی چنانچہ سراج کے تلامذہ کے ساتھ یہ اورنگ آباد میں نظر آتے ہیں انہوں نے ایک قطعہ اپنے معاصرین کو گنانے ہی کے لئے لکھا ہے جن میں اکثر سراج کے تلامذہ ہیں۔ لیکن یہ خود سراج کے شاگرد نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ان کے تھے پاس بہت شاعر سنجیدہ سخن — فکر عالی سے ضیا ان میں عیاں بیٹھے تھے

میر جعفر کے انھوں میں تھے وہ منصب تنک — یکدم و سیّد علی آکے وہاں بیٹھے تھے

شاہ رضا حق کی رضا میں تھے فقیر کامل — لے کے خاموش تھے پن ترلساں بیٹھے تھے

فخر و عزّت کا دیا تب نور رسا نے خلعت — ویسی جائے کہ جہاں پیر و جواں بیٹھے تھے

محمد عطا ضیا محمد رضا بیگ رضا، شاہ سراج کے مشہور تلامذہ ہیں جن کا لچھمی نرائن شفیق نے "چمنستان شعراء" میں تذکرہ کیا ہے۔

رسا۔ ذرہ کے استاد ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنے کلیات میں بار بار کیا ہے۔ رسا کے متعلق فضل قاقشال دولت آبادی اپنے تذکرہ "تحفتہ الشعراء" میں لکھتے ہیں۔

ابتدا ہمراہ نواب شجاعت خاں بہادر مرحوم صوبہ دار صوبہ برار بودہ در سخن سرائی از بلند فہمی طرز نکتہ دانی دارد۔ نواب شاہنواز خاں بہادر معنی یاب از اشعارش محفوظ"

مصنف تذکرہ شعرائے دکن لکھتے ہیں۔ "مرزا جان کا مولد حیدرآباد دکن ہے اور نشو و نما نواب آصف جاہ بہادر کے لشکر میں پایا...... عالم فاضل ادیب کامل تھے۔ آصف جاہ بہادر اول کے آخر عہد میں دارالانشا میں موسیٰ خاں جرأت کی جگہ میر منشی ہوئے۔ حضور آصف جاہ کے خاص معتبرین میں داخل ہوئے دلی کے سفر میں حضور آصفجاہ کے ہمرکاب تھے...... آخر عمر میں دارالانشا سے محکمہ کروڑگیری بلدہ حیدرآباد میں منتقل ہوئے" اس واقعہ کا تذکرہ قاقشال نے بھی کیا ہے۔

ذرہ نے برہان پور کے متعلق بھی لکھا ہے اور اورنگ آباد کے بھی۔ رسا کی زیادہ عمر اورنگ آباد میں گذری

اوراس سے خیال ہوتا ہے کہ ذرہ نے اورنگ آبادہی میں نشو و نما پائی وہ آزاد بلگرامی کی بھی تعریف کرتے ہیں اور انکے ساتھ رہے ہیں اور اس پر تعجب ہے کہ شفیق نے اپنے تذکرہ میں ذرہ کو جگہ نہ دی۔

ذرہ شاہ اقدس کے معتقد ہیں چنانچہ کئی اشعار ان کی تعریف میں ملتے ہیں۔ ان کی وفات پر ذرہ نے جو اشعار لکھے ہیں یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

اس گلشن دنیا کا شمشاد گیا گذرا — سالار سخن تھا وہ فریاد! گیا گذرا
ذرہ نے فلک اوپر خورشید سے جا بولا — فردوس میں شہ اقدس آزاد گیا گذرا

سرو گلزار سخن تھے شاہ اقدس پیشوا — عالم علم معانی اور فقیر رہنما
تھے مسافر، ان کی منزل کو کہا ہاتف نے آہ — ایکہزار یکصد و نود و دو میں جنت جا رہا

گل و بلبل پہ غم تھا شور تھا کل باغ میں یارو — کوئی کہتا تھا گلشن میں سے جھاڑو سرو کو جھاڑو
نکالو قمریوں کو اور چمن ماتم سیں رنگیں ہو — ہوا ہے شاہ اقدس اس کو گلشن بیچ لاگاڑو

شاہ علی تجلی کے متعلق دو قطعے کلیات میں ہیں۔

شاہ عالی منزلت دے باب حق سر خفی — مقتدائے شاہ شیر اللہ فقیر منجلی
ذرہ در وصفش زباں را شاخ گل بیہودہ است — در سر راہش کند از چشم فرش مخملی

مظہر نور کرامت شاہ علی بے نوا — مقتدائے ہر دو ملت سر اسرار خدا
ذرہ کردہ اشتیاق از دل جناب آں ولی — طوطیائے چشم ساز د خاکپائے رہنما

شاہ تجلی اور شاہ اقدس بھی اورنگ آبادی ہیں اور گمان غالب یہی ہے کہ ذرہ بھی اورنگ آباد کے باشندے ہیں۔

وہ اپنے استاد کے بیحد مداح ہیں اور مختلف مقامات پر ان کی شاگردی پر فخر کیا ہے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل کا مقطع ہے۔

کوئی دن کی فکر بیچ میرا مبد ہے ذرہ — از فیض رسالائق سلطان کہوں گا

ذرہ بھی اپنے رنگ میں خورشید طبع ہے — مضموں کا اس کے رنگ پڑا ہے رسا کے ہاتھ

فیض اقدس ہو رسا جب ذرہ ہووے آفتاب — تب لگے تجھ ہاتھ میں مضمون کے آنے کے ڈھب

کہا ذرہ نے دیکھا ہوں میں اکثر — رسا کا سچ ہے بانڈ بیر ہے دل

ذرہ عاشق ہے رسا خورشید کا — کون کہتا ہے سخن میں آئے ہیں

غرض ایسے کئی اشعار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذرہ کو رسا کی شاگردی پر فخر ہے ذرہ کے ممدوحوں میں صادق علی خاں خورشید جنگ نمایاں ہستی ہیں۔ اسکے بعد احمد میر خان اور عبدالرحیم خاں ہیں۔ مصنف تزک آصفیہ لکھتے ہیں کہ احمد میر خاں امیر بیگ خاں کے بعد داروغگی احشام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

خورشید جنگ کی تعریف میں ذرہ نے جتنے اشعار کہے ہیں کسی اور رئیس کی شان میں نہیں کہے۔

شاعری ۔ ذرہ کی شاعری میں ایسے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو آجکل متروک ہیں مثلاً سیں۔ سیتے۔ سوئیں سجن۔ وو۔ نمن وغیرہ۔

ذرہ کی غزلیات کم سے کم چار اشعار کی اور زیادہ سے زیادہ چھ اشعار کی ہیں اس سے زیادہ اشعار کی پورے دیوان میں صرف دو تین غزلیں ہیں۔ دیوان کی ابتداء میں پانچ پانچ اشعار ہی کی غزلیں ملتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذرہ یقین کا تتبع کرنا چاہتے تھے۔

ذرہ نے خود کو جو مصرع پسند آئے ہیں اُن کی شاعر کے نام کے ساتھ تضمین کردی ہے جسکی چند مثالیں ذیل میں دیجاتی ہیں

عزلت	مصرع عزلت کو ذرہ ورد کرتا ہے مدام	اے سجن درشن ہوا کچھ کام باقی رہ گیا
یقین	یقین کا مصرع موزوں بہت دلچسپ ہے ذرہ	وفا یوں چاہیے شاباش بلبل مرحبا بلبل
سراج	سن سن کے یوں پڑھا ہے گا مصرع سراج کا	ہم نے بھی اپنے وقت میں دھوئیں اڑا چکے

ذرہ کا دیوان جس غزل سے شروع ہوتا ہے اس سے ان کے اعتقاد پر روشنی پڑتی ہے۔

لے نام خدا کا جو میں دیوان کہوں گا — لاشک ہے کہ موصوفہ انسان کہوں گا

کیا خوب سعادت ہے کہوں نعت نبی کی — ہر حرف ثنا بیچ جوں ریحان کہوں گا

لے نام علی وضع کروں دل سیتے مضموں — کیا شک ہے کہ میں رشک گلستان کہوں گا

حسنین کی تعریف لکھوں خون جگر لے — ہر سطر کو یا صورت مرجان کہوں گا

کوئی دن کی فکر بیچ میں امید ہے ذرہ — از فیض رسا لایق سلطان کہوں گا

ذیل کے اشعار صوفیانہ رنگ میں کہے گیے ہیں اور آخری مصرع قابل داد ہے۔

خدا کو صورت انساں میں دیکھا — علی کو مظہر قرآن میں دیکھا — ظہور کائنات سر مخفی — سو حضرت دل میں اور میں جان میں دیکھا

کیوں ذرہ بھید مخفی بولتا ہے — طلبگار جہاں کو نان میں دیکھا

مریض عشق کے معالجہ کے متعلق ذیل کے دو شعر لکھے ہیں۔

جنوں کے درد کی تدبیر پر تقدیر ہنستی ہے — دوا دیتا ہوں گر اس کو تو پھر تاثیر ہنستی ہے

سوزش عشق کا نہ کر تو علاج — واں تباشیر مثل چونا ہے

ان کی غزلیات سے چند منتخب اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ تاکہ ایک ایسے شخص کا اردو شاعری میں رتبہ معلوم ہو سکے جو اب تک بالکلیہ قعر گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔

کیا ہے اس ستمگر نے دل وحشی شکار اپنا — شہید ناز اپنا بسمل اپنا بے قرار اپنا

نہ بولی شمع اتنا ہائے پروانے کے ماتم پہ — کہ تھا یہ ہمدم اپنا یار اپنا جاں نثار اپنا

اس جان ناتواں کا مسیحا کب آئیگا — مجھ دل کا موسوی ید بیضا کب آئیگا

پتلیاں مری نین کے جھروکے میں بیٹھ کر — لے کل ہو جھانکتیاں ہیں پیارا کب آئیگا

عجب یہ باغ ہے بلبل گیا سو پھر نہ پھرا — وہ لینے واسطے یک گل گیا سو پھر نہ پھرا

خدا کی کھا کے وہ سوگند زاہد مکار — وہ پینے واسطے جو مل گیا سو پھر نہ پھرا

تجھ جلوہ گہ میں کس کی طاقت جو سر اٹھاوے — اوس حشر گہ میں کس کا درس کتاب ہوگا؟

گردش چشم سے ہیہات اونے لے بھاگا دل معلق ہی دھرا تھا مجھے معلوم نہ تھا

خوب سیکھے ہو پیارے دل کے لے جانے کے ڈھب ایک سیدھی بات کو نظروں میں سمجھانے کے ڈھب

سرو میں کاں ہے لطافت جو کہ تیرے قد میں ہے عمر چاہیے کہ سیکھے تیرے بل کھانے کے ڈھب

کون ہوتا ہے شمار چشم و قد ہم ہوے ہیں کے شکار چشم و قد لالہ و گلفام آیا باغ میں دیکھ لے اے دل بہا چشم و قد

ذرہ چل بیٹھ پہاڑوں میں یہاں کام نہیں کوئی دل خالی ز افکار نہیں ہے ہرگز

نور مظہر ہے سب جہاں میں فاش توں نہیں دیکھتا ہے جوں خفاش

توں فقیروں کے پاس ڈھونڈا کر معرفت کی اگر تجھے ہے تلاش

دیکھ تو ذات اسکی اے ناداں چھوڑ دے کلہم تو فکر معاش

پیر ہادی نے یوں کہا ذرہ جب تلک ہے جہاں میں تو خوش باش

بے وفاؤں سے وفا کرتے ہیں ہم حق محبت کا ادا کرتے ہیں ہم

بے مروت سے نبھانا خوب ہے اس سخن کو مقتدا کرتے ہیں ہم

قیامت رات ہے یہ رات تم بن خوش آتا نہیں کسی کا ساتھ تم بن

پیالہ اور صراحی کے اے پیارے نہ ڈالوں گا گلے میں ہاتھ تم بن

جو نشش میں ایک آہ کے کوں مکاں ہو گرم دیکھا ہے ایسی آہ کا تونے اثر کہیں؟

صبحدم اٹھتے ہی پیارے نے جو زلفیں کھولیاں ہم پہ کیا کیا آفتیں وحشت کی یکدم ہولیاں

رو کے کہتا باغباں ہر غنچہ سیں ہر شاخ سیں گل کا سینہ چاک ہے بلبل کی سن سن بولیاں

کیا حجابی موہنی ہے آہ اے پیارے مرے طوطیٔ جاں بات کے کرنے میں تونے موہیاں

ہوشیاری اہل دل کو کیف مے خواروں کے تئیں ہے ضیائے دل اونوں کو بے خودی ساروں کے تئیں

نوحہ بلبل کو، صدا مردنگ کو، قمری کو طوق شیشہ کو مے، مے کو شیشہ، زنگ گلزاروں کے تئیں

کچھ بھی یہ انصاف ہے اے ظالم خونخوار نت　　ہم کو ہجر دائمی اور وصل اغیاروں کے تئیں

ایسے خوبوں کو دل نہ دے زنہار　　تیرا دنیا میں کیا خدا ہی نہیں

اے دل تو ہوش میں رہ کر سب تلاش دل میں　　اس کی گلی میں مت جا تیرے کو پھیریاں ہیں

یہ ترش تیری باتیں صفرائیوں سے پیارے　　صفرائیوں کے حق میں شکر بکھیریاں ہیں

دل دیکھئے ہر بار یہ کیا بوالعجبی ہے　　اک راکھ کی ڈھیری ہے ذرا آگ دبی ہے

دیوانہ و وحشی مجھے کہتے ہیں پیارے　　مجنوں کے قبیلہ میں یہ عمدہ نسبی ہے

کھو دیا اعتبار آنکھوں نے　　دل دیا ایک بار آنکھوں نے　　سبز و سیراب تھا صدیقہ تن　　کیا لٹا دی بہار آنکھوں نے

گردش چشم میں کیا لطف رکھا ہے تو نے　　جس طرف پھیرے ادھر گنج شہیداں ہووے

اگر شبنم نمن گل پر عرق اس حور کے ٹپکے　　تو آنکھوں سے لہو خون دل رنجور سے ٹپکے

شمع جرأت نہ کرے دیکھ کے نازک بدنی　　گل کھلے دیکھ کے گلشن میں یہ غنچہ دہنی

طپش دل کو مرے دیکھے اگر تو یکبار　　ہووے برباد اے پروانے تری سوختنی

کیوں ان دنوں میں پیارے مجھ سے خفا ہے　　غیروں سے تو تو جانے کیسا ملا رہے ہے

میں نے کہا کہ اے جاں اک رات نور ہو تم　　اون نے کہا کہ جا رے میری بلا رہے ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے　　پرستش تو یاں تک کئے ہم تری　　کہ دنیا میں تجھ کو خدا کر چلے

ہیں فرض و سنت ہے تیرا جمال　　نماز محبت ادا کر چلے

ذرہ نے دو تین چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک مظہر نامہ اور دوسری مثنوی لطیف ہے مظہر نامے میں خدا کی وحدانیت اور اسکا ہر شکل میں رہنا بتلایا ہے اور موخر الذکر میں مثنوی مولانا روم کے چند اشعار لے کر انکی تشریح کی گئی ہے ایک سراپا بھی لکھا ہے جس میں ایک سو چودہ اشعار ہیں۔ انکے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر و سخن سے انکو خاص ذوق تھا۔ اور اس دور میں لچھمی نارائن شفیق اور رنگ آبادی سے قبل غالباً ہندو شعراء میں ذرہ ہی کا نمبر اول ہوگا۔

عشق

مرزا جمال اللہ عشق اورنگ آبادی

سنہ تا سنہ ۱۱۹۵ھ

از سید اشفاق حسین صاحب بی۔اے (عثمانیہ)

اورنگ آباد کی سرزمین کو ہمیشہ یہ فخر رہیگا کہ جدید اُردو شاعری کے اولین معمار وہیں پیدا ہوئے۔ ولی نے جدید اُردو شاعری کا کالبد یہیں تیار کیا اور اس میں روح پھونکی، سراج نے اسے چلنا پھرنا سکھایا اور داؤد نے اس کی چال میں لچک پیدا کر دی جب تک سک سے درست ہوکر دکن کی یہ سانولی، باہر نکلی تو ہر دیکھنے والا اس پر مٹ کر رہ گیا۔ شمالی ہند میں اس کا سحر خوب رنگ لایا۔ دلّی میں اس حسین مہمان کی بڑی خاطر و مدارات ہوئی۔ گلی گلی اور کوچے کوچے اسی کا تذکرہ ہونے لگا۔ باہر تو اس نے خوب رنگ جمایا مگر خود "گھر" میں اس کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ آصف جاہ اول نے سنہ ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی تو دکن کی سرزمین فتنہ و فساد کا گھر بن گئی۔ اس دور انتشار کا خاتمہ نظام علیخاں آصفجاہ ثانی کی تخت نشینی سے ہوا۔

اورنگ آباد اجڑ کر حیدرآباد پایہ تخت بنا۔ اورنگ آباد کی شعر و شاعری کی محفلیں رفتہ رفتہ سونی پڑتی گئیں۔ بہت سے شاعروں نے حیدرآباد کا رخ کیا۔ مرزا جمال اللہ عشق بھی اسی دور انتشار کی پیداوار ہیں۔ عشق نے جب آنکھ کھولی تو اورنگ آباد کی فضا شعر و شاعری کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ گھر گھر شاعری کے چرچے تھے۔ ولی کے بعد سراج اور داؤد کی استادی میں سیکڑوں شعرا پروان چڑھ رہے تھے۔ عشق مرزا داؤد کے بیٹے تھے جنکے گھر پر

رات دن شعر و شاعری کی محفلیں جمی رہتی تھیں۔ اسی ماحول میں جوان ہو کر عشق نے عنفوان شباب ہی سے شعر کہنا شروع کیا اور اپنے باپ کے ساتھ اورنگ آباد کی شعر و شاعری کی محفلوں کی رونق بڑھاتے رہے۔ اس دور کے استاد شاعروں میں سراج اور داؤد کے سوا سامی اور عاجز بھی اپنے قدرتِ کلام کی وجہ سے مشہور تھے۔ عشق غلام قادر سامی سے جن کے منظوم قصے "سرو شمشاد" اور "طالب و موہن" مشہور ہیں، اصلاح سخن لیتے تھے اور ابتدائی دورِ شاعری میں احسن تخلص کرتے تھے۔ عشق کے معاصرین میں حسب ذیل نوجوان شعراء مشہور تھے۔

بیکل، شفیق، مہربان، بندہ، مرزا، فقیر، ذکا، داغ، ارشد، رضا، رنگین، عرفان، شرافت، ذہین، فتوت، غازی، عشرت، کلاں، کمتر، لایق، قمر، مضمون، مہتاب، نادر، قدرت، نثار، نیاز، ہادی، فغاں، کاظم، رائے، یار، افسر، انور، ظفر، خیال وغیرہم۔

اس دور کی شعری پیداوار کو دکن کے سیاسی انتشار نے پھلنے پھولنے نہ دیا اور جب اس بدامنی کا زمانہ ختم ہوا تو پایہ تخت اورنگ آباد سے حیدرآباد میں منتقل ہو گیا اور بہت سے شاعر اور صاحبان علم و فضل اورنگ آباد چھوڑ حیدرآباد جا بسے۔ ان جانے والوں میں عشق بھی تھے، یہ حیدرآباد جا کر عبدالولی عزلت سے اصلاح سخن لینے لگے جن کی شاعری کی اس وقت دھوم تھی۔

عشق اور انکے معاصرین پر دلی کے اساتذہ کا رنگ غالب تھا۔ میر اور سودا یقین اور درد کی شاعری کے چرچے دکن میں بھی ہو رہے تھے۔ شفیق کی طرح عشق بھی یقین کے کلام کے عاشق تھے۔ عشق نے اپنے کلام میں جگہ جگہ یقین کے مصرعوں پر مصرعے لگائے ہیں۔

عشق کو رونے میں لایا مصرعہ زار یقیں
آج بادل یے طرح امنڈے ہیں برسیں گے ضرور
چل یقیں کی بات پرائے عشق ہم بھی جل مریں
کیا ہی پھولے ہے پلاس اور لگ رہی ہے بن کو آگ

مخمس تضمین ریختہ یقین

اگرچہ قصد درد عشق دکھلانے کا گر کرتا | اک آہ شعلہ بار اپنے دل پرسوز سے بھرتا
سمندر آگ میں جیتا ہے لیکن اس سے جل مرتا | یقیں سوز و گداز اپنے کو گر اظہار میں کرتا
خدا شاہد ہے آتش کا بھی زہرہ آب ہو جاتا

عشق کا کلام سادہ اور درد اور اثر میں ڈوبا ہوا ہے ایک غزل کے چند شعر ہیں۔

خاطر سے غبار دہو گئے ہم | جتنا کہ ہنسے تھے رو گئے ہم
اے عشق بقول درد ہیچ ہے | کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم
غفلت پہ نہ ہونے پائے ہشیار | ویزلک آنکھ کھلے کہ سو گئے ہم (؟)

اپنے حلقۂ احباب میں عشق ایک مقبول شاعر تھے۔ جب نور العین واقف بٹالوی اور عبدالحکیم حاکم لاہوری ۱۱۵۷ھ میں اورنگ آباد آئے تو عشق سے مستفید ہوتے رہے۔ واقف نے ان کے کلام سے متعلق ایک شعر کہا ہے۔

دیدیم کتب خانہ ہفتاد دو ملت | غیر از سخن عشق نشد منتخب ما

عشق ظریف الطبع اور شگفتہ جبیں تھے۔ احباب سے نہایت خوش اخلاقی اور محبت سے ملتے تھے ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔ ان کا ایک دیوان پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب کے کتبخانہ میں موجود ہے۔

یہاں ان کے کلام سے چند منتخب شعر دیئے جاتے ہیں۔

کوچہ میں گلستاں کے چلا ہوں یہ جا کر | ہرگز وہاں سے ہم سے پھر آیا نہ جائیگا

آتشیں روتیرے آگے تاب کب لاتی ہے شمع | رشک سے تجھ حسن روز افزوں کے جل جاتی ہے شمع
چاند سی صورت کے آگے تیرے شرماتی ہو شمع | دیکھ روشن مکھ ترا بے نور ہو جاتی ہے شمع
سینہ بریاں چشم گریاں آہ سوزاں دل تپاں | کس قدر جلنے کا پروانہ کے غم کھاتی ہے شمع

گل پہ یہ شبنم نہیں پانی چھڑکتی ہے بہار | ہائے رے کتنی لگائی آکے اس گلشن کو آگ

شمع پر جب بزم میں ہوتا ہے پروانہ نثار
ہم سے پوچھا چاہیے صدقے ترے جانے کا لطف

اس ہوا میں آہ وہ ساقی نہیں
ابر سا اُمڈا ہوا آتا ہے دل

سوتے بختوں کا مرے یارو سنو افسانہ
سرگذشت اپنی کہوں تو اسے نیند آتی ہے

خوش چشم کے فراق میں بے اختیار ہو
دل چاہتا ہے جا گلِ نرگس کو دیکھیے

تجھ بن چمن تو خانۂ ماتم سے کم نہیں
یکسر سے سب گلوں کا گریبان چاک ہے

کیا خاک کہو اس میں تجلی ہو نمایاں
خورشید کا جو ذرہ پرستار نہووے

گلستاں میں نہ دکھلاتا اگر تو خال رخسار
نہ نافرماں سیہ ہوتے نہ لالہ داغ ہو جاتا

یہ اب کی فصل گل میں دل کے سر سودا کا ساماں تھا
نہی دامنگیر وحشت اور جنوں دست و گریباں تھا

اگر وہ قاتل جاں بخش کھینچے تیغ ابرو کی
ہمارے ہر بن مو سے زبان شکر پیدا ہو

ادھر بلبل گذر جا گل سے اودھر گل گلستاں سے
جو تو گلزار سے گزرے تو کیا ہنگامہ برپا ہو

سخن اس کے دہان تنگ سے ہوتا ہے یوں ظاہر
نزاکت سے نگہ گویا کہ چشم مور سے نکلے

رات گلگشت کو مہتاب کے نکلا تھا سخن
ماہ میں اسکے مقابل تو ذرا نور نہ تھا

ہوس ہے جاں نثاری کیجیے پروانہ وار اے عشق
کہ ہے وہ شمع رو محبوب اپنا جان جاں اپنا

اس دور میں نواب میر نظام علیخان آصف جاہ ثانی (متوفی سنہ ۱۲۱۸ھ) اور نواب میر اکبر علیخاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث (سنہ ۱۲۴۴ھ) کے علاوہ وزرائے سلطنت ارسطو جاہ (سنہ ۱۲۱۹ھ) اور میر عالم (سنہ ۱۲۲۳ھ) نے حیدرآباد میں شعر و سخن کی خاص سرپرستی کی ہے جس کا شہرہ سن کر اسی زمانہ سے اقصائے ہندوستان سے باکمال شعراء کی دکن میں آمد شروع ہوئی جن میں سے بعض یہ ہیں۔ میر قمرالدین منت۔ (سنہ ۱۲۰۸ھ) خواجہ احسن اللہ بیاں (سنہ ۱۲۱۳ھ) نیز مرزا علی لطف، حافظ تاج الدین مشتاق، میر دولت علی دولت وغیرہ۔

خود حیدرآباد میں اس وقت متعدد باکمال شعراء اردو موجود تھے جن میں سے چار یعنی شیر محمد خاں ایمان، ماہ لقا بائی چندا، محمد صدیق قیس اور مہاراجہ چندو لعل شاداں کے حالات و کلام پر تفصیلی معلومات جلد اول میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس جلد میں حسب ذیل چار شعراء کے حالات و نمونۂ کلام درج ہے۔ میر اسد علیخاں تمنا، لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی قاضی کریم بخش سالم اور خواجہ خاں آشفتہ۔ ان میں اول الذکر اصل میں گذشتہ دور سے متعلق سمجھے جا سکتے ہیں مگر ان کا زیادہ تر کلام اسی دوسرے دور میں لکھا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اس دور کے شعراء اردو میں میر علی مردان خاں یکدل (سنہ ۱۲۰۶ھ) محمد علی نیاز (سنہ ۱۲۱۰ھ) نیاز احمد خاں نیاز (سنہ ۱۲۱۱ھ) میر ہاشم فقیر (سنہ ۱۲۱۲ھ) مرزا محمد جان نثار (سنہ ۱۲۱۲ھ)

میر نجف علی خاں ندرت (۱۲۱۳ھ) اور مرزا داؤد ہنر زیادہ مشہور ہیں۔ میر حسین علی خاں ایما، میر بہاء الدین حسین خاں عروج اور میر عباس علی خاں احسان بھی اس دور کے شعرا میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ یہ تیسرے دور کے اوائل میں بھی موجود تھے۔ اس دور کے بعض شاعروں کے کلام کے مجموعے موجود ہیں اور اکثروں کے کلام کے نمونے مختلف تذکروں اور رسائل میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ عبدالولی عزلت اور عارف الدین خاں عاجز بھی اس دور میں حیدرآباد میں قیام پذیر تھے۔

اس دور سے حیدرآباد کے اردو شاعر اپنی قدیم زبان کو (جو تین سو سال تک معیاری اردو رہ چکی تھی اور جس میں اب تک سیکڑوں اعلیٰ پایہ کی کتابیں لکھی جاچکی تھیں جن کو دیکھ کر دہلی کے صاحبان ذوق نے فارسی کو ترک کر کے اردو میں لکھنا شروع کیا تھا) متروک سمجھنے لگے کیونکہ اس وقت دہلی میں مرزا مظہر جان جاناں کی یہ تحریک کامیاب ہو چکی تھی کہ اب شمال کے اردو شاعروں کو دکنی زبان کی پیروی ترک کر کے اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کے محاورے اور روزمرے نیز فارسی کے لفظوں اور ترکیبوں کو استعمال کرنا چاہئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سے حیدرآباد میں مقامی شاعروں کے مقابلہ میں شمالی ہند کے شعرا کی قدر و منزلت زیادہ ہوگئی اور حیدرآبادی شاعر یہ سمجھنے لگے کہ ہم جو زبان بولتے ہیں وہ معیاری نہیں ہے اور اب ہمیں شمال کے اردو شاعروں کی زبان کا اتباع کرنا چاہئے۔

حیدرآباد سے باہر اس عہد میں اردو کے جو ممتاز شاعر موجود تھے ان کے یہ نام ہیں۔ میر محمد علی بیدار (۱۲۰۹ھ) قیام الدین قائم (۱۲۱۰ھ) عبدالحی تاباں (۱۲۱۱ھ) محمد میر سوز (۱۲۱۳ھ) ہدایت اللہ خاں ہدایت (۱۲۱۵ھ) جعفر علی حسرت (۱۲۱۷ھ) قلندر بخش جرأت (۱۲۲۵ھ) اور میر تقی میر (۱۲۲۵ھ)۔

تمنّا

میر اسد علیخاں

سنہ ۱۲۰۴ھ

از خلیق احمد صاحب نعمانی

اورنگ آباد کی سرزمین نے اردو ادب کی آبیاری میں گراں مایہ حصّہ لیا ہے۔ جس سرزمین سے ولی دکنی کی نغمہ سرائی اور سراج کی شعلہ نوائی نے اردو دنیا کو خیرہ کر دیا۔ وہیں تمنّا نے آنکھیں کھولیں۔ جہاں اس نے تلوار کی جھنکار سنی وہیں اسے میٹھے بول اور رسیلے دوہے بھی سنائی دئے۔ خجستہ بنیاد کا محلہ محلہ شعر و سخن کے نغموں سے گونج رہا تھا۔ ایک اجڈ سپاہی بھی لمحات فرصت میں شعر کہنا اور سننا تھا۔

تمنّا کی پیدائش بھی ایک ایسے ہی گھرانے میں ہوئی جہاں سیف و قلم کے دھنی بیٹھے رزم و بزم کے نقشے کھینچتے تھے گل عجائب کا مولف گل بکاؤلی کی طرح کوہ خفا میں کھلا اپنی بہار دو روزہ دکھلائی اور مرجھا گیا لیکن شکر ہے کہ اس کی مشام جان افزا معنوی رنگ میں جلوہ گر ہے جس سے روح کو کیف اور سرور حاصل ہوتا ہے۔ تمنّا کے کلیات سے اس کی حیات مستتر سے متعلق چند اشارے ملتے ہیں ورنہ ان کا تذکرہ گل عجائب تو اس بارے میں خاموش ہے۔ ان کا اصلی نام میر اسد علی ہے جیسا کہ مجموعہ فصاحت میں لکھا ہے۔ سید النسب و رخطابی خان تھے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں ؂

لازم ہے تجکو خانِ تمنّا سے رکھ نہ لاف پیارے ترے مزاج میں انصاف گو نہیں

اس کی تصدیق اس قطعہ سے بھی ہوتی ہے جو شفیق نے ان کی وفات پر لکھا تھا جو آگے نقل کیا جائیگا۔ تمنّا اثنا عشری تھے ؂

غیر اثنا عشر تمنّا کی دل میں ہرگز نہیں ہے سا اور پانچ

انکی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی لیکن کس سنہ اور کس خاندان میں، باوجود تلاش کے معلوم نہ ہو سکا۔ انکے آبا کا شریف پیشہ فنِ سپاہ گری تھا لیکن علم و ادب کے چرچوں سے یہ لوگ بے بہرہ نہ تھے ؎

روزِ ازل سے صاحبِ سیف و قلم ہیں ہم
میدان میں کمیتِ قلم کے ہوں شہسوار

انھیں اس پیشہ پر فخر رہا کسی موقعہ پر اپنے رفیقوں کو کٹ مرنے کی تعلیم دی ہے ؎

سپاہی زادوں کو ایسے رفیق لازم ہیں
کہ ایک سمجھیں وفات و حیات سنتے ہو

تمنا کی زندگی کا ابتدائی زمانہ خجستہ بنیاد ہی میں گذرا۔ فارسی اور عربی زبانوں پر عبور تھا۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ تقریباً سولہ غزلیں ان کے دیوان اردو میں درج ہیں اور فارسی قطعات اور تاریخیں "مجموعہ قصائد بمدح نواب ارسطو جاہ" (در بہا) میں شامل ہیں۔ اپنی تعلیم کا ذکر گل عجائب میں سیف اللہ انور کے تذکرہ میں کیا ہے۔ انور ان کے والد کے ہاں فروکش تھے لکھتے ہیں "فقیر و انور حصول کتب فارسیہ در جناب حضرت داور صاحب قبلہ مدظلہ مثل شوکت و اسیر و چار عنصر مرزا سامع فاری بودند و در عربیہ شمع ادراک خود از شعلہ توجہ میر صاحب میر انور الدین دل سلمہ اللہ افروختنہ"۔

میر سید علی رمز کے حال میں لکھتے ہیں کہ اکثر اوقات باہم مجالس منعقد ہوتیں کبھی غریب خانہ پر اور کبھی رمز کے دولت خانہ پر جہاں فقیر تمنا، انور، صوفی شاہ کاظم اور میر رمز مل بیٹھتے۔ کلیات بیدل، شوکت اور اسیر سبقاً سبقاً پڑھتے اور یہ طے پایا تھا کہ مشکل شعر کے معنی ہر شخص علیحدہ علیحدہ لکھے غرض یہ کہ عجب لطف سے گذرتی تھی۔ تمنا کے ایک اور ہم مکتب مہر بھی تھے۔

اس زمانہ میں آزاد بلگرامی کی مجلس تشنگان علم کو سیراب کر رہی تھی۔ تمنا بھی ۱۱۸۵ھ ہی کے بعد اس حلقۂ درس میں شریک ہوگئے۔ انکا تعلق آزاد کے بعد کے شاگردوں سے قریبی رہا جیسا کہ انہوں نے میرزا ضیا کے ذکر میں اپنی "خواجہ تاشی" کا ذکر کیا ہے اور ذکا سے اپنی دوستی کا اظہار کیا ہے۔ یہ تعلق شعر و سخن کی حد تک تھا جو خوشگوار رہا۔ جہاں کہیں آزاد مرحوم کا ذکر آیا ہے نہایت ادب کے ساتھ ان کو یاد کیا ہے۔ میرزا ضیا کے کئی فارسی اشعار جو حضرت آزاد کی تعریف میں ہیں اپنے تذکرہ میں لکھے ہیں۔

آصف جاہ ثانی کے عہدِ حکومت میں حیدر آباد دار الحکومت قرار پایا اور سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ادبی مرکز بھی

یہاں منتقل ہو گئے۔ تمام امراء اور اعیان سلطنت جن کا وطن اورنگ آباد تھا حیدرآباد چلے آئے ان کے ساتھ انکے متوسلین بھی تھے۔ اسی زمانہ میں میر اسد علیخان تمنا بھی بلدہ چلے آئے۔ انکے تعلقات نواب لشکر جنگ بہادر، ارسلان جنگ، غضنفر جنگ اور مجاہد جنگ ارمان وغیرہ سے تھے موخر الذکر ان کے شاگرد تھے۔ ارمان کے علاوہ حیدرآباد میں اکثر نوابوں کے لڑکے شعر و سخن میں تمنا کے شاگرد تھے۔ علی نقی ایجاد اور ان کے تینوں بیٹوں انصاف، افسر اور نیر اور نواب صمصام الملک بہادر صارم سے انکے اچھے اور گہرے روابط تھے۔ ان کے ہاں روزانہ آیا جایا کرتے اور شعر و سخن کی محفلوں میں رونق محفل بنے رہتے ؎

ملنے سے تیرے خلق ہے خوش وقت تمنا　　ہر حال میں خوش رہو مگر یار کہیں رد

اسی عرصہ میں وہ شاہ معین الدین علی تجلی سے جو دکن کے ایک باکمال شاعر اور مصور شاہ تجلی کے استاد اور صاحبدل بزرگ تھے، ملاقی ہوئے۔ پہلی ہی ملاقات میں یہ ان کے گرویدہ اور بالآخر مرید ہو گئے ؎

جناب شاہ معین مدظلہ العالی　　کہ اس غلام کا ہے پیر و مرشد و استاد

اس زمانہ میں نواب ارسطو جاہ بہادر کی بارگاہ شاعروں کا ملجا و ماوا تھی۔ نواب کی قدردانی اور فیاضی کا شہرہ تمام ہندوستان میں تھا جہاں سے ارباب کمال کھینچ کھینچ کر اس مرکز کی طرف رجوع ہونے لگے تھے۔ تمنا جیسے بلند پایہ شاعر کو اور کیا چاہئے۔ وہ بھی اس بارگاہ کے متوسل ہو گئے کئی تاریخی قطعات اور قصیدے گذرانے اور پھر آصف جاہ ثانی کے دربار محیط کرم میں بھی باریاب ہوئے۔ کئی قصیدے اور تاریخی قطعات گذراننے کا شرف حاصل کیا اور ارسطو جاہ کے طفیل سے اپنی مراد کو پہنچے

ہے تمنا مجکو خدمت میں تری اتنی تنہا　　حکم ہو جاگیر کا تیاری اسناد ہو

جس گھڑی جاگیر کی مجکو ملی پروانگی　　شمع احساں پہ مرے دل کو ہوئی پروانگی

گرد واقعی یہ دریافت طلب ہے کہ خانی کا خطاب اور جاگیر کس صلہ میں عطا کی گئی اور کب؟

باوجود اس کے وہ آسودہ زندگی بسر کر رہے تھے اور اعلیٰ طبقہ میں کافی رسوخ تھا ؎

راسخ الخدمت ہوں سب کی بیچ گفتگو ہوں رسوخ　　اے تمنا ہے جہاں واقف مرے ترسیخ سے

وہ حیدرآباد کی زندگی سے بیزار ہی رہے جیسا کہ اس سے (رباعی)

جس شہر میں میں رہوں تو آتا ہے یاد — کرتا ہوں جناب اپنے دیں میں فریاد

معشوق کا وصل ہو جو پہنچیں کیونکر — اورنگ آباد ہائے اورنگ آباد

یاد وطن خیال بتاں میں گھرا ہے دل — فرصت کے اندنوں میں تو اوقات ہی نہیں

گو وہ غالباً اورنگ آباد واپس نہ جا سکے اور عین اقبال مندی اور خوش بختی کے زمانہ میں اس دار فانی سے ۱۲۰۴ھ میں کوچ کر گئے اور غالباً دائرہ میر مومنؒ میں آسودہ ہیں۔ لالہ لچھمی نارائن شفیق نے انکے انتقال کی تاریخ کہی ہے ؎

خانِ تمنا اہل سخن رفت چواں زین ارفتن — بود ہنرور صاحب فن، زود لسوئے عقبیٰ رفت

بہر خیال تاریخ آں غور چو کرد شفیق من — سال وفاتش ہاتف گفت ہائے ہا تمنا رفت

تمنا نہایت سنجیدہ اور متین آدمی تھے، لاف زنی اور بذلہ گوئی سے فطرتاً نفرت تھی، خوش وقت، خوش صحبت اور یار باش آدمی تھے۔ طبیعت کے غنی اور دل کے دھنی واقع ہوئے تھے ؎

اے تمنا، ہجوم مردم ہے پسند دل کہاں — میں تو لا سکتا نہیں ہیچ ایک جز میں کل کی طرح

جسے چاہا ہے دل سے میں نے اسنے بھی مجھے چاہا — تمنا معتقد ہوں دل سے میں اپنی کرامت کا

دست کرم کو رکھیو یداللہؑ سر پہ جلد — رکھتا ہی بار دوش تمنا غلام قرض

حضرت امام حسینؑ کی منقبت میں ایک نظم دلچسپ اور نادر اسلوب میں لکھی ہے جس کا خاتمہ دعائیہ اشعار پر ہوا ہے اس کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جس سے شاعر کے کردار اور رجحان پر روشنی پڑتی ہے ؎ وہو ہذا

قرباں ہوں تمہارا مجھے صدقے سے تمہارے — افزائش ایماں ہو عرفاں کا مزا ہو

علم و عمل، و صحت و عشرت زر و مقدور — لطف سخن و فہم و مدارات و سخا ہو

صدقے سے تمہارے مجھے ای مظہر احسانؑ — اعدا سے تبرا ہو احبا سے ولا ہو

شاہ معین الدین علی تجلی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ تمنا کو عرفان کی چاشنی کا مزا لگا۔ تمنا نے ہمیشہ دین کے ساتھ دنیا کی آرزو کی ہے ؎

دنیا و دین کی دو مجھے جاگیر بادشاہ

تمنّا جیسے استاد فن شاعر کے شاگردوں کی تعداد کی فہرست کافی طویل ہو گی لیکن تذکروں میں چار یا پانچ شاگردوں کا پتہ چلتا ہے۔ مجاہد جنگ ارمان، حکیم محمد اکبر خاں شہر، محمد علی خاں شوق اور خواجہ ابو طالب خاں آشفتہ۔ ان شاگردوں کا پایہ بلند ہے۔ تمنّا نے اس بات پر فخر کیا ہے کہ میرا شاگرد ایک دن استاد ہو گا ؎

تمنّا ہوں غلام شاہ مرداں علم گھر کا ہے   جو کوئی شاگرد ہوتا ہے تو میں استاد کرتا ہوں

تصنیفات: ۔ حالیہ تحقیق سے تمنّا کی دو تصانیف کا پتہ چلا ہے۔ ایک تذکرۂ گل عجائب اور دوسرا کلیات۔ تعجب نہیں اگر آئندہ مقالات الغرائب اور ۱۹۳ھ سے ۱۲۰۴ھ تک کا کلام بھی دستیاب ہو جائے جو فی الحال ناپید ہے۔

تذکرۂ گل عجائب: ۔ کسے خبر تھی کہ گل زمیں اورنگ آباد میں "گلشن گفتار" "ریاض حسنی" اور "چمنستان شعراء" کے حدیقوں میں "بہار و خزاں" کی تبدیلیوں سے "سرو آزاد" کے بعد گل عجائب کھلیگا۔؟ تمنّا کا نہایت اہم کو نامکمل کارنامہ ان کا تذکرہ شعراء ہے۔ اس تذکرے کا نام جیسا کہ کتب خانہ آصفیہ کے اصل قلمی نسخہ کے صفحہ دوم کی پیشانی پر لکھا ہے "رنگ دوم گل عجائب من مقالات الغرائب" ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمنّا نے "مقالات الغرائب" نام کوئی کتاب تصنیف کی جس کا مقالہ ہر "گل" کے نام سے موسوم ہے اور پھر اس کے ہر باب کو گل کی مناسبت سے "رنگ" کا نام دیا ہے تذکرہ کا نام "مقالات الغرائب" کی مناسبت سے "گل عجائب" رکھا اور پیش نظر تذکرہ رنگ دوم "گل عجائب" ہے اس قدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ رنگ اول شعراء کے حالات ہی میں لکھا گیا ہے جس کی تصدیق خود مولف تذکرہ کے بیانات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ آرزو کے حال میں اس کا ذکر آیا ہے کہ "و میر صاحب سخن کہ ذکرش در رنگ اول گذشت" ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "ول برادر زادۂ شاہ نور خوش است کہ ذکر پیشتر آمد" گویا "رنگ اول" شعراء کے حالات میں لکھا گیا تھا اس کی مزید تصدیق اس قطعہ سے بھی ہوتی ہے جو تمنّا نے تذکرہ کے اتمام پر کہا تھا جس میں "رنگ" کے اتمام کی نہیں بلکہ "گل عجائب" کے تکمیل پر تاریخ نکالی گئی ہے ؎

وجہ تالیف: ۔ گل عجائب قیام حیدر آباد کے زمانہ میں ۱۱۹۲ھ سے لکھنا شروع کیا اور بالآخر ۱۱۹۴ھ میں تکمیل کو پہنچا جیسا کہ ان تاریخی قطعات سے پتہ چلتا ہے جو تمنّا نے آغاز و اختتام تذکرہ پر کہے تھے اور جو تذکرہ کے اول و آخر صفحوں پر درج ہیں

یہ تذکرہ قاضی محمد کرم بخش سالم کی فرمایش پر لکھا گیا جن کا ذکر آئندہ آئیگا۔

کتب خانہ آصفیہ کا قلمی نسخہ مولف کے ہاتھ کا مسودہ معلوم ہوتا ہے جس میں کئی جگہ کاٹ چھانٹ کی گئی چنانچہ خیال کے تذکرے کو دو جگہ لکھکر ایک جگہ قلم زد کر دیا ہے۔ ذکا کے حالات ایک جگہ تشنہ اور دوسری جگہ تفصیل وار درج ہیں مظہر پنچھی، اور ممتاز یار جنگ یار کے حالات کی خانہ پوری کیلئے جگہ اور حاشیہ چھوٹا ہوا ہے۔ بعض شعرا کے مزید کلام کے اندراج کیلئے گنجایش رکھی ہے۔ ہر ردیف کے ختم پر تین چار صفحے بالعموم سادہ چھوڑ دئے گئے ہیں تاکہ آئندہ اور شاعروں کو جگہ دیجا سکے۔

اس قلمی نسخہ کی ترتیب حروف تہجی پر رکھی گئی ہے اور جہاں مقدم موخر ہوگیا ہے صراحت کر دی ہے کہ اس شاعر کا تذکرہ فلاں حرف کی ذیل میں ہونا چاہئے اس مسودہ میں ہر شاعر کا فارسی کلام اور پھر "ہندی" کے عنوان سے اردو کلام درج کیا گیا ہے اس طرح کا التزام قاقشال اورنگ آبادی نے اپنے تذکرہ تحفتہ الشعراء (۱۱۶۸ھ) میں کیا تھا ممکن ہے تحفتہ الشعراء تمنا کے پیش نظر رہا ہو جیسا کہ شہید کے حالات اور کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعینہ تحفہ سے ماخوذ ہے۔ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ "سرو آزاد" مولف کے پیش نظر تھا۔

اکثر شعرا کے بارے میں اسے اصل ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ بعض شعرا کے نام سوائے اس تذکرے کے اور کہیں نہیں ملتے۔ بیانات مولف کے ذاتی تعلقات اور شخصی معلومات کا نتیجہ ہیں جن میں نہایت کارآمد معلومات ہیں دوسرے تذکروں کے برعکس اسکی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں اکثر شعرا کے سلسلۂ نسب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جیسا کہ آرزو، ایجاد، آصف، جراءت، حشمت، فخر دین، قدر، غم اور ہمدم کے حالات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح اکثر شعرا کی تاریخ پیدائش، سن وفات اور باہر سے آنیوالے شاعروں کے سنین آمد و رفت کو بھی خاص التزام سے درج کیا ہے واقف، حاکم، ذکا، عاجز وغیرہ سے متعلق جو سنین دئے گئے ہیں وہ تاریخی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اس تذکرہ کی زبان فارسی ہے جو سادہ سلیس اور پرکار ہے تشبیہ اور استعارہ سے لطف سخن دوبالا ہوگیا ہے۔ نام اور کلام سے پہلے ان کی مناسبت سے چند توصیفی جملے بھی لائے ہیں اس طرح کا التزام "مجموعہ نغز" میں بھی کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے حال میں شائع ہو چکا ہے۔

کلیات:۔ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں تمنا کا نایاب کلیات دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ نہایت قابل قدر ہے کہ شاعر کے ایک خاص شاگرد مجاہد جنگ ارمان کا مرتب کردہ ہے اس پر ارمان ۱۲۰۸ھ کی مہر بھی کندہ ہے۔

تمنا نے ۱۱۹۴ھ میں تذکرہ گل عجائب اختتام کو پہنچایا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں اس کلیات کی ترتیب انکے شاگرد رشید مجاہد جنگ ارمان نے دی اور اسکی تاریخ اختتام بھی کہی ہے جو کلیات کے صفحہ اول پر درج ہے۔

ہزار شکر خداوند قادر ذوالمن — رسید زود باتمام نسخہ پرفن
چو بود دل بہ تمنا سال تاریخش — بجہد ختم نمودہم نوشت خامہ من
۱۱۹۴ھ

یہ کلیات نہایت مہذب اور اچھے طریقہ سے مرتب کیا گیا ہے جس سے ارمان کی نفاست پسندی کا پتہ چلتا ہے ابتدائی حصہ خوشخط لکھا ہوا ہے کہیں کہیں اور آخر میں ذرا خط خراب ہو گیا ہے قدیم طریقہ املا ہی میں منفرد الفاظ کو مرکب صورت میں لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جگہ جگہ اس میں بعد میں کلام کا اضافہ کیا گیا ہے۔ نہایت قابل قدر اور قابل اشاعت کلیات ہے کہ اس سے نہ صرف اردو ادب کی فہرست میں ایک قدیم دیوان کا اضافہ ہوگا بلکہ دکنی شاعری کے درمیانی دور کے ارتقائے زبان، طرز بیان اور رجحانات فکری نیز لسانی تبدیلیوں کا پتہ پتہ چلتا ہے۔ اگر سلسلہ ادبیات اردو کی طرف سے اس کا انتخاب ہی شائع کر دیا جائے تو مناسب اور احسن ہے۔!

تمنا نے اردو فارسی کے اچھے شاعر ہونے کے علاوہ غزلت کی طرح کبت اور دوہے بھی کہے ہیں ؎

اے تمنا ہر زباں میں شاہ ہے میرا کلام — کیا کبت، کیا دوہا، کیا ہے ریختہ، کیا فارسی

لیکن تمنا ریختہ کے باکمال اور پرگو شاعر تھے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مرثیے، قطعات، نظمیں، رباعیات، قصائد، غزلیں، مخمس مستزاد اور عشرہ غرض ہر صنف سخن میں کافی کلام موجود ہے۔ کیوں نہ ہو تمنا اپنے وقت کے باکمال شاعروں میں سے ہیں ؎

اے تمنا شاہ اقلیم سخن ہوں وقت فکر — مانگتا ہے ہر گھڑی میرے سے استعداد داد

ہر صنف سخن سے متعلق جدا بحث کیجاتی ہے اور دیوان ہی کی ترتیب کے مطابق ہم پہلے حصہ مناقب کو لیتے ہیں۔

حصۂ مناقب:۔ تمنا کا خمیر ہی اس "آب لال" سے گوندھا گیا تھا، فاتح خیبر و شاہ شہیداں کے ساتھ فدائیت کا یہ عالم ہے کہ ہر قدم پر پنجتن کا نام لیے آگے نہیں بڑھتے وہ ہر غزل کے شروع میں بجز "یا علی" یا "یا علی المدد" یا "علی عمرانی" یا "علی ولی اللہ" لکھے آگے نہیں بڑھتے اور پھر کلیات میں سب سے پہلے حصہ مناقب ہی کو جگہ دی ہے پہلی غزل مرتضیٰ رض و زہرا رض اور اہل بیت کرام کی

یاد سے مالامال ہے ؎　میں تمنا چشم کے مژگاں سے ہوں جاروب کش　پنجتن اور چاردہ معصوم کی درگاہ کا

اسی طرح اکثر غزلوں کے مقطعوں میں "وہ بہا کر" سے مدد طلب کی ہے اور اقرار ہے کہ میری مداحی بہت مشہور ہے ؎

مداح شہر یار ہوں وصاف ہشت و چار　واقف ہیں جن و انس تمنا فلک تک

اس باب میں ۲۸ مناقب ہیں اور تتمہ کے طور پر دو نظمیں بھی ہیں۔ منقبت مخمس کی شکل میں ہے اور ہر مخمس کا ایک جدا نام ہے جیسے سوز عشق، زاد المسافر، مظہر النور، شمس الاشعار، دود دل، مقبول المناقب اور فخر المناقب وغیرہ۔

ان کا اسلوب بیان نہایت شگفتہ اور سلیس ہے کلام میں اثر و کیف اور سوز و گداز بھی ہے۔ ذیل میں ایک بند بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے جس سے جدت بیان اور شگفتگی خیال کا پتہ چلتا ہے ؎

علیؑ شگوفہ میں، گل میں علیؑ، چمن میں علیؑ　علیؑ بہار میں نسرین و نسترن میں علیؑ
علیؑ کنول میں علیؑ لالہ میں، سمن میں علیؑ　علیؑ ہے نرگس و ریحان میں یاسمن میں علیؑ
علیؑ حدیقہ و بستان کے جزو و تن میں علیؑ

ایک نظم حضرت امام حسینؑ کی منقبت میں ہے جو قدرت بیان، جدت ادا اور پاکیزہ اسلوب کے لحاظ سے درج کرنے کے قابل ہے ؎

نزدیک اجابت کے الٰہی یہ دعا ہو　کچھ دور نہیں مجھ پہ اگر رحم ترا ہو
گر عشق بھی دے تو کسو ایسے کا یارب　جیسا میں کہوں ویسا ہی معشوق مرا ہو
عشاق نواز و کرم انداز و وفا ناز　دلدار و کرم گستر و انصاف نما ہو
جاں بخش ہو الطاف گر و مہر منش ہو　ہو لطف مجسم گہر مہر و وفا ہو
یہ جور و جفا ظلم و ستم دور ہو جس سے　لطف و کرم و مہر و ترحم کی بنا ہو
تیغ ابرو کی اوسکے نکرے زخم جگر پر　ناخن کی طرح دل کا مرے عقدہ کشا ہو
آنکھ ایسی ہو اوسکی کہ رکھوں چشم ترحم　بیماری و زاری کو مری جس سے شفا ہو
زلف اوسکی پریشاں نہ کرے پیچ سے دل　مثل شب معراج مرے حق میں سا ہو

ہو اس کے تکلم میں تبسم کا ترحم — بلبل کی طرح غنچہ بھی دیکھے تو فدا ہو

اتنے میں غیب سے ندا آئی کہ ؏ "جس پاس ہو ایسی صفتیں نور خدا ہو"۔ گرشاعر کی توضیح ملاحظہ ہو ؎

دو ہیں میں کہا صل علیٰ آل محمد — اس مطلع برجستہ کو جو مہر سما ہو

یا شاہِ شہیداں اے مہر تم راد نما ہو — دلبندِ نبیؐ جانِ علیؑ شیر خدا ہو

حصۂ غزلیات:۔ پیش نظر کلیات میں (۲۱۰) غزلیں ہیں۔ بیس سے زیادہ میں قطعے ہیں اور ایک غزل تو ایسی ہے جس میں دو قطعے باندھے گئے ہیں۔ بیشتر غزلوں میں تمنا نے پانچ اور سات ابیات کا التزام کیا ہے غزلوں کے اشعار کی جملہ تعداد (۱۳۵۷) ہے۔

تمنا ایک ایسے زمانہ کے شاعر ہیں جبکہ ناسخ کے تتبع میں مضمون آفرینی کا رواج ہو چلا تھا۔ سنگلاخ اور مشکل زمینوں کی عاجز نے طرح ڈالی تھی لیکن صاحب عاجز کے رنگ تغزل کے برعکس تمنا کے کلام میں داخلی رنگ سادگی اور صفائی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی اثر و کیفیت میں ڈوبی ہوئی بحروں میں جھلکتا ہے وہ فلسفہ اور تصوف سے غزل کے نازک دامن کو بوجھل نہیں کرتے۔ خیالات کی پیچیدگی اور مبالغہ کی بہتات نہیں۔ تشبیہوں اور استعاروں کا بہت اچھا استعمال کیا ہے جس سے محاکاتی رنگ پیدا ہو گیا ہے جن میں ندرت بھی ہے اور جدت بھی حقیقت یہ ہے کہ تمنا کی غزل "غزل" ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمنا اپنے زمانہ کے داغ ہیں۔ انکے کلیات میں طویل بحروں میں بہت کم غزلیں ہیں۔ ایک غزل یہ ہے ؎

رخ و زلف کی یاد میں شام و سحر شب و روز میں نے جو آہ کیا — مرے نالہ میں فرق نہ تھا سر مو نہیں اوسکے کلیجہ میں راہ کیا

نہ کتاب وفا کا پڑھا ہے ورق نہ حیا ہی کا تم نے لیا ہے سبق — یہ مجھی کو سزا ہو خدا ہے کہ تمہارے لئے انہی تباہ کیا

کبھو وعدہ ہم سے خلاف کرو چلو آؤ دل اپنے کو صاف کرو — یہ کسو بھی طرح سے معاف کرو نہیں کرنا تھا تو گناہ کیا

کہیں شیوۂ سوز و گداز کیا کہیں جلوۂ ناز و نیاز کیا — شب زلف کو جس نے دراز کیا مرا روز اسی نے سیاہ کیا

نہ ہی لطف و کرم نہ ہی مہر و وفا وہی طرز ستم وہی رنج جفا — یہ مجھی کو مناسب وقت نہ تھا کہ اس آن پہ تیرے چاہ کیا

ترے شرم کے ہاتھ سے جی ہے گیا کبھو آنکھ اٹھا کے تو نے بلا — نہ نگاہ کیا نہ نگاہ کیا نہ نگاہ کیا نہ نگاہ کیا

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ زبان کی لطافت کا کیا عالم ہے اور رنگِ تغزل کس قدر گہرا ہے۔ تمنا کے کلیات میں

بیشتر غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں جن کی مثالیں درج کیجاتی ہیں ؎

جبکہ خنداں ایاغ ہوتا ہے ۔ دل مرا باغ باغ ہوتا ہے ۔ عرض احوال رنگ رو تو نہ کر ۔ بات سے بے دماغ ہوتا ہے

داغ دل پر یہ داغ لالہ کا ۔ داغ بالائے داغ ہوتا ہے ۔ اے تمنا لگے چمن کو آگ ۔ سیر سے جب فراغ ہوتا ہے

ایک غزل ذوبحرین ہے ؎

تا کف افسوس نہ مل جاؤں میں ۔ زلف کو کھول کے آنزے بل جاؤں میں ۔ رحم کر اے سینۂ سوزاں کہیں ۔ آہ کے بھرنے سے نہ جل جاؤں میں

آج تیرے کوچہ میں کرتا ہوں عیش ۔ سیر کو فردوس کی کل جاؤں میں ۔ پان کے کھانے میں گر ہونا لگے ۔ ہونٹ تیرے آن کے مل جاؤں میں

آہ کے صدمے کی ہے طاقت کسے ۔ یاد کی تحریک سے ہل جاؤں میں

مضامین کے اعتبار سے تمنا کے ہاں سوائے عاشقی کے اور کچھ نہیں مگر اسی رنگ میں "لطف گویائی" جدت ادا اور سلاست زبان انکے کلام کے جوہر ہیں۔ اکثر اشعار محاکاتی رنگ کے بھی ہیں ؎!

اک ساغر حباب کرے ہے سیاہ مست ۔ کم ظرف مجھ سے شخص کو بس ہے شراب آب

زمیں پر آنکھ فلک پر دماغ منہ پہ نقاب ۔ کدھر چلا ہے او شرم و حجاب کی صورت

پلکوں کی آستیں او سے کافی ہے شیخ تو ۔ رکھتا ہے ہات دیدۂ نم پر عبث عبث

فصل گل میں ہو متنا جام و مینا زرد و سرخ ۔ شمع نے بھی اپنے سر پہ دی ہے ٹیکا زرد و سرخ

ہے پان چبا کر متبسم وہ چمن میں ۔ مونہہ ہات سے غنچہ کا کرے باد صبا بند

ہر کہیں رمز و کنایہ خوب نہیں ۔ ہوگا ان باتوں سے آپس میں بگاڑ

نہیں ہے اور کے ملنے کا گر تجھے سروکار ۔ یہ گجرے اور یہ لٹکن یہ ہار کس منہ پر

جو آگ اور پانی کو دیکھا ہو یک جا ۔ جا دیکھے گلوں کو ہے بہم شبنم و آتش

نوخط کو سادہ رو سے ہی رکھتا ہوں میں عزیز ۔ کم کم لبوں پہ سبزہ نمودار ہو بشرط

ساقی نہ دیا تو نے اگر مے تو کیا ہوا ۔ بے بادہ گذر ہی گئے مستوں کے رات دن

تو بات جب کہ گریباں پہ اپنی لاوے ہے ٭ برنگ تکمۂ یاقوت ہے بجا فندق

پھر میں دیوانہ ہوں یاروں سے رکھوں چشم وفا ٭ جب کہ آوے نظر اس طرح سے احباب کا رنگ

تمنا آج نہیں کل مے پئیں گے ٭ رہے سر پر سلامت سایۂ تاک

یہ دل ہی ہے اس زلف سیاہ فام کے قابل ٭ کوئی ایسا چراغ اور ہے اس شام کے قابل

جس طرح چاہئے اوسے کس طرح دیکھئے ٭ وہ شرمسارِ چشم ہے ہیں اشکبار چشم

یہ گریۂ شادی ہے تمنا نہیں شبنم ٭ بلبل کو ملا غنچوں کا اور رنگ تبسم

اوسی کے لب سے ہے یاقوت نے ہنر سیکھا ٭ کہ آب و تاب سے رکھتا ہے آگ پانی میں

سوال وصل تمنا نہ کیجو چونک نہ جائے ٭ بچک رہا ہے وہ حاضر جواب پہلو میں

حنائی ہاتھ میں ساغر نہ لیجیو ساقی ٭ چلے نہ بادہ نہ بھڑکے ایاغ سے شعلہ

ترش روئی بد ہے سن خوب اے دل شیریں کلام ٭ شہر چیں کی سیر کر چین جبیں کا مونہہ نہ دیکھ

آنکھوں کے دیکھتے ہی نظر یوں چرا گیا ٭ اے کم نگاہ واہ تغافل پناہ واہ

وہ دست حنائی گر دکھاوے ٭ کھا جائے رخ ارم طمانچہ

رباعی:۔ تمنا کے کلیات میں کل ۳۴ رباعیات ہیں جس میں وہی عاشقانہ مضامین اور یاد رفتگان کا ذکر ہے۔ سب سے پہلی رباعی یہ ہے!

نظارہ گرِ چشم خماری نہ ہوا ٭ زخمی پلکوں کا جو تمھاری نہ ہوا

ہے جنبش مژگاں سے یہ دل بسمل آہ ٭ اوچھا سا ہوا یہ تیر کاری نہ ہوا

ایک اور آخری رباعی درج کر کے اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔

یوں عشق کی راہ تم نے سیکھ لی کب سے ٭ اور حسن کی چاہ تم نے سیکھ لی کب سے

دل سرد کن جہاں ہے پیارے دم سرد ٭ یہ ٹھنڈی آہ تم نے سیکھ لی کب سے

ان کے کلام میں ایک مستزاد اور ایک مثلث نو بند کا اور ایک عشرہ آٹھ بند کا بھی ہے۔ غرض یہ کہ

ہر صنف سخن میں تمنا نے طبع آزمائی کی ہے۔ مضمون کی طوالت کے خیال سے نمونۂ کلام سے اجتناب کیا جاتا ہے البتہ مستزاد درج ذیل ہے

اے شاہ شاہاں وزیر فرخندہ جناب — اے فخر کے پرچم
لاتا ہوں بجا ادب سے تم کو آداب — با قامت خم
ہے بارش احساں سے ترے سیراب — عالم عالم
اے ابر کرم محیط بخشش نواب — کر مجھ پہ کرم

قصائد:۔ تمنا کی زندگی ایسے ماحول میں گذری جہاں درباری تعلق کی خاطر قصیدہ کہنا ضروری تھا۔ مگر جہاں انہوں نے دنیاداروں کی مدح میں قصائد سے دنیا پائی وہیں ائمۂ اطہر اور "شہباز دکن" کی مدح میں بھی قصائد گزرانتے کا شرف حاصل کیا۔
پیش نظر کلیات میں بارہ قصائد ہیں جن میں سے دو مخمس کی شکل میں ہیں۔ ایک شہباز دکن حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی شان میں اور دوسرا نواب ارسطو جاہ بہادر کی۔ اول الذکر قصیدہ کا ایک بند درج ذیل ہے جس میں "طلب" کے ساتھ وصف ممدوح بھی جلوہ گر ہے ؎

اے شہنشاہ حقیقی اے شہ ملک مجاز — اے خطا بخش جہاں اے خواجۂ گیسو درازؒ
کوئی ہے تم بن کروں جس سے بیاں سوز و گداز — کار فرمائے جہاں سارے جہاں کا کارساز
اپنے بندہ کو نواز اے حضرت بندہ نوازؒ

ایک قصیدہ "حضرت پیر و مرشد شاہ معین الدین علی تجلی حسینی" کی مدح میں ہے جو ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔ شاہ صاحب چونکہ تمنا کے پیر و مرشد تھے اسلئے ان کی مدح میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک خاص شان رکھتا ہے ؎

مطلع صبح سعادت مشرق خورشید فضل — بار یاب خدمت خاص امیر المومنین
قبلۂ ارباب عرفاں کعبۂ اہل یقیں — قدوۂ دوراں جناب حضرت شاہ معین رح
ہے وہ عاشق اور علیؑ معشوق اسکے رمز کو — کوئی کیا سمجھے نہ سمجھیں گے کرام الکاتبیں
اسکے دست رحم کے باعث فلک مشکور ہے — پوچھتے ہر گز نہ انجم کہکشاں کے آستیں

صدق دل سے جو کوئی نقاش آیا اوسکے پاس | گو ہے سبقت لیگیا وہ از مصوّر ہائے چیں

اس طرح چند اشعار میں اوصاف ہیں ؎

جب سوال اوس سے کرے پاوے جواب با صفا | ہے بجا اوس کو اگر کہویں محب السائلیں
جس گھڑی اس پاس ہوں ہے وہ زمان خوشتریں | جس جو غم اس سے ہوں جدا پر وہ ہے وقت بند
جس کے دل میں شبہ آجاوے سو آجاوے وہیں | سب حقیقت معرفت کی وہ بتا دیتا ہے آ

آصف جاہ ثانی کی مدح میں دو اور ارسطو جاہ کی مدح میں کئی قصائد لکھے گئے ہیں ان قصیدوں کی تشبیب عموماً بہاریہ ہوتی ہے درمیان میں غزلیں بھی لاتے ہیں ایک قصیدہ ارسطو جاہ کی سالگرہ کی تقریب میں لکھا گیا تھا جس کی ردیف "گرہ" ہے۔ اس ردیف میں شاہ تجلی علی تجلی نے بھی ایک قصیدہ فارسی میں گذرا تھا۔ معلوم نہیں تقدم کسے حاصل ہے پھر بھی تقابلی مطالعہ کیلئے دلچسپ ضرور ہے۔ تمنا نے اس قصیدہ میں دنیا جہاں کی گرہیں بیان کر دی ہیں۔ مگر اس کی گریز بڑی پرلطف ہے ؎

لیکن گرہ وہ جس سے کہ دل کی گرہ کھلے | دنیا میں نہیں ہے ایک گرہ کے سوا گرہ
گر چاہتا ہے تو کہ ہو وا شد اسے نصیب | ناخن سے بستگی کے جو ہووے رہا گرہ
چل ایک بارگاہ وزارت پناہ میں | وہ کئی دنوں سے دل میں جو ہے مدعا گرہ
نواب مستطاب معلے جناب کی | ہو گی کرم سے عقدہ مطلب کی وا گرہ
نسبت گرہ کو ہے گرہ سال سے زلیس | ہو بے بہا گہر سے ہے افزوں بہا گرہ
فرصت سے خوش ہو رشتہ بہجت شہر میں | دیتے ہیں آج سال گرہ کے کہا گرہ
سبحہ ہزار دانہ کا ہے یا گہر کے سلک | یا زلف میں صنم کے گرہ پر دیا گرہ
میں نے کہا کہ شکر خداوند ذوالجلال | تا صد ہزار اس میں ہو نام خدا گرہ

اور پھر اس "بے بہا گرہ" کی خصوصیات گنائی ہیں۔ تمنا کے قصائد پر بجائے خود ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

تاریخی قطعات۔ تمنا کو تاریخی قطعات کہنے میں بڑی مہارت حاصل تھی اور درباری تعلق کی بنا پر ایک ضروری چیز تھی۔ ارسطو جاہ کی اکثر تقریبوں کی اور اپنی تصانیف کی تاریخیں نکالی ہیں جو عموماً فارسی میں ہیں۔

آغاز تذکرہ گل عجائب کی تاریخ ہے "خرد گفت آغاز صفحہ بگو" اور اختتام تذکرہ کی تاریخ ۱۱۹۴ھ ان مصرعوں گل عجائب شگفت نیکو رنگین سادہ گفت طبعم اور آمادہ آواز غیب شکر خدائے جہاں سے نکلتی ہے۔

مشیر الدولہ کی شادی کی تقریب میں گیارہ شعر کا ایک فارسی قطعہ لکھا اور ایک "محاورہ" سے تاریخ نکال کر جودت طبع کی داد حاصل کی ؎

گوشے شنیدہ و نہ چشمے دیدہ ہاتف ز سر یاد خبر داد مرا

عید نوروز سے متعلق ایک قطعہ لکھ کر بارگاہ سلطانی میں گزرانا جس کے آخری مصرعہ سے یہ تاریخ ۱۱۹۴ھ نکلتی ہے۔ ع

نیکو سالے کہ از بہارش پیداست

جب مشیر الدولہ کو سیف الملک کا خطاب ملا تو نہایت برجستہ تاریخ کہی "مشیر الدولہ سیف الملک شد" ۱۲۰۰

نواب ارسطو جاہ کے غسل صحت پر اردو میں ایک قطعہ گذرانا جس کی تاریخ ۱۲۰۰ اس شعر سے نکلتی ہے ؎

لے چاروں حرف از پئے سال انتساب امنیت و تہنیت کے اول آخر

ات ت ت ۹ = ۱۲۰۱ھ

ارسطو جاہ نے حوض تعمیر کیا تو اس کی کئی تاریخیں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں گزرائیں مثلاً

چشمۂ سلسبیل جنت دہر سال تاریخ لکھ تمنا جلد

ایک اور تاریخ اردو قطعہ میں کہی ہے۔ ع

سال تاریخ حوض چشمۂ فیض

۱۳۰۲ھ

شفیق

لچھمی نراین

۱۱۵۸ھ تا ۱۲۱۵ھ

از سید محمد صاحب ایم۔ اے لکچرار اردو سٹی کالج

لچھمی نراین شفیق کھتری ذات کے ہندو تھے۔ ان کے بزرگ لاہور کے رہنے والے تھے۔ جب اورنگ زیب عالمگیر نے دکن پر چڑھائی کی تو ان کے دادا لالہ بھوانی داس بھی مغل فوج کے ساتھ اورنگ آباد آئے اور یہیں رہ گئے۔ ان کے خاندان کو حضرت آصف جاہ کے ساتھ قدیم تعلق ہے۔ چنانچہ شفیق کے والد رائے منسارام اپنی کتاب مآثر نظامی میں اپنا خاندانی حال لکھتے ہوئے خود کو آصف جاہی اپنے والد کا نام بھوانی داس غازی الدین خانی اور دادا کا نام بال کشن عابد خانی بتاتے ہیں، جس سے اس خاندان کی قدیمی نسبت کا اظہار ہوتا ہے۔ رائے منسارام اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اگرچہ وہ بہت کم عمری میں یتیم ہو گئے تھے لیکن سن شعور کو پہنچ کر انہوں نے ایسی لیاقت حاصل کی کہ حضرت آصف جاہ اول نے صدارت صوبہ جات دکن کی خدمت پیشکاری پر مامور فرمایا۔ وہ اس سے پہلے بخشی الممالک کی پیشکاری کے فرائض بھی انجام دے چکے تھے۔ وہ نہ صرف دفتری خدمات کو عمدگی سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے، بلکہ علم و ادب سے کماحقہ بہرہ ور تھے۔ خصوصاً انھیں تاریخ و انشاء کا خاص ذوق تھا۔ ان کی تصانیف مآثر نظامی اور قانون دربار آصفی بہت ہی قابل قدر تاریخی کتب ہیں۔ اول الذکر میں آصف جاہ اول کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں جو اکثر ان کے چشم دید ہیں یا خود حضرت موصوف کی زبان مبارک سے سنے ہوئے ہیں یا ثقہ اور معتبر لوگوں سے معلوم کئے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب حضرت آصف جاہ اول کی بہت ہی مستند و معتبر سوانح عمری ہے۔ دوسری کتاب میں جیسا کہ اس کے نام

ظاہر ہے دربار آصفیہ کے ضوابط درج ہیں۔ نیز بہت سی کارآمد باتیں جو تاریخی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہیں، اس میں بیان کی گئی ہیں۔

شفیق ۱۱۵۸ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد ملا شیخ عبدالقادر سے جو ایک بڑے عالم تھے کتب متعارفہ کی تحصیل کی اور عربی، فارسی، صرف و نحو وغیرہ علوم مروجہ میں مہارت حاصل کی۔ اُن کے خاندان میں علم و ادب کا کافی چرچا تھا۔ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ گیارہ برس کی عمر میں ہی شعر کہنے لگے۔ شاعری اور بعض دیگر علوم میں اُن کو مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے جو اپنے زمانے کے ایک جید عالم، بلند پایہ شاعر اور مورخ تھے، شرف تلمذ حاصل ہے۔ مولانا آزاد کے فیض تربیت سے ادب اور انشاء میں شفیق نے بہت جلد اعلیٰ دستگاہ حاصل کر لی۔ نیز شاعری میں چند ہی سال کے عرصہ میں دو ہزار بیت کا دیوان مرتب کر لیا۔ جو معمولی بات نہیں۔ وہ ابتداءً صاحب تخلص کرتے تھے۔ لیکن ۸ا برس کی عمر میں انہوں نے اپنے استاد کے مشورے سے اپنا تخلص شفیق رکھا۔ اگرچہ یہ تخلص اُردو غزلوں میں بہت کم استعمال ہوا اور زیادہ تر فارسی کلام کے لئے مخصوص رہا، لیکن آگے چل کر وہ اسی تخلص سے مشہور ہوئے۔

شفیق نواب میر احمد علیخاں المخاطب بہ اسدالملک عالی جاہ بہادر فرزند نواب آصف جاہ ثانی کے متوسلین میں سے تھے وہ شفیق کے بڑے قدردان اور اُن پر بہت مہربان تھے۔ شفیق کے کلیات میں اُن کی مدح میں متعدد قصیدے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

یک زبردست ہے مراد الی — یک قوی دل مرا ہے پشت پناہ

حق و باطل ہے سامنے جس کے — یوں عیاں جس طرح سفید سیاہ

یعنی نواب میر احمد خاں — اسدالملک حضرت عالی جاہ

باپ جس کا نظام دولت و دیں — جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

شفیق کی تاریخ وفات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اُن کی آخری کتاب "بساتین الغنائم" ۱۲۱۳ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "غالباً ۱۲۱۵ھ کے بعد شفیق کا انتقال ہوا" جیسا کہ "دکن میں اُردو" کے مولف نے لکھا ہے۔

شفیق کو شاعری کے علاوہ مورخ کی حیثیت سے بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ و انشاء کا ذوق اُنکو

اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ اس پر اُن کی خوش نصیبی سے مولانا آزاد سا استاد حاصل ہوا جنکے فیض تربیت نے اُن کو ایک بلند پایہ انشاء پرداز اور مورخ بنا دیا۔ ان کا تذکرہ چمنستان شعراء جو ۱۸ برس کی عمر میں لکھا گیا ہے۔ اُنکی اعلیٰ انشا پردازی اور بلند پایہ ادبیت کا پائیدار ثبوت ہے۔ یہاں ہم اُنکی تمام تصانیف کا مختصراً ذکر کرتے ہیں :۔

۱۔ **چمنستان شعراء**۔ یہ اُردو شعراء کا بہت ہی قابل قدر اور نہایت ضخیم تذکرہ ہے ۱۱۷۵ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں دو سو اٹھارہ شعراء کا حال بہت احتیاط اور غیر جانبداری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نہ کسی شاعر پر ناگوار طریقہ سے تعریض کی ہے اور نہ کسی کو حد سے زیادہ سراہا ہے سوائے انعام اللہ خاں یقین کے جس کے وہ بے حد معتقد اور پرستار تھے۔ اس تذکرے کا صرف ایک ہی قلمی نسخہ جو کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے جس سے نقل کرکے انجمن ترقی اردو نے اسکو شائع کردیا ہے۔ ۲۔ **شام غریباں**۔ یہ ان ایرانی شاعروں کا تذکرہ ہے جو ہندوستان آئے اور یہاں شاعری میں نامور ہوئے۔ یہ زیادہ ضخیم نہیں لیکن انشاپردازی اور انتخاب کلام کے لحاظ سے ضرور قابل قدر ہے۔ ۳۔ **گل رعنا**۔ یہ ہندوستان کے فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ہے اور شام غریباں سے زیادہ ضخیم ہے۔ اسکا سنہ تصنیف ۱۱۸۱ھ ہے۔ اس میں دو الگ الگ فصلیں قرار دیکر ہندو اور مسلمان شاعروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اپنے استاد مولانا آزاد بلگرامی کا تذکرہ بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سی کار آمد ادبی معلومات اور تشریح اشعار بھی اس تذکرے کی ایک خصوصیت ہے۔ اسکے دیباچہ میں ہندوستان کی اسلامی فتح اور یہاں میں فارسی زبان کی مختصر تاریخ بھی بیان کی ہے۔ اس تذکرے کا ایک نامکمل نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں اور ایک برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ۴۔ **تنسیق شگرف**۔ یہ کتاب ۱۲۰۰ھ میں تالیف ہوئی اور مسٹر جیمز ڈیلس ریزیڈنٹ حیدرآباد کے نام سے معنون کی گئی۔ اس میں دکن کے مختلف صوبوں کے تاریخی و جغرافی حالات اور بہت سے اعداد و شمار درج ہیں۔ نیز دکن کے مختلف حکمران خاندانوں کا مختصر احوال بھی لکھا ہے۔ ۵۔ **حقیقتہائے ہندوستان**۔ شفیق کے دادا نے ایک گوشوارہ مال حضرت آصفجاہ اول کی دستخط سے مرتب کیا تھا جس میں ۱۱۳۹ھ تک آمد و خرچ اور افواج وغیرہ کے اعداد و شمار درج تھے۔ اس مواد سے استفادہ کرکے شفیق نے اپنے محسن کپتان ولیم پیٹرک کے لئے جو اس وقت ریزیڈنٹ تھے یہ کتاب ۱۲۰۴ھ میں تالیف کی۔ اس میں چار مقالے ہیں جن میں قدیم دفتروں کا گوشوارہ، ہندوستان اور دکن کے صوبوں
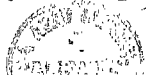
حالات اور ہندوستان کے بادشاہوں کے مختصر احوال درج ہیں۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

۶۔ **مآثر آصفی**۔ یہ کتاب ۱۲۰۸ھ میں تالیف ہوئی۔ اس میں آصف جاہ اول سے لے کر آصف جاہ ثانی تک کی تاریخ کے علاوہ امراء و راجگان کے حالات درج ہیں۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے۔ ۷۔ **حالات حیدرآباد**۔ یہ کتاب ۱۲۱۴ھ میں لکھی گئی۔ اس میں بلدۂ حیدرآباد کی مساجد، محلات، باغات اور صوبوں کے مختصر حالات درج ہیں۔ اس کا بھی ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ۸۔ **بساط الغنائم**۔ یہ کتاب سرجان ملکم کی فرمائش سے جو اس وقت حیدرآباد میں تھے لکھی گئی ہے۔ اس میں مرہٹوں کی نسلی تحقیق اور ان کے مختلف فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے شروع سے لیکر اپنے زمانے تک کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اس کا سن تالیف ۱۲۱۴ھ ہے یہ شائع ہو چکی ہے۔

شاعری۔ شفیق ایک نہایت پرگو شاعر تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں جب انہوں نے اپنا تخلص تبدیل کیا ہے اسوقت دو ہزار اشعار کا ایک ضخیم دیوان اُن کے پاس مرتب تھا جس کو انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ اُن کے کلیات میں ہر صنف سخن کا کلام موجود ہے۔ قصیدہ، رباعی، غزل، مثنوی، شہر آشوب، مثلث، مخمس اور واسوخت سب کی تکمیل کی ہے۔ وہ زباندانی اور فن شعر کے رموز و نکات سے خوب آگاہ تھے۔ اُن کی قادر الکلامی کے ثبوت میں اُن کی مشہور مثنوی تصویر جاناں[1] پیش کیجاسکتی ہے جس میں انہوں نے سراپا کھینچنے میں خوب کمال فن اور زور بیان دکھایا ہے۔ عام طور پر شفیق کا کلام بہت کم دستیاب ہوتا ہے۔ انکا ایک دیوان جو ۱۲۰۰ھ کا مرتبہ ہے "دیوان صاحب" کے نام سے مشہور ہے۔ شفیق کو یقین کی شاعری بہت پسند تھی اور اُن کی نظروں میں یقین بہت بڑی عظمت رکھتے تھے۔ انہوں نے ان کا دیوان بھی نہایت اہتمام سے لکھوا کر اپنے پاس رکھا تھا۔ دیوان صاحب میں دیوان یقین کی ہی بحروں اور زمینوں میں پانچ پانچ شعر کی غزلیں ہیں اور ہر طرح اس کی متابعت میں کوشش کیگئی ہے۔ یہ دیوان میاں ایک خانگی کتب خانہ میں موجود ہے نیز انجمن ترقی اردو میں بھی انکے دیوان کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ ذیل میں اُن کی غزلیات کے چند شعر اور مثنوی تصویر جاناں کے چند اشعار ناظرین کے ملاحظہ کیلئے پیش کئے جاتے ہیں۔

---

[1] یہ مثنوی چند سال قبل ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ رسالہ تجلی حیدرآباد جلد ۲ میں شائع ہوئی ہے۔

انتخاب کلام

وہ کمان ابرو جب آ شمع شبستاں ہوگیا
دل مرا اُس پر پتنگے سا ہی قرباں ہوگیا

ان وفاؤں کا یہ بدلہ ہے جفا یا قسمت
ہم چلے تم کو تو اب کر کے دعا یا قسمت

ہم ترستے ہی مریں لوٹے مزہ یوں پرویز
کوہ کن چیر کے سر کو یہ کہا... یا قسمت

مہر اور لطف و تسلی ہے رقیبوں کے نصیب
ہم پہ یہ جور و ستم اور بلا یا قسمت

دوستی میں کون ہے گا کوہ کن سا دل چلا
بات کہتے ہی دیا ہے جان ہے رے اتحاد

جس گھڑی لیلیٰ کی کھولی فصد آ فصاد نے
خون نکلا قیس سے اُس آن ہے رے اتحاد

تیرے بس میں ہیں ہمیں تو چھوڑ دے یا قید رکھ
آ پھنسے اب دام میں تدبیر کرنا کیا ضرور

خط پہ آویزاں نہیں یہ زلف تیری پیچدار
مارنے کو مور کا لشکر مگر آیا ہے مار

آخری دم ہے ٹک ایک دیکھ بھلا اے قاتل
بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس

حق تعالیٰ نہ کرے کس کو کسی پہ مائل
میں نے دیکھا ہوں گرفتار ہو آزاد کہ بس

بس ڈھپی رہنے دو یہ بات میاں مت بولو
ہم تمہیں دیکھ لیا اور تمہارا اخلاص

بات کہتے ہی گئی جان تصدق تم پر
ہم پہ یہ کچھ ہیں وہ یہ کچھ ہے ہمارا اخلاص

کم رکھے جی دل میں اپنے گل رخاں کا اختلاط
جی ہی لے چھوڑے گا ورنہ ان بتاں کا اختلاط

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

بہار آنے سے اب کے باغ میں اے ناصح مشفق
دوانے دل نے کچھ سن گن تو پایا ہے خدا حافظ

جیوں جلا آگ کا آتش سی ہوتا ہے بھلا
عشق کے درد کو تحقیق دوا ہے گا عشق

مرے نے وعدہ کر کے پھر مکرنا
تری باتیں بنانے کے تصدق

مرا دل لینے ہی تک آشنا تھا
ترے آنکھیں پھرانے کے تصدق

شیخ جی آتے ہیں کس وضع سے پکڑ تسبیح کو ہاتھ
مارئے گردن میں ایسا جائے جو منکا ڈھلک

دل الجھتا ہے مرا جیوں جیوں کہ سلجھے ہیں وہ بال
کیا مچے گی دیکھئے کاکل کے کھل جانے میں دھوم

کس طرح بیمار دل کی ہم شفا چاہیں کہ آج
پڑ گئی ہے اس کی آنکھوں سیتی میخانے میں دھوم

مزاج گل نہایت نازک ہے اور مالی ہے بے پروا
چمن میں بلبلوں نے غل مچایا ہے خدا حافظ

عجب ہے یہ کہ ہم کو داغ دے کر
کہاتے ہو تم اب لالہ جہاں میں

کیا کریں عرض حال تیرے پاس
ہم کو دل نہیں تجھے دماغ نہیں

کوئی بیچارا تجھے کہاں ڈھونڈے
ایک جا کا ترے سراغ نہیں

ہم تو حاضر ہیں نہ کرتے ہیں ترا حکم عدول
خون دل تو جو پلاتا ہے پلا بسم اللہ

آب حیات حق میں سخن گو کے ہے سخن
باقی ہے میرے بعد یہی یادگار کچھ

اس طور پہنچ گئے ہیں کسی کی یاد میں
نرگس کو ہے چمن میں مگر انتظار کچھ

کہاں ہے دل سوزدہ پروانہ کو آکر دیکھے
شمع مجلس رنداں میں رمق باقی ہے

کہو باتیں بنا تم اب و لیکن
تمہارا دل کہیں جاتا رہا ہے

کہیں کنج چمن میں چھپ کے وہ صیاد جاتا ہے
خدا جانے کہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

چھایا ہے ابر چار طرف سے چمن کے بیچ
ساقی! کدھر ہے جام کہاں وہ رفیق ہے

لائے جواب وہ کوئی صاحب کے شعر کا
جس کا کہ ذہن ثاقب و فکر دقیق ہے

دوستی کر تم سے ہم بیکس ہیں ہائے رے دوستی
ہم تمہیں دل دے کے یوں بیکس ہیں ہائے رے دوستی

گالیاں بھی کھا چکے جھڑکی بھی تیری سہہ گئے
یہ تمہاری دوستی کے حق میں ہے ہائے رے دوستی

اگر وہ شعلہ خو ٹک منہ سے پردہ دور کر دیوے
پتنگے جل مریں اور شمع کو بے نور کر دیوے

جان! جنگل میں یوں نہ جاؤ تم
دل جلا کوئی سانس بھرتا ہے

خاک سے اُس کی نرگس اُگتی ہے ‏ ‏ جو ترا منتظر ہو مرتا ہے

اپنے بندوں پہ جانی دیکھو بھلا ‏ ‏ کوئی اِس طور ظلم کرتا ہے

جب کھلے بندوں گیا اور بسما تو باغ میں ‏ ‏ تیری ایسی طرح پر سب گل بھی خنداں ہو گئے

ہر جہت بادِ صبا کے یہ قدم کا فیض ہے ‏ ‏ مرقدِ بلبل پہ گل جو یوں چراغاں ہو گئے

آنکھوں کا بیان

سراسر رمز اور ایما ہیں آنکھیں ‏ ‏ اشاروں میں بہت گویا ہیں آنکھیں

نہیں یہ چشم و ابرو میں گیا بھول ‏ ‏ دھرے ہیں طاق میں دو نرگسی پھول

جو راحت نیند میں پاتے ہیں وہ چشم ‏ ‏ کنول کے پھول بن جاتے ہیں وہ چشم

نہ زیر ابرو ہیں آنکھیں خواب کے بیچ ‏ ‏ ہرن سوتے ہیں دو محراب کے بیچ

اگر مخموری آنکھوں کو جو کھولے ‏ ‏ خجل ہو اُنسے مر جاوے ممولے

جسے وہ چشم رشک آہو جگایا ‏ ‏ اُنے تحقیق کوئی جادو جگایا

نظر کر ایسی اچپلیاں نین میں ‏ ‏ ہرن نے چوکڑی بھولا ہے بن میں

چھل آنکھوں کو اُس کی دیکھ اچھی ‏ ‏ خجالت سے رہے پانی میں مچھی

پڑی آنکھوں کی اس کی دیکھ جرأت ‏ ‏ بہت ہے نرگس شہلا کو حیرت

نگاہِ لطف اُس آنکھوں سے گر پائیں ‏ ‏ ہرن آنکھوں سے نذر پیشکش لائیں

نشہ اُن لعل آنکھوں میں رسا ہے ‏ ‏ گل نرگس گل لالہ بنا ہے

ہوئے ہیں نشہ سے یوں چشم خونیں ‏ ‏ کہ جیوں شنجرف سے بادام رنگیں

نہیں آنکھوں کے ڈورے سمے ہیں ‏ ‏ مگر مستوں کو رسیوں سے کسے ہیں

غلط ہے دو ہرن جنگل سے پکڑے ‏ ‏ پھر اُن کو ریشمی رسیوں سے جکڑے

بیاض دیدہ پر ڈورے ہیں کیا لال — رگِ یاقوت سے بلّور پر جال

عجب ان لال ڈوروں کے ہیں انداز — گُلِ فردوس پر قدرت سے پرواز

سفیدی کچھ نہیں الماس سے کم — سیاہی ہے سیہ مانندِ نیلم

سفید اور سیہ جو نا بناتا — نور روز و شب کی قسمیں حق نہ کھاتا

بحد سرخ ہیں آنکھوں کے کوے — مگر یاقوت کے ریزے ہیں دوصوے

نہیں ہیں سرخ گو ہیں چشم میخوار — گزک کر نے رکھا ہے دانۂ نار

نگہ مژگاں کی صف سے یوں ہے راہی — کہ جیسے فوج سے یکہ سپاہی

نکلتی ہے نگہ آنکھوں سے ایسی — چمک آئینہ سے جاتی ہے جیسی

نگاہ کج نے سینہ کو گئی چیر — کہ چھوٹا بازگشتی جس طرح تیر

نگاہ کج نے لے دل کا کبوتر — کہ شاہیں جس طرح جھپٹے اُٹھا کر

(ماخوذ از تصویر جاناں)

سالم

قاضی محمد کرم بخش

ابوالفضل خلیل احمد آزاد (احمد پوری)

ممالک محروسہ سرکار عالی میں جو اہل خدمات شرعیہ یعنی قاضی خطیب محتسب و مفتی ہیں ان میں زیادہ تر فاروقی ہیں اور بقیہ صدیقی۔ جتنے اصحاب فاروقی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے اکثر کا سلسلۂ نسب قاضی شیخ احمد ولد قاضی شیخ محمد تک پہنچتا ہے جو حضرت عمر فاروقؓ کی چھبیسویں پشت میں تھے۔ اس سلسلہ میں شیخ جمال الدین سلیمان خواہر زادہ سلطان محمود غزنوی، خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر اور شیخ بدرالدین سلیمان نبیرہ سلطان محمد تغلق وغیرہ مشہور ہستیاں گزری ہیں۔ خود قاضی شیخ احمد مشہور بزرگ تھے اور قاضی مرزا احمد بیگ قاضی احمد نگر کے نواسے تھے۔ اور غالباً ان کے بعد یہی قاضی احمد نگر ہوئے تھے۔ ان کی دو بیویاں تھیں ایک دختر میر مراد علی خاں صدر اور دوسری دختر عبدالرحمٰن قاضی پاتور اول الذکر کے بطن سے قاضی محمود پیدا ہوئے جن کے نبیرہ اور ہم نام قاضی محمود کے چار فرزند تھے جن کے آپس میں پاتھری، قندہار، عثمان نگر، دھارور، انبجی اور بسمت نگر وغیرہ کی قضاءت تقسیم ہوئی۔ عبدالرحمٰن قاضی پاتور کی دختر سے جو اولاد ہوئی وہ پاتور کی قضاءۃ پر قابض رہی اور غالباً انہیں کے سلسلہ میں قاضی محمد کرم بخش سالم بھی ہیں جو عہد نظام علیخاں آصفجاہ ثانی تک پرگنہ پیپری کی قضاءۃ انجام دیتے رہے۔ اور اس زمانہ میں کسی وجہ سے وہ بہت ممکن ہے کہ آپس کی منافشات کی وجہ سے قضاءت سے معزول کئے گئے تھے۔ ان کے حالات سے متعلق تاریخ قندھار اور شعرائے قندھار میں تعجب ہے کہ کوئی مواد دستیاب نہیں ہوتا۔ حالانکہ دونوں کتابیں اس موضوع پر نہایت مستند اور مبسوط معلومات کی حامل ہیں۔

"تذکرۂ گلِ عجائب" مولفہ میر اسد علیخاں تمنا اورنگ آبادی میں ان کی نسبت چند معلومات درج ہیں اس میں لکھا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب ۳۸ واسطوں سے حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ثانی تک پہنچتا ہے۔ اور ایک مدت تک پرگنہ پیپری کی جو اورنگ آباد سے ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ خدمت قضاۃ کو بہ استقلال تمام سرانجام کرتے رہے۔ اور ۱۱۹۰ھ کے قریب معزول ہوکر بحالی خدمت کی کارروائی کرنے کیلئے حیدرآباد چلے آئے اور نواب صمصام الملک بہادر صارم کے یہاں فروکش ہوئے ۱۱۹۴ھ تک زندہ تھے اور اس وقت تک خدمت قضائت اُن پر بحال نہیں ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ اُن کی تاریخ وفات کا علم نہ ہو سکا۔

ان کی عربی و فارسی لیاقت، خوش خلقی، بدیہہ گوئی اور سخن شناسی کی اُن کے ہمعصر تذکرہ نگار میر اسد علیخاں تمنا نے بے حد تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مرد یست خوش خلق، کشادہ رو، بدیہہ گو، مضمون رس، سخن شناس" نواب صمصام الملک صارم اپنے عہد کے بڑے علم پرور اور سخن دوست امیر تھے اور اُن کے یہاں سالم کا قیام پذیر ہوکر قدر و منزلت حاصل کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ واقعی عالم و فاضل اور بلند پایہ صاحب سخن تھے نواب موصوف کے دربار میں روزانہ حیدرآباد کے دیگر امراء اور صاحبانِ کمال سے اُنکی ملاقات ہوتی تھی اور اُن میں سے اکثر ان کے گرویدہ اور دوست بنگئے تھے۔ اور انہوں نے یہاں بھی خاص اثر پیدا کرلیا تھا چنانچہ میر اسد علیخاں تمنا کو اپنی شخصیت سے اتنا متاثر کیا کہ شعراء اردو کا ایک تذکرہ لکھنے پر مجبور کردیا۔ چنانچہ وہ خود اپنے تذکرہ کا سبب تالیف یوں بیان کرتے ہیں۔

"ایں تذکرہ نیز از گفتہ او صورت آغاز و کیفیت انجام پذیرفت"۔

قاضی سالم نہ صرف رائے مشورہ پر ہی اکتفا کرتے تھے بلکہ اپنی رائے پر چلنے والوں کی ہر طرح سے امداد بھی کرتے تھے چنانچہ تذکرۂ گل عجائب کے مصنف کی یہاں تک مدد کی کہ جیسے جیسے وہ لکھتا جاتا تھا۔ اسکے مسودوں پر نظر ڈال کر اُن کو صاف لکھدیا کرتے تھے جس کی بناء پر اسد علیخاں تمنا نے اظہار تشکر بھی کیا ہے۔

سالم اگرچہ پیپری کے رہنے والے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ آباد میں بھی انکی کافی آمد و رفت تھی اور

انہوں نے علم و فضل اور شعر و سخن کا ذوق حاصل کیا۔ اُن کی شاعری کا زمانہ تقریباً ۱۱۶۲ھ سے شروع ہوتا ہے کیونکہ اسی سال میر اولاد محمد خاں ذکا بلگرامی اپنے وطن سے اپنے چچا میر غلام علی آزاد کی طلب پر اورنگ آباد آئے تھے لیکن اُس دفعہ صرف پانچ سال قیام کر کے اپنے وطن کو واپس ہوئے اور دوبارہ ۱۱۷۹ھ میں دکن آئے اور پھر یہیں وفات پائی۔ قیاس غالب تو یہی ہے کہ قاضی محمد کرم بخش سالم نے اس دوسری دفعہ کی آمد کے بعد سے اُن سے استفادہ کرنا شروع کیا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ ذکا بھی صمصام الملک بہادر صارم ہی کے زیر سرپرستی حیدرآباد میں قیام پذیر تھے۔

سالم کے کلام کی خصوصیات قریب قریب وہی ہیں جو اُس دَور کے دیگر اورنگ آبادی شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ ایک بات ان کے یہاں قابل ذکر یہ ہے کہ یہ اپنے تخلص سالم کو اپنے مقطع میں بڑی خوبی سے نبھاتے ہیں مثلاً

گذر گئی عمر سب خوش قامتوں کی ٹھوکریں کھاتے ۔۔۔ ہمارا سر بھی سالم ہے گویا اس باٹ کا روڑا

گرے ہے آستیں سے چھن کے آنسو خاک میں سالم ۔۔۔ عجب موتی ہے پھوٹے پر بھی جس کی یہ ڈھلک رہ گئی

کس طرح عشق تیرا کوئی نہ سمجھے سالم ۔۔۔ چشم گریاں، دلِ غمگیں کا نشاں ہے تحفہ

اُن کا تخلص سالم ظاہر کرتا ہے کہ یہ نواب صمصام الملک صارم کی مناسبت سے رکھا گیا ہوگا افسوس ہے کہ اُنکا مکمل دیوان اس وقت دستیاب نہ ہوسکا لیکن تذکرہ گل عجائب میں تقریباً ہر ردیف کے اشعار موجود ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۹۲ھ سے قبل ہی اُن کا دیوان ترتیب پاچکا تھا انہوں نے سخت زمینوں میں بھی غزلیں لکھی ہیں فن عروض سے اچھی طرح واقفیت تھی اور کلام میں جگہ جگہ صنعتوں سے بھی کام لیا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

تنِ شیریں پہ چسپاں جس نے دیکھا تنگ جوڑا ۔۔۔ اسی دم کوہکن سان تیشۂ حسرت سے سر پھوڑا

کناری زلف کے نزدیک کیا بل کھا کے گرتی ہے ۔۔۔ کہ کالے ناگ نے گویا الٹ کر کینچلی چھوڑا

کوئی کر چاک جگر کوئی ہوا گھوٹا نکلا ۔۔۔ جو سر خاک سے میرے گل و بوٹا نکلا

سرخ رو کیونکہ بر و بار سے ہووے شمشاد ۔۔۔ راستی میں جو ترے سامنے جھوٹا نکلا

یاد ہے زلف شکن دار کی کس کی سالم ۔۔۔ جو دم سرد ترے سینے سے ٹوٹا نکلا

میں نے دل اب تو ترے ہاتھ دیا یا قسمت　　کام جو مجھ سے نہ ہونا تھا ہوا یا قسمت
کوئی دن خوب سی ہم نے بھی مچائیں دھومیں　　اب وہ ہم ہی ہیں نہ وہ دل ہی ہا یا قسمت
ایک تھا مجھ طرف آنے کو تجھے عذر حیا　　تس پہ اب پانوں کو باندھی ہے حنا یا قسمت

جس طرح کھیت کو شاداب رکھے ہے شبنم　　سبز ہے حسن ترا یوں عرق شرم کے ساتھ

سونواں جوڑا قیامت ہے یہ تیرے بر میں آج　　سج بنانا خون عاشق سے کہاں کا ہے رواج

خاک میری مت بیاباں سے اڑا اے گرد باد　　ان غزالوں کے مجھے پھر نقش پا آویں گے یاد

باغباں ہم لے چلے سر پر ترے پتھر کے زخم　　باغ میں آتے ہی طالع نے ہمارے گل کیا

خوب رویوں کو نہیں پردے میں ہرگز اعتبار　　در صدف کی قید سے نکلے پہ پاتا ہے وقار

دیکھیے آتا ہے قاتل کس طرف خنجر بکف　　ایک میں ہوں سو تو آپی لے رہا ہوں سر بکف
کس بت طامع سے ای خورشید سودا ہے تجھے　　ہر سحر دیکھا تو آتا ہے لئے تو زر بکف

مجھے تو نے عبث کیوں نیم بسمل کر دیا قاتل　　نہ جیتا ہوں نہ پورا مر چکا یہ کیا کیا قاتل
نہ بچے کس طرح سے جو دمہ ابرو کا ہو مارا　　کہیں بھی تیغ زہر آلود کا زخمی جیا قاتل

بگولا کب ہے وہ یعنی جو گرد آلود اٹھتا ہے　　مزار قیس سے صحرا میں رہ رہ دود اٹھتا ہے

سراسر اشک ہے بنائے کاغذی کی شکل　　کہ آستیں کی ہوا سے شتاب پھوٹے ہے

دیکھی نہ وفا ہم نے تو واللہ کسو کی　　پھر دل کو کس امید پہ ہو چاہ کسو کی

مرے کے بعد مصاحب بنا ہے سنگ مزار　　بزیر خاک بھی ہم سے جنوں کی خو نہ گئی
حجاب دختر رز کو تجھی سے ہیں زاہد　　جہاں گئی ہے تو بے پردۂ سبو نہ گئی

باغ میں دیکھ لیا سرو چمن اور ہی ہے　　ہم نے جو دید کیا ہے وہ چمن اور ہی ہے
لعل و یاقوت ترے لب کو نہ پہنچیں ہرگز　　اس میں سنتا ہوں تو کچھ لطف سخن اور ہی ہے

عشوہ و ناز ترا ہوش ربا ہے لیکن — صید دل جس سے کرے ہے سو وہ فن اور ہی ہے

عطر و عنبر کو کس انصاف سے دیجے تشبیہ — بو تری زلف کی ہے رشک ختن اور ہی ہے

خان و ماں سے مجھے اب کام نہیں ہے سالم — گھر دوانے کا کہیں ہووے وطن اور ہی ہے

گوارا ہو سکے دل پر اگر مجھ سے خدا روٹھے — و لیکن کیا قیامت ہے جو تجھ سا دلربا روٹھے

کبھی نظریں چرا کر مسکرانا کچھ نگہ کرنا — غرض کیا لطف ہے جب آشنا سے آشنا روٹھے

نہ کھینچا سر کبھی تیغ جفائے یار سے سالم — مرے بھی کوئی تو ایسے نازنیں قاتل سے کیا روٹھے

اک جان ہے سو اب تک تجھ بن ترس رہی ہے — پھر پوچھتا ہے پیارے کیا کیا ہوس رہی ہے

میں کب ہوں ملکیتی میں محتاج ابر و باراں — میری ہی چشم تر سے بھادوں برس رہی ہے

ہمارے قتل کا اثبات تجھ پر کیونکہ ہو قاتل — حنا شاہد تھی سو اب وہ اڑی جاتی ہے ہاتھوں سے

کف پا تک نہیں ہے بار جن کو سو یہ عاشق ہیں — جو سر پر بیٹھتے ہیں میرزا ہیں بلکہ بے پروا

بات کہتے ہو پھر اڑاتے ہو — تاڑ کا جان ہم نے بوجھ لئے

سر نے جب اوس کا میں سینے سے لگایا تو کہا — بس اب افشاں مرے ماتھے کی جھڑی جاتی ہے

دیکھ لیویں گے کبھی ہم بھی مخصص خوب طرح — کہیں آخر تو مل جاؤ گے باٹے گھاٹے

نالہ خاطر خواہ کیجئے تو اب دم نہیں — بات کہہ کر دل کو بہلا دیں تو کوئی محرم نہیں

عطر داں دیکھ ترا کیونکہ ہو دل کو حیرت — چار کونے ہی کہیں چاند نظر آیا ہے

زیب دیتا ہے زری جوڑا سنہری رنگ پہ — شعلہ رویوں سے مناسب ہے رکھے نا مس راہ

اس حنائی دست پر دیکھا ہوں سالم دم بدم — کر لیا ہے پنجہ مرجاں سے کیا الماس راہ

تو جب میرے ہاتھ سے دامن چھڑا چلے — تب میں جو تیرے پانوں پکڑ لوں تو کیا چلے

صیاد بلبلوں کے قفس کو تو کر غلاف — گل کے جلے ہوؤں پہ کبھی تو ہوا چلے

ارمان دل کا دل میں نکالے یوں ہیں کب تلک
اے بے وفا کبھی تو مرا بھی کہا چلے

سالم ہے اشک سرخ سے دامن مرا چمن
بس اب گلوں کی سیر کو کس کی بلا چلے

گیا تو ناز سے پر دل میں وہ تیری لٹک رہ گئی
برنگ گل تو جس کے پاس سے گذرا مہک رہ گئی

وہ کیا حسن جہاں افروز ہوگا شعلہ رویوں کا
صفا میں آئینہ کے جن کی صورت چمک رہ گئی

کہاں دل سے نکلتا ہے خیال اوسکی کناری کا
مرے خاطر میں یعنی جس کے دامن کی دھنک رہ گئی

جی دیئے بات کے کہتے ہی وفا ایسی ہو
ہم نے یہ کی ہے میاں اور سے کیا ایسی ہو

ہو سکے کب ترے قامت کے مقابل شمشاد
راستی ہے کہ کہاں اوس میں ادا ایسی ہو

ایک دم میں ہی کھلیں جا کے سو غنچۂ دل
اے نسیم سحری ہو تو ہوا ایسی ہو

آشفتہ

خواجہ ابوطالب خاں

سنہ ۱۱۶۵ھ تا سنہ

از خلیق احمد صاحب نعمانی

خواجہ ابوطالب خاں آشفتہ کے جد امجد خواجہ محمد بچپن میں اپنی والدہ کے ہمراہ بلخ سے گجرات آئے اور حضرت شاہ دولہ کی خدمت فیض درجت میں باریاب ہوئے۔ شاہ صاحب نے اس ہونہار بچہ کے تابناک مستقبل کی پیشین گوئی کی اور اپنے فقیرانہ لباس سے ایک پارچہ مرحمت فرمایا۔

عالم شباب میں خواجہ محمد کی دوستی مرزا یار علی سے ہوگئی جو بادشاہ وقت کے مزاج میں بیحد دخیل تھا۔ انہیں بخشی گری سیوم کا عہدہ ملا، چندے سردار خاں کوتوال شہر کی نیابت بھی کی اور اس عرصہ میں ان کی شادی کشمیر کے ایک معزز امیر عنایت اللہ خاں کی لڑکی سے ہوگئی۔

وفادارانہ خدمات کے صلہ میں بیجاپور اور سنگمیر کے صوبہ کے صوبہ دار مقرر کئے گئے اور امانت خاں کا خطاب عطا ہوا۔ عہد خلد منزل میں سورت کی منصدی گری اور فوجداری پر فائز رہے۔ جب فرخ سیر نے داؤد خاں پنی کو گجرات کا صوبہ دار بناکر بھیجا تو انہیں مبارز خاں کا خطاب اور حیدرآباد کی صوبہ داری عطا کی۔

اس طرح ان کا دکن آنا ہوا جہاں بارہ سال تک نہایت شان و شوکت اور امن چین سے صوبہ داری کی اور اس ملک کو مرہٹوں کی یلغار سے محفوظ رکھا۔ جب آصفجاہ اول نے سادات بارہہ کو شکست فاش دی اور اورنگ آباد آئے تو [illegible] سفارش کر کے ان کو عماد الملک کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب معہ سات ہزار سوار کے دلوایا۔ مگر وہ ان کا حیدرآباد کا عہدہ دینا [illegible]

پسند نہ کرتے تھے۔

بعد میں جب آصف جاہ اول وزیر سلطنت ہندوستان مقرر ہوگئے تو مبارز خان کو دکن سے بلا کر کابل کی صوبہ داری عطا کی کہ وہاں کی ابتر حالت کا سنبھالنے اور ٹھیک کرنے والا ان کے سوا اور کوئی نظر نہ آیا۔ مبارز خان نے اس عہدہ کو قبول کر لیا اور کابل کے ارادہ سے مچھلی بندر پہنچے اور پہاڑی کے مقام پر آپا راؤ زمیندار کی بغاوت کو فرو کیا۔ اسی عرصہ میں افغانوں کی کوشش سے پھر انہیں محمد شاہ نے صوبہ دار دکن ہی رہنے کا حکم بھیجا۔ اس فرمان کو لیکر خان موصوف دکن واپس ہوئے اور راستہ میں نانڈیڑ میں برسات گذارنے کے ارادہ سے ٹھیر رہے۔

اس عرصہ میں آصفجاہ مرہٹوں کی سرکوبی کیلئے مالوہ آئے ہوئے تھے۔ اجین کے قریب محمد عنایت خاں کا خط ملا جس میں اس واقعہ کی اطلاع تھی۔ انہوں نے فوراً دکن کا رخ کیا اور اورنگ آباد پہنچنے کے بعد خان موصوف کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا لیکن معاملہ جنگ پر منتج ہوا شکر کھیڑہ کے میدان میں مبارز خاں کو شکست نصیب ہوئی اور وہ ان کے دو لڑکے اسعد خاں و مسعود خاں مارے گئے۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے مبارز خاں کی معاملہ فہمی کاردانی اور بہادری کی بڑی تعریف کی ہے۔

مبارز خاں کے تین اور لڑکے تھے ان کے سب سے بڑے فرزند خواجہ احمد خاں نے جو حیدرآباد میں نگران کار صوبہ دار تھے اس واقعہ کے بعد قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لی لیکن آصف جاہ اول نے ادھم پور اور قوال جاگیریں دیں اور شش ہزاری منصب مع چار ہزار سوار اور شہامت خاں کا خطاب عطا کیا۔ اسکے بعد وہ خجستہ بنیاد میں گوشہ نشین ہوگئے۔ انکے دوسرے فرزند خواجہ محمود خاں کو پنجہزاری منصب تین ہزار سوار اور مبارز خاں کا خطاب عطا کیا۔ یہ نہایت بہادر اور معاملہ فہم آدمی تھے ان پر آصف جاہ اول کی خاص نظر عنایت تھی، ہمیشہ اپنی مصاحبت میں رکھتے تھے۔ صلابت جنگ بہادر کے زمانہ میں خواجہ محمود خاں المخاطب مبارز الملک غالب جنگ کو بیدر آباد کی نظامت دی۔ انکے انتقال کے بعد انکے بھتیجے حامد اللہ خاں بہادر نے دیوانی بیدر آباد پر ترقی پائی جنھیں دو ہزار منصب مع ایک ہزار سوار عطا ہوا تھا اور پھر آصفجاہ اول نے اپنی بہن جمشیدہ بیگم کو حبالہ عقد میں دیکر خاندانی عداوت کو نسیاً منسیاً کر دیا تھا۔

نواب شریف خاں مبارز خاں عماد الملک کے پوتے تھے۔ اسد علی خاں تمنا نے لکھا ہے کہ انکو غضنفر جنگ

خطاب ملا تھا اور دیوانی حیدرآباد کے جلیل القدر عہدہ پر فائز رہے۔ اکثر معرکوں میں ہمرکاب شاہی رہے چنانچہ صاحب تزک آصفیہ نے پیڑگانوں احمد نگر کی لڑائی کے سلسلہ میں ان کا نام لیا ہے۔ "سید موصوف (سید لشکر خاں) بتوسط خود صلح کنانیدہ لشکر را حرکت داد بہ حسب اتفاق فقیر نیز بعمر سیزدہ سالگی ہمراہ خال خود کہ برفاقت خواجہ محمد اشرف خاں بہادر نبیرۂ نواب مبارز خاں عماد الملک حاضر بود ایں ہمہ جنگ و پیکار بچشم خود دید۔" جیسا کہ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے دکن کے ایک باکمال شاعر اور صوفی شاہ تجلی علی تجلی اور ان کے ماموں کو خواجہ اشرف خاں کی رفاقت حاصل تھی۔ ممکن ہے اس تعلق سے شاہ تجلی نے اکثر استفادہ کیا ہو۔

خواجہ ابوطالب خاں آشفتہ ان کے بیٹے تھے۔ داروغگی فیل خانہ کے عہدہ پر سرفراز رہے۔ آشفتہ نہایت مہذب اور ثقہ واقع ہوئے تھے طبیعت میں انکسار تھا ہر شخص سے نہایت اخلاق سے پیش آتے اور اس کی اسکے درجہ اور لیاقت کے مطابق قدر و منزلت کرتے تھے۔ آداب مجلس سے واقف تھے وہ نہایت اعلیٰ کردار کے حامل تھے۔ ان کی زندگی باوجود سرمستی شباب کے بے داغ رہی۔ ایک نوجوان کا شاعر ہونا ہی کیا کچھ کم ہے کہ اس پر اس کا متمول ہونا! مگر پارہ و آتش کی یکجائی نے انھیں بے پر اڑنے کی اجازت نہ دی' ان کی پاک زندگی ولائے اہل بیت عظام سے معمور تھی۔۔۔

وہاں کی خاک سے آشفتہ اپنے سر پہ رکھ　　　　کہ جس زمیں سے نکلے ہے بوتراب کی بو

آشفتہ کے متعلق ہماری معلومات کا دارو مدار گل عجائب ہے جس کے مولف میر سید علی خاں تمنا نہ صرف آشفتہ کے بے تکلف دوست بلکہ ایک مہربان مشیر سخن بھی تھے۔ تمنا کو اس بات کا اعتراف ہے کہ آشفتہ خود "صاحب زبان الفاظ شستہ و رفتہ" ہیں۔ انھیں کیا اصلاح دی جا سکتی ہے چونکہ دوستی کے دائرہ میں استادی اور شاگردی کو کوئی دخل نہیں۔ مگر آشفتہ کا اصرار تمنا کو گاہے گاہے مشورہ سخن پر آمادہ کر دیتا تھا اور یہ اصرار اس نوبت پر پہنچا کہ آشفتہ نے اس تعلق کو اپنے ایک شعر میں اس طرح واضح کیا ہے

استاد فلاطونم و شاگرد تمنا　　　　آشفتہ دو عالم شدہ یکساں زمن امروز

آشفتہ اور تمنا میں اس قدر یگانگت اور یکدلی تھی کہ آشفتہ اکثر اوقات ان ہی کے ہاں رہتے اور ہنسی اور کھیل

باتوں سے خوش کرتے اور خوش ہوتے۔ تمنا کو شکایت رہی سرد مہری یاراں سے! اگر کوئی چیز اس بار خاطر کو ہلکا کرنے والی تھی تو وہ آشفتہ کی گرم جوشی! ۔

ان کی علمی قابلیت کے متعلق تمنا کا یہ اشارہ کہ "بزیور قابلیت پیراستہ" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ رواج کے مطابق علوم متداولہ سے بہرہ ور تھے۔ فارسی قابلیت بہت اچھی تھی اس زبان میں شعر بھی کہتے تھے اور بعض بہت اچھے شعر کہے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ۔

خون دل بہر کف پائے نگارے بودم ۔۔۔ گفت در کار مرا نیست حنائی خواہم
ز دولت خانہ بیروں آمد بیا اے گلبدن بنشیں ۔۔۔ ہوا گرم است قدرے باش بشنو این سخن بنشیں
بیا اے جان من از خانہ در صحن چمن بنشیں ۔۔۔ بکش جام شراب از دست من بہ پہلوے من بنشیں
می آید آں نگار کنم لعل ساں نثار ۔۔۔ اے لخت دل ز دیدہ گریاں جدا مباش

آشفتہ اردو کے اچھے شعرا میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ یہ اس دور کے شاعر ہیں جب فرخندہ بنیاد کو پایۂ تخت قرار دیا گیا تھا اور شعر و سخن، علم و فن کی تمام سرگرمیاں بلدہ میں منتقل ہو گئی تھیں۔ اس زمانہ میں تجلی، ایمان اور تمنا کبھی شعرا میں خاص امتیاز رکھتے تھے ان کی شاعری کے بڑے چرچے تھے۔ آشفتہ بھی اس دور کے اچھے نمائندہ ہیں۔

آشفتہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کا شمار ان لوا برادران علم و فن میں ہے جو رزم و بزم کے سرگرم شرکا، کی حیثیت سے سیف و قلم کے جوہر یکساں دکھاتے ہیں۔ "سیف" کے جوہر دکھانے کا یہ موقع نہیں مگر اس قلم کے دھنی کی باکمالی کا اظہار نمونۂ کلام سے ہو سکتا ہے۔ ریختہ میں انھیں کافی مہارت حاصل تھی۔ اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آشفتہ پُر گو شاعر نہ تھے۔ ان کے خوش گو ہونے میں کس کو کلام ہے اور یہ کیا کچھ کم بات ہے!

ان کے کلام کے اس مختصر انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاشقانہ مضامین کو صاف اور سلیس زبان میں باندھتے تھے۔ کلام میں ابہام اور دور از کار مضمون آفرینی نہیں کہ سوچنے اور سمجھنے کیلئے "مہلت" درکار ہو۔ مضامین کی رنگینی رنگین مزاجی کی آئینہ دار ہے۔ تشبیہات اور استعارات سے بھی اپنے کلام کو پرکیف بناتے ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے ۔

سبز ہو نخل مری آہ کا چھوٹا نکلا
قد دلدار ہوا سرو کا بوٹا نکلا

بلبل کی خاک پر اب پھولوں کی کیا ہے جا جہت
مشہد پر اسکے ہیگا روشن چراغ گل کا

گریباں چاک پھرتا ہوں مجھے کیا کام گلشن سے
دکھاتا ہے کسے لے باغباں تو انتظام اپنا

کیا بزم میں گلابی چلی ہے چمن کے بیچ
ساقی یہ طور تیری بھلی ہے چمن کے بیچ

خاکستری بدن تر اکس سرو نے کیا
قمری تو کس کے ہاتھ جلی ہے چمن کے بیچ

شاید ہے دستِ نازکِ گلرو ہے سبز پوش
یہ شاخ گل نہیں جو ہلی ہے چمن کے بیچ

خم جوش میں ہے ساغر و مینا ہے لوٹ پوٹ
کس نے گلابی آنکھ ملی ہے چمن کے بیچ

آج گلشن میں کھلی ہے اوس کی کاکل بیطرح
کیا عجب گر پیچ کھاوے شاخ سنبل بیطرح

آتا ہے کہاں غنچہ کو یہ رنگِ تبسم
جو لب پہ نمایاں ہے ترے رنگِ تبسّم

میں کب سے ترا طالب دیدار کھڑا ہوں
رسوا شدہ کوچہ و بازار کھڑا ہوں

کرنا ہے اگر قتل تو پھر دیر کی کیا وجہ
حاضر ہوں ترے روبرو جلاد کھڑا ہوں

سجن کے منہ سے نکلتی ہے اب شراب کی بو
چمن میں جس طرح مہکے گل گلاب کی بو

تمھاری زلف معنبر کے سامنے پیارے
ہے کیا مجال مقابل ہو مشک ناب کی بو

وہاں کی خاک اے آشفتہ اپنے سر پر رکھ
کہ جس زمین سے نکلے ہے بوتراب کی بو

پانوں پڑتا ہوں مرے خون کو مل اے مشفق
یار کے ہاتھ میں مشاطہ حنا ہی ہو

خوں ہے کس کا نگار سچ کہیو
تیرے دامن پہ یار سچ کہیو

دود پہنچا زمیں سے تا بفلک
کس کی ہے یہ مزار سچ کہیو

صیاد تجکو دیکھ یکایک پھڑک اٹھی
بلبل نے شاخ گل سے سلرپنا پٹک اٹھی

گلرو تو مت سمجھ کہ ہے تختہ گلاب کا
بلبل کے دل کی آگ تھی آخر دہک اٹھی

مردمک روتی ہے اور لاگی ہے مژگاں کی جھڑی　　خوب برسائی نگہ نے ابر نیساں کی جھڑی

اے آہ تو نے آنکھ سے لوہو بہا چلی　　لختِ جگر کو خون میں ظالم ڈبا چلی

ٹکڑے کر اپنے دل کو اے بلبل سحر کے وقت　　غنچوں کے چاک کرنے کو بادِ صبا چلی

فصلِ گل کیوں جہان پر آئی　　عندلیبوں کی جان پر آئی

پھر مزا کیا رہا مرا صاحب　　بات جب امتحان پر آئی

وہ اپنے گھر ستی مستِ شراب نکلے ہے　　طلوعِ صبح کا جوں آفتاب نکلے ہے

اوس پری رو کا دل دیوانہ ہے　　نہ فلک جس کا شیشہ خانہ ہے

خط تجھیں لیکے اوسنے کبوتر کے پر کسے　　اے نامہ بر چلا ہے کہاں تو کمر کسے

رباعی:—

فریاد و فغاں کیا بہت سا بسمل　　سن کر بھی گزر کیا نہ اودھر قاتل

اک دم کیلئے خموشی بہتر نادان　　دیجیو نہ کسی کو دل اگر ہے عاقل

نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث

تیسرا دور

سنہ ۱۲۳۵ھ سے سنہ ۱۳۰۱ھ تک

اس دور میں نواب میر اکبر علیخاں آصف جاہ ثالث (سنہ ۱۲۴۴ھ) کے بعد نواب میر فرخندہ علیخاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع (سنہ ۱۲۷۳ھ) اور نواب میر تہنیت علیخاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس (سنہ ۱۲۸۵ھ) اور ان کے وزرا اور امرا مثلاً مہاراجہ چندو لال شاداں (سنہ ۱۲۶۱ھ) اور نواب فخر الدینخاں شمس الامراء (سنہ ۱۲۹۷ھ) اور ان کے فرزندوں نے اپنی بے نظیر سرپرستیوں کی وجہ سے حیدرآباد کو اردو ادب کا مرکز بنا دیا۔ یہ دراصل میر شمس الدین محمد فیض (سنہ ۱۲۸۳ھ) اور انکے شاگردوں کا عہد تھا جن پر ایک مبسوط تذکرہ قلمبند کیا جا چکا ہے۔

اس دور کے شعراء میں مرقع سخن کی پہلی جلد میں میر شمس الدین فیض، نواب بدر الدینخاں معظم الملک تمیز، راجہ گردھاری پرشاد باقی، نواب فیاض الدینخاں مشرف جنگ فیاض، میر احمد علی عصر اور سید اصغر حسین ناجی کے متعلق تفصیلی مضامین شائع ہو چکے ہیں اور اس جلد میں حسب ذیل سات شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام درج ہے۔ سید معین الدین شاہ خاموش، حکیم محمد مظفر الدینخاں مزاج، میر حیات الدین محمد صاف، سدا شند جوگی، بہاری لال رمز، آغا محمد داؤد تحو، مرزا غلام سجاد اشہر اور محمد حفیظ الدین یاس۔ لیکن اس دور میں حیدرآباد میں سب سے زیادہ ممتاز شعراء وہ تھے میر حسین علیخاں ایما (سنہ ۱۲۳۰ھ)، میر بہاء الدین حسین خاں عروج (سنہ ۱۲۳۰ھ)، میر عباس علیخاں احسان (سنہ ۱۲۳۰ھ)، میر عباس علیخاں کاتی (سنہ ۱۲۳۷ھ) اور میر سجاد علیخاں سجاد (سنہ ۱۲۴۰ھ) وغیرہ اس دور کے

اوائل کے مشہور شعراء ہیں بعد کے شاعروں میں حافظ غلام محمود محمود (۱۲۸۶ھ) مرزا قربان علی بیگ سالک (۱۲۹۱ھ) اور محمد روشن علی روشن (۱۳۰۰ھ) کے علاوہ افتخار علیشاہ وطن، محمد محسن محسن، سیتل پرشاد حزم، بچولال تمکین، میر احمد علی قاضی اور دیگر تلامذہ فیض شامل ہیں حیدر علی حیدر، فیاض الدین مرد اور عبداللہ حسینی افسر ان ہی کے معاصر ہیں۔

اس زمانہ میں حیدرآباد میں متعدد ایسے شعراء موجود تھے جو یہاں کی قدردانی سخن سے مستفید ہونے کے لئے دور دراز مقامات سے آئے تھے اور جن میں سے بعض تو یہیں رہ پڑے اور حیدرآباد ہی کو اپنا وطن بنالیا۔ جو شعراء اس دور میں وارد حیدرآباد ہوئے ان میں حسب ذیل مشہور ہیں۔ شیخ حفیظ (۱۲۴۷ھ) مرزا علی رضا ہوتن (۱۲۵۲ھ) عیسیٰ خاں آفاق (۱۲۵۳ھ) شاہ نصیر (۱۲۵۴ھ) شیخ وزیر علی مسرت (۱۲۵۷ھ) حیدر بیگ خاکی (۱۲۵۷ھ) ذوالفقار علی صفا (۱۲۶۰ھ) حبیب اللہ ذکا (۱۲۹۱ھ) میر احمد علیخاں شہید (۱۲۹۲ھ) میر سرفراز علی وصفی (۱۲۹۳ھ) سید غلام حسین قدر (۱۳۰۱ھ) میر کاظم علیخاں شعلہ (۱۳۰۸ھ) وغیرہ

یہ پچہتر سال اردو شاعری کے عہد زریں سمجھے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں دکن کے علاوہ شمالی ہند میں بھی متعدد اعلیٰ پایہ کے شاعر موجود تھے مثلاً انشاء (۱۲۳۳ھ) مصحفی (۱۲۴۰ھ) نظیر (۱۲۴۶ھ) رنگین (۱۲۵۱ھ) ناسخ (۱۲۵۴ھ) ممنون (۱۲۶۰ھ) نسیم لکھنوی (۱۲۶۰ھ) آتش (۱۲۶۳ھ) مومن (۱۲۶۸ھ) وزیر (۱۲۷۰ھ) ذوق (۱۲۷۱ھ) نسیم دہلوی (۱۲۸۱ھ) اشک (۱۲۸۴ھ) آزردہ (۱۲۸۵ھ) غالب (۱۲۸۵ھ) شیفتہ (۱۲۸۶ھ) انیس (۱۲۹۱ھ) دبیر (۱۲۹۲ھ) اسیر (۱۲۹۷ھ) نیر (۱۲۹۸ھ) اور سحر (۱۳۰۰ھ)۔
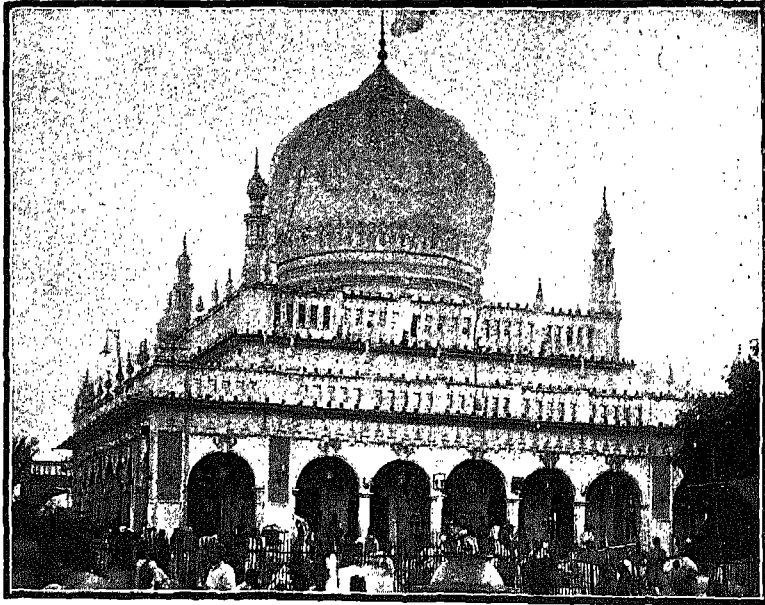
درگاہ حضرت شاہ خاموش صاحب قبلہ قدس سرہ العزیز

خاموش

حضرت خواجہ سیّد شاہ معین الدین حسینی قدس سرہٗ

۱۳۰۴ھ تا ۱۳۸۸ھ

از سیّد قطب الدین حسینی صاحب صابری

حضرت شاہ خاموش قدس سرہٗ ۱۳۰۴ھ میں بمقام محمد آباد بیدر پیدا ہوئے اُن کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ دکن بندہ نواز گیسو دراز حسینی سے ملتا ہے۔

شاہ خاموش صاحب تقریباً ۱۲ سال کے تھے اور بیدر میں اپنے محلہ کے بچوں کیساتھ کھیلا کرتے تھے کہ بیدر کے ایک مشہور مجذوب حضرت بندہ علی شاہ صاحبؒ نے ایک وقت ان کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ "تم شیر ہو گیدڑوں کیساتھ کیوں کھیل رہے ہو؟" اور کوئی چیز شیرینی کھلادی اس واقعہ کے بعد سے ان کے کیفیات میں تغیر شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ ذکر و اشغال کا شوق اور سلسلہ قایم ہوگیا۔

حضرت کے اجداد امجادیوں تو سلسلۂ عالیہ نظامیہ کے شیوخ طریقت اور فیض یافتہ گذرے ہیں مگر انہوں نے اوائل عمر ہی میں اپنے خاندانی سلسلہ سے فیض پاکر پیدل سفر کرتے ہوئے دربار حضرت سلطان الہند خواجہ اعظمؒ (اجمیر شریف) میں پہنچ کر چلہ کشی شروع کی اور عرصہ تک بارگاہ عالیہ میں حاضری دی وہاں سے پیر مرشد کامل کی تلاش میں دور دور علاقہ جات پنجاب میں مصروف سیاحت رہے۔ بالآخر مَنْ جَدَّ وَجَدَ ایک ولی کامل صاحب دل منبع شریعت حضرت حافظ محمد موسیٰ صوفی رحمۃ اللہ علیہ سے (مانک پور پنجاب میں) شرف بیعت حاصل کیا اور بتدریج سلسلۂ قادریہ چشتیہ صابریہ میں خلافت سے ممتاز ہوئے۔ عرصہ تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر رہے مریدین کے ہمراہ مدینہ طیبہ کا سفر کیا مکہ معظمہ میں جبل ثور پر چلہ کشی کے عجیب و غریب محیر العقول احوال کے بعد دو سال تک مدینہ طیبہ میں سکونت پذیر رہے۔

حضرت کا اسم گرامی سید شاہ خواجہ محمد معین الدین حسینی تھا اور شاہ خاموش لقب چونکہ وہ مدینہ طیبہ و مکہ معظمہ میں عبادات و ریاضت کیلئے خاموش رہا کرتے تھے اسلیئے ابتک اسی لقب سے مشہور ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب وہ حیدرآباد تشریف لائے اور خانقاہ عقب مکہ مسجد میں قیام فرمایا تو ایک امیر گھرانے کی خاتون نے درخواست کی کہ "میرے شوہر مجھ سے ایک عرصہ سے بے پرواہیں" انہوں نے ایک آیت قرآن تحریر فرمائی اور یہ تعویذ اس خاتون کو عنایت فرمایا اس تعویذ کے باندھتے ہی وہ خاتون اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئیں۔ اس واقعہ کا علم ہوتے ہی ہزارہا آدمی معتقد ہوگئے بارگاہ خاموش میں حاضری دینے لگے اور طرح طرح کے سوالات سے حضرت کو دق کرنے لگے۔ اس وجہ سے بھی حضرت نے خاموشی اختیار فرمائی اور رجوع الی اللہ ہو کر ریاضت میں مشغول ہوگئے۔

حضرت شاہ خاموش رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۵۰ھ میں سرزمین عرب سے حیدرآباد کی طرف بہ عہد نواب ناصر الدولہ واپس تشریف لائے تھے اور مستعدپورہ کی مسجد میں قیام فرمایا تھا پھر چند روز کے بعد جب نواب افضل الدولہ تخت نشین ہوئے تو انہوں نے حضرت کو اپنے محل کے قریب عقب مکہ مسجد (خانقاہ موجودہ) میں منتقل فرمالیا اور تین مواضع بطور جاگیر دیئے مگر حضرت نے انکے لینے سے انکار فرمایا بعد میں لنگر خانہ قائم کرکے فقراء و مریدین اور تمام ہمراہیوں کیلئے خورد و نوش کا انتظام فرمایا۔ نواب عمدۃ الملک بہادر نواب رشید الدینخاں اور اکثر امراء نیز ہزاروں آدمی حضرت کے معتقد تھے ہندوستان کے اکثر و بیشتر مقامات پر مریدین کی جماعتیں پھیل گئیں تھیں لاہور، مرادآباد، چاندپور، رام پور، جاؤرہ، اور سارے ممالک محروسہ سرکار عالی میں حضرت کے خلفاء اور مریدین تعلیم و تبلیغ میں مصروف تھے حضرت کو تعمیر مساجد کا بہت ہی شوق رہا چنانچہ اسوقت بھی انکی تعمیر کرائی ہوئی چھ مسجدیں موجود ہیں۔

۱ مسجد درگاہ شریف محلہ نامپلی ۲ مسجد زیر دامن پہاڑی بابا شرف الدین صاحب قدس سرہٗ ۳ مسجد بمقام مرادآباد ۴ مسجد امروہا ۵ مسجد مانک پور اور ۶ مسجد محمد آباد بیدر۔

حضرت طریقہ چشتیہ و صابریہ میں بیعت لیا کرتے تھے اور اکثر عبادت و ریاضت اور اعتکاف میں مصروف رہتے تھے۔ سماع سے بھی دلچسپی تھی غرباء پر بیحد شفقت فرماتے تھے شہر میں جو بھی مسافر یا غریب الوطن آجاتا حضرت ہی کی خانقاہ میں فروکش ہوتا تھا۔ اور خانقاہ سے خورد و نوش کا انتظام ہوتا تھا۔ یہ دراصل حضرت کے کرامات، تصرفات، فیوض و برکات اور روحانیت کے اثرات تھے جن کی وجہ سے ایک عالم گرویدہ تھا ہزاروں اشخاص فیضیاب ہوئے۔ علماء فضلاء و مشائخین بھی عقیدت رکھتے تھے۔

نواب ناصر الدولہ بہادر آصف جاہ رابع
مہاراجہ چندو لال شادان
راجہ بالا پرشاد

حضرت شاہ خاموش کے ہمعصروں میں حضرت شاہ سعد اللہ صاحب حضرت محمد حسن صاحب حضرت سردار بیگ صاحب حضرت شجاع الدین صاحب حضرت شمس الدین صاحب فیض حضرت حافظ محمد علی صاحب خیرآبادی اور مولانا نیاز بریلوی قابل ذکر ہیں۔

حضرت شاہ خاموش کے حالات زندگی اور کشف و کرامات مختلف کتب سیر اور تذکروں میں موجود ہیں۔ یہاں ان کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ البتہ صرف اسقدر لکھدینا کافی ہے کہ آپ دکن کی ان عظیم الشان ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے اس ملک کو اپنے روحانی فیضان سے سیراب کیا اور ساتھ ہی شعر و سخن کے ذریعہ سے اردو کی بھی حفاظت کی۔

حضرت شاہ خاموش صاحب قبلہ کو ۴ ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ ۸۴ سال کی عمر میں (خانقاہ عقب مکہ مسجد حیدرآباد) میں سحاب رحمت نے چھپا لیا۔ محلہ نام پلی میں قریب درگاہ حضرت یوسف صاحب شریف صاحب تدفین عمل میں آئی۔ حضرت کی مزار مبارک پر امیر اکبر نواب سر آسمانجاہ مرحوم نے (جو حضرت سے خاص اعتقاد رکھتے تھے) گنبد کی تعمیر فرمائی جو نہایت خوشنما اور مرجع خلایق ہے۔ حضرت کے بعد جسقدر کلام دستیاب ہوسکا لوگوں نے جمع کیا اور دیوان کی شکل میں طبع کرایا جو متعدد دفع طبع ہوچکا مگر پھر بھی اسکی مانگ ہے کلام زیادہ تر خزانۂ معرفت اور گنجینۂ حقائق و تصوف سے معمور ہے۔

حضرت شاہ خاموش کو شاعروں کے زمرہ میں شریک کرکے انکے کلام پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ وہ اہل قال سے نہیں تھے اور اہل حال تکلفات زبان و تصنعات شعر کی پروا نہیں کرتے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے آمد ہی آمد ہے۔ آورد اور زیب و زینت کو مطلق دخل نہیں۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کی خاطر شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ اظہار عشق حقیقی کی خاطر۔ اور یہ اظہار بھی مصنوعی نہیں بلکہ بے ساختہ ہے۔ یہی وجہہ ہے کہ انکے کلام میں خاص حلاوت اور اثر ہے اور وہ سماع کی محفلوں میں اہل دل اصحاب کو تڑپا دیا کرتا ہے۔

لقائے خدا ہے لقائے محمد　　ثنائے خدا ہے ثنائے محمد
نہ ہوتے محمد خدائی نہ ہوتی　　بنی سب خدائی برائے محمد
قیامت کا خاموش کیا خوف اسکو　　جو دل سے ہے جاں فدائے محمد
جانا کیطرف جائیں تو جاتا نہیں ہوتا　　گھر اپنے بلائیں تو بلانا نہیں ہوتا
مضمون دلی اپنا سوا یار کے اپنے　　غیروں کو سنائیں تو سنانا نہیں ہوتا

یاد اسکی نہ دل میں ہے اور جان جگر میں　　دل سے جو بھلائیں تو بھلانا نہیں ہوتا
ہم گرچہ نہیں لائق دربار تمہارے　　مشہور تو ہیں بندۂ سرکار تمہارے
مقتل میں جو آؤ تو نہ لو ہاتھ میں شمشیر　　بس کرتے ہیں دو ابرو خمدار تمہارے
خاموش نہیں قابل محفل ہو کسی طور　　رہنے دو اسے بس پس دیوار تمہارے
الفت کا ہرا غم ہو وہ غم اور ہی کچھ ہے　　آزار محبت کا الم اور ہی کچھ ہے

مزاج

حکیم محمد مظفر الدین خاں

۱۲۳۱ھ تا ۱۳۰۸ھ

از محمد اکبر الدین صاحب صدیقی

حافظ شمس الدین فیض نے حیدر آباد کی شاعری میں نئی روح پھونک دی تھی اور وہ تنہا اپنے دور میں استادی کا مرتبہ رکھتے ہیں لیکن ان کے انتقال کے بعد انکے شاگردوں میں پرگو شعرا الحاج حکیم محمد مظفر الدین خاں مزاج، میر احمد علی عصر، مشرف جنگ فیاض اور حفیظ الدین پاس ہیں۔ مزاج ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور عربی و فارسی کی تعلیم کے بعد علم طب پر خاص توجہ کی۔ ان کا شمار اس وقت کے اعلیٰ طبیبوں میں ہوتا ہے۔ پائیگاہ نواب خورشید جاہ بہادر سے مزاج کو منصب ملتا تھا اور وہ وہاں کے خاندانی طبیب بھی تھے۔ انکے ہاتھ میں شفا بھی تھی اسکو حسن اعتقاد کہیں یا انکا اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھنے کا ایک ثبوت۔ وہ حکمت میں جیسے مشہور تھے انکی شاعری نے بھی انہیں چمکا دیا تھا۔ مزاج کو حضرت فیض کی شاگردی پر فخر تھا اسکا اشارہ انکے کلام میں بھی ملتا ہے مثلاً ایک شعر میں فیض کی شاگردی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

آتی ہے بوئے فیض سخن سے ترے مزاج   شاید جناب فیض سے تو مستفید ہے

حضرت فیض کے انتقال پر انہوں نے تاریخ لکھی۔

شد سال وفات او بوحدت   باللہ وجود مظہر کل

۱۲۸۳

اور انکے انتقال کے بعد ایک غزل میں اس دور کو یاد کرتے ہیں جبکہ استاد اپنے شاگردوں کو شاعری کی نزاکتوں اور لطافتوں سے بہرہ ور کیا کرتے تھے

وہ عہد حضرت فیض اور فیضیاب ان کے   مزاج یاد ہے تھی اک بہار کی صورت

یہ یاس و قاضی و فیاض و عصر سلمہم   ہیں اس زمانے کی اب یادگار کی صورت

مزاج دیکھنے والا جناب فیض کا ہوں   یہ بس ہے میرے لئے افتخار کی صورت

جو شخص حضرت فیض کو دیکھ لینا اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہو تو ایک شاگرد جس نے تیس سال سے زیادہ اپنا کلام فیض کو بتایا ہو اس کے فخر کی کیا انتہا ہوگی۔

مزاج کے چار ضخیم قلمی دیوان تھے جن کا شیرازہ بکھر گیا اور چار دیوان کی باقیات الصالحات جو آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے نواب عزیز یار جنگ بہادر کے پاس محفوظ ہے انکا ایک مطبوعہ دیوان بھی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انتخاب ہے یا کوئی ایک دیوان مطبوعہ دیوان میں اکثر و بیشتر غزلیں دیوان اول کی معلوم ہوتی ہیں ممکن ہے کہ یہ پہلا دیوان ہو۔ اسکے بھی تین سو صفحات ہیں۔ تاریخ طباعت وغیرہ درج نہیں ہے۔ یہ اگرچہ مطبوعہ ہے لیکن غالباً شایع نہیں ہوا اور بہت کمیاب ہے۔

مزاج کے کلام میں سب سے پہلی بات جو مطالعہ کرنیوالے کو متاثر کرتی ہے وہ سلاست اور سادگی ہے انکی زبان سے اشعار ایسے بے ساختہ نکل جاتے ہیں کہ گفتگو اور مکالمہ کے جملے معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ خصوصیت کسی شاعر کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک وہ شاعری کے اسالیب پر قادر نہ ہو گیا ہو اور سر تا پا خود شعر نہ بن جائے۔ اس کی چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

جان گئی عشق میں کچھ غم نہیں　حق محبت تو ادا ہو گیا　خاک نشینی نے کیا سرفراز　نقش قدم راہنما ہو گیا

موت سر پر ہے گور میں ہیں پاؤں　لے کے پھر تخت و تاج کیا کیجیے　لو خوشی سے میں جان دیتا ہوں　تم نہ رنجیدہ ہو خدا کے لئے

بے نصیبوں کی آہ ہے وہ درخت　اور کبھی پھولتا نہ پھلتا ہے　کہا سب نے عنقا پھنسا دام میں　جو گیسو ترے تا کمر آ گئے

معشوق کی کمر کو عنقا کہنا اور پھر اس کو دام میں پھانسنا مزاج ہی کا کام تھا۔

عیاں سبزہ گرد رخ یار ہے　پئے طوف کعبہ خضر آ گئے

سبزہ خط کو خضر سے اور رخ کو کعبہ سے تشبیہ دیکر حج کرانا بھی مزاج ہی کیلئے ودیعت ہوا تھا کلام کا بیشتر حصہ سادگی اور روزمرہ سے بھرا ہوا ہے۔

مزاج ۸۶ یا ۸۷ سال زندہ رہے وہ اپنی زندگی سے بیزار ہوگئے تھے اسکا سبب کچھ معلوم نہیں ہوتا لیکن آخری ایک سال انکے لئے جیسا کٹھن رہا اسکی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ انکے اکلوتے فرزند حکیم منور الدین خاں علاج نے انہیں عین شباب کے عالم میں داغ مفارقت دے دیا۔

ابتدا ہی سے انکے کلام میں درد ہے اور مزاج ایک حد تک قنوطی ہیں۔ خواجہ میر درد کا کلیات زیادہ مطالعہ میں رہتا تھا

اور غالباً یہی سبب انکے قنوطی ہونے کا بھی ہے وہ دردؔ کے متعلق اپنا خیال ایک شعر میں یوں ظاہر کرتے ہیں۔

یوں تو ہر شاعر ہے فرد اپنی طرح میں اے مزاج　　　ہے دوا ہر درد کی دیوان خواجہ میر ایک

مزاج کے بعض اشعار میں تصوف کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے اور یہ بھی اسی مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

ہیں عبدیت کے بھید ہیں کہتے ہیں سب خدا　　بندہ ہے کون کون خدا ہے خبر نہیں
افسوس ہے کہ بے خبروں کو خبر نہیں　　وہ کونسی جگہ ہے کہ تو جلوہ گر نہیں

ہے جستجو خدا کی تو اے شیخ و برہمن　　دیر و حرم کو جاتے ہو کیوں وہ کہاں نہیں
آپ کو کھویا نہ جب تک یار کو پایا نہیں　　عشق میں ہمکو خیال اپنا کبھی آیا نہیں

ہوں بے خودی میں خدا دیکھتا نہیں　　راہ فنا میں راہ نما دیکھتا ہوں میں
کب دو عالم کو تیرے سوا دیکھتا ہوں میں　　گلزار ما سوا میں ہزاروں ہیں گل عذار

دیکھوں میں رخ یار نور رکھو نہ مجھ پہ حرف　　اے واعظو کتاب خدا دیکھتا ہوں میں
وہ بھی بے پردہ ہوا رہ نہ سکا پردہ نشیں　　لاکھوں بے پردہ ہوں جسکے لئے پردہ نشیں

ہے یہی معنے العلم حجاب الاکبر　　چشم زاہد سے رہا نور خدا پردہ میں
بیگانہ خلق سے ہوں تو تیرا آشنا ہوں میں　　عنقا کی طرح گوشہ نشیں ہو چھپا ہوں میں

کیا چاہوں کس سے چاہوں میں تیرے سوا ہے کون　　میرے کریم تجھ سے تجھے چاہتا ہوں میں

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفسیر اس سے بہتر ملنی مشکل ہے۔

مزاج اسکے قائل نہ تھے کہ زبان کسی ملک کی ملک ہو سکتی ہے انکا خیال تھا کہ زبان جگہ کی پابند نہیں بلکہ بولنے والوں پر منحصر ہے دہلی اور لکھنؤ ہی کیلئے مخصوص نہیں بلکہ اسکا ہر ایک بولنے والا اہلیت رکھنے کے بعد دعویدار ہو سکتا ہے۔ انکا شعر ہے

جو طرز فصاحت ہے مزاج اور ہی شے ہے　　پھر مملکت ہند ہو یا ملک دکن ہو

پہلے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ مزاج قنوطی تھے ان پر یاس و حرمان کے بادل چھائے ہوئے تھے انکے اشعار میں کسک اور درد ہے انکے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اب زندگی کیلئے تیار نہیں اور موت کی ہر آواز پر لبیک کہتا ہے۔ انکی چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں۔

اس بحر کم ثبات میں ہوں مثل حباب　　ساحل کی آرزو نہ سفینہ کی آرزو
اللہ جانے کتنے ہیں اب مرحلے رہے　　سفر تو عمر کے ہو چکے طے مرحلے مزاج

مزاج کو بزرگان دین سے بیحد عقیدت و ارادت تھی ایک سبب تو یہ بھی ہے کہ انکے استاد حضرت حافظ شمس الدین فیض رشد و ہدایت کے سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے دوسرا عام طور پر قدامت پسند انتہا سے زیادہ عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ مزاج اعراس وغیرہ میں نمایاں حصہ لیتے تھے اور یازدہم دوازدہم شریف کے موقعوں پر دو دو تین تین دن تک میلاد ہوتا اور غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ حیدر جنگ اور نیکی کے

تقریباً ۸۷ سال کی عمر میں بتاریخ ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۱۸ھ انتقال ہوا انکے فرزند حکیم منورالدین خاں علاج نے ان سے ایک سال پہلے ہی ایک لڑکی یادگار چھوڑ کر والد کو داغ مفارقت دیا تھا۔ اسی لئے غالباً انھوں نے یہ شعر لکھا ہے۔

پڑھ کے اشعار مرے یاد کرے گی دنیا　　　بس رہیگا یہ مرا نام و نشاں میرے بعد

ہم نے یہاں سرسری طور پر انکے کلام کا کچھ انتخاب پیش کیا ہے تاکہ ایک گمنام شاعر کی عظمت کا اندازہ ہوسکے۔

[1]

پیدا بتوں کے عشق سے عشق خدا ہوا　　　آئینۂ مجاز حقیقت نما ہوا
مقصود نشکل عجز میں صورت نما ہوا　　　دستِ دعا ہی آئینۂ مدعا ہوا
ایمان سے ہاتھ اٹھا کے بتوں پر فدا ہوا　　　کم بخت میرے دل کو خدا جانے کیا ہوا
وحدت میں ہو نہ کثرتِ وہمی سے کچھ ضرر　　　دو ہوں کہ سو ہوں ایک ہے سب میں گنا ہوا
شوریدگانِ عشق ہیں آزاد ما سوا؟　　　سب سے بری ہوا جو ترا مبتلا ہوا
واعظ جو بات سچ ہو تو بہ دم مرگ ہوگا سند　　　رحمت کا در ہی تا بہ قیامت کھلا ہوا
کیا خاک منہ دکھائیں خدا کو ہم اے مزاج　　　ہم سے نہ کوئی کام یہاں کام کا ہوا

[2]

قہر اور مہر سے جس شان میں جاناں آیا　　　کہیں جلاد کہیں بن کے مسیحا آیا
گل کو ہنستے ہوئے دیکھا تو خزاں یاد آئی　　　گریۂ شبنم کا مجھے دیکھ کے رونا آیا
مر گئے حسرتِ دیدار میں لاکھوں بیمار　　　نہ تجھے ترس خدا آئے نہ ترسا آیا
یاد اس وعدہ فراموش نے خلوت میں کیا　　　دل میں جب کہئیے مزاج آپکے کیا کیا آیا

آنے سے تیرے باغ میں ہیں باغ باغ گل　　　بلبل کی چشم میں نظر آتے ہیں داغ گل
شاہد مرے جنوں کے ترے حسن کے گواہ　　　ہیں خار دشت تو ہیں باغ باغ گل
پوچھو نہ بیکسوں کی لحد کا مزاج حال　　　روشن اگر ہزار کریں ہو چراغ گل

ہے منقش لوح دل پر صورت جاناں تمام　　　ایک چھوٹے صفحہ پر چھاپا گیا قرآں تمام
اشک باری کو بھی اے شبنم سلیقہ چاہئے　　　تیرے گریہ پر تو گل ہیں باغ میں خنداں تمام
بے کسی، غربت، جنوں، مرنا، یہ سب مشکل تھے کام　　　حضرت عشق آپ نے اب کر دئے آساں تمام
اے صبا کہہ دے کہ شبنم رو رہی ہے کس لئے　　　گل ہیں کس کو دیکھ کر گلزار میں خنداں تمام
جستجو میں اک گل مقصود کی اللہ رے شوق　　　روند ڈالے نجد کے مجنوں نے خارستاں تمام
جزو جزو صورت جاناں نظر میں ہے مزاج　　　یاد ہے الحمد سے والناس تک قرآں تمام

ہے کیا ہی سخت معرکۂ عشق الحذر　　　بسمل کہیں پڑا ہے کوئی نیم جاں کہیں
پست و بلند دہر سے کیا عاشقوں کو خوف　　　ہم ہیں کہیں زمیں کہیں آسماں کہیں
صیاد تفرقہ ہو تجھے بھی یہی نصیب　　　بلبل کہیں ہے باغ کہیں آشیاں کہیں
انساں کی مدح ہے کہیں خدا کا ذکر ہے　　　ہے خامہ زرفشاں کہیں گوہر فشاں کہیں

۱

برنگِ سبزہ چمن میں ہے کام کیا اپنا　　نہ گل ہے دوست نہ غنچہ ہے آشنا اپنا

کیا یہ فرض کہ ہیں زیبِ بزمِ دہر مگر　　برنگِ شمع سحر اعتبار کیا اپنا

یہ دشت میں ہے کفِ پائے خونچکاں کا فیض　　کہ رشکِ لعل ہے ہر سنگ زیرِ پا اپنا

کریں ستم نہ زبردست زیردستوں پر　　کہ پیش آئیگا اک دن کیا ہوا اپنا

اب اس خرابہ میں رکھا ہے آدمیت نے　　کبھی بہشت مقدس مکان تھا اپنا

۲

جھکا دو سر کو کھا دو جوہرِ تسلیم خم ہو کر　　نہ رہ جائے مگر شمشیرِ قاتل علم ہو کر

کرشمہ، ناز، ادا، انداز، غمزہ، عشوہ، طنازی　　کریں گے فتح ہفت اقلیم یہ ساتوں بہم ہو کر

دوبارہ نوح کے طوفان کا عالم نظر آتا　　مگر یہ چشمِ گریاں رہ گئی افسوس نم ہو کر

بنایا کفر نے اسلام میں توحید کا رستہ　　خدا کو ہم نے پایا پاس ہی محوِ صنم ہو کر

الٰہی زندگی ہے ہجر میں پابست کا ساماں　　کہ ہے آمد شدِ انفاس کی با تیغِ دودم ہو کر

لطافت ہے کہ ہے صحرائے بت کشمیر چٹکی میں　　لیا چٹکی میں گل، گل کی کھنچی تصویر چٹکی میں

شبیہہ شانِ قاتل شوق افزائے شہادت ہے　　وہاں زخم میں ناوک ہے گویا تیر چٹکی میں

کیا چینِ جبیں نے ابروئے خمدار پر قبضہ　　کہ لی ہے کاتبِ تقدیر نے شمشیر چٹکی میں

رکا جب نکتہ کا ہے ورنہ کب ہے عود کے قابل　　کلام راست ہونٹوں پر ہے گویا تیر چٹکی میں

تحیر میں ہوں بعد مرگ بھی اغماض سے انکے　　کہ نفرت سے وہ لیتے ہیں مری تصویر چٹکی میں

آرزو فقر میں یہ ہے دولتِ استغنا کی　　کبھی مانگیں نہ دعا ہم جو دعا کرتے ہیں

چاہا جو ہم نے یار کو پھر کیا برا ہوا　　ہے کون وہ جو اپنا بھلا چاہتا نہیں

لب پر ہجوم آہ ہے آنسو رواں نہیں　　آیا ہے ابر جھوم کے بارش عیاں نہیں

ایسا کہیں ہے یار کہ جس کا مکاں نہیں　　لیکن مکان کونسا ہے وہ جہاں نہیں

پست و بلند دہر سے ممکن نہیں نجات　　کس جا نہیں زمیں کہاں آسماں نہیں

کس کے پرزے اڑائے گی وحشت　　جیب و دامن میں ایک تار نہیں

کام کر لو مزاج کرنے کے　　زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

فضلِ خدا بتوں کی محبت کو جانیے　　بت چاہتے نہیں تو خدا چاہتا نہیں

اس کے سوائے اور کسی کو جہاں نہیں　　کسطرح چاہوں دل ہی مرا چاہتا نہیں

صبر و قرار و ہوش تو سب تھے کنارہ کش　　اے مرگ تو بھی کام نہ آئی فراق میں

بے کسوں کی شان سے پیدا ہے عالم نور کا — دیکھئے گورِ غریباں پر ہے چادر چاندنی
عاشق اس پردہ نشیں کا چاند ہے چوری سے پھر — کیوں نہ در آئے درونِ روزنِ در چاندنی
خاکساروں کو ہے راحت گرم و سرد دہر سے — دھوپ ہے دن کو بچھونا شب کو بستر چاندنی
نور ہے فرقت میں چونے کی سفیدی ہے مجھے — گھر میں خوش آئیگی مجھ کو خاک تیھر چاندنی
آئینہ خانہ میں اوس کے عکس رخ سے ہے مزاج — چاند آئینوں کے اندر اور باہر چاندنی

⁂

ہوئی تسکینِ جاں ہوتے ہی آنکھوں سے رواں پانی — مگر جو آگ تھی دل میں ہوئی وہ ناگہاں پانی
حضورِ چشم گریاں آبرو کیا ابر و باراں کی — لہر پانی سات دریاؤں کا بھرتا ہی یہاں پانی
جو دریا دل ہیں وہ مصروف ہیں عاجز نوازی میں — زمیں پست ہی کی سمت ہوتا ہے رواں پانی
وہاں لب پر تبسم تھا یہاں آنسو ہوئے جاری — تماشا ہے گری بجلی کہاں برسا کہاں پانی
مبارک خضر کو آبِ بقا زاہد کو زمزم ہو — الٰہی ہم کو تیغ ناز کا ہو نوشِ جاں پانی
مزاج اب یار کے گھر جاؤ تم گر چاہ رکھتے ہو — مثل مشہور ہے جاتا ہے پیاسا ہو جہاں پانی

⁂

اس نمونے کے پیش کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً مزاج کے قول کے مطابق کہ ؎

پڑھ کے اشعار مرے یاد کرے گی دنیا — بس رہیگا یہ مرا نام و نشاں میرے بعد

دنیا انھیں یاد کرے گی اور اردو دنیا میں ان کا نام بھی زندہ رہیگا۔

صاف

میر حیات الدین مرحوم

(وفات ۱۲۸۹ھ)

محمد عمر صاحب مہاجر

میر حیات الدین صاف دکن کے مشہور شاعر حضرت حافظ شمس الدین محمد فیض کے فرزند تھے۔ ستر ھویں صدی ہجری کے ربع سوم اور ربع آخر میں فیض کی ذات دکن کی تمام ادبی تحریکات اور شعری سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ نواب مشرف جنگ فیاض، میر احمد علی عصر، مظفر الدین مزاج اور حفیظ الدین پاس وغیرہ نے فیض ہی کے دامان علم و ادب میں پرورش پائی تھی اور دکن کے ممتاز شاعروں میں شمار کئے جا رہے تھے۔

صاف نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ انکو شعر و سخن کی طرف مائل کرنے میں بے حد موزوں ثابت ہوا اور بہت جلد انہوں نے اپنے فطری ذوق کی بناء پر اپنے ہم جلیسوں کے طبقے میں ایک نمایاں اور ممتاز جگہ حاصل کرلی لیکن موت نے انہیں اسکی مہلت نہ دی کہ وہ شعر و سخن کی محفلوں کو اپنی گرمی سخن سے چمکاتے اور اس طرح دنیائے شاعری میں ناموری حاصل کرتے۔ چنانچہ ۱۲۸۹ھ میں فیض کی وفات کے چھ سال بعد عین جوانی کے عالم میں صاف نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور شعر و سخن کی محفلوں کو ہمیشہ کے لئے سوگوار کر گئے۔

صاف نے جس وقت یہ شعر کہا ہوگا ؎

اے صاف سمجھ صحبت احباب غنیمت ۔۔۔ سنتے ہیں جدائی کی گھڑی سر پہ کھڑی ہے

تو انکے احباب کے دلوں میں شاید ہی یہ خیال گذرا ہو کہ انہیں واقعی بہت جلد اس نوجوان شاعر کی جدائی میں ماتم گسار ہونا پڑیگا۔

صاف نے اپنے والد ماجد حضرت فیض ہی کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی تھی اور ان ہی کے فیض صحبت سے انکا ذوق شاعری سنورتا رہا۔ انکو اپنے والد سے بے انتہا عقیدت تھی جسکی بناء پر انہوں نے کئی غزلیں فیض کی مدح میں کہی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ فیض نے بھی ان پر اپنی خاص توجہات مبذول کی تھیں غالباً اسی وجہ سے صاف نے تفاخراً کہا ہے کہ :-

سن کے حاسد کہیا نہ کٹ جائینگے صاف
شعر مرا ذوالفقار فیض ہے

صاف کا ایک مختصر دیوان ۱۳۱۹ھ میں نواب محمد کریم الدین خاں خلف نواب مشرف جنگ فیاض نے طبع کرایا تھا۔ اس دیوان کے علاوہ صاف کا کلام کہیں دستیاب نہیں ہوتا اس دیوان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاف کے کلام میں دبستان فیض کی تمام خصوصیات جھلکتی ہیں اسی بناء پر جلیل مانک پوری نے قطعہ تاریخ طبع دیوان میں کہا ہے کہ ۔

صاف کے دیوان کا ہر لفظ جام فیض ہے

زبان کا لوچ اور بیان کی سادگی وہی ہے جو دبستان فیض کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھی یہی وجہ ہے کہ صاف کا کلام اکثر و بیشتر سہل ممتنع ہے اور کلام سہل ممتنع کہ خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی خوبیوں کی تشریح کرنی بہت دشوار ہوتی ہے ۔ ایسے اشعار خود بخود دل میں اترتے جاتے ہیں اور سننے والے کا دل جذبات و کیفیات سے معمور ہونے لگتا ہے صاف کے کلام سے اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں ۔

دکھ ہے الفت کے خریداروں کو دیکھ آیا کرو بیماروں کو
کہتے ہیں ہم مست پی پی کر شراب تا ابد آباد ساقی کی دکان

اے جنوں چھیڑ چھاڑ ٹھیک نہیں ان دنوں روٹھے ہیں خفا سے ہم
خاکساری میں کیا ملا ہے مزا پوچھیے اپنے پائمالوں سے

کیوں نہ مجبور لوگ جانیں ہمیں دل بے اختیار نے مارا
جب روتا ہوں لوگ پوچھتے ہیں ہے موسم برشگال کب تک

ہے جب سے خیال ابروؤں کا مانند ہلال جھکے جاتا ہوں
زلفوں کا کروں خیال کب تک لوں جان پہ میں وبال کب تک

زمانے کے عام رجحان کے مطابق صاف نے بعض غزلیں نہایت سنگلاخ زمینوں میں لکھی ہیں لیکن ان سے کلام کی شگفتگی اور روانی متاثر ہوتی نظر نہیں آتی ۔ بعض مقامات پر تو نہایت کامیابی کے ساتھ بلند پایہ خیالات نظم کئے ہیں جن سے انکی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔

گل بنا ہے ساغر مل باغ میں بیٹھیے بے تامل باغ میں
یہ چار دن کی ہوا ہے بہار خندہ گل نہیں ہے باد صبا اعتبار خندہ گل

یہی ہے گریہ شبنم کی وجہ اے بلبل نہیں چمن میں ثبات و قرار خندہ گل
امید میں بلبل نے دی قفس میں جان ہزار حیف نہ دیکھی بہار خندہ گل

چمن مقام ہے رونے کا اے نسیم سحر　　ہوا ہے اب کوئی دم میں بہار خندۂ گل
وہ اگر خورشید رُو الٹے لب دریا نقاب　　ہو ہر اک گرداب رشکِ ماہ تاباں آب میں

روتے دم جیب شمع رویوں کا تصور آگیا　　آگئے مجھ کو نظر سرو چراغاں آب میں
چل کبھی تو اے مرے رشکِ گلستاں باغ میں　　چہچہے کرتے ہیں بلبل گل ہیں خنداں باغ میں

شوخیاں دل کی دم کے ساتھ گئیں　　بگڑے سب رنگ ڈھنگ مرقد میں
سوزِ دل ہرگز نہیں کرتے بیاں مانند شمع　　رکھتے ہیں گو منہ میں رکھتے ہیں زباں مانند شمع

کردیا ہے حیرتی عالم کو روئے یار نے　　رات دن رہتا ہے دستِ مرد و زن میں آئینہ
ہر گلی کوچہ میں صدہا آئینہ رو پھرتے ہیں　　منہ ہے کیا آئے جو بازار دکن میں آئینہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ صاف کا کلام اردو شاعری کی روایتی غیر فطرتی مبالغہ آمیزی سے خالی نہیں ہے لیکن بعض اشعار میں سچے انسانی جذبات کی بہت اچھی مصوری بھی پائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عاشق ہر درماندگی اور جفاکاری کو برداشت کرسکتا ہے لیکن اسے اپنے محبوب کی فرقت کسی عالم میں بھی گوارا نہیں ہوتی۔ ذیل کے شعر میں اسی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ۔

چھوڑ کر جائیں کہاں صیّاد کو　　ہم قفس کو جانتے ہیں آشیاں

اس شعر کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ایک عرصہ تک قید میں رہنے سے اسیروں کو قفس سے کچھ انس سا پیدا ہوجاتا ہے قفس کے باہر کی دنیا سے ایک زمانے تک قطع تعلق ہوجانے کے بعد جب ان کو رہائی نصیب ہوتی ہے تو ان کو یہ ساری کائنات باوجود اپنی تمام وسعتوں کے بیگانہ نظر آنے لگتی ہے اور وہ دوبارہ قفس کے آغوش میں پناہ لینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ اس شعر کے لکھتے وقت ہمارا موجودہ نظام معاشرت اور اس کے سزا و جزا کے طریقے شاعر کے پیش نظر نہ ہونگے۔

انسان کی زندگی میں کبھی ایسے لمحات بھی درپیش ہوتے ہیں کہ جن میں زندگی کی ساری دلکشیاں بے حقیقت اور ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔ قنوطیت کا یہ جذبہ انتہائی مایوسی اور یاس کے عالم میں پیدا ہوتا ہے لیکن پیہم شکست کی وجہ سے دل میں دنیا کی تمام خواہشات اور تمناؤں سے بے نیازی سی پیدا ہوجاتی ہے ذیل کے اشعار میں اسی کیفیت کو بیان کیا ہے

نہ گل سے کام نہ بلبل سے کچھ غرض مجھ کو　　مری بلا سے اگر موسم بہار آیا
ہمصفیران چمن سے یہی کہتا ہوں میں　　گلستاں تم کو مبارک ہو بیاباں مجھ کو

وحشت اور دیوانگی صاف کی شاعری کے خاص موضوع ہیں۔ تقریباً ہر غزل میں اس قسم کے اشعار ملتے ہیں جن میں جنون کی کیفیتیں بیاں کی گئی ہیں۔ مضامین اگرچہ قریب قریب وہی ہیں جو قدیم اساتذہ باندھتے آئے ہیں لیکن اسلوب بیان نے

ہر شعر میں تازگی پیدا کردی ہے ذیل کے اشعار کی تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کرکے پابوسی ترے دیوانوں کی　　　سرخ رو خار بیاباں ہو گئے

ہے یہ خواری ترے دیوانوں کی صحرا میں پڑی　　　خاک سر پر خار پاؤں میں ہے پتھر ہاتھ میں

شاید اسیر زلف تمھارا نکل گیا　　　وحشت لئے جو پھرتی ہے زنجیر ہاتھ میں

چونکہ شاعر ہمیشہ مذہب و ملت کی بندشوں سے آزاد ہوتا ہے اس لئے صاؔف کا مسلک بھی صلح کل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب عشق میں کفر و ایماں کی کوئی تحقیق نہیں ہوتی۔ چونکہ شیخ و برہمن دونوں کے دلوں میں ایک ہی لگن ہوتی ہے اس لئے انکے تمام اختلافات محض اعتباری اور بے حقیقت ہیں۔ ذیل کے اشعار اسی احساس کے آئینہ دار ہیں۔

جی میں ہے دیر و حرم کو ڈھائیے　　　تا نہ جھگڑیں پھر یہ شیخ و برہمن

کفر و ایمان کے دو آبے میں نہ ڈوبے کوئی　　　مان لیں کہنا اگر گبر و مسلماں میرا

عشق کے بندے ہوئے مذہب سے کچھ مطلب نہیں　　　بندگی کہد و ہماری کافر و دیندار کو

اب صاؔف کے کلام سے ہر قسم کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اس سے ان کے کلام کا اصلی رنگ سخن معلوم کیا جا سکے

ہنسا ہے بڑھاپے میں داغ خودی　　　ہوئی صبح ٹھنڈا دیا ہو گیا
ایک دن آئے نہ تربت پر کبھی　　　جیتے جی کے تھے عزیزان وطن

مرا افسانہ سنکر طعن سے کہتے ہیں محفل میں　　　خیالی ہیں جو کچھ آتا ہے جی میں انکے گاتے ہیں
مخلوق خدا کی ہے پریشاں　　　یوں کھولے رہو گے بال کبتک

شرط ہے انصاف اے چرخ کہن　　　کیا ہمیں سہتے رہیں رنج و محن
وہ تو آئے مگر اغیار بھی دو چار ہیں ساتھ　　　خوب آباد ہوا خانۂ ویران میرا

ہوا ہے شرم سے پانی سحاب گوہر بار　　　پہن کے یار مرا موتیوں کا ہار آیا
وفور شوق سے افسوس ضبط ہو نہ سکا　　　زباں پکار اٹھی جب خیال یار آیا

خدا کے واسطے صیاد اب رہا کر دے　　　چمن میں ہنستے ہیں گل موسم بہار آیا
وہ عندلیب ہوں میں خار و گل نہیں معلوم　　　مرا چمن ہے خزان و بہار سے باہر

نہ کر سکے کبھی اُس بت سے عرض حال فراق　　　رہی زبان مری اختیار سے باہر
روتے روتے فرقت جاناں میں صاؔف　　　دونوں آنکھیں ہو گئیں گنگ و جمن

وہاں سے میں نہیں اٹھتا جہاں ہوں　　　سراپا نقش پائے رفتگاں ہوں
مری خلقت ہوئی ہے خار و گل سے　　　بہار باغ ہوں یا خزاں ہوں

صاؔف کے منتخب کلام کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ وہ اگر کچھ دن اور زندہ رہتے تو دنیائے شاعری کے سرمایہ میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوتا۔ افسوس ہے کہ قضا نے بہت جلد زبان اردو کو ایک ہونہار شاعر کے وجود سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دیا۔

سدا نند جوگی بہاری لال رمز

رمز

سدانند جوگی بہاری لال

۱۲۴۰ھ تا ۱۳۲۵ھ

از۔ ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زور

رمز کے آباء و اجداد کا وطن دہلی تھا۔ انکے والد منشی گنّو لال صغر سنی میں حیدرآباد آئے تھے اور یہاں حضرت فیض کی ہمدرسی کا شرف حاصل کیا۔ فراغ تعلیم کے بعد نواب مختار الدولہ (جد نواب شہاب جنگ معین المہام کوتوالی و صفائی وغیرہ) کے یہاں ملازم ہوئے جسکی نسبت رمز اپنے خود نوشتہ حالات میں لکھتے ہیں:۔

ملازمت یکصد و سی روپیہ ماہانہ مددگاری نواب مختار الدولہ مرحوم جد نواب شہاب جنگ بہادر۔۔۔۔۔۔ بخدمت انتظام کارخانۂ نواب منیر الملک مرحوم مدار المہام جد سالار جنگ۔۔۔۔۔۔۔

خود رمز بھی نواب شہاب جنگ ہی کے یہاں "بوجہ قدامت" منتظم کارخانہ تھے اور دو سو روپئیے ماہوار پاتے تھے۔ نہایت خوشحال اور امیرانہ زندگی تھی اور کبھی بغیر سواری کے باہر نہ نکلتے تھے۔ تقریباً چھیالیس سال کی عمر تھی کہ انکے عیال و اطفال یکایک انتقال کر گئے جسکا اتنا اثر ہوا کہ ملازمت ترک کر دی اور ملازمت کے ساتھ دنیا سے بھی قطع تعلق کر کے اپنے استاد و مرشد حضرت فیض کی خدمت میں رات دن رہنے لگے لیکن اس حالت خانہ نشینی میں بھی نواب شہاب جنگ بہمہ وجوہ ان کے خبر گیراں رہے۔

رمز حضرت فیض کے فیضانِ صحبت و تربیت کا ایک خاص نمونہ تھے۔ وہ اپنے استاد کی نسبت اپنے کلام میں جگہ جگہ نہایت عقیدت سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ بعض شعر یہ ہیں ؎

اسم اعظم نہ پڑھاتے جو مجھے حضرت فیض ۔۔۔ دیو سے دہر کے واللہ نہ سر بر ہوتا!!

رمز کے ہیں پیر و مرشد میر شمس الدین فیض ۔۔۔ فیضیاب اس فیض سے سارا زمانہ ہو گیا

طفیل فیض ہوا اب توجع دفتر دل ۔۔۔ بندہی تھی رمز بہت انتشار کی صورت

دامن نہ چھوٹے فیض کا کتنا چھڑائے کوئی ! — جب تک ہے رمز جسم میں تاب و توان روح

حالت ہی میری اور ہے اور ڈھنگ ہی ہے اور — کچھ علم شاعری کا مجھے حوصلہ نہیں !

پیرو ہوں رمز ایک کا اور ایک دھیان ہے — جز فیض فیض کوئی میرا پیشوا نہیں !

تبریز میں جو شمس تھا چمکا دکن میں بھی — ہر حال رہبر اپنا بجز شمس دیں نہیں !

یہ تو کلام کی شہادتیں ہیں۔ رمز نے اپنے حالات زندگی خود اپنے قلم سے مرتب کئے تھے جو اتفاق سے اسوقت ہمارے سامنے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ انکے والد منشی گنولال صغر سنی میں حیدرآباد آے تھے اور یہاں اتفاق سے ان کا قیام حضرت فیض ہی کے متصل مکان میں ہوا دونوں ایک ساتھ کھیلا اور پڑھا کرتے تھے وہ لکھتے ہیں :-

" والد راقم از مولانائے مرحوم ہم بازی وہم درس۔ نیز تا الا لآن مکان بالاتصال دریک محلہ موجود "

اسی لئے ایک غزل میں لکھا ہے ؎ ہے فیض کے قدموں کے تلے رمز کا تکیہ — جس جاکے رتبہ کا بیاں ہو نہیں سکتا !!!

قربت کی وجہ سے بہاری لال بچپن سے حضرت فیض کے یہاں آتے جاتے تھے۔ انکی یہ خوش بختی اکثر تلامذہ فیض کیلئے باعث رشک تھی کہ وہ بالکلیہ حضرت فیض ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں :-

" در شروع شباب از فیضان صحبت و تربیت حضرت مولانا مرشدنا مولوی حافظ میر شمس الدین فیض علیہ الرحمۃ چندے مذاق کلام بود۔ باز بہ تحصیل علوم طب و دیگر کاروبار مصروف شد۔ اکنون باز از دو سہ سال بہ اصرار بعض احبا چندے اشعار اردو و فارسی حسب کم حوصلگی خود موزوں میکنم و اصلاح سخن فقط از الہام و تصرف مولانائے ممدوح علیہ الرحمۃ "

غرض ترک ملازمت اور حالت تحریر کے بعد سے چالیس سال تک یعنی جب تک استاد زندہ تھے رمز کی حالت کچھ سنبھلی رہی۔ لیکن استاد کے انتقال کے ساتھ ہی انکی طبیعت میں پھر انتشار پیدا ہوگیا۔ اور انہوں نے بے چین ہوکر گوشہ نشینی کو خیرباد کہا اور مجذوبانہ حالت میں باہر نکل پڑے حضرت فیض کے انتقال پر انہوں نے لکھا تھا ؎

وہ فیض جس سے زبان و دہن سے نکل گیا ! — وہ لطف اور مذاق سخن سے نکل گیا !

دست خزاں سے ہوگئی گلشن کی ابتری !!! — ہر رنگ نغمہ سنج چمن سے نکل گیا !

رفتہ رفتہ حالت جذب میں اغراق ہوتا گیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ بعض اوقات بالکل برہنہ رہنے لگے دنوں غائب ہو جاتے اور پھر یکایک یا تو حضرت فیض کی مزار کے قریب نمودار ہوتے یا مہاراجہ بہادر یا مشرف جنگ فیاض کی ڈیوڑھی میں نکل آتے۔ ہر شخص ان کی خاطر تواضع کرنا چاہتا مگر یہ جملہ تکلفات سے مستغنی تھے کبھی ایک بغل میں شراب کا شیشہ اور دوسری میں کتے کا بچہ لئے ہوئے پہنچتے اور کبھی بالکل برہنہ۔ یہ حالت چند سال رہی اور پھر مدت العمر عالم سکوت طاری رہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت چھاسٹھ ۶۶ سال کی عمر سے قبل ہی ختم ہو گئی تھی کیونکہ اس عمر میں انہوں نے اپنے اور اپنے استاد کے حالات نہایت سنجیدگی کے ساتھ قلمبند کئے ہیں اور اسی زمانہ میں انہوں نے دوبارہ شاعری بھی شروع کی تھی۔

ان کے مجموعہ کلام کے مطالعہ سے تو یہ بھی علم ہوتا ہے کہ جذبہ کے عالم میں بھی وہ شعر کہتے رہتے تھے۔ اسی حالت میں وہ حضرت فیض کے عرس کے سالانہ ہر مشاعرے میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اُن کو اپنے مرشد اور استاد سے روحانی لگاؤ تھا وہ فنافی الاستاد تھے۔ جہاں کہیں اور جس عالم میں ہوتے عرس کے دن مشاعرۂ فیض میں ضرور پہنچ جاتے اور اگرچہ ان مشاعروں میں صاحبزادہ نواب آصف یار الملک اور مہاراجہ سر یمین السلطنتہ جیسی وقیع ہستیاں بھی شریک رہتیں مگر رمزان سب کا لحاظ کئے بغیر اپنی اصلی حالت میں مشاعرہ میں داخل ہو جاتے اور سیدھا حضرت فیض کے مزار کے پائنتی یعنے مشاعرہ کی صدر میں جا بیٹھتے اور کچھ نہ کچھ کلام جو زیادہ تر حضرت فیض کی مدح میں ہوتا ضرور سناتے۔ غالباً ۱۳۲۵ھ میں ۱۴ رجب کو عرس حضرت فیض کے دن مجلس مشاعرہ میں یکایک ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اس واقعہ کو ترک علی شاہ ترکی نے اپنے مطبوعہ تذکرہ شعراء فارسی موسوم "سخنوران چشم دیدہ" میں لکھا ہے جسکا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"در عین مشاعرہ فیض کہ فقیر ہم حاضر بودم بوقت غزل خواندن بریں شعر مرغ جانش از تن پرید
ہمہ شعرا و حاضرین حیران ماندند"

جس شعر کا ذکر کیا گیا ہے وہ طرحی مشاعرہ عرس فیض کی فارسی غزل کا مقطع یہ ہے:۔

چو دل شد مستقل کن ہر چہ خواہی!! کنوں گویم چہ رمزا ایں کن کہ آں کن!!

آخری مصرعہ پڑھ رہے تھے کہ یکایک ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ گر پڑے۔

صبح ہیں مسلمانوں اور ہندوؤں کے آپس ہیں تبادلۂ خیال شروع ہوا۔ کوئی کہتا کہ وہ مسلمان تھے اسلئے اہل اسلام کے طریقہ پر جنازہ اٹھایا جائے اور کوئی کہتا کہ ہندو تھے اسلئے لاش ہندو احباب کے سپرد کر دیجائے۔ نواب مشرف جنگ فیاض بانی مشاعرہ دعرس فیض نے مناسب یہی سمجھا کہ لاش کو مہاراجہ سرکین السلطنت کے سپرد کر دیا جائے۔ انہوں نے اپنی ڈیوڑھی کے قریب اس جگہ دفن کر دیا جہاں اسوقت تک متعدد مجذوب اور اہل اللہ دفن ہو چکے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ کلیات رمز کے مکمل اجزا اسوقت تک محفوظ ہیں اور ہمارے زیر نظر ہیں۔ یہ غالباً کسی دوسری کتاب سے نقل کئے گئے ہیں کیونکہ فہرست میں کتاب سابق کے بھی صفحات درج کئے گئے ہیں۔ اس کلیات میں سات ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱ **غزلیاتِ اُردو**۔ تین سو اٹھارہ ۳۱۸ ہیں جن میں ردیف ی میں ایکسو تین ۱۰۳ ردیف ا میں چھیاسٹھ ۶۶ اور ردیف ن میں چونتیس ۳۴ بقیہ ردیفوں میں دس دس اور اس سے کم غزلیں ہیں۔ غزلوں کے جملہ شعر تقریباً پانچ ہزار سات سو ۵۷۰۰ ہیں

۲ **رُباعیاتِ اُردو**۔ تراسی ۸۳ ہیں جو تصوف و اخلاق کے مضامین پر لکھی گئی ہیں۔

۳ **خمسہ جاتِ اُردو**۔ چونتیس ۳۴ ہیں جو مختلف اساتذہ مثلاً انشا، رند، آتش، وزیر، منیر، ذوق، فیض، آصف اور امیر کی غزلوں پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں قریب ڈیڑھ سو اشعار ہیں

۴ **قطعاتِ اُردو**۔ اکیس ۲۱ ہیں جن میں ساٹھ اشعار ہیں۔ اعلیحضرت غفراں مکاں کی سالگرہ اور شہاب جنگ کی تعریف میں لکھے گئے ہیں۔

۵ **قصائد اُردو**۔ پانچ ہیں جن میں جملہ اسّی ۸۰ شعر ہیں۔ تین غفراں مکاں، ایک مہاراجہ بہادر اور ایک حضرت غوث اعظم رح کی شان میں۔

۶ **تاریخیں تہنیت و تعزیت، ابیات و مصرعہ جات وغیرہ**۔ ان میں دو سو سے زیادہ شعر ہیں اور انہی میں وہ نظمیں بھی ہیں جو رمز کی آپ بیتی کہی جا سکتی ہیں اور جنکے چند شعر آخر میں نقل کئے جائیں گے۔

۷ **رُباعیاتِ فارسی**۔ ۳۳ ہیں۔ ان میں بعض حضرت فیض، غفراں مکاں اور مہاراجہ بہادر سے متعلق ہیں۔

۸ **قطعاتِ فارسی** - ۹ ہیں۔ قریب ۲۵ شعر۔

۹ **قصائد فارسی** - ۳ - ۱۰۰ اشعر۔ اعلحضرت غفراں مکاں اور شہاب جنگ کی تعریف میں

۱۰ **خمسہ ہائے فارسی** - ۲ - دونوں شمس تبریزی کی غزلوں پر ہیں۔

۱۱ **کلام ہندی بھاشا** - ۱۳۶ نظمیں۔ ہولیاں منظوم رقعے وغیرہ ہیں جن میں قریب قریب چھ سو پچاس ۶۵۰ شعر ہیں

رمزؔ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن میں شعر و سخن کا فطری ذوق تھا اور یہ ذوق نتیجہ تھا حضرت فیضؔ اور اُن کے تلامذہ کی صحبت اور میل جول کا۔ اگر چہ وہ ابتدائے دنیاوی کاروبار اور ملازمت اور فن طب کے شوق میں شعروشاعری سے کنارہ کش ہو چکے تھے لیکن چالیس سال بعد جب پھر اسکی طرف راغب ہوئے تو انہیں از سرِ نو شاعرانہ قوتیں عود کر آئیں۔ لیکن ان کے اس دور کے کلام میں ایک بے ساختگی، اور بے پروائی ظاہر ہوتی ہے۔ تصنع اور آورد کا پتہ نہیں یہی وجہ ہے کہ ایک ایک رات میں سو سو شعر کہنے لگے تھے اُن کا مصرعہ ہے

اک رات میں سَو شعر تو کہنے لگا اے رمزؔ

انہوں نے اپنے عہد کی شعروسخن کی محفلوں کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ اپنے استاد بھائیوں کو اِس طرح یاد کیا ہے ؎

فیاضؔ ہیں مزاج میں اور عصرؔ ہیں بزرگ	تلمیذ فیضؔ کے ہیں فقط انتخاب آپ!

فیاضؔ و عصرؔ اور تقیؔ و مزاجؔ و پاسؔ!	ایسا بھی اور اہل سخن اب کہیں نہیں

شعروسخن کے چرچوں کا ذکر یوں کیا ہے ؎

چرچا چلا ہے خوب جو شعر و سخن میں رمزؔ	استاد نامور ہیں بہت سے دکن میں آج

دکن کا ذکر ان کے اور اشعار میں بھی ملتا ہے جن سے انکے حبِ وطن کا بھی پتہ چلتا ہے ؎

عاشق نہیں دنیا میں کسی رشکِ چمن کا	گُل خوردہ ہوں میں عارض سبزانِ دکن کا

اندازِ حورِ خلد کا مشہور ہے مگر!!!	آتی نہیں ہے دلبرِ ملکِ دکن کی بات

رمزؔ نے اپنی غزلوں میں قلندری اور ترک دنیا کی طرف اشارے کرنے کے علاوہ اپنی حالت آوارگی اور مستانہ پن کے اسباب بھی بیان کئے ہیں۔

کار دنیا کا نتیجہ ہی جو بہتر تھا! | رمزؔ کیوں چھوڑ کے پھر اس کو قلندر ہوتا
ہیں جذب میں اور حال ہے مستانہ ہمارا | لبریز مئے عشق ہے پیمانہ ہمارا
تھا ناچ پتلیوں کا زمانہ کا کھیل رمزؔ | آنکھوں سے دیکھکر بھی نہ تجھکو یقیں ہوا
جب گنج لازوال توکل ہو دستیاب | خواہاں ہو کون دولت ناپائدار کا!!!
خلاق لامکاں مرے دل میں مکیں ہوا | بیت الحزن مقابل عرش بریں ہوا
جواہر میں تلے گا یہ فسانہ عشق کا میرے | چھپے گا بعد میرے قصّہ بن کر لعل و گوہر کا

لعل و گوہر عاجزؔ دکنی کی ایک قدیم اردو مثنوی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمزؔ کے مطالعہ میں قدیم اردو کتابیں بھی گذری تھیں۔ اور اس مطالعہ کا اتنا اثر ہوا تھا کہ خود ان کے کلام میں بھی بعض ایسے شعر ملتے ہیں جو قدیم دکنی اردو شاعروں کا کلام معلوم ہوتے ہیں رمزؔ کے زمانہ میں اس زبان میں شعر گوئی قطعاً ترک ہو چکی تھی۔ عشق کے متعلق ایک مسدّس لکھا ہے ایک بند یہ ہے

یہ دکھ ہی ہے ایسا کہ نہیں اسکی دوا کچھ! | حلوا تھکے کر کرے دوا اور نہوا کچھ!!!!
جنتر کئے منتر کئے چیٹک کئے کیا کچھ | بالکل نہیں سر سِتّیِی اترتی یہ بلا کچھ!!!!

(بھنے سے)

اللہ رے دشمن کو بھی یہ درد نہو ئے!

اس پھندے میں پھنسکر کوئی جان اپنی نہ کھوئے

اب ہم رمزؔ کی دو ایسی نظمیں یہاں درج کرتے ہیں جو غالباً حالت جذب میں لکھی گئی تھیں اور جن میں انہوں نے اپنی ان کیفیات کے اسباب و نتائج قلمبند کرلئے ہیں۔ پہلی نظم میں نواب شہاب جنگ کی ملازمت اور عیش و عشرت کی زندگی کے بعد تباہی (یعنے اولاد اور بیوی کے انتقال) کی وجہ سے ترک دنیا کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ان نظموں کا اسلوب بتا رہا ہے کہ وہ ہوشیاری کا کلام نہیں۔

آپ بیتی کی نظمیں

آغاز میرے عشق کا احباب لیجیے سن (۱) تھا میں وزیر شاہِ دکن کا جو کارکن !!!

سامانِ عیش دہر کے سب میں لیا تھا چن — تھا دھیان سب اُدھر کا نہ تھی کی ادھر دھن

اُس جائے میں بھی خود ہمہ تن نور نور تھا! — خاکی وجود تک بھی گویا کوہ طور تھا !!!

معشوق وہے بھی راگ بھی سب کچھ نصیب تھا — بس آسمان ڈہی تو انگل قریب تھا!

شیشے لگے ہوئے تھے وساغر لگے ہوئے — پریوں کے ڈولے رہتے تھے شب بھر لگے ہوئے

احباب گو مزے میں بہت دن گذر گئے — بس پھر یہ سارا کھیت ہرن آ کے چر گئے

موتی کے دانے ہاتھ سے گر کر بکھر گئے — وہ سب حسین عیال واطفال مر گئے!

وہ سب اُدھر چلے تو ادھر ہم بھی چل گئے
دنیائے دوں کے پنجہ سے اک دم نکل گئے

طفلی میں مجھ پہ ایک محقق نے کی نظر!!! (۲) تھے اولیائے اکمل و نور ابو البشر!!!

تھا دھیان سب اُدھر کا پہ ظاہر تھا میں ادھر — پھر کعبہ ہو گیا مجھے فیض دکن کا گھر!

دنیا کا عیش خواب سمجھکر کیا میں سب!
بے وصل اور اُس سے کیا میں نہ کچھ طلب!

خدمت سے اہل عشق کے رہنے لگا میں شاد — ہر باصفائے جوڑ لیا رشتۂ وداد !!!

کافر سے دشمنی نہ مسلماں سے اتحاد — رکھا الف سے کام دیا چھوڑ صاد ضاد!

اغراق مجھ کو ہو گیا آزاد ہو گیا!!! — نمرود دل جو بن گیا تھا عاد ہو گیا

قلندری

(۳)

ہیں اپنا آپ عاشق ہوں وہ رندانہ قلندر ہوں
کبھی بے حد نہیں ہوتا ہیں اپنی حد میں رہتا ہوں

سدا سرمست رہتا ہوں پیا ہے عشق کا پیالہ
مجھے کیا کام ہے جگ سے میں ہوں جھگڑے سے نروالا

ہوا مدہوش مستی میں لگا دل میں جو کچھ آیا
پیالا پیر کا پی کر کبھی رویا کبھی گایا!!

مسلماں کوئی کہتا ہے کوئی کہتا یہ ملحد ہے
غرض تو اور ہے اپنی کسی سے کچھ نہیں ضد ہے

نہیں کچھ کام سمرن کا مشقت سے غرض کیا ہے
مرا سائیں ہے خود مجھ میں وہ آپ ہی آپ جپتا ہے

سرود عاشقاں ہر دم ہے ہر تارِ نفس میں ہے
کبھی آوازیا ہو ہے کبھی ہو ہو کبو تر ہے

جو گونگا ہے کہے گا کیا الف کیا لام کیا ہے
سکوت اپنی تو منزل ہے کوئی کہہ لے جو کچھ چاہے

دوئی کی دھجیاں کر دیں ہوں دیوانہ و مستانہ
جناب فیض کا خادم مرا کوئی رمز نہیں جانا

(۴)

ایک طویل نظم میں رمز نے ایک ایسی عورت کا حال بیان کیا ہے جو غالباً ان کی یاد اور فراق میں تڑپ کر مر گئی اور جس کے ساتھ بے توجہی کرنے کا انہیں صدمہ باقی رہا۔ جگہ جگہ سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

بن بن پھروں گی بن کے میں جوگن ترے لئے
رلدونگی خاک میں مرا جوبن ترے لئے

چھپ چھپ کے رات کو جو ترے گھر کو آتی ہوں
ڈرتی ہوں چھاؤں دیکھ کے گھبرائی جاتی ہوں

خانہ خراب تو نے کیا کیا مجھے خراب
آگے خدا کے ہوئے گا تیرا مرا حساب

مرجانا مجھکو ٹھیک ہے جھگڑا تو جائے گا
پیچھے وہ اپنا آپ ہی صدمہ اٹھائے گا

جھگڑا یہ خوب رمز نے آخر ہی کر دیا!
اور اپنی سرگذشت کو ظاہر ہی کر دیا!

اب رمزؔ کی غزلوں سے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؎

تو مرے دل ہی میں رہکر جو نہ چھپتا مجھ سے
کعبہ و دیر میں کیوں مفت میں چکّر ہوتا!

ہوتی ہے چکا چوند نہیں آنکھ ٹھہرتی!!!
کھنچتا ہے کب اُس مطلع انوار کا خاکا!

یہ سارے جیتے جی کے آشنا ہیں!
نہیں کوئی پسِ مُردن کسی کا!

پھری آنکھ ہم سے جب اے یار تیری
تو چشمک زدن میں گیا پھر زمانا

تری بے وفائی نے کی یہ نصیحت
کسی سے نہ زنہار دل کو لگانا

ہے شام و سحر یوں مجھے تقدیر سے جھگڑا
جیسا کہ ہو دیوانے کو زنجیر سے جھگڑا

منظور ہے یہ بات رقیبوں کو سراسر
ہو میرے تمہارے کسی تدبیر سے جھگڑا

اٹھے دھواں جو دل داغدار سے میرے
بناؤں زیر فلک اور آسمان بنا

ہوگئی تنگ مرے تن پہ قبائے ہستی!
مجھکو جس وقت کوئی غنچہ دہن یاد آیا

ملک دل میں غم کا لشکر رکھدیا!
ہم نے کوزہ میں سمندر رکھدیا

خوب بے پر کی اڑی خط کے عوض
اک لفافہ میں فقط پر رکھدیا!!!

آباد ہے ان قدموں سے ویرانہ ہمارا
گھر ہوگیا اب رشک پریخانہ ہمارا

یار تو محفل سے اٹھکر کیا گیا
شمع کے اوپر اندھیرا چھا گیا!

بھرتا ہوں دم احمد و حیدر تہہ خنجر
ہے لب پہ مرے قند مکرر تہہ خنجر

تحصیل شاعروں کو فقط واہ وا کی ہے
کوڑی کا فائدہ نہیں محنت بلا کی ہے!

ہے جسم کو ثبات نہ دم ہی کو ہے قرار
کھل جائیگی ذرے میں یہ گٹھڑی ہوا کی ہے

سو گتھیاں ہوں رشتۂ تدبیر میں تو کیا
ہمت ہمیں تو حضرت مشکل کشا کی ہے

کرتے ہیں جان بوجھ کے انسان دوڑ دھوپ
ہوتا وہی ہے رمزؔ جو مرضی خدا کی ہے

وجد و مراقبہ نہ تو دل کو قیام ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ہو حق سے کیا حصول یہہ سودائے خام ہے
شہرت نہیں وہ سم ہے اگر بد قوام ہے ‏ ‏ ‏ ‏ بے معرفت شراب تصوف حرام ہے
سب کے لئے معاش کو ملک نظام ہے ‏ ‏ ‏ ‏ یہاں ساری روم شام کی ترکی تمام ہے
کر دیجئے معاف جو کچھ شب میں ہو گئی!! ‏ ‏ ‏ ‏ یہہ آپ جانتے ہیں کہ نشہ حرام ہے

گھٹ گئی عمر کی راتیں یوں ہی گرتے پڑتے ‏ ‏ ‏ ‏ دن قریب آ گئے آرام سے سو جانے کے!
باتیں کچھ اور کرو اور سنو اور سناؤ ‏ ‏ ‏ ‏ تذکرے یہہ تو ہیں آنے کے نہ کچھ جانے کے

یہہ زندگی کی ہے بازی قمار کی صورت ‏ ‏ ‏ ‏ کبھی ہو جیت کبھی اسمیں ہار کی صورت
دلوں سے جائے دورنگی تو کہئے کیونکر جائے ‏ ‏ ‏ ‏ زمانہ آپ ہے لیل و نہار کی صورت
جو دیکھا دیدۂ دل سے تو ہم نے یہہ دیکھا ‏ ‏ ‏ ‏ اُدھر بھی یار اِدھر بھی ہے یار کی صورت

فیض کے ہندو تلامذہ میں گردہاری پرشاد مبنی راجہ باقی سیتل پرشاد خرم اور بجو لال تمکین کے علاوہ رمز بھی استادی کے رتبہ کو پہنچ چکے تھے اور ان سب پر ان کو ایک طرح سے فضیلت بھی حاصل ہے وہ اس طرح کہ ان کے متعدد تلامذہ اپنے زمانہ میں اچھے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ غالباً مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنۃ شاد نے بھی ابتداءً ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ رمز کے دیگر تلامذہ میں مرزا صفدر علی جاہ اور سید ملتانی بادشاہ مواج قابل ذکر ہیں۔
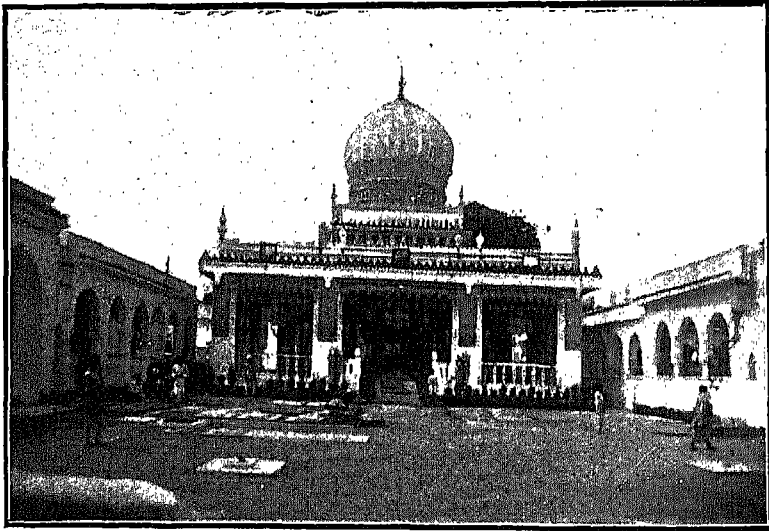
درگاہ حضرت آغا داؤد صاحب قبلہ صحو قدس سرہ العزیز

صحوؔ

آغا محمد داؤد ابو العلائی

۱۲۵۳ھ تا ۱۳۲۴ھ

از

صاحبزادہ محمد علی خان صاحب میکشؔ

دکن کی اردو نوازیاں اہل دنیا تک ہی محدود نہیں رہیں اسمیں صوفیائے کرام کا بھی قابل لحاظ حصہ ہے اگر حیدرآبادی شاعروں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ان میں کئی ایک ایسے صوفی شاعر ملیں گے جن کا محبوب مشغلہ رشد وہدایت کے بعد شعر و شاعری ہی تھا چنانچہ فیضؔ، خاموشؔ، وطنؔ، خلیقؔ، علوی ..... یہ وہ پاک نہاد ہستیاں ہیں جنکا کلام اردو کے ذخیرۂ سخن میں بہت دل آویز اضافہ ہے ان ہی حضرات صوفیاء کے سلسلہ میں حضرت محمد آغا داؤد صحوؔ ابو العلائی کی ذات مرجع رشد وہدایت ہونے کے علاوہ ذوق شعر وسخن کی بھی لو ابر دار ہے

حضرت صحوؔ کے والد آغا محمد حیدر اور جد امجد آغا محمد قادر تھے۔ صحوؔ غالباً ۱۲۵۳ھ میں پیدا ہوئے۔ انکا وطن مالوف دگل تھا جو ضلع اطراف بلدہ میں نواب سالار جنگ کا ایک جاگیری موضع ہے لیکن انہوں نے شہر حیدرآباد میں بود وباش اختیار کر رکھی تھی۔ اور یہیں اکہتر سال کے سن میں ۱۵ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ کو پنجشنبہ کے دن انتقال کیا جنازہ کے ساتھ کئی ہزار آدمیوں کا اژدحام تھا۔ تاریخ وفات سے آجتک ہر سال بہ تقریب عرس تین روز تک مزار پر خلایق کا اجتماع ہوتا ہے اور مجلس سماع گرم رہتی ہے۔

ان کے آبا واجداد قطب شاہی عہد میں صاحب منصب تھے۔ اور جانثارانہ فوجی خدمات کے صلہ میں علاقۂ برار سے جاگیرات بھی پائی تھیں اور ڈھائی سو سواران اسپ، دو ہاتھی مع لوازمۂ اعزاز کے سرفراز تھے۔ انکے والد کرامت شاہ کے آوردہ تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو زمانہ کی الٹ پھیر نے نقشہ بدل دیا اور کچھ انکی بے پرواطبیعت نے ان دنیوی کھیڑوں سے سروکار رکھنا گوارا نہ کیا اسلیئے یہ خدمت سے دستکش ہو گئے

انہوں نے سید حسین علی صاحب سے انشاء خلیفہ، طغرائے ظہوری اور سکندر نامہ کی تعلیم پائی تھی۔ اس کے سوا کوئی دوسری کتابی تدریس میں حصہ نہیں لیا۔

سوانح ابوالعلاء میں حضرت صحوؔ کا حلیہ یوں مرقوم ہے :- بلند قد، گورا رنگ، کشادہ جبیں، بلند بینی، چشم میگوں پُرخمار، فربہ اندام، ریش دبروت سفید، متناسب الاعضاء اور خوب رو"، گھر میں ہوتے تو ٹوپی اور کرتہ پہنتے۔ باہر جاتے تو سر پر دکنی وضع کی لٹ پٹی دستار ہوتی جسم پر سادہ چین دار انگرکھا، دوش پر کھادی کا رومال غذا سادی۔ مدت دراز تک گوشت اور نمک کا استعمال نہیں کیا۔

سولہ سترہ برس کی عمر میں ایک بزرگ کی مجلس میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا، تو عجب لطف پایا، تمنائے بیعت پیدا ہوئی۔ حضرت محمد حسن صاحب محوؔ ابوالعلائی ان کے والد کے مرشد تھے اکثر اپنے والد کے ہمراہ بہ بزم محوی میں پہنچتے بالآخر وہ دن آگیا کہ صحوؔ دیدار محو میں محو ہو گئے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ ایک نے جوہر باطنی کو پرکھا، دوسرے کے اضطراب آشنا دل نے سکون پایا۔ انجام کار دونوں کے ہاتھ آرزو اور رضامندی سے ملے اور بیعت ہو گئی۔ دو سال کے مجاہدہ میں جذب غالب ہو گیا۔ بادیہ پیمائی اختیار کی۔ لباس کا خیال تھا نہ غذا کی فکر۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت کم ہو گئی سچا راہ نما تھا اور مخلص راہ پیما۔ منازل طریقت طے ہونے لگے آخر حضرت محوؔ نے خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا

سلسلۂ ابوالعلائیہ میں انکو ایک خاص شرف و امتیاز حاصل تھا۔ یہی وہ ذاتِ گرامی تھی جس نے نہ صرف اپنے بزرگوں کے سلسلۂ رشد و ہدایت کو ترقی دی بلکہ بہر عنوان اسلام کی سچی خدمات انجام دیں۔

وہ پابند صوم و صلوٰۃ، تہجد گزار، ذاکر، شاغل، صاحبِ کشف و کرامات، پابند شریعت خدا رسیدہ اور خلیق بزرگ تھے اور ایسے بے ریا کہ کبھی اپنے آپ کو شیخ اور مریدوں کو مرید نہیں کہا۔ اغنیا سے دنیا داری کی باتیں کرتے۔ غربا پرور اور ہمدرد تھے۔ لنگر سے غذا اور مدرسہ سے فیضانِ علم جاری تھا۔

ہزاروں اشخاص انکے معتقد اور مرید تھے۔ حضرت غفراں مکاں کو بھی عقیدت تھی ذیل کی نظم انہیں عقیدتمندانہ جذبات کا آئینہ ہے:-

کعبہ دل میں جو مہمان ہیں آغا میرے | دل کے دل، جان کی بھی جان ہیں آغا میرے
مرشدِ پاک کی درگاہ ہے گویا فردوس | جمع سب خلد کے سامان ہیں آغا میرے
پائے جاتے ہیں صفاتِ ملکوتی ان میں !! | گرچہ ظاہر میں تو انسان ہیں آغا میرے
آپ کی ذات سے ہے قوتِ دینِ اسلام ! | ایسے دیں دار مسلمان ہیں آغا میرے
دل عارف سے کوئی پوچھے حقیقت انکی | کیسے ذی رتبہ و ذی شان ہیں آغا میرے

رکھئے اس سلطنت و ملک کو محفوظ مدام! | مدعی گھات میں ہر آن ہیں آغا میرے
نہیں اندیشہ مجھے جوشِ محیط غم سے | میری کشتی کے نگھبان ہیں، آغا میرے
سامنے میرے تصور میں ہیں ہر روز مدام | دل میں بیٹھے مرے مہمان ہیں آغا میرے
نہ رہے فیض سے یہ بندۂ عاصی محروم | خلق پر آپ کے احسان ہیں آغا میرے

ایسے مخدوم کی خادم کو ہے خدمت واجب
میں ہوں **آصف** تو سلیمان ہیں آغا میرے

حضرت صحوؔ کے یہاں اکثر شعراء موجود رہتے جن میں ڈاکٹر احمد حسین مائلؔ، دائم جنگ علمؔ، صادق جنگ حلمؔ، عبد القیوم حفظؔ عاشق حسین ہاتفؔ، عبد الکریم خاں شمشیرؔ، خواجہ فیاض الدین خاں مہرؔ اور میر جہاندار علی خاں وفائیؔ قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت صحوؔ نے بالارادہ کبھی شعر نہیں کہا حالت کیف و جذب میں زبان سے جو موزوں الفاظ نکل جاتے وہی اشعار ہوتے اور ان کو حاضرینِ محفل محفوظ کر لیتے تھے۔

کہا کرتے تھے کہ "بھئی! ہم شاعر نہیں ہیں، بس یوں ہی کہہ لیتے ہیں، موزوں ہیں یا ناموزوں تم جانو"

محفل سماع کی کیفیات سے جب تاثرات وارفتگی لئے ہوئے اٹھتے تو ان میں ایک وجدانی جذبہ جھلکیاں لیتا ہوا نظر آتا اسی عالم کیف میں جو موزوں جملے منہ سے نکلتے وہی ان کی شاعری کی کائنات ہے؟

تخیل کی گرمی، طبیعت کے تقدس اور عشق حقیقی کے خاموش جذبہ نے ان کے شاعرانہ رجحانات کو ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام ایک دریا ہے جو ایک ہی رخ پر بہا چلا جا رہا ہے۔ انکے معنی خیز اشعار سامع کو تصوف و عرفان کی ان گہرائیوں میں لے جاتے ہیں جہاں دل کی سرشاری اور بیداری اپنی انتہائی بلندی پر ہوتی ہے۔

حضرت صحوؔ کا دیوان ۱۳۳۲ھ میں محمد عبد الکریم خاں شمشیرؔ سابق ناظم کروڑگیری ممالک محروسہ سرکار عالی کی سعی سے ابو العلائی اسٹیم پریس آگرہ میں طبع ہوا۔

دیوان میں فارسی کلام (۱۲۷) صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ۳۹۲ غزلیں ہیں ایک خمسہ ہے۔ آخر میں نظم مختلف کے زیرِ عنوان مختلف اشعار لکھے ہیں۔ اردو کا حصہ (۱۰۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ (۲۵۷) غزلیں ہیں۔ کچھ متفرق اشعار اور چند ٹھمریاں آخر میں بعض شعرا کی تاریخیں ہیں۔ اختر مینائی کا خیال ہے کہ

یہ سخن مغز ہے شریعت کا!　　یہ سخن رہبر طریقت ہے!!
یہ سخن جان ہے تصوّف کی!　　یہ سخن کاشفِ حقیقت ہے!!

جلیل القدر جلیل کی رائے ہے کہ۔

ہر تاجِ سخن کیوں نہ ہو جس کا یہ سخن ہو　　کہتے ہیں جسے بادشہِ کشورِ عرفاں
ہر مصرعہ تر موجۂ دریائے حقیقت　　ہر معنیٔ نازک ہے کلیدِ درِ عرفاں
مرکز ہیں کہ ہیں مرکزِ اسرارِ الٰہی!　　نقطے ہیں کہ ہیں نامِ خدا گوہرِ عرفاں
رکھی ہے عجب معنیٔ والفاظ میں خوبی!　　وہ شاہدِ عرفان ہے تو یہ زیورِ عرفاں
آنکھوں میں ضیا آتی ہے لفظوں کی چمک سے　　کوئی مہ عرفاں ہے کوئی اخترِ عرفاں
اڑ چلنے کو تیار ہے ہر طائرِ مضموں　　کھولے ہوئے کس ناز سے ہے شہپرِ عرفاں
مطلع سے نمایاں ہے کہ ہے مطلعِ انوار!!　　مقطع سے یہ ظاہر ہے کہ ہے مظہرِ عرفاں
سب دنگ میں ہیں دیکھ کے اس رنگِ سخن کو　　ہر مست لئے ہاتھ میں ہے ساغرِ عرفاں

حضرت صحو کے بھائی جناب آغا محمد قادر کے پاس جس قدر ذخیرہ تھا وہی بہ صورت دیوان طبع ہو سکا۔ حال میں ایک قلمی دیوان کا پتہ چلا ہے اور بعض معتقدین کے پاس سے غیر مطبوعہ غزلیں بھی ملی ہیں۔

چند غزلوں سے چند اشعار بہ طور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

بے خیالی خیال ہے میرا!!!　　لاابالی کمال ہے میرا　　میں نہیں کہتا زباں سے آ رہی ہے تو دوست　　خونِ دل پیتے ہیں ہر دم ساکنانِ کوئے دوست
کہہ دو یہ صحو سے کہ آپ آتے ہیں تیرے گھر!　　تکتا کھڑا ہے صبح سے تو چار سو عبث　　صحوِ محتاج در پہ حاضر ہے!　　زور پر بختِ نارسا ہے آج!!!

ہم سے نزدیک ہیں نہیں کچھ دور!! پردۂ ابہام میں چھپے ہیں حضور! مرتا ہوں یار ماہئی بے آب کی طرح مضطرب ہے تن میں دل میرا سیماب کی طرح

زمین آسمان لامکاں میں ہے رونق تجھ ہی سے ہر اک جا جہاں میں ہے رونق رات کو درکار ہے ہر جا دھواں ہی چراغ شب کو جان و دل جلا کر آہ کر اے صحو تو

کروں کیا نہیں ہے چھپانے کے قابل میرا حالِ دل ہے سنانے کے قابل اگر تجھ سے ہوی دو جہاں میں ہے رونق کوئی صحو سے جا کے اتنا تو کہہ دو

بیت الحرم کی پہلی بنیاد ہیں تو ہم ہیں عالم میں سب سے پہلی ایجاد ہیں تو ہم ہیں جو زندہ ہیں دلِ مردہ تو کیا غم نگاہِ یار سے جادو نہیں کم!!!

خیال ماسوا دل سے بھلا دے! مقابل آئینہ سا ہوں میں تیرے تو اپنے رنگ میں پیارے رنگا دے ہوی میلی میرے تن کی گدڑیا!!!

خدایا خاک میں مجھ کو ملا دے مجھے ظاہر کیا ہے آپ چھپ کر

ان اشعار میں آپ وہی صوفیانہ تخیل پائیں گے جو ایک صوفی منش دل و دماغ سے نکلکر الفاظ کا جامہ پہنتا ہے ۔

حضرت صحو نے چند مخمس بھی لکھے ہیں ۔ مخمسوں کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں ان ساغروں میں بھی وہی بادۂ تصوف و معرفت چھلک رہا ہے

بے وسیلوں کا وسیلہ ہے عراقی ساقی! تیرے میخانہ پہ حاضر ہے شرابی ساقی!
عرض کچھ کر نہیں سکتا ہے خرابی ساقی اس بلانوش کو تلچھٹ ہی ہے کافی ساقی
بھر دے چلوؤں میں جو شیشہ میں ہے باقی ساقی

جب سے ساقی نے پلائی ہے شراب عرفاں بھول کر بیٹھا ہوں میں دل سے خیال دو جہاں
نیک و بد سے مجھے کیا کام ہے صحو ناداں! مست کیا جانے کدھر دیر ہے کعبہ ہے کہاں
عمر ساری تری بھٹی پہ گذاری ساقی!

اک زمانہ تھا کہ ہجر یار میں سینہ فگار جستجو میں اس کی پھرتا تھا یہ ہر شہر و دیار
اب وہ دن آئے کہ پارے کی طرح لیل و نہار یار مائی ماہئی گیرد قرارش بے قرار!
طالب دیدار گشتہ ہمچو موسیٰ بار بار!!!

چند ٹھمریاں بھی کہی ہیں یہاں ایک ٹھمری پیش کی جاتی ہے انہوں نے جس صنف سخن میں کہنے کا ارادہ کیا اسکو عرفان و تصوف کا گلزار بنا دیا ہے

بنا دا ایسے پپیہا پیا رے!!! مجھے لاگی سنجریا تو ری رے!!

ایک تو نینا مدھ کے ماتے
دوجے نینا باندھی کٹاری رے

آؤ پیارے دوارے ہمارے
مجھے لاگی نجریا توری رے

تن من تجھ پہ ڈاروں واروں!
تورے کارن جوگ اٹھائی!

برہ کی برچھی میں نے کھائی!
ماتا پتا کا نام ڈبائی!!

ایک غزل

لبریز جام محفل مستاں میں رہگیا!
عالم نشہ کا دیدۂ حیراں میں رہگیا

یاں جستجو میں اوسکی ہر اک صبح و شام تھے
مخزن کسی کا خانۂ انساں میں رہگیا

پہچانتے نہیں ہیں ابھی تک وہ آپ کو
جھگڑا یہی تو گبر و مسلماں میں رہگیا

وحشت کو میری دیکھ کے گھبرا گیا ہے وہ
دست جنوں بھی چاک گریباں میں رہگیا

ہرگز یقیں نہ ہوگا مری بات کا اوسے
کیا ہو گیا صحوکو یہیں ہاں میں رہگیا!
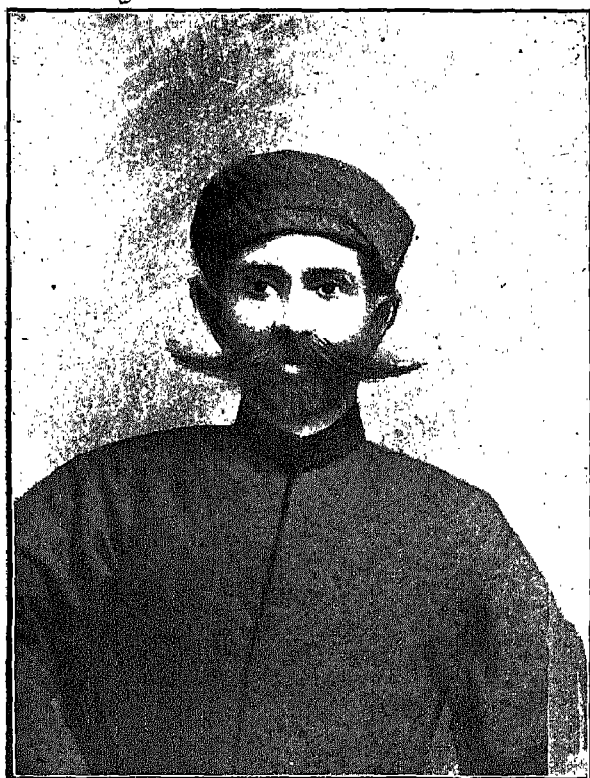
مرزا غلام سجاد اشہر مرحوم

اشہر

مرزا غلام سجّاد مرحوم

۱۲۵۶ھ تا ۱۳۲۱ھ

از مرزا محمد علی صاحب ایم اے

مرزا غلام سجاد اشہر کے اجداد طہرانی تھے جداعلیٰ مرزا اصلان بیگ خاں سیاحت کیلئے بزمانہ سلطان عبداللہ قطب شاہ حیدرآباد پہنچے دربار میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ علم و فضل اور طبیعت کی خداداد خوبیوں کی بنا پر بہت جلد بادشاہ کے منظور نظر بن گئے اور زمرۂ ارکان شاہی میں منسلک ہوکر باعزت زندگی بسر کی۔ ان کے بعد انکے فرزند مرزا علی بیگ 'علی نواز خاں بہادر' کے خطاب سے مفتخر کئے گئے اور ان کیلئے بھی دربار شاہی کی حاضری لازمی قرار دی گئی۔

ایک عرصہ کے بعد جب دکن کے تخت و تاج کے مالک نواب نظام الملک آصفجاہ ہوئے تو علی نواز خاں قطب شاہی کے فرزند مرزا ابوتراب کو اپنے دربار میں باریاب کیا اور پہلے علی نواز خاں بہادر کے موروثی خطاب اور بعد میں عین الملک کے خطاب اور جاگیرات سے ممتاز فرمایا۔ انکے فرزند مرزا نجم الدین علی کو خان بہادر کا خطاب عطا ہوا جو نواب داراجاہ کے ہاں متعین کئے گئے تھے یہ زمانہ نواب ارسطوجاہ کی وزارت کا تھا۔

نجم الدین علی خاں کو نواب میرعالم سے رشتہ داری تھی۔ نہ معلوم کیا اسباب ہوئے کہ زمانہ نے کروٹ بدلی اور نواب ارسطوجاہ نے نجم الدین علی خاں کو سخت نقصان پہنچا تمام جاگیرات ضبط ہوگئیں اور گوشہ نشین ہوگئے۔ جب نواب میرعالم کا زمانہ آیا تو صرف پانسو روپئے ماہوار منصب مقرر ہوا۔ انکے فرزند مرزا حسین علی ظفر تھے جنکو آصفجاہ رابع نواب ناصرالدولہ نے حسین نواز خاں بہادر کے خطاب سے نوازا تھا اور جاگیرات بھی واگذاشت فرماکر الطاف شاہانہ سے ضلع ناگرکرنول کی تعلقداری پر مامور کیا تھا۔ ان تمام حالات خاندانی کا ماخذ خود حسین نواز خاں بہادر کی تحریر ہے جو زیر نظر ہے۔

اُن کے دو لڑکے تھے۔ مرزا غلام عباس اور مرزا غلام سجاد اشہر۔ ثانی الذکر کی پیدائش ۱۲۵۶ھ میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ مرزا غلام عباس راقم مضمون کے حقیقی نانا تھے اشہر مرحوم (۵) پانچ سال کے بھی نہ تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور جاگیرات بھی خطرہ میں آ گئیں۔

انکی ابتدائی تعلیم و تربیت خانگی اساتذہ سے گھر پر ہوئی اور عربی و فارسی کے درس بھی خانگی طور پر قابل استادوں سے لئے عالم پرست آدمی تھے۔ علماء وقت کی صحبت سے مستفید ہونے لگے۔ مولوی سید محمد علی نجفی سے علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ کتب اسلامی کا مطالعہ رہا۔ اچھی علمیت پیدا ہو گئی تھی۔ مذہب کے پرستار اور صوم و صلواۃ کے پابند تھے۔ محرم و صفر میں اُن کے گھر مجالس ہوا کرتی تھیں جو اب تک جاری ہیں۔

شاعری سے بھی طبیعت کو بے حد مناسبت تھی اوائل عمر ہی سے شعر کہنا شروع کیا اور ناجی کے استاد منشی تفضل حسین عطا کے شاگرد ہوئے۔ عطا حضرت فیض کے ہم عصر اور بڑے پایہ کے شاعر مانے جاتے تھے۔

ابتداً نواب مختار الملک اول نے مدرسہ دارالعلوم کی مددگاری پر اشہر کا تقرر کیا۔ بعد میں خدمت تحصیلداری پر مامور فرمایا جس کو وہ آخر عمر تک انجام دیتے رہے۔ شیعی المذہب تھے۔ مذہبی جوش بھی بلا کا تھا کہ اجازت و بلا اجازت محرم و صفر کے مہینوں میں ترک مستقر کر کے بلدہ آ جانا انکے ہاں ایک معمولی سی بات تھی کئی بار بالادست عہدہ داروں سے اسی معاملہ میں چل گئی۔ لیکن وہ تا عمر اپنی اسی وضع داری پر قائم رہے۔ عہدہ دار متعلقہ سے اُن سے ہر وقت پرخاش رہتی تھی۔ اسکا کچا چٹھا نہایت بے تکلفی سے فارسی میں نظم کیا گیا ہے۔ جو پر لطف ہے۔ ہجو گوئی میں خاص مہارت حاصل تھی انکی ان گنت ہجویں موجود ہیں۔ غالباً یہی اسباب ترقی کی راہ میں حایل رہے۔

اشہر کو قدیم اسلحہ جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اور انکے ہاں موروثی ہتھیاروں کی بھی کافی تعداد موجود تھی۔ جب حضرت غفران مکاں آصفجاہ سادس کو اسلحہ کا شوق ہوا تو بتوسط نواب محبوب یار جنگ ناظم الملک انکو طلب فرمایا اور اسلحہ کو پسند فرما کر معاوضہ میں سات سو پچاس روپیے ماہوار منصب سے سرفراز کیا۔ جو انکی اولاد میں جاری ہے۔

اُنکے پانچ فرزند اور چار لڑکیاں تھیں جن میں سے دو لڑکوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ لڑکوں میں مرزا جواد علی جواد وکیل ہائیکورٹ

اور مرزا علی جعفر جعفرؔ مرحوم نے شہرت حاصل کی۔ موخر الذکر فخر پدر کہلائے جاسکتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ اس کتاب میں انکا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اشہرؔ کی لڑکیاں ملک کے طبقۂ جاگیرداران و منصبداران کے خوشحال شریف گھرانوں میں بیاہی گئیں اور بفضلہ تعالےٰ خوشحال ہیں۔ سیّد علی رضا صاحب انجینیر و ناظم تعمیرات جامعہ عثمانیہ اشہرؔ مرحوم کے حقیقی نواسے داماد (یعنی مولوی حیدر علیخاں صاحب جاگیردار کے داماد) ہیں۔ اشہرؔ نے ہر چند دنیا میں ناجیؔ کے ساتھ ہی جنم لیا تھا لیکن اس دارفانی کو الوداع کہنے میں ناجیؔ سے دس قدم آگے ہی رہے۔ ۲۸ صفر ۱۳۲۱ھ کو انکا انتقال ہوا چنانچہ ناجیؔ نے اس موقع پر جو قطعۂ تاریخی کہا تھا وہ یہ ہے جسکا آخری مصرع مادۂ تاریخ ہے

دو پارہ ہے جگر تیغ الم سے!!! ۔۔۔ گیا لطف حیات اشہرؔ کے ہمراہ

یہ ہے ناجیؔ کے لب پر ۔۔۔ چھٹا باون برس کا دوست صد آہ
۵۲ / ۱۳۲۱ھ

اشہرؔ کی شاعری۔ اشہرؔ کو تقریباً تمام اصناف سخن سے لگاؤ تھا۔ ہر صنف میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے انکا فارسی کلام بھی موجود ہے۔ تاریخ گوئی میں انکو خاص ملکہ تھا قصیدہ نگاری میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی قصیدوں میں انکے ممدوح حضرت سرور کائنات یا اہل بیت اطہار ہوا کرتے اور تشبیب بالعموم بہاریہ رہا کرتی۔ مرثیہ نگاری کی حدتک ان کے ہم عصر دکنی شعرا میں سوائے ناجیؔ مرحوم کے کوئی بھی انکا مدِمقابل نہ تھا ناجیؔ سے اشہرؔ کو بے حد قلبی لگاؤ تھا۔ اشہرؔ ان کی قدر کرتے اور انکے کلام کو بھی بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے کلام میں ایک مقام پر شاعرانہ تعلّی کے ساتھ فرماتے ہیں :۔

جہاں میں اشہرؔ سوائے ناجیؔ ترا مقابل نہیں ہے کوئی ۔۔۔ ہے شاہ اقلیم نظم وہ بھی اور آسماں شعر کی زمیں کا

غزل بھی خوب کہتے تھے۔ اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہتے۔ بہت اچھے اچھے اشعار کہہ جاتے تھے۔ تضمین کرنے کی مشق تو اسقدر ہو گئی تھی کہ اسکی وجہ سے ملک کے حلقۂ شعرا میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ چنانچہ حضرت سلطان العلوم اصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ کے ارشاد پر بزمانۂ ولی عہدی رفیعؔ اور رندؔ کی غزلوں پر تضمین کرکے بارگاہِ ہمایونی میں گذراننے کی عزت حاصل کی تھی جنکو جہاں پناہ نے پسند فرمایا تھا۔

رندؔ کی غزل پر جو تضمین کی تھی اس کے چند بند آگے درج کئے جائینگے۔ وہ فن شاعری میں کامل ضرور تھے۔ اُن کے کلام میں پختگی اور روانی اتنی ہی موجود ہے جتنی کہ ایک ماہر فن اور استاد کے کلام میں درکار ہے انکا اسلوب بیان نہایت شگفتہ ہے

اور بدرجۂ اتم سلجھا ہوا نظر آتا ہے لیکن اِن اوصاف کے باوجود تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ انکے تلامذہ شاید ہی کہیں نظر آتے ہوں۔ اسکی حقیقت یہ ہے کہ اُنکے ہاں جب کبھی کوئی اصلاح لینے آتا تو اسکو وہ ناجیؔ مرحوم سے صلاح لینے کی رائے دیتے۔ انتہا یہ کہ اپنی اولاد کو بھی انہوں نے ناجیؔ ہی کے سپرد کر دیا اور خود کبھی اصلاح نہ دی اسکے دو اسباب تھے ایک تو یہ کہ ناجیؔ سے انکو خاص عقیدت و محبت تھی دوسرے یہ کہ نوکری کی وجہ سے انکا رہنا زیادہ تر اپنے مستقر (اضلاع) پر ہوتا تھا اسلئے انہوں نے تلامذہ کو تکلیف دینا نہیں چاہا۔

افسوس ہے کہ اشہرؔ مرحوم کا کوئی کلام بھی اب تک شایع نہیں ہوا جو کچھ کلام اسوقت تک دستیاب ہوا ہے۔ اِن میں صرف پانچ مرثیوں کا پتہ چلا جو مسدس کی شکل میں ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ انکو مرثیہ پڑھنے میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ انکے پانچ مرثیوں میں چار تو جناب امیر علیہ السّلام کے حالات میں لکھے گئے ہیں جو علی الترتیب ۶۵۔ ۷۵۔ ۹۵۔ اور ۱۱۶ بند پر مشتمل ہیں جنمیں خیبر خندق اور صفین کی جنگوں کے مناظر نہایت ہی دلکش اور پر شکوہ اسلوب میں نظم کئے گئے ہیں۔ اور پانچواں مرثیہ جناب امام حسین علیہ السلام کے حال میں لکھا گیا ہے جو (۹۰) بند کا ہے ۔

روایت بندی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے اور یہی خصوصیت انکے فرزند جعفرؔ مرحوم کو ورثہ میں ملی تھی بول چال اور روزمرّہ سے وہ کلام میں بے شمار فائدے اٹھاتے ہیں جسکی وجہ سے انکے مرثیوں میں ڈرامائی اثر پیدا ہو جاتا ہے ۔ مکالمہ۔ رزم اور منظر نگاری وہ اس خوبی سے نظم کرتے ہیں کہ ایک طرف مرثیت بھی قائم اور دوسری طرف ڈرامہ کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن کے مرثیوں میں وہ تمام اجزائے مرثیہ موجود ہیں جو اسوقت دکن اور لکھنو میں رائج تھے۔ لکھنوی اثر کی وجہ ۱۲۸۷ھ میں انیسؔ مرحوم کی آمد حیدر آباد ہوی۔ انیسؔ کے بعد شمالی ہند کا ایک نہ ایک شاعر دکن کے اکثر امراء کے ہاں ہر سال مدعو ہونے لگا اور اسکا ایک تانتا بندھ گیا۔ اس آمد و رفت کا اثر دکنی مرثیہ نگاری پر یہ ہوا کہ یہاں کے مرثیہ نگاروں نے بھی اپنے مرثیوں میں ان اجزاء (چہرہ۔ ساقی نامہ۔ منظر نگاری تلوار اور گھوڑے کی تعریف۔ رزم۔ بزم۔ سراپا اور رخصت وغیرہ) کو شامل کر لیا۔ ورنہ اِس سے قبل قدیم دکنی مرثیوں کی ممتاز خصوصیتں صرف بَین اور واقعہ نگاری تھیں ۔

قدیم دکنی کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً بارہویں صدی کے آغاز سے چودہویں صدی کے آغاز تک اردو زبان پر فارسی کا بہت زیادہ تسلط رہا۔ شعر و سخن کے قطع نظر خانگی خط و کتابت اور کار و بار سلطنت بھی فارسی زبان کے ذریعہ انجام پاتے رہے۔

اس لحاظ سے اشہر کے کلام پر فارسی اثر بہت نمایاں ہے اور یہ اُس زمانہ کے رنگ میں رنگا ہوا قدیم طرز کا اچھا نمونہ ہے۔

نمونہ کلام اشہر - قطعہ تاریخی بتقریب کتخدائی شجاع الملک خلف خانخاناں مرحوم

بنے ہیں نوشہ و نو کتخدا و نو داماد!!　　بفضل مرحمت کبریا شجاع الملک

حروف معجمہ میں جبکا سال اشہر نے　　رقم کیا کہ - ہوئے کتخدا شجاع الملک

۱۳۱۳ھ

حضرت سرور دو عالم کی مدح میں جو قصیدہ نظم کیا گیا اسکی تشبیب سے چند اشعار ذیل میں درج کیئے جاتے ہیں۔

چمن میں کس گل کی آمد آمد کی دھوم آج اے صبا مچی ہے　　ادھر غنچہ ہر اک چٹک رہا ہے ہر ایک بلبل چہک رہی ہے

کہیں ہیں کبک دری خراماں کہیں ہیں طاوس مست رقصاں　　کہیں یہ گلچیں ہیں گل بہ داماں کہیں کوئی صرف مے کشی ہے

مسی ہے لب پر جما ئے سوسن سمن بھی دکھلا رہی ہے جوبن　　غضب صفا ہے صحن گلشن چمن کی رونق بھی کچھ نئی ہے

کسی طرف سرو جو کی صف ہے کسی طرف صوت چنگ و دف ہے　　خمار آنکھوں سے ہر طرف ہے بشوق نرگس بھی تک رہی ہے

کسی روش پر بتان مہوش ہیں صرف رقص و نوائے دلکش　　ادھر جس کو سنکر ہوں بلبلیں غش وہ تان ہے اور وہ گٹکری ہے!!!!

ہر ایک گل سرخ پوش کیوں ہے بہار کا آج جوش کیوں ہے　　یہ ہر طرف نائو نوش کیوں ہے بیاں تو کر آج کیا خوشی ہے

غزل

ہوں کشتۂ رفتار کسی آفت جاں کا　　دینا مرے لاشہ کو کفن آب رواں کا

پھر فصل بہار آئی ہے اے بلبل شیدا　　پھر لطف ہے اب نوحہ و فریاد و فغاں کا

اس ماہ کی فرقت نے کیا ہے مرا دل چاک　　احباب کفن دیں مرے لاشہ کو کتاں کا

ابرو پہ نہ بل آئے اگر دل پہ لگے زخم　　تیر و تبر و خنجر و شمشیر و سناں کا!

مضمون تو اچھا ہے مگر چیست ہو بندش　　بندش ہو مگر چیست تو مضمون کہاں کا

وہ سو گئے جا کر لحد تنگ میں آخر!　　شکوہ جو کیا کرتے تھے تنگیٔ مکاں کا

رہنے دے مجھے کوچۂ دلدار میں واعظ　　مشتاق میں ہرگز نہیں ہوں باغ جناں کا

دل نے مجھے رسوائے جہاں کر دیا کمبخت　　بیٹھا مرے پہلو میں تھا دشمن یہ کہاں کا

سینہ پہ لحد میں بھی کسی من کا ہے پتھر　　آرام پس از مرگ بھی قسمت میں کہاں کا

جنت میں پہنچتے ہی جواں ہو گئے اشہر　　اللہ رے تشوق تمہیں حوران جناں کا

جو چہرہ دیکھا ہے اُس حسیں کا ہے لب پہ دم　　چیں کا　　اگر کہیں چاند چودھویں کا تو نقص ہے عقل دوربیں کا!!!!

نہیں کے یہ دن نہیں میری جاں کہا بھی مانے کسی کا انساں　　بہت بری ہے یہ بات ہاں ہاں یہ لفظ چھوڑو "نہیں نہیں" کا!

شگفتگی کا ہوا یہ عالم کہ پھوٹے کنج مزار میں ہم !
لحد پہ پھول اُس نے رکھے جس دم الٹ کے خاک اپنی آستیں کا

کہوں میں تم خوش ہو یا خفا ہو کہو مرے منہ پہ تم جو چاہو!
تمھارے اس عشق کا بھلا ہو رکھا نہ اس نے ہمیں کہیں کا

نہ قتل سے ہو مرے پریشاں ذرا کہا مان دشمنِ جاں
ارے نہ پکڑے کوئی گریباں لہو تو دھو ڈال آستیں کا!

ہے بے محل واہ واہ کا غل مقام تحسیں یہ ہے تغافل
ہے شور زاغ انکو صوت بلبل یہ رنگ ہے یہاں کی سرزمیں کا

یہ اہل فن پر سدا عیاں ہے ہر اک زمیں رشکِ آسماں ہر
پہ اشہر اب قدرداں کہاں ہے ہے دور ہر ایک عیب بیں کا!

برغزل انیس ۔۱۲ار ربیع الاول سنہ ۱۳۱۱ھ یکشنبہ

رند کی غزل پر جو تضمین کی تھی اُس کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں :۔

پیدا مرے جگر سا جگر کیا کریگا غیر
مقتل میں میرے حال پہ روتے ہیں وحش و طیر!!
دیکھا تو ہوتا خاتمہ کیونکر ہوا بخیر
دم بھر مرے تڑپنے کی دیکھی نہ تم نے سیر
دو ہاتھ تیغ کے لگائے چلے گئے !

کل بام پر تھے بہر تماشہ وہ جلوہ گر
جو راہ سے جنازہ کا میرے ہوا گزر
لاشہ پہ میرے دور سے پڑتے ہی اک نظر
کوٹھے پہ وہ جو چھپ گئے تابوت دیکھکر
ہم بھی کفن میں منہ کو چھپائے چلے گئے!

بہلانے دل کو کونسی تدبیر کی نہیں
تسکین کسی طرح سے یہ حاصل ہوئی نہیں
صحرا ہو یا کہ باغ ہو لگتا ہی جی نہیں
برخاستہ دلوں کی کہیں دل لگی نہیں!
بیگانہ وار بزم میں آئے چلے گئے !

دیتے رہے سدا جو مرا مشفقانہ ساتھ
ہنگام عسر اُن کا بھی اشہر رہا نہ ساتھ
اب یوں جدا ہیں جیسے کبھی انکا تھا نہ ساتھ
اے رند وقت بد میں کسی نے دیا نہ ساتھ
آنکھیں چرا کے اپنے پرائے چلے گئے

شہر کے مرثیوں سے چند بند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں خیبر کی لڑائی کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایک مقام پر رسالت مآب صلعم نماز صبح کے بعد آغاز جنگ سے پہلے فوج اسلام سے اِس طرح مخاطب ہوتے ہیں :—

سجادہ سے ابھی نہ اُٹھے تھے شہ اُمم — مشرق سے مہر کا جو چمکنے لگا علم
فرمایا غازیوں سے یہ شہ نے بصد حشم — کمریں کسیں مجاہد راہ خدا بہم!
مشتاق جنگ اسلحہ تن پر سنوار لیں! — غافل بھی کوئی ہو تو صدا دیں پکار لیں

جب فوج اِسلام آراستہ ہو گئی تو رسول مقبول صلعم مصلّے سے اٹھ کر خیمہ میں تشریف لے گئے اور اسلامی فوج کے نشان کو باہر لے آئے۔ یہ نشانِ علم عموماً اس شخص کو دیا جاتا تھا جو سب سے زیادہ بہادر جرّار اور کرّار ہوا کرتا تھا۔ ایسے موقع پر اشہر یوں کہتے ہیں۔

جسوقت فوج ہو چکی آراستہ تمام — اٹھے مقام خاص سے سلطاں خاص و عام
خیمہ میں جاکے لے کے علم باصد احتشام (احترام) — باہر جو آئے پڑ گئی لشکر میں دھوم دھام
ہاں آگے بڑھ کے جائے جو طالب ہو جاہ کا — نکلا علم وہ فوج رسالت پناہ کا

جس وقت ہو چکا علم پاک جلوہ گر — گردن اٹھا کے فوج پہ حضرت نے کی نظر
دیکھا کہ دست بستہ جوانانِ پر جگر — باندھے سلاح جنگ کھڑے ہیں اِدھر اُدھر
اپنے مقام خاص پہ حق کا ولی نہیں — موجود ساری فوج ہے لیکن علی نہیں!!

سلماں سے مڑ کے کہنے لگے قبلۂ زماں — کیوں خیریت تو ہے اسداللہ ہیں کہاں
سلماں نے بڑھ کے عرض کی اے شاہ انس و جاں — ناخوش ہے طبع اقدس سردار دوجہاں

تشویش کا محل نہیں خالق کفیل ہے　کچھ اُن کے دشمنوں کی طبیعت علیل ہے

فرمایا دیکھکر سوئے اصحاب کوئی جائے　جسطرح ہوسکے انہیں مجھ پاس لے کے آئے
کیا دخل تھا کہ حکم میں کچھ دیر ہونے پائے　فی الفور جاکے بادشۂ لافتا کو لائے
عمار ہاتھ تھامے ہوئے ساتھ ساتھ تھے　سلمان بھی دیئے ہوئے بغلوں میں ہاتھ تھے

دیکھا جو دور سے تو کہا شہ نے بھائی آؤ!　آئے علی قریب تو فرمایا بیٹھ جاؤ
بیٹھے تو بولے کیا ہے شکایت مجھے بتاؤ　کیسا ہے اب مزاج مفصل ذرا سناؤ
تھا تمکو مجھ سے بُعد نہ میں تم سے دور تھا!　مجھ سے بیاں مزاج کا بھائی ضرور تھا

جناب امیر علیہ السّلام کے گھوڑے کی اس طرح تعریف کی ہے:-

مہمیز کی کہ اشہب رف رف عناں اُڑا　پر کھول کر ہمائے سعادت نشان اُڑا!
بالائے اوج طائر عرش آشیاں اُڑا　حسرت میں تھے بشر کہ کدھر تھا کہاں اُڑا
کہنے کو تھا فرش پہ فراست اساس تھا　اک دو قدم میں قلعۂ خیبر کے پاس تھا

حیرت

پاسؔ

محمد حفیظ الدین مرحوم

سنہ ۱۲۶۰ھ تا سنہ ۱۳۳۱ھ

از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

استاد الاساتذہ میر شمس الدین محمد فیضؔ کے تلامذہ اور تربیت یافتوں میں ہر طبقہ اور ہر فرقہ و مذہب کے افراد نظر آتے ہیں۔

انہوں نے جہاں خانوادۂ شاہی اور امرائے کبار کے نونہالوں مثلاً مرشدزادہ نواب مبارز الدولہ (فرزند نواب سکندر جاہ آصفجاہ سوم محمد بدرالدین خاں معظم الملک (فرزند نواب شمس الامرا امیر کبیر) اور صاحبزادہ آصف یار الملک (برادرزادہ و داماد نواب افضل الدولہ آصفجاہِ خامس) کو اپنے اثر سے میدانِ علم و عمل میں گامزن کردیا متعدد شرفا اور متوسط درجہ خاندانوں کے نوجوانوں مثلاً میر احمد علی عصرؔ حفیظ الدین پاسؔ اور جمال الدین مطلبؔ وغیرہ کو بھی آفتابِ شعر و سخن بناکر چمکا دیا۔

حضرت فیضؔ کے جملہ تلامذہ پر نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ذوقِ سخن اور کمالِ فن کے لحاظ سے جہاں اُنکے چار مسلمان شاگرد یعنے بدرالدین خاں تمیزؔ، مشرف جنگ فیاضؔ، احمد علی عصرؔ اور حفیظ الدین پاسؔ اِس کائنات تلامذہ کے عناصر اربعہ تھے اسی طرح گردھاری پرشاد باقیؔ جمیل پرشاد خرمؔ بھولا لال تمکینؔ اور بہاری لال رمزؔ ہندو شاگردوں کی دنیا کے عناصر اربعہ سمجھے جاسکتے ہیں ان اٹھوں تلامذۂ فیضؔ کو اس عظیم الشان ہستی کے دیگر فیض یافتوں پر کئی امور کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ علم و عمل کی قوتوں اور فیض رسانی کے لحاظ سے یہ آٹھوں قریب قریب ایک ہی سطح پر ہیں۔ لیکن حضرت فیضؔ کے سلسلۂ شعر و سخن کے جاری رکھنے میں سب سے زیادہ میر احمد علی عصرؔ محمد حفیظ الدین پاسؔ اور مشرف جنگ فیاضؔ نے حصہ لیا ہے۔ موخرالذکر نے ہر سال عرس کے موقعہ پر مشاعرہ اور گلدستۂ فیض کے ذریعہ سے اس فیضان کو جاری رکھا لیکن اول الذکر دو نے اپنے تلامذہ کے ذریعہ سے اپنے استاد کا نام چمکایا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہی دو استادانِ سخن نے حضرت فیضؔ کو استاد الاساتذہ ثابت کردیا۔

یونتو فیض کے بعض دیگر تلامذہ بھی استادی کے مرتبہ تک پہنچ چکے تھے اور ان میں خاص طور پر رمز مزاج وغیرہ کے بھی متعدد شاگرد تھے لیکن اس خصوص میں عصر اور یاس کو امتیازی شان حاصل ہے۔ اور الّول الذکر پر مرقع سخن کی جلد اول میں ایک مضمون شائع ہو چکا ہے یہاں موخر الذکر کی یاد تازہ کی جائیگی۔

محمد حفیظ الدین یاس کے دادا محمد حفیظ صاحب جمعدار سورت سے حیدر آباد آئے تھے۔ نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث نے اپنی ایک دختر جمال النساء بیگم صاحبہ کو سورت کے نواب تاج الدین خاں بہادر سے منسوب کیا تھا۔ اور نواب صاحب کو حیدر آباد دکن کا صوبہ بھی بنایا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے خدم و حشم کے ساتھ حیدر آباد چلے آئے۔ انہی ہمراہمراہ میں محمد حفیظ جمعدار بھی تھے جو آخر عمر تک نواب سورت کی ملازمت میں ممتاز رہے۔ ان کے فرزند غلام عبدالقادر صاحب عرف بنو میاں شہزادی جمال النساء بیگم کی سرکار میں بزمرۂ مرد آدمیاں بمواجب ۳۵ روپئیے ملازم تھے۔ اور وہیں رہتے تھے حفیظ الدین یاس انہی بنو میاں صاحب کے فرزند تھے لیکن ان کی تعلیم و تربیت ایسی اچھی ہوئی کہ یہ سپاہی پیشگی چھوڑ کر محکمۂ دار القضاء سرکار عالی میں مہتمم تعمیل دار القضاء مقرر ہوئے۔ چونکہ عربی و فارسی کی اچھی لیاقت پیدا کی تھی اور خوش سلیقہ اور وجیہہ الشان تھے بہت جلد ترقی حاصل کی اور منتظمی پولٹیکل فینانس پر مامور ہوئے۔ پھر تحصیلدار ہو گئے۔

شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق تھا اور بہت ممکن ہے کہ اسی ذوق اور حضرت فیض کے تلمذ نے بھی ان کی وجاہت اور اثر میں اضافہ کر دیا ہو۔ استاد کی زندگی ہی میں یہ بھی استادی کے رتبہ پر پہنچ چکے تھے۔ اور ان کے بعد تو عصر اور یاس دو ہی ایسے اساتذہ سمجھے جاتے تھے جن سے ایک کثیر تعداد مشورہ سخن کیا کرتی تھی۔ ان میں ملک کی خدمت کا خاص جذبہ تھا اور اہل ملک کی بے وقعتی اور تباہ حالی سے یہ بہت متاثر رہتے۔ چنانچہ جب حیدر آباد کے ایک مشہور شاعر سید رضی الدین حسن کیفی ان کے زمرۂ تلامذہ میں شریک ہوئے تو انکا تخلص زخمی سے بدل کر ملکی رکھدیا اور اس دور میں کیفی نے یہی تخلص اپنی غزلوں میں لکھا ہے۔

یاس کی شاعری فیض کے طرز سخن میں رنگی ہوئی تھی۔ وہ مطالب سے زیادہ الفاظ اور طرز ادا پر زور دیتے تھے۔ اُس زمانہ کا عام رجحان ہی یہ تھا تشبیہ و استعارات شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے اور انہی کے استعمال کی خوبی پر شاعر کی قدرت زبان اور علو مرتبہ کا انحصار تھا۔ یاس بہت پرگو شاعر تھے۔ اور ہر مشاعرہ کیلئے دو غزلہ سہ غزلہ لکھتے تھے۔

ہر گلدستۂ فیض میں اِن کی دو دو تین تین غزلیں شایع ہوتی تھیں۔ اور کلام میں بالعموم دلآویزی پائی جاتی۔

حفیظ الدین یاسؔ کے شاگردوں میں کیفیؔ کے علاوہ نواب لقمان الدّولہ دلؔ کو شہرت حاصل ہوئی۔ جو اعلیحضرت غفراں مکاں کے طبیب خاص اور بڑے با اثر اور سلیقہ مند بزرگ تھے۔ اِن دو کے علاوہ یاسؔ کے حسب ذیل شاگردوں کی غزلیں گلدستۂ فیض میں اکثر شایع ہوا کرتی تھیں۔ سید حسین ادیبؔ۔ محمد عبد الرحمٰن افضلؔ۔ میر دادر حسین داورؔ۔ محمد رشید الدین رشیدؔ سید رشید الدین رشیدؔ۔ شیخ یوسف علی فریدی عزیزؔ محمد کو ہیری فتحؔ اور عبد المجید مجیدؔ۔ ان میں محمد رشید الدین رشیدؔ خود یاسؔ ہی کے فرزند تھے۔ ان کے اور بھی لڑکے تھے مگر رشیدؔ کے سوا کسی کا کلام ۱۳۲۰ھ سے قبل کے گلدستہائے فیض میں نظر سے نہیں گذرا۔

یاسؔ نے مختلف سرکاری خدمات انجام دینے کے بعد غالباً ۱۳۲۰ھ میں پچاس روپیہ وظیفہ حسن خدمت لیکر خانہ نشینی اختیار کی۔ صاحب اخلاق، خوش وضع، اور قدیم طرز روش کے پابند تھے۔ اپنے آبائی مکان میں جو تیھر گھٹی میں جمال النساء بیگم صاحبہ کی پھاٹک میں واقع تھا بود و باش تھی۔ ان کا مکمل کلیات افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہو سکا۔ ورنہ جملہ اصناف سخن کے نمونے پیش کئے جا سکتے اور ان کی شاعری پر مجموعی حیثیت سے بحث کی جاتی۔ بحالت مجبوری اسوقت تک مختلف گلدستوں اور تذکروں سے جو بھی غزلیں مل سکیں انہی سے چند شعر بطور نمونہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ ان غزلوں کی فراہمی میں نواب محمد کریم الدین خاں صاحب سابق تحصیلدار خلف نواب مشرف جنگ فیاضؔ نے راقم مضمون کو جو قابل قدر مدد دی ہے اسکا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ مولوی معین الدین صاحب رہبر فاروقی کا بھی شکریہ ضروری ہے کہ انہوں نے یاسؔ کے کسی قریبی رشتہ دار سے انکے مرض الموت وغیرہ کے متعلق معلومات فراہم کیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "یاسؔ نے بعارضہ فالج ۲۹ رجب ۱۳۳۲ھ کو وفات پائی اور انکی قبر درگاہ حضرت یوسف صاحب و شریف صاحب قبلہ کے سامنے جو حوض ہے اسی کے متصل واقع ہے۔" یاسؔ کے ایک ہمعصر فارسی شاعر ترکیؔ نے انکی تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکالی ہے

ع پاسبان شد در قصر جنت یاسؔ (تذکرۂ سخنوران جمشید صفحہ ۲۲) یاسؔ بڑے سخن فہم اور صاحب ذوق شاعر تھے۔ مشہور ہے کہ حضرت غفراں مکاں نے ابتداء میں انہی کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ مشاعروں میں انکی شاعری اور شعر فہمی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بڑے سے بڑے شاعر کے کلام پر اعتراض اور تنقید سے نہیں جھجکتے تھے۔ نواب مرزا خاں داغؔ کے حریف مقابل سمجھے جاتے۔ اور اپنی وضعداری اور لیاقت کی وجہ سے خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قدیم اصحاب کی زبانی انکی شاعرانہ جودت اور تنقید کی اکثر روایتیں

سننے میں آتی ہیں۔ تذکرہ سخنوراں چشمدیدہ میں انکے ایک فارسی گو معاصر ترکی نے مہاراجہ بہادر کے حسب ذیل شعر کے سلسلہ میں لکھا ہے ؎

"فصل بہار آمد و عہد خزاں گزشت
باید زدست یار مے ارغواں گرفت

سوئید شیرازی و بہروز عراقی و پاس حیدرآبادی ہر سہ یک زباں شدہ گفتند در مصرعۂ ثانی مے ارغوانی بجائے نسبت می باید ورنہ شعر بے معنی خواہد شد۔ شعرائے حاضر الوقت کہ علم استادی خود بر فلک می افراشتند نام ایشاں نوشتن دریں جا سود ندارد از جواب فرو ماندند حضرت تمنا ؔ گویا خبر گرفتہ کہ اگر کدام سند داری پیش کن۔ فقیر تاب خوردہ بنیاں اظہار کرد کہ شراب شیراز و شیرازی در کلام اساتذہ آمدہ ہمچنیں شراب ارغواں و ارغوانی است"

پاس نے اسکی سند مانگی اور جب تک ترکی نے مستند شعر نہیں پیش کئے خاموش نہیں ہوئے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاس مہاراجہ یمین السلطنت شاد کے کلام پر بھی اعتراض کرنے سے نہیں ڈرتے تھے حالانکہ وہ اسوقت مدار المہام سلطنت تھے۔

نمونہ کلام پاس

مستی میں سیر عالم امکاں مدام ہے — جام جہاں نما مرے ساغر کا نام ہے
ہے دل میں بے شمار غم و حسرت و الم — اس مختصر مکاں میں کیا ازدحام ہے
جنت میں کب نصیب ہیں دنیا کی لذتیں — زاہد کی بندگی کو ہمارا سلام ہے
فرد رقم سے بھر گئے اوراق آسماں — مکتوب اشتیاق ابھی ناتمام ہے

پرہیز کیا کرے لیشر اس کارگاہ سے! — دنیا میں بچ سکے نہ فرشتے گناہ سے
ہم مثل نقش پا جو زمیں پر گرے تو کیا!! — وہ دیکھتے نہیں کبھی نیچی نگاہ سے
کہتے ہیں نکتہ سنج اسے حسن اتفاق!! — چہرہ کو زیب ہوگئی خال سیاہ سے
بدلی کو دیکھتے ہی بدل جائیگا مزاج — کبتک بچیں گے حضرت زاہد گناہ سے

دہان رخ کا دیکھیں کیا آیا کہ حیرت ہی تجھے — سینۂ صد پارہ سب آئینہ خانہ ہوگیا
کہیں آنے کے ہیں تو اب نہ کہیں جانے کے — ہم پڑے رہتے ہیں سایہ میں پری خانے کے
عوض بادہ چلی بادہ کشوں میں تلوار!! — آج ٹوٹے ہوئے دروازے جو میخانے کے
دل ناداں کہیں اس شوخ کی آنکھوں پہ نہ بھول — دیکھنے کے ہیں یہ بادام نہیں کھانے کے
پاک ہے پنبہ و روغن سے چراغ توحید — محفل یار میں پر جلتے ہیں پروانے کے

ادب سے دیکھ ہر اک خاکسار کی صورت　　اسی غبار میں ہے شہسوار کی صورت

ہوا جو خندۂ دنداں نما لب دریا!!　　اتر گئی گہر آبدار کی صورت

تمہارے خط سے نمودار ہے کدورت دل　　چھپائے سے نہیں چھپتی غبار کی صورت

چھپی نہ لاکھ چھپائے سے حشر میں آپاس　　قدح کشاں مئے خوش گوار کی صورت

* * *

ذرا تو آنکھ ملا کر مری طرف دیکھو　　جگر کے پار خدنگ نظر یہ کس کا ہے

دیا ہے آپ نے مٹی کی مورتوں کو شرف　　بشر ہو خاک کا پتلا ہنر یہ کس کا ہے

قتیل تیغ تبسم تو ہم ہوئے لیکن!　　کسی نے ہنس کے نہ پوچھا کہ سر یہ کس کا ہے

* * *

سبک ہیں معصیت کے بوجھ سے زلفوں کے دیوانے　　کہ گردن زیر بار منت زنجیر رکھتے ہیں!

جو سنتے ہیں مری بے تابیٔ دل کا تپ عامل　　تڑپ کر ہاتھ سے خامہ دم تحریر رکھتے ہیں

خبر کچھ اڑتی اڑتی آرہی ہے موسم گل کی　　زرآہنگ پر پدن بلبل تصویر رکھتے ہیں

* * *

کیفیت شراب الست اک بلا کی ہے　　معلوم ابتدا نہ خبر انتہا کی ہے!　　سامان موت صنعت خطی ہوا مجھے　　ترچھی نظر میں آپکی برچھی قضا کی ہے

جکڑ میں عقل ناخن عقدہ کشا کی ہے　　دل کی گرہ ہے یا تری بند قبا کی ہے

جمال روئے کتابی میان زلف دوتا　　شبیہ جلوۂ بین السطور ہوتا ہے

کس حسن سے خدا نے گنہگار کر دیا!　　مومن بنا کے بت کا پرستار کر دیا

ہوں درمیان عالم ہستی عدم نما!　　تن کو فراق نے کمر یار کر دیا

عمر اپنی دائرے میں عبث قنا کے طے ہوئی　　ہم نے طلب کو نقطۂ پرکار کر دیا

اے سرو نونہال گلستان حسن میں　　جھنڈا اگڑا ہوا ترے قد کا ابھی سے ہے

اور اک کتاب چاہئے تحریر کے لئے　　اعمال زشت کا یہ تقاضا ابھی سے ہے

سوز تب غم سے یہ ہوئی قلب کی حالت　　ہے موم کے مانند الٹتا ہوں جدھر سے

کرتا ہوں رقم وصف دہان و خط رخسار | ہوتی ہے مسیحا کی ملاقات خضر سے
سیراب زمانہ ہے مرے دیدۂ تر سے | آفاق میں پانی کہیں برسے کہ نہ برسے
حلقہ میں زلف کے خط قدرت سے خال ہے | نقطہ کا دایرے سے نکلنا محال ہے

ادس خط ولب کی جو زیبائی ہے خضری ہے نہ مسیحائی ہے! | لطف دیدار کا بینائی ہے!! شمع سے انجمن آرائی ہے
ایک تو فصل بہار آئی ہے کالی اوپر سے گھٹا چھائی ہے | دیکھ کر بادہ کشی رندوں کی! چرخ میں گنبد مینائی ہے
متعدد ہو نہیں سکتے امثال | یار کو دعوی یکتائی ہے!
نار مغرب سے اذان کا باندھا! | یہہ موذن کوئی سودائی ہے
صبح تک جاگتے گزری شب وصل | رات بھر نیند کسے آئی ہے!
کیا قیامت کے یہہ معنی تو نہیں | وعدۂ وصل جو فردائی ہے!
ریختہ خاص ہے ایجاد دکن | رنگ اسی جا سے زباں لائی ہے
یہہ تو سچ ہے مگر استاد کا فیض! | آبروئے سخن آرائی ہے
آدن ہجر میں ہم بھول گئے! | یاد ماضی تمنائی ہے

کھٹکتا ہے کٹورا فصل گل میں بادہ خواروں کا!!! | طبیعت زاہدان خشک کی کیا کیا ترستی ہے
وہی ہے نرخ اس کا جس قدر فضل الہی ہو | متاع قسمت عالم نہ مہنگی ہے نہ سستی ہے
قدامت کا لحاظ اسے پاس لازم ہے ہر انساں کو | کریں کیونکر نئی توبہ، پرانی مئے پرستی ہے

یہ دور بھی نہایت درخشاں رہا۔ حضرت آصف جاہ سادس سنہ ۱۳۲۹ھ جو آصف تخلّص فرماتے تھے، ادب نواز اور شعر و سخن کے قدر داں تھے اور باکمال شعرا کی سرپرستی بھی فرماتے تھے۔ ان کی علم نوازی اور قدردانی سخن کا شہرہ دور دور تھا یوں تو شمالی ہند کے باکمال شعرا کی آمد و رفت کا سلسلہ پہلے سے قائم ہو چکا تھا لیکن اس دور میں وہ اور مستحکم ہو گیا اِس باہمی میل جول کا شاعری پر بھی اچھا اثر پڑا۔ سب کا رجحان صحیح شاعری کی طرف تھا۔ ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا اور متّفقہ طور اصلاح زبان کی طرف خاص توجہ کی اس طرح رفتہ رفتہ متروکات کی بنیاد مضبوط ہوتی گئی۔

اس وقت حیدرآباد میں اچھے اچھے ذی کمال اور صاحب فن شعرا کچھ تو دکن ہی کے تھے اور کچھ باہر سے آئے ہوئے تھے جنکی ایک طویل (کئی صفحات کی) فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن بنظر اختصار آیندہ صفحات میں دکن اور شمالی ہند کے چند ممتاز و مشہور شعراء کے نام درج کئے گئے ہیں۔ اس دور کے جن شعراء کا تذکرہ مرقع سخن کی پہلی جلد میں شایع ہو چکا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مائل	ڈاکٹر احمد حسین۔	۱۲۷۴ تا ۱۳۳۲
۲۔ توفیق	سید جلال الدین	۱۲۸۱ تا ۱۳۳۹
۳۔ کیفی	سید رضی الدین حسن	۱۲۹۷ تا ۱۳۳۸

۴	شاد۔	مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت	۱۲۸۱
۵	عزیز۔	محمد عزیز الدینخاں عزیز یار جنگ	۱۲۹۰
۶	رسا	غلام مصطفےٰ	

موجودہ جلد میں حسب ذیل شعرا کے حالات اور تصانیف پر مکمل تبصرہ شایع کیا جا رہا ہے۔

۱	آصف	نواب میر محبوب علیخاں آصفجاہ سادس غفران مکان	۱۲۸۳ تا ۱۳۲۹
۲	وزیر	نواب میر وزیر علیخاں آصف یاور الملک	۱۲۶۸ تا ۱۳۲۹
۳	واصل	احمد اللہ	۱۲۷۰ تا ۱۳۳۶
۴	صفی	نواب میر اسد علیخاں حسام الملک خانخاں	۱۲۷۱ تا ۱۳۵۲
۵	حمزہ	شمس الدین محمد امیر حمزہ	۱۲۷۶ تا ۱۳۳۷
۶	مہدی	نواب سید محمد مہدی خاں	۱۲۷۷ تا ۱۳۳۷
۷	دل	محمد حیدر خاں لقمان الدولہ اشرف الحکماء	۱۲۷۷ تا ۱۳۴۰
۸	ولا	شمس العلماء احمد عبد العزیز عزیز جنگ	۱۲۷۷ تا ۱۳۴۴
۹	نامی	عبد الغفور خاں	۱۲۸۲
۱۰	الم	میر مہدی حسین	۱۲۸۳
۱۱	قادر	قادر حسین	۱۲۸۶ تا ۱۳۵۱
۱۲	واصفی	سید عبد الصمد	۱۲۸۸
۱۳	حسرت	محمد عبد القدیر صدیقی	۱۲۸۸
۱۴	اطہر	سید اعظم اللہ حسینی	۱۲۸۹
۱۵	وفائی	صاحبزادہ میر جہاندار علی خاں	۱۲۹۱
۱۶	شباب	صاحبزادہ میر معین الدین علیخاں	۱۲۹۶

اِس دور کے دیگر حیدرآبادی شعراء :۔ میر نادر حسین فرق۔ میر تراب علی زور۔ محمد حسین ساماں۔ محمد مظفر الدین معلےٰ۔
فیاض الدین فیاض۔ اقبال یار جنگ اقبال۔ غلام محمد عرب شوق۔ غلام علی جوش۔ میر دلاور علی دانش۔ میر حسین علیخاں امیر
سید مخدوم حسینی رفعت۔ سید احمد افسر۔ محمد وزیر الدین مہر۔ میر خیرات علی خاں سخی۔ میر محمد علی تخشی۔ امداد حسین عازم
میر محمد علی ریخ۔ سید نوازش علی لمعہ۔ نواب صادق جنگ حلم۔ خواجہ بہاء الدین وارا۔ صدیق احمد فہیم۔ عبد العلی طپش۔
منتخب الدین تجلی۔ میر نوازش علی مست۔ سید شاہ ابراہیم عفو۔ سید غلام محمد شاہ زعم۔ محی الدین محفوظ۔ اعظم علی شایق۔
وحید الدین عالی۔ احمد نواز جنگ فانی۔ ضیغم جنگ سرفراز۔ میر وزیر علی خاں جوش۔ عباس حسین خاں شہید۔ سید خواجہ دوست
شہاب الدین توقیر۔ سید محمد حسینی عقیل۔ عبد الحی بازغ۔ یٰسین بخش یٰسین۔ مجاہد الدین مجاہد۔ احتشام الدین تجلی۔ برہان علی محمود
عبد الوارث خاں وارث۔ محمد علی خاں ناظم۔ صولت جنگ عابد۔ عبد الولی فروغ۔ شایق حسین صفیر۔

جو شاعر اس دور میں حیدرآباد آئے :۔ سید کاظم حسین شفتہ لکھنوی۔ سید محمد کاظم حبیب کنتوری۔
حیدر یار جنگ نظم طبا طبائی۔ شمس الحق بیکس تھانوی۔ فصیح الملک داغ دہلوی۔ امیر احمد امیر مینائی۔ ظہیر الدین ظہیر دہلوی۔
احسان الحق زار دہلوی۔ نواب مرزا شکیب دہلوی۔ عبد الرحمٰن بیدل سہارنپوری۔ محمد باقر فکر کانپوری۔ امراد مرزا ناداں دہلوی
سید محمد شاہ وارثی بے نظیر۔ درگا پرشاد ذکا فتحپوری۔ نادر علی برتر قنوجی۔ عبد اللہ خاں ضیغم لکھنوی۔ نجم الدین ثاقب بدایونی۔ عابد مرزا بیگم
لکھنوی۔ سید محمد ضامن کنتوری۔ محمد جلال الدین اشک لکھنوی۔ فصاحت جنگ جلیل مانک پوری۔ اختر یار جنگ اختر مینائی۔
ابو الحمید آزاد دہلوی۔ منیر الدین ضیا دہلوی۔ امیر حسن فروغ لکھنوی۔ مرزا بہادر یاور۔ اصغر یار جنگ اصغر۔

اِس دور کے شمالی ہند کے باکمال شعراء :۔ میر مہدی مجروح۔ حکیم ضامن علی جلال لکھنوی۔ منشی امیر اللہ تسلیم دہلوی
عبد الرحمٰن راسخ دہلوی۔ ریاض احمد ریاض خیرآبادی۔ سید علی نقی صفی لکھنوی۔ مرزا ہادی عزیز لکھنوی۔ علی احسن احسن مارہروی
سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی۔ محمد نوح نوح ناروی۔ حکیم برہم برہم گورکھپوری۔ حفیظ جونپوری۔ احمد علی ندرداعی شوق
لکھنوی۔ وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی۔ محمد نوح شہیر مچھلی شہری۔ محمد محسن محسن کاکوروی۔ عبد الحی بیخود بدایونی۔ محمد جعفر اوج
سید علی شاد عظیم آبادی۔ امداد امام اثر عظیم آبادی۔ افتخار حسین مضطر خیرآبادی۔ وحید الدین احمد بیخود دہلوی۔

اور جدید طرز کے شعراء مثلاً محمد حسین آزاد۔ الطاف حسین حالی۔ محمد اسمٰعیل میرٹھی۔ اکبر حسین اکبر الہ آبادی۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی۔ برج نراین چکبست فیض آبادی۔

یہ دور نہ صرف دکن کے باکمال شاعروں بلکہ شمالی ہند کے اعلیٰ پایہ سخنوروں کی وجہ سے اردو شاعری کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے اساتذہ موجود تھے اور خاصکر فصیح الملک داغ اور امیر احمد امیر مینائی نیز شمس العلماء محمد حسین آزاد اور شمس العلماء الطاف حسین حالی کی شخصیتوں نے اس دور کو عہد آفریں بنا دیا تھا۔ موخر الذکر شعرا کو اگر جدید طرز کی شاعری کے موسسین کہا جاسکتا ہے تو اول الذکر دو ناخدائے سخن قدیم طرز کے خاتم الشعرا سمجھے جاسکتے ہیں۔
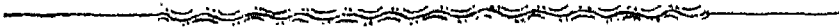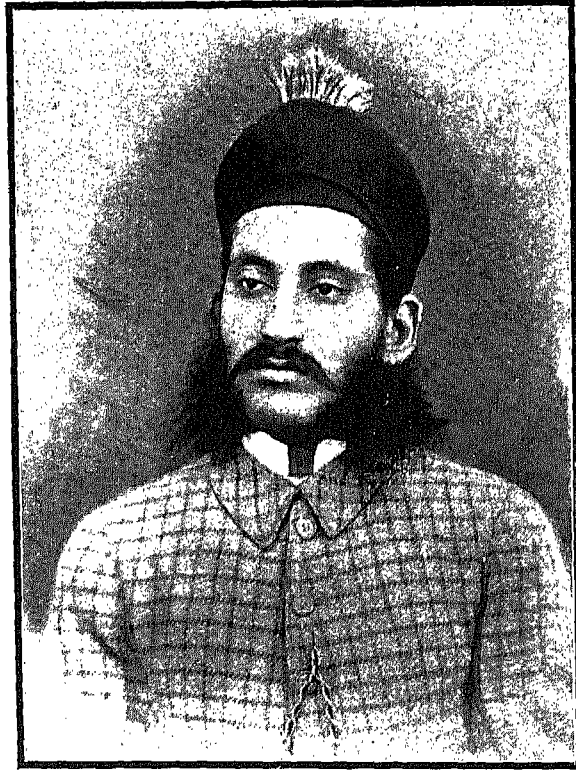
اعلحضرت نواب میر محبوب علی خاں غفراں مکاں آصفجاہ سادس

حیدر آباد پرنٹنگ ورکس

آصف

اعلیٰ حضرت آصفجاہ سادس نواب میر محبوب علیخاں غفران مکان

از

سید محمد تقی صاحب رضوی

سلسلۂ آصفیہ کے پانچویں فرمانروا نواب میر تہنیت علیخاں افضل الدولہ کو عظمت و حکومت و دولت و حشمت سبھی کچھ حاصل تھی بچے صاحبزادیاں اللہ نے دی تھیں لیکن وارث تخت سلطنت کی آرزو پادشاہ اور رعایا کے دلوں میں مدتوں رہی۔ آخر کار اللہ نے مخلوق کی دعائیں قبول فرمائیں اور ماں باپ کی تمنائیں بر آئیں۔

سنہ ۱۲۸۳ ہجری میں آٹھویں ربیع الثانی جمعہ کے دن حضرت آصف تولد ہوئے جنکو سے محلوں میں مبارک سلامت کی دھوم مچی شادیانے بجنے لگے سلامی کی توپوں نے بہجت و مسرت کا اعلان کیا۔ اہل شہر شادان و فرحاں ہوئے جگہ جگہ ممالک محروسہ میں ولادت کے جشن منائے گئے۔ اُمراء عظام رؤسا کرام اور حکام ذوی الاحترام نے بارگاہ شاہی میں نذریں پیش کیں، خلعت پائے شعراء نے تاریخیں لکھیں قصیدے گزرانے انعام و اکرام سے مالامال ہوئے۔

حضرت فیض رح نے یہ تاریخ کہا :-

در محل فضل الدولہ بہادر وقت شب   جلوہ گر شد بچہ شہزادۂ عالم پسند
سال تاریخ ولادت عقل کل با فیض گفت   گشت پیدا میر محبوب علی اقبال مند

۱۲۸۳ھ

ایک اور قطعہ تاریخ جو زیادہ مشہور ہوا اوسکا مادۂ تاریخ "چراغ دکھن" ہے۔

صاحب دربار آصف کا بیان ہے کہ اس تقریب میں لاکھوں روپیے ہزاروں اشرفیاں مشائخین کے نذر اور محتاجوں میں تقسیم ہوئیں۔ دو سال آٹھ ماہ تک حضرت آصف اپنے ذی قدر باپ کی آغوش محبت میں رہے۔ لیکن ان قلیل

کے اختتام پر نواب افضل الدولہ بہادر نے رحلت فرمائی تجہیز و تکفین سے قبل اعلیحضرت نواب میر محبوب علیخاں آصف کی تخت نشینی کا اعلان ہوا۔ اس فوری انتظام کے سبب شہر میں اور مضافات شہر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرح کا امن و سکون قائم ہوگیا۔

فاتحہ سوم کے دوسرے روز جملہ اراکین دولت اور رزیڈنٹ بہادر کی موجودگی میں دربار تخت نشینی منعقد ہوا۔ نونہال آصفی کی تخت نشینی کے بعد حاضرین دربار نے نذریں پیش کیں رزیڈنٹ بہادر نے مبارکباد دی۔

جب اعلیحضرت چار برس کے ہوئے تو رسم تسمیہ خوانی نہایت دھوم دھام سے منائی گئی۔ نواب مختار الملک مدار المہام اور نواب شمس الامراء بہادر نے اعلیحضرت کی تعلیم و تربیت کے انتظامات میں خاص دلچسپی لی۔ اساتذہ اور اتالیق چن چن کر رکھے گئے ساتھ پڑھنے اور کھیلنے کے لئے امراء اور معززین کے لڑکوں کا انتخاب ہوا نصابی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا بھی خاص اہتمام تھا اور باضابطہ فوجی تربیت بھی ہوئی۔ آپکی ذات جو ہر قابل تھی تعلیم و تربیت نے جامع الکمال بنا دیا علوم متداولہ کے ساتھ ساتھ فن شہسواری، نشانہ اندازی، شمشیر زنی، نیزہ بازی وغیرہ اور دوسرے تمام فنون سپہ گری میں اعلیحضرت کو خاصی دستگاہ حاصل تھی۔

ٹنٹ پکنگ میں وہ حیرت انگیز کمال حاصل کیا تھا کہ ایک ہی بھالے میں تین تین میخیں پرولیجاتے تھے بندوق سے اتنا نازک نشانہ اڑاتے تھے کہ بڑے بڑے قادر انداز ششدر رہ جاتے تھے۔ پھر دل ایسا قوی اور حوصلہ اتنا بلند کہ انتہائی خوف و خطر کے موقع پر بھی ارادہ میں فرق نہ آتا تھا جوں جوں خطرے میں اضافہ ہوتا استقلال اور بھی بڑھتا جاتا۔ اس قسم کے حالات اکثر شکار کے مواقع پر پیش آتے رہے ہیں۔

سنہ ۱۳۰۰ھ میں نواب مختار الملک کا انتقال ہوا اور سنہ ۱۳۰۱ھ میں اعلیحضرت نے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس وقت آپ کا سن اٹھارہ سال سے زائد نہ تھا مگر قدرت نے آپ کے توانا کندھوں پر تجربہ کا سر رکھدیا تھا۔ آپکے زمانہ حکومت میں حیدرآباد امن اور چین کے ساتھ آہستہ آہستہ ہر قسم کی ترقی کے زینے طے کرتا رہا۔

بہت سی خصوصیتیں حضرت غفران مکاں کی ذات میں جمع تھیں جن کی وجہ سے وہ بہت جلد "محبوب خلائق" بن گئے۔ ان کی وجاہت، شجاعت اور سخاوت نے انھیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ آپکے دربار کی شان و شوکت شاہان مغلیہ کے

پر شکوہ درباروں کی یاد تازہ کرتی تھی آپ کی دلبری اور دریا دلی رستم و حاتم کے کارناموں کو دل سے بھلا دیتی تھی ۔

آپ کے سیر و شکار کے بہت سارے واقعات ہیں جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں اعلیٰحضرت کو طبعاً شیر شکار سے دلچسپی تھی اور اس ضمن میں ملک کا دورہ بھی مطمح نظر تھا ۔ ہر موقع پر ہر داد خواہ بارگاہ حضور میں عرض معروض کر سکتا شعرا بھی شکار میں ساتھ ہوتے تھے اور شیر مارنے کی تہنیت میں تاریخیں اور قصائد لکھ لکھ کر پیش کرتے اور انعام و اکرام پاتے تھے ۔ اعلیٰحضرت کے بذل و نوال نے حاتم کی داد و دہش کو افسانۂ ماضی بنا دیا تھا ۔ جسے دیتے نہال کر دیتے ۔ کوئی بدقسمت ہی ہوتا جو ان کے پاس پہنچ کر محروم پھرتا ۔

اعلیٰحضرت اکثر راتوں کو بھیس بدل کر محل سے نکلتے اور شہر کے گلی کوچوں میں گشت کر کے رعایا کے حالات کا مشاہدہ فرماتے اور محتاجوں کی امداد فرماتے تھے ۔ اصلاح نفس کا بھی اتنا خیال تھا کہ اسی تبدیل ہیئت کے عالم میں اجنبیوں کی طرح باتوں باتوں میں بادشاہ وقت کا ذکر چھیڑ دیتے اور بڑے اشتیاق سے دریافت حال فرماتے ۔ لوگ بھی بے کھٹکے رئیس وقت کی نسبت اچھی بری رائے کا اظہار کرتے آپ بھی نہایت دلچسپی کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیتے اور غیروں کے آئینۂ خیال میں اپنا عکس جمال ملاحظہ فرما کر اصلاح حال فرماتے ۔ اس طرح یہ زندہ دل اور رعایا پرور بادشاہ اپنی اور اپنی رعایا کی اصلاح کی تدبیروں میں دن رات مصروف رہتا تھا ۔ ان کی یہ شب بیداریاں اصلاحات کے علاوہ سیکڑوں دلچسپ فسانوں کی پیدائش کا باعث ہوئیں جن میں واقعیت کو بھی بڑا دخل ہے یہ قصے اس عہد میں عام طور پر لوگوں کے نوک زبان تھے ۔ راتوں کو سونے سے پہلے مائیں مامائیں اور اتائیں بچوں کو یہ خواب آور کہانیاں سناتی تھیں اور رفع بیدار بنانے کے لئے اپنی طرف سے بھی ان میں خوب خوب نمک مرچ لگاتی تھیں ۔ اس کا ایک نہایت مفید سیاسی نتیجہ یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہر روز سو کر اٹھنے کے بعد بچوں اور بڑوں کے دلوں میں بادشاہ وقت کی محبت اور عزت دو چند بڑھ جاتی تھی یہ افسانے لوگوں کے سینوں میں ابھی تک محفوظ ہیں ۔ اور جب کبھی یہ لوگ اپنی یادداشت کی اس کائنات کو رنگ و آب دے کر محفل میں پیش کرتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص اثر پیدا ہوتا ہے ۔

اعلیٰحضرت تحریر و تقریر دونوں کے حاکم تھے ۔ ان کی نظم و نثر فرامین اور اسپیچیں اس دعوے پر شاہد عادل ہیں ۔ انہوں نے نہ صرف مال و دولت سے اردو (ادب) کی سرپرستی کی اور ملک میں ذوق ادب کو ترقی دی ، بلکہ اپنی زبان اور قلم سے بھی اردو زبان کی خدمت کی ۔ انہیں کے عہد کا یہ کارنامہ تھا کہ ممالک محروسہ کی دفتری زبان فارسی کی بجائے اردو قرار پائی ۔

کے اختتام پر نواب افضل الدولہ بہادر نے رحلت فرمائی۔ تجہیز و تکفین سے قبل اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خان آصف کی تخت نشینی
کا اعلان ہوا۔ اس فوری انتظام کے سبب شہر میں اور مضافات شہر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرح کا امن و سکون قائم ہو گیا۔

فاتحہ سوم کے دوسرے روز جملہ اراکین دولت اور رزیڈنٹ بہادر کی موجودگی میں دربار تخت نشینی منعقد ہوا۔
نونہال آصفی کی تخت نشینی کے بعد حاضرین دربار نے نذریں پیش کیں۔ رزیڈنٹ بہادر نے مبارکباد دی۔

جب اعلیٰحضرت چار برس کے ہوئے تو رسم بسم اللہ خوانی نہایت دھوم دھام سے منائی گئی۔ نواب مختار الملک مدار المہام وقت
اور نواب شمس الامراء بہادر نے اعلیٰحضرت کی تعلیم و تربیت کے انتظامات میں خاص دلچسپی لی۔ اساتذہ اور اتالیق چن چن کر رکھے
گئے۔ ساتھ پڑھنے اور کھیلنے کے لئے امراء اور معززین کے لڑکوں کا انتخاب ہوا۔ نصابی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا بھی خاص
اہتمام تھا اور باضابطہ فوجی تربیت بھی ہوئی۔ آپکی ذات جوہر قابل تھی تعلیم و تربیت نے جامع الکمال بنا دیا۔ علوم متداولہ
کے ساتھ ساتھ فن شہسواری، نشانہ اندازی، شمشیر زنی، نیزہ بازی وغیرہ اور دوسرے تمام فنون سپہ گری میں اعلیٰحضرت کو
خاصی دستگاہ حاصل تھی۔

ٹنٹ پکنگ میں وہ حیرت انگیز کمال حاصل کیا تھا کہ ایک ہی بھالے میں تین تین میخیں پرو لیجاتے تھے۔ بندوق سے
اتنا نازک نشانہ اڑاتے تھے کہ بڑے بڑے قادر انداز ششدر رہ جاتے تھے۔ پھر دل ایسا قوی اور حوصلہ اتنا بلند کہ انتہائی
خوف و خطر کے موقع پر بھی ارادہ میں فرق نہ آتا تھا۔ جوں جوں خطرے میں اضافہ ہوتا استقلال اور بھی بڑھتا جاتا۔ اس قسم کے
حالات اکثر شیر کے شکار کے مواقع پر پیش آتے رہے ہیں۔

سنہ ۱۳۰۰ھ میں نواب مختار الملک کا انتقال ہوا اور ۱۳۰۱ھ میں اعلیٰحضرت نے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس وقت
آپ کا سن اٹھارہ سال سے زائد نہ تھا مگر قدرت نے آپ کے توانا کندھوں پر تجربہ کا سر رکھ دیا تھا۔ آپکے زمانہ حکومت
میں حیدرآباد امن اور چین کے ساتھ آہستہ آہستہ ہر قسم کی ترقی کے زینے طے کرتا رہا۔

بہت سی خصوصیتیں حضرت غفران مکاں کی ذات میں جمع تھیں جن کی وجہ سے وہ بہت جلد ”محبوب خلائق“
بن گئے۔ ان کی وجاہت، شجاعت اور سخاوت نے انہیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ آپکے دربار کی شان و شوکت شاہان مغلیہ کے

پرشکوہ درباروں کی یاد تازہ کرتی تھی آپ کی دلبری اور دریا دلی رستم وحاتم کے کارناموں کو دل سے بھلا دیتی تھی ۔

آپ کے سیر و شکار کے بہت سارے واقعات ہیں جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں اعلیٰ حضرت کو طبعاً شیر کے شکار سے دلچسپی تھی اور اس ضمن میں ملک کا دورہ بھی مطمح نظر تھا۔ ہر موقع پر ہر دادخواہ بارگاہ حضور میں عرض معروض کر سکتا تھا شعراء بھی شکار میں ساتھ ہوتے تھے اور شیر مارنے کی تہنیت میں تاریخیں اور قصائد لکھ کر پیش کرتے اور انعام واکرام پاتے تھے ۔ اعلیٰ حضرت کے بذل و نوال نے حاتم کی داد و دہش کو افسانہ ماضی بنا دیا تھا۔ جسے دیتے نہال کر دیتے ۔ کوئی بد قسمت ہی ہوتا جو ان کے پاس پہنچ کر محروم پھرتا

اعلیٰ حضرت اکثر راتوں کو بھیس بدل کر محل سے نکلتے اور شہر کے گلی کوچوں میں گشت کر کے رعایا کے حالات کا مشاہدہ فرماتے اور محتاجوں کی امداد فرماتے تھے ۔ اصلاح نفس کا بھی اتنا خیال تھا کہ اسی تبدیل ہیئت کے عالم میں اجنبیوں کی طرح باتوں باتوں میں بادشاہ وقت کا ذکر چھیڑ دیتے اور بڑے اشتیاق سے دریافت حال فرماتے ۔ لوگ بھی بے کھٹکے رئیس وقت کی نسبت اچھی بری رائے کا اظہار کرتے آپ بھی نہایت دلچسپی کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیتے اور دوسروں کے آئینہ خیال میں اپنا عکس جمال ملاحظہ فرما کر اصلاح حال فرماتے۔ اس طرح یہ زندہ دل اور رعایا پرور بادشاہ اپنی اور اپنی رعایا کی اصلاح کی تدبیروں میں دن رات مصروف رہتا تھا ۔ ان کی یہ شب بیداریاں اصلاحات کے علاوہ سیکڑوں دلچسپ افسانوں کی پیدائش کا باعث ہوئیں جن میں حقیقت واقعہ کو بھی بڑا دخل ہے یہ قصے اس عہد میں عام طور پر لوگوں کے نوک زبان تھے ۔ راتوں کو سونے سے پہلے مائیں مامائیں اور انائیں بچوں کو یہ خواب آور کہانیاں سناتی تھیں اور رمز پیدا بنانے کے لئے اپنی طرف سے بھی ان میں خوب خوب نمک مرچ لگاتی تھیں۔ اس کا ایک نہایت مفید سیاسی نتیجہ یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہر روز سو کر اٹھنے کے بعد بچوں اور بڑوں کے دلوں میں بادشاہ وقت کی محبت اور عزت دوچند بڑھ جاتی تھی یہ افسانے لوگوں کے سینوں میں ابھی تک محفوظ ہیں ۔ اور جب کبھی یہ لوگ اپنی یادداشت کی اس کائنات کو رنگ و آب دے کر محفل میں پیش کرتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص اثر پیدا ہوتا ہے ۔

اعلیٰ حضرت تحریر و تقریر دونوں کے حاکم تھے ۔ ان کی نظم و نثر فرامین اور اسپیچیں اس دعوے پر شاہد عادل ہیں انھوں نے نہ صرف مال و دولت سے اردو (ادب) کی سرپرستی کی اور ملک میں ذوق ادب کو ترقی دی، بلکہ اپنی زبان اور قلم سے بھی اردو زبان کی خدمت کی ۔ انہیں کے عہد کا یہ کارنامہ تھا کہ ممالک محروسہ کی دفتری زبان فارسی کی بجائے اردو قرار پائی ۔

یہ وہ عزت تھی جو اُسے نہ دلی میں نصیب ہوئی اور نہ لکھنؤ میں یہی وہ احسان تھا جس نے اردو کو موت کے منہ سے کھینچ نکالا اور حیات جدید عطا کی۔ ورنہ غدر کے زمانہ میں سب سے پہلے بیچاری سولی پر چڑھا دی جاتی۔

حضرت آصف اردو کے نہایت پرگو شاعر تھے اُن کی ہر غزل قافیہ کی رسائی تک طولانی ہوتی ہے مگر زبان کی شستگی محاوروں کی برجستگی خیالات کی صفائی اور انداز بیاں کی سلاست ہاتھ سے جانے نہیں پاتی۔ آصف کا دیوان چھپ جاتا تو اس میں شک نہیں کہ ادب اردو کا قابلِ قدر اضافہ سمجھا جاتا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ انھوں نے کس کس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اُن کی وہ غزلیں جو بعض گلدستوں میں چھپی ہیں یا اڈیسوں کی جوابی نظمیں جو تاریخوں یا تذکروں میں شائع ہوئی ہیں یا وہ سلام جنھیں اہلِ ذوق نے مجلسوں میں سن کر نقل کر لیا ہمارے مقالے کی کائنات ہیں۔ مگر جو کچھ بھی مواد ہمارے پاس ہے وہ آصف کی طبع رنگین کا اندازہ کرنے کے لئے کافی نہیں تو ناکافی بھی نہیں۔

شعر و سخن میں آپ استاد داغ دہلوی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ہزار روپیہ ماہوار و فصیح الملک کے خطاب سے انھیں سرفراز فرمایا تھا۔

آپ کے کلام کا نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جو محبوب الکلام وغیرہ سے لیا گیا ہے۔

غزل

انداز شوخ شوخ جو ملتے ہیں یار کے
اپنا نہ دیکھے کوئی دل بیقرار کے

وعدے کا انتظار کہاں تک کرے کوئی
ناچار ہم بھی بیٹھ رہے دل کو مار کے

افتاد اس کی کیوں نہ قیامت بپا کرے
فتنے قدم سے اٹھتے ہیں اس شہسوار کے

اس کی نشیلی آنکھوں سے ایمان کب بچے
دشمن یہ دونوں مست ہیں پرہیزگار کے

یہ دل نہیں ہے زلف بگڑ کر جو پھر بنے
اس کو کہیں بگاڑ نہ دینا سنوار کے

آصف سے ہم نے پوچھا جو مذہب تو یہ کہا
ہم ہیں غلام پنجتن و چار یار کے

ذیل میں حضرت آصف کی اور تین غزلیں درج کی جاتی ہیں جن کے مطالعہ سے انکے رنگ تغزل کا اندازہ ہوگا :۔

وہ بھی کیا دن تھے! ہمیں غم سے سروکار نہ تھا	دل کو ارمان نہ تھا جان کو آزار نہ تھا
جان دینا نہ تڑپ کر یہ دو بیمار نہ تھا	دل پہ جب ہاتھ نہ رکھا تم نے تو آزار نہ تھا
ایلچی کو بھی کوئی قتل کیا کرتا ہے ؟	میں خطاوار تھا قاصد تو خطاوار نہ تھا
وجہ کیا؟ اس کو قلمبند کیا آپ نے کیوں؟	یہ تو روداد غم ہجر تھی اظہار نہ تھا
منصفی شرط ہے شایان کرم غیر ہی تھے؟	میں ترے جور و ستم کا بھی سزاوار نہ تھا
حسرت مشق ستم کیوں نہ دل میں رہتی؟	میں تو حاضر تھا اگر کوئی خطاوار نہ تھا
وہ شب وصل بناوٹ سے بگڑنا اس کا	غصہ تھا قہر تھا اخلاص تھا پیار نہ تھا
دور ہی سے وہ مجھے دیکھ کے فرماتے ہیں	نہ ہوا ہے کبھی ایسوں سے سروکار، نہ تھا

لیجئے غیر سے وہ دل بھی نباہی گئی
آپ کے ذہن میں آصف تو وفادار نہ تھا

(۲)

محشر میں کون دوست ہی مجھ داد خواہ کا	دل اپنی راہ کا ہے جگر اپنی راہ کا	دیکھا یہ شعبدہ تری چشم سیاہ کا	محفل میں ہو گیا ہے تماشا نگاہ کا
دل حکمراں ہے لشکر بیداد و آہ کا	سردار ہی کے دم سے ہے بڑھنا سپاہ کا	وہ دیکھتے ہیں حشر میں منہ داد خواہ کا	یہ دیکھنا ہے ناز سے پھرنا نگاہ کا
اک ہاتھ اور بھی تجھے قاتل قسم مری	اک شور اٹھے چار طرف واہ واہ کا	آجائے گرم دشت زمانہ نگاہ میں	ہنگامہ دیکھ لو جو مرے اشک و آہ کا
سنتا ہے کون حشر میں مجھ داد خواہ کی	سنتے ہیں عذر یار سب عذر خواہ کا	آصف سے یہ چھٹا ہے نہ ہرگز چھٹے کبھی	لپکا ہے آنکھ و دل کا جسے ہے نگاہ کا

(۳)

جب اس کے کام کا نہ مرے کام کا ہے دل	پھر کس مرض کی بار خدایا دوا ہے دل	اس سنگ دل کے جور و جفا پر فدا ہے دل	کمبخت میری جان کے پیچھے پڑا ہے دل
کچھ وسعت زمین و فلک کی نہیں بساط	گر حوصلہ ہو دل میں تو سب سے بڑا ہے دل	اک بے کسی تلاش کیے خاک چھانئے	کشتہ کے جو نقش کو پھر کیا ہے دل
انجام کیا ہو دیکھئے اس اختلاف کا	سنتا ہوں دل کی میں نہ مری مانتا ہے دل	آصف کا امتحان تو کیا منصفی بھی کر	یہ ہر کسی کا حوصلہ ہر ایک کا ہے دل

سالگرہ مبارک کے موقع پر ممالک محروسہ کے مختلف طبقات کی جانب سے سپاس نامے پیش ہوتے تھے اور اعلیٰحضرت ہر سپاس نامے کے جواب میں فرداً فرداً تقریر فرماتے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے انہیں جمع کیا ہے۔ یہ تقریریں نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔ طلبہ کی طرف سے جو اڈریس پیش ہوا تھا اس کی جوابی تقریر کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :-

میرے پیارے عزیز طلبا!

"تمھارا ایڈریس لینے میں مجھے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوئی کیونکہ تمھاری ترقی علم و فضل میں بمقابل دیگر امور کے مجھے زیادہ دلچسپی ہے۔ میں تم کو اپنے گلشن ریاست کے ہونہار پودے سمجھتا ہوں جس طرح ہر باغبان اپنے باغ کے بڑے اشجار کی حفاظت سے زیادہ چھوٹے درختوں کی نشو و نما کی نگرانی کرتا ہے اسی طرح میری توجہ اپنے نونہال و عزیز طالب العلم رعایا کی طرف زیادہ مائل رہتی ہے۔ تمھاری ترقی علم اور تہذیب اخلاق سے میرے ملک کیلئے بہت کچھ فائدہ کی امید کیجاسکتی ہے اور یقیناً تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو آٹھ دس سال کے بعد اس ریاست کے لئے ہر ایک کارگزار عہدہ دار خیرخواہ وفادار رعایا ہوں گے پس اس وقت تمھاری تعلیم میں جس قدر کوشش کی جائے اس کا عمدہ اثر نہ صرف تمھاری ذات پر منحصر رہے گا بلکہ اس سے تجاوز کر کے تمھارے ذریعے سے ملک کی عام بہبودی و ترقی کو مستحکم کریگا پس تمھارے لئے یہی وقت ہے کہ تم اپنی آئندہ بہبودی کا سٹر یہ جس قدر جلد ہو سکے جد و جہد کیساتھ حاصل کریں"۔

(ماخوذ از دربار آصف)

طلباء سے خطاب

علم کی قدر کرو قدر کرو قدر کرو	تم کو اللہ نے بخشی ہے اگر طبع سلیم
سمجھو سمجھو وہ نکات اور وہ اسرار و رموز	دیکھو دیکھو وہ کتب جو ہیں جدید اور قدیم
علم ہے اس کی دوا اور دوا بھی اکسیر	ہر جہالت بھی ہے منجملہ امراض سقیم
طالب علم ہو کی اور ہو استاد شفیق	کیوں پسندیدہ نہ ہوں ایسے تعلم تعلیم

فہم و دانش کی ترقی کا یہی باعث ہے ۔۔۔ علم کی وجہ سے ہیں حضرت لقمان حکیم
قابلِ صحبت شاہان و سلاطیں ہے وہی ۔۔۔ عزت اس کی ہے زمانے میں جو کہلائے فہیم
یہ جو آصف نے کہا غور سے اس کو سمجھو
علم وہ شئے ہے کہ اللہ کا ہے نام علیم

(ماخوذ از دربار آصف)

خطاب بہ افواج

اے جاں نثار فوج ظفر موج شکر ہے ۔۔۔ جوہر ہیں تم میں صورت شمشیر آبدار
رخ رخ سے مرد مرد کے مردانگی عیاں ۔۔۔ رگ رگ سے فرد فرد کے جرأت ہے آشکار
ایسے سپاہیوں کی سپاہی کو قدر ہے ۔۔۔ تعریف کیوں نہ آئے مرے لب پہ بار بار
فنِ سپہ گری مری میراث جد کی ہے
اس سے ہی میرا نام ہے اس سے ہی افتخار

(ماخوذ از دربار آصف)

اعلیحضرت کو غزل گوئی کا شوق عنفوان شباب سے تھا اور مشق کا یہ عالم تھا کہ ہر صنف پر یکساں قدرت تھی کیا رباعیات کیا قطعے کیا سلام عثمان بازار تیلی باولی کے محاذی نواب مرزا فیاض علیخاں مرحوم کی شاندار کوٹھی میں دھوم دھام سے ماہ محرم میں مجلس منعقد ہوتی تھیں اوج و رشید وغیرہ باہر سے بلائے جاتے بارہ بوقت تک مرثیہ خوانی کی گرم بازاری تھی ازدحام خلائق کے علاوہ امراء و اعزا بھی شرکت کی سعادت حاصل کرتے اعلیحضرت نے بھی دو ایک دفعہ رونق افروز ہوکر مجلس کی رونق میں اضافہ فرمایا تھا اور کئی دفعہ آپ کا سلام اور رباعیات بھی منبر پہ پڑھی گئی ہیں۔ ہم ایک سلام کے چند شعر ذیل میں درج کرتے ہیں۔

سوئے مقتل جو تشنہ جگر آتے ہیں ۔۔۔ لشکرِ جن و ملک پیٹتے سر آتے ہیں
ہائے کیا نام ہے شبیر کا اے نسل علی ۔۔۔ دردمندوں کے دل اس نام سے بھر آتے ہیں
شاید اب ماتم سرور کا زمانہ ہے قریب ۔۔۔ جگر و دل مرے بیتاب نظر آتے ہیں
خونِ دل نے مرے اشکوں کی بدل دی صورت ۔۔۔ پہلے کچھ اور تھے اب اور نظر آتے ہیں

شرکتِ محفلِ ماتم کوئی آسان نہیں — لوگ تھامے ہوئے ہاتھوں سے جگر آتے ہیں
دل میں ہو داغِ محبت تو ملے دل کی مراد — بھول کے بدلے درختوں میں ثمر آتے ہیں

کیا تصوّر میں ہے قوت کہ جگر بندِ رسول — بن کے تصویر مرے دل میں نظر آتے ہیں
کیا تماشہ ہے ترستی ہے نظر جن کیلئے — جلوہ افروز وہی دل میں نظر آتے ہیں

آخر میں حضرت غفران مکاں کی دو رباعیاں لکھ کر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں:-

جو خاص ہیں بنتے ہیں وہ ہم عوام — پابند طمع ہو کے عبث ہو بدنام
جو اہلِ دیانت ہیں جو ہیں خیر اندیش — ہر حال میں ہی اپنے انھیں کام سے کام

دن کے لئے واجب ہے ضیائے خورشید — لازم ہے کہ پانی ہو زراعت کو مفید
یہ لازم و ملزوم ہمیشہ سے ہے — آقا سے ملازم کی بر آئے امید

نواب میر وزیر علی خاں برقرار جنگ آصف یار الملک وزیر مرحوم

وزیر

صاحبزادہ نواب میر وزیر علیخان برقرار جنگ

آصف یار الدولہ آصف یار الملک مرحوم

۱۲۶۸ھ تا ۱۳۲۹ھ

از صاحبزادہ میر محمد علیخان صاحب میکش

خانوادۂ آصفیہ کے اراکین کی علمی دلچسپیاں اور سرپرستیاں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ انکے دربار محفلیں علمی و ادبی مشاغل کی جولانگاہ رہا کی ہیں اور انھوں نے علم پروری کی ایسی مثالیں قائم کی ہیں جو تاریخ دکن میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

خاندانِ شاہی کی ان ممتاز ہستیوں میں جنھوں نے اپنے علمی شغف کے باعث دنیا میں ایسے کارنامے چھوڑے ہیں، جو اہلِ ذوق کو دعوت نظر دیتے ہیں، صاحبزادہ میر وزیر علی خاں مرحوم کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔

نواب وزیر علی خاں، ملک میں ایک خاص اعزاز کے مالک تھے۔ تمام امرائے عظام اور عمائدین سلطنت ان کی خاطر خواہ عزت کرتے تھے۔ وہ شاہی خاندان سے وابستہ تھے۔ ان کے والد نواب بابر جنگ بہادر نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث کے پوترے یعنے نواب صمصام الملک کے فرزند تھے۔ نواب وزیر علیخاں ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور عام طور پر وزیر علی پاشا کہلاتے تھے۔ تاجدار دکن نے انکو برقرار جنگ آصف یار الدولہ آصف یار الملک کے خطابات اور اعزازات سے سرفراز فرمایا تھا۔ ان کی شادی، نواب افضل الدولہ غفران مآب کی صاحبزادی سراج النساء بیگم سے جو ان کی چچازاد بہن ہوتی تھیں، ۱۲۹۵ھ میں ہوئی انکے بطن سے اولاد نہیں۔ دوسری بیوی سے دو صاحبزادے تولد ہوئے جنمیں سے بڑے فرزند کا نام چراغ علی خاں اور فرزند ثانی کا نام میر بہادر علیخاں ہے۔

صاحبزادہ وزیر علیخاں کی تعلیم مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی جو اس زمانہ کی واحد علمی درسگاہ تھی عربی اور فارسی میں ان کو خاص مہارت تھی اور علمی محفلوں میں وہ بڑی عظمت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

وہ بہت خوددار اور پابند وضع امیر تھے۔ ان کو اپنے خاندان کا بہت پاس و لحاظ تھا اور جب کبھی موقع ملتا وہ اپنے خاندا

کی ممکنہ امداد سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ انکے کردار کی یہ وہ قابل تعریف خصوصیت ہے جو بہت کم با اعزاز شخصیتوں کے حصہ میں آتی ہے۔ شاہ پرستی کو وہ اپنے ایمان کا جزو سمجھتے تھے اور انکے دل میں جاں نثارانہ جذبات تاج و تخت کی نسبت ہمیشہ موجزن رہتے تھے۔ چنانچہ اکثر اشعار سے ان کے ان احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔

آصفِ وقت، سکندر رسا تیرا ہو طالع　　اور ہر کام میں ناصر ہو زمانہ تیرا

اے شہنشاہِ زمن، کیوں نہ ثنا خواں ہو وزیر　　حیدرآباد دکن کا ہے ترے سر سہرا

قیامت تک رہے نام و نشاں سرکارِ عالی کا　　زمیں سرکار کی ہو آسماں سرکارِ عالی کا

حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخاں کی تقریب شادی کے سہراگین موقع پر انہوں نے جو سہرا کہا تھا اس کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں:-

دیکھوں سر پر ترے محبوب ولاور سہرا　　عالم افروز، درخشندہ و خوشتر سہرا

رشتۂ تارِ شعاعی سے عجب حسن کے ساتھ　　گوندھ کر لایا ہے خورشید منور سہرا

بزم عالم میں ہے اک ایک بشر کے لب پر　　ہو مبارک تجھے اے رشکِ سکندر سہرا

اسکے بعد جب آصفجاہ سابع اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں بہادر تولد ہوئے تو انہوں نے جھولے کی رسم کی تقریب میں ایک نظم مبارکباد عرض کی تھی:-

فضلِ حق سے جو مرے شاہ کا بالا جھولا　　کہکشاں ڈوری بنی، چاند کا ٹکڑا جھولا

اس میں آسودہ ہے شہزادۂ سلطانِ دکن　　تختِ شاہی سے ہے رتبہ میں دوبالا جھولا

ساتھ ہر جھونکے کے ہے موج ہوا کے جھونکے　　آشنا لہر میں کہتے ہیں کہ دریا جھولا

انکو شاعری سے خاص ذوق تھا۔ وزیر تخلص کرتے تھے۔ حضرت شمس الدین فیض کے تلمیذ رشید میر احمد علی عصر سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور استاد الاساتذہ سے دلی عقیدت تھی جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:-

حضرتِ فیض تھے سلطانِ سخن سنئے وزیر　　ہم نے ہر فن میں اس استاد کو یکتا دیکھا

ملکِ سخنوری کی ہے سر سے سلطنت　　ہم اے وزیر خاص ہیں خدمت گزارِ فیض

شاگردوں میں نسبت تھی عزیز ہے یاد　　کہلائے اسی وجہ سے ہم بھی جگرِ فیض

اپنے استاد کو آتش اور ناسخ سے بھی زیادہ بلند پایہ سمجھتے تھے۔

کہنے کو تو ہیں آتش و ناسخ سے ہزاروں　　　اوستاد کے مانند سخنداں نہیں دیکھا

حضرت غفران مکاں کی چہل سالہ جوبلی میں جو سرکاری مشاعرہ ہوا تھا۔ اسکی صدارت انھوں نے ہی کی تھی اور حضرت فیض کے عرس کی تقریب میں جو شاندار مشاعرے سالانہ ہوا کرتے تھے، ان کے صدر نشین بھی اکثر وہی رہا کرتے تھے۔

انکا ۲۲ شوال ۱۳۲۹ھ کو انتقال ہوا اور درگاہ حضرت برہنہ شاہ صاحب کے احاطہ میں دفن کئے گئے۔

ان کا ایک قلمی دیوان ہے جس کو خود انھوں نے "چمنستانِ سخن" سے موسوم کیا تھا۔ دیوان پر ۲۶ صفر المظفر ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۲ اسفندار ۱۳۲۲ف تاریخ درج ہے۔ غالباً یہ تاریخ کتابت دیوان کی ہے جو ان کی وفات کے دو سال بعد مرتب ہوا۔ اس لحاظ سے دیوان وزیر آج سے (۷۵) سال پہلے کی دکنی شاعرانہ سرگرمیوں کی ایک خوش گوار یادگار ہے۔

دیوانِ وزیر تقریباً (۱۶۵) صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں غزلوں کے علاوہ بعض مسلسل نظمیں بھی ملتی ہیں جو بزرگانِ دین کی مدح یا شاہانِ دکن کی توصیف میں رقم کی گئی ہیں۔

وزیر کی غزلوں میں تخیل اور سلاست زبان کے ساتھ ساتھ جابجا شوخی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ انداز بیان بے ساختہ پن کی ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے:۔

مری نظروں میں ہے وہ آنکھ لڑانا تیرا　　　آنکھ تھی عشق کی تھا حسن جوانی کو غرور
کیا یہ دستور ہے فقروں میں اڑانا تیرا　　　مجھ ہوا خواہ کو رکھتا ہے ہوا کے اوپر

اس پری زاد نے باتوں میں اڑایا تجھ کو　　　اڑ نہ چل، او دل دیوانہ! میں کہتا تھا تجھے

غرض یہ اور اسی قسم کے کئی اشعار وزیر کی شوخ طبعی کے غماز ہیں۔ سلاست زبان کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

رہبر کو اپنے ہاتھ سے رہزن بنا لیا　　　بیٹھے بٹھائے دوست کو دشمن بنا لیا　　　دھن میں دہنِ تنگ کے ہر اک ہے گم　　　کس شخص کو انگشت بدنداں نہیں دیکھا

آپ میں جب نہ رہا آپ کا کٹ میر گزر　　　دیکھا جب آپ کو پھر آپ میں آیا نہ گیا　　　آدمی سیکھے ہے کچھ لکھ کے، پڑھ کے شہ پر　　　بن گئے گر بڑے ہو دوں سے بگھڑ نام اول کا

نہیں مطلب کسی خانہ نشیں سے　　　ہے پھر جا کس لئے گھر گھر ہمارا　　　سچ ہے نہیں جدائی میں کچھ اپنی خودی　　　نزدیک جب وہ آئے تو اپنے سے دور تھا

جان کر صاف ہوتے ہیں انجان　　　صلح میں ہے مزا لڑائی کا　　　بعد مدت کے وہ پھر آتے ہیں روز افزا　　　دیکھئے باتوں میں جاتی ہے کدھر آج کی رات

ان اشعار سے بلندیٔ تخیل کا ثبوت ملتا ہے۔

جانتے ہیں جسے دل ہے وہی دلبر اپنا عشق ہی حسن ہوا، روپ بدل کر اپنا رہ کے پابند جو دہی نام صدا اپنا ہے تیغ کے دل سے مرض ماہ تمام کا نہ گیا

صورت حق مجھے ہر بت میں نظر آتی ہے یہ مرا کفر ہی اک معنیٔ ایمان ہوگا نہ دھواں اٹھا نہ لو بھڑکی ہوا خاکستر کس سے سیکھا ہے حسینوں نے جلانا دل کا

جو دیر میں تھا نار، حرم میں وہ نور تھا دونوں مکاں میں ایک مکیں کا ظہور تھا پانی پانی ہو کے غیرت سے گھٹا جاتا ہے ہے ہمارا دیدۂ گریاں سمندر کا جواب

بسا ہے میری نظر میں جمال عارض و زلف ہے دھوپ چھاؤں یہ بلبل بہار کی صورت بود و نبود عالم، اثبات و نفی ہستی ویران ہیں تو ہم ہیں، آباد ہیں تو ہم ہیں

حضرت وزیر کے کلام میں بعض ایسے بصیرت افروز اشعار بھی ملتے ہیں جن کو شاعر کا پیغام سمجھنا چاہئے۔

اس عشرت دو روزہ پہ تو بھول کر نہ پھول کیا اعتبار زندگیٔ مستعار کا جو شخص کرے عالم پستی کو اختیار زینہ نہ کیوں بلند ہو اس خاکسار کا

پامال ان کے کاسۂ سر ٹھوکروں میں ہیں دو دن کی زندگی پہ جنہیں یاں غرور تھا تمہارے بعد تمہیں خلق یاد کرتی رہے کرو جہان میں تم ایسا کوئی کام نیا

یہ لکھا جا چکا ہے کہ حضرت وزیر اپنے بادشاہ سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں انکی کئی نظمیں دیوان میں پائی جاتی ہیں۔ جنمیں شاہ دکن کی مدح کی گئی ہے اور مختلف شاہی تقریبوں کے موقع پر مبارکباد کے پیرایہ میں جاں نثارانہ اور دعائیہ جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

جمال بے مثالی ہے جلالت اعلیٰحضرت کی ہے دولت اعلیٰحضرت کی ہے عظمت اعلیٰحضرت کی رشک گلزار ارم ہے حیدرآباد دکن حسن لطف باغبانی سے شہ ذیجاہ کے

اپنا کعبہ آستانہ ہے شہ محبوب کا کیوں نہ ہم شاکر رہیں بندے ہیں اس درگاہ کے عقدہ کشا ہے شان نظام شہ دکن مشکل کے کام بن گئے آسان نئے نئے

دولت قارون نہ فخر حکمرانی چاہئے ہم کو سلطان دکن کی مہربانی چاہئے وصف وہ لکھے جو ہو پیغمبر ملک سخن مدح شہ کے واسطے معجز بیانی چاہئے

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت سے انکے مخلصانہ تعلقات تھے چنانچہ بعض اشعار سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔

شاد کرتی ہے ہر اک دل کو زیارت شاد کی دھوم ہے گلزار عالم میں صبا کے باد کی بہ جبر حسن کر دل احباب شاداں ہو گئے مشتمل راجہ کشن پرشاد دیواں ہو گئے

حضرت وزیر کو بزرگان دین سے بہت عقیدت تھی۔ آنحضرت صلعم، اہل بیت اطہار، حضرت غوث اعظم اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی مدح میں انھوں نے کئی نظمیں لکھیں چند منتخب شعر ذیل میں درج ہیں۔

ہے سینہ لیے کینہ مرا کوئے مدینہ ہر سانس سے آتی ہے مجھے بوئے مدینہ ہو فہم کیا ہم سے صفت داستان اہل بیت لا بیاں کہتے ہیں جس کو ہے بیان اہل بیت

نہ بھولیں گے کبھی ہم راہ حق کی ہمارے رہنما ہیں غوث اعظم اسرار حق دین کو اعجاز سخن کو الہام غیب جانا گویا کلام خواجہ

ان کے دیوان میں کئی مخمس شریک ہیں انھوں نے خود اپنی غزلوں پر مصرعے پہنچائے ہیں۔ اور بعض اساتذہ اور معاصر شعراء کی غزلوں پر بھی
اساتذہ اور ہم عصروں میں، رند، وطن، امیر، ناسخ، داغ، ظفر، فیض، عصر، آتش، عشرتی، صبا، مصحفی، افسوس، آباد، ذوق،
انیس، قدسی، وحید، نفیس، آصف، اور ظہیر کی غزلیں ملتی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت وزیر نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔
بطور نمونہ ہم چند بند نقل کرتے ہیں۔

چاروں طرف سے شور ہے ہم پر دیئے دیا — وہ کون ہے جو پاؤں پڑا کر نہ سر دھرا
اوتار تک پکارتے ہیں مجھ کو دیوتا — کفر آشنا کہاں ہے کوئی مجھ سے دوسرا
سجدے کا تار ہاتھ میں زنار ہو گیا

ناقدرداں کے ہاتھ ہے فکر سخن عبث — ساقی تو نہیں تو شراب کہن عبث
رونق فزا جو روح نہ ہو ہے بدن عبث — تکلیف باغ دیتا ہے گلبدن عبث
لہرا رہی ہے مجھ کو ہوائے چمن عبث

انکے مطلب کو نہیں ہوتی ہے مدت مانع — دل لگانے سے نہیں غیر سے غیرت مانع
اک نہ اک میرے لئے رہتی ہی علت مانع — بات کرنے کو ہے چپ رہنے کی عادت مانع
جنبش لب کو ہے اس لب کی نزاکت مانع

حضرت وزیر تاریخ گوئی میں بھی ملکہ رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی تاریخی قطعے لکھے ہیں انکی بعض تاریخیں بہت برجستہ اور بے ساختہ ہیں
ایک قطعہ تاریخ سے مادۂ تاریخ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

برائے نذر ہم سال جلوسش
جلوس میمنت آراست، گفتم
۱۳۰۱

آخر میں ہم صاحبزادہ وزیر کی چند رباعیاں پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ انکے یہاں بیسیوں[20] رباعیاں ہیں جن میں سے
اکثر اولیاء اللہ اور بزرگان دین کی شان میں لکھی گئی ہیں ؎

نمونہ رباعیات وزیر

پکارتا ہے جو ہر آن پادشہ بغداد
قبول ہو یہ دعا پائے اپنے دل کی مراد
وزیر اندنوں ہے مبتلائے رنج و الم
یہ بے نوا کی نہ فریاد ہیں جب تلک امداد

(۲)

ہر مشکلات میں ترے مشکل کشا کے ہاتھ
اٹھے ہیں التجا کیلئے بے نوا کے ہاتھ
شاہ نجف کے قدموں پہ رکھ سر کو اے وزیر
تیرے ولی مراد ہیں دستِ خدا کے ہاتھ

(۳)

شہ کو شہزادۂ ثانی یہ مکرم ہوگا
نام عثماں علیخاں ہے معظم ہوگا
فکرِ تاریخ میں ہاتف نے کہا مجھ سے وزیر
سالِ مولود یہ ہے نیّرِ اعظم ہوگا
۱۳۰۳ ہجری

(۴)

سدا کھائے چکر بلا آپ کی
بلائیں رہے ہر بلا آپ کی
جہاں میں ہمیشہ ہی کرتے رہیں
حمایت شہِ کربلا آپ کی

واصل

محمد احمد اللہ

سنہ ۱۲۷۰ تا ۱۳۳۶ھ

از

جناب محمد عمر صاحب مہاجر

چودھویں صدی ہجری کے ربع اوّل کو حیدرآبادی علم و ادب کے نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے۔ اس دور میں حضرت غفران مکان کی ادب نوازیوں سے ایک طرف تو شمالی ہند کے شعرا کھینچ کھینچ حیدرآباد چلے آتے تھے اور دوسری طرف خود حیدرآبادی شاعروں کی زندگی میں ایک ایسی لہر دوڑ گئی تھی جس نے انکے کارناموں کو درخشاں بنا دیا تھا۔ ان ہی آخر الذکر شاعروں میں ڈاکٹر احمد حسین مائل کے مشہور دوست اور رشتہ کے بھائی محمد احمد اللہ واصل نائطی والشافعی بھی تھے جنکے کارناموں پر اس وقت تک گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

ابتدائی حالات۔ واصل تقریباً سنہ ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ انکے والد ماجد محمد تقی حسین رفعت محکمۂ امور مذہبی میں منتظم تھے اور فارسی ادب اور علوم دینیات میں فرید عصر سمجھے جاتے تھے۔ واصل نے انہی کے آغوش تربیت میں ابتدائی تعلیم کے مدارج طے کئے تھے۔ رفعت کے جد امجد نواب قادر علیخاں (والاجاہی) ریاست ارکاٹ کے عمائدین تھے۔ واصل کے نانا مفتی حاجی غلام کلیم اللہ مہاجر نواب ارادت جنگ سالار الملک سالار الدولہ حسین دوست خاں کے برادر حقیقی تھے اور مدراس میں عہدہ قاضی القضاۃ پر مامور تھے۔ واصل نے سنہ ۱۲۹۰ھ میں محکمۂ اول تعلقداری اطراف بلدہ صرفخاص مبارک میں ابتدائی ملازمت شروع کی اور اپنے حسن کارگزاری سے رفتہ رفتہ مددگار مہتمم بندوبست آبپاشی و تعمیرات صرفخاص مبارک ہو گئے۔ وظیفہ حسن خدمت پر علحدہ ہونے کے کوئی دس گیارہ سال بعد سنہ ۱۳۳۶ھ میں وفات پائی۔ رود موسی کی مشہور طغیانی میں واصل کے برادر حقیقی محمد صبغۃ اللہ کا پورا خاندان دریا برد ہو گیا انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بھائی کے خاندان کے تیرہ افراد کو غرق آب ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس حادثے کے تاثرات انکے دل سے زندگی بھر نہ مٹ سکے۔ اپنے دیوان میں انھوں نے جس انداز سے اس حادثہ کا ذکر کیا ہے اس سے ایک عجیب سوگواری اور غمگینی ٹپکتی ہے۔

موسیٰ عمران کو بھولے لیکن نہ بھولینگے تجھے　　　یاد ہے اے رود موسیٰ تیری طغیانی ہنوز

رود موسیٰ کہیں پھر آئے نہ طغیانی پہ　　　دیدہ پھر واصل عدیدہ کا نم ہوتا ہے

واصل نے ایک نہایت غیور اور خود دار طبیعت پائی تھی خدا کے سوا کسی اور کے آگے دستِ طلب دراز کرنا انکے شیوۂ بے نیازمندی کے خلاف تھا۔ ذیل کے اشعار میں ان کی فطرت کے اسی پہلو کی تصویر نظر آتی ہے۔

تھا فخر فقیری پہ کچھ ایسا کہ نہ پوچھو　　　منہ پھیر لیا دیکھ کے رخ ہم نے غنی کا
تھی یہ غیرت کہ نہ لی غیر سے امداد کبھی　　　دکھ اٹھایا کئے احسان اٹھایا نہ گیا

سائل ترے در کے نہیں پھیلاتے کبھی ہاتھ　　　ہم اور دراز اپنے کریں دست طلب چھوٹ
بندہ ہوں ترا سر نہ جھکاؤنگا بہ پیش غیر　　　ایسی فروتنی ہے مرے بانکپن سے دور

لے بے نیاز مجھ کو بھی تو بے نیاز رکھ　　　ہے مدعا یہی دل بے مدعا لئے

جب ہم واصل کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو انکے کمال کے مقابلے میں ان کی گمنامی زندگی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اور دل میں یہ احساس شدید ہو جاتا ہے کہ حیدرآباد کے شاعروں نے نام و نمود کی خواہش سے الگ ہو کر اردو ادب کی جو خاموش خدمتیں انجام دی ہیں، وہ بجائے خود اپنا آپ انعام ہیں اور ہمیشہ داد سے مستغنی اور تحسین سے بے نیاز رہیں گی۔

واصل نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی وہ ایک جوہر قابل کو راستے پر لگا دینے کے لئے بہت موزوں تھا صفی لکھنوی، جلیل مانکپوری، نظم طباطبائی، اور فصیح الملک داغ دہلوی نے وہ بساطِ سخن جما رکھی تھی کہ جس سے دلی کے اجڑنے سے پہلے کی محفلوں اور لکھنو کی تباہی سے پہلے کی جلسوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ان بزرگوں کے کلام کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور انکے طرزِ سخن کی تقلید شاعری کا صحیح معیار سمجھی جاتی تھی۔ واصل بھی اپنے دیگر معاصرین حالی اور آزاد کی اصلاحی کوششوں سے متاثر ہوئے بغیر اس شاہراہِ سخن پر ہو لئے جس کی طرف زمانے کا عام رجحان تھا۔

اردو زبان کی خدمت۔ واصل کی گمنامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ فطرۃً خاموش اور منکسر المزاج تھے شاعرانہ تعلی اور شہرت کی خواہش، غرض ہر نام و نمود کا جذبہ ان سے کوسوں دور تھا۔ ان کا سب سے بڑا مطمح نظر یہ تھا کہ اردو زبان کی بے لوث خدمت انجام دیں جس سے دکن کی قدیم علمی و ادبی عظمت بے نقاب ہو سکے۔ ان اشعار میں اسی جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔

واصل ترقی دیں گے ہم اردو زبان کو　　　ملکِ دکن کو ہند کا ہمسر بنائیں گے

ہیں ذمہ زباں میں دکن بھی ہند کا ہمسر   رہیں واصل اگر جلسے یونہی یارانِ یکدل کے

حیدرآباد کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کو دیکھ کر شاعر کی نظروں کے سامنے ایک پرعظمت مستقبل کی جھلک نظر آنے لگی تھی اور اسنے کتنی سچی پیشینگوئی کی تھی:-

صحبتِ شعر و سخن واصل اگر یوں ہی رہے   پھر دکن بھی بیت غیرِ ہندوستاں ہو جائیگا

داغ مرحوم کی مشہور تعلی ——— کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے:-

کا جواب واصل نے، اس فطری لگاؤ کی بنا پر جو انہیں اردو زبان سے تھا، یوں دیا ہے کہ:-

نہیں کوئی اردو کی تخصیص واصل   کہ آتی ہے ہر اک زباں آتے آتے

غالباً داغ کی اسی تعلی سے متاثر ہو کر واصل نے داغ کی مشہور زمین میں ایک غزل لکھی ہے جسکے مقطع میں کہتے ہیں۔

کہہ دیجئے انصاف کی واصل بھی ہیں اور داغ بھی   خواہانِ دادِ اہلِ فن ایک اس طرف ایک اس طرف

جب ہم واصل کی اس مرصع غزل پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی یہ "اہلِ فن سے دادخواہی" بیجا نہیں معلوم ہوتی۔ فرماتے ہیں۔

یاں ضعف و جذبِ خامشی واں شرم مانع بات کی   میں بے زباں وہ بے دہن اک سطر ایک اس طرف

وہ طعنِ واعظ زند پروہ محتسب کا ہائے ڈر   ساغر شکن خاطر شکن ایک اس طرف ایک اس طرف

پہلے ہو خونِ آرزو پھر قتل کرنا مجھ کو تو   کشتے ہوں دو زیرِ کفن ایک اس طرف ایک اس طرف

کہا جاتا ہے کہ واصل نے اپنی صلح جو اور سنجیدہ طبیعت کے تقاضے سے مشاعرے میں مقطع یوں بدل کر پڑھا تھا ———

ہو گوش زد واصل بھلا کیونکر ہمارا مدعا   حائل ہے زلفِ پرشکن ایک اس طرف ایک اس طرف

حقیقت یہ ہے کہ بعض نام نہاد اہلِ زبان کی ذہنیت سے واصل کے احساسِ خودداری کو ٹھیس لگی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے داغ دہلوی پر چوٹ کی ہے ورنہ وہ ہمیشہ اپنے ہمعصروں کی فیاضی کیساتھ تعریف کرتے تھے۔ ڈاکٹر مائل کے متعلق، جن سے کمالِ فن کے اعتبار سے واصل کسی طرح کم نہ تھے، فرماتے ہیں:-

اس دکن میں نہیں مائل کا جواب اے واصل   آپ کی کیا ہے بِسات اپکی اوقات ہی کیا

اسی طرح مائل کہتے ہیں۔

دکن میں مائل و واصل ہیں ولو فخرِ دکن ۔۔۔ یہی سنا ہے سرِ بزمِ خوش بیانوں سے

واصل کے اعتراف میں ایک انکسار ہے لیکن مائل نے واصل کے کمالِ فن کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اپنی برتری کا بھی اظہار کیا ہے

تلمذ :- واصل کو شاعری میں سرفراز علی و صفی لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا جو اپنے زمانے کے ماہرِ فن اساتذۂ سخن میں شمار کئے جاتے تھے۔ حیدرآباد میں داغ سے پہلے انہی کی شہرت تھی۔ اور بڑے بڑے شاعران کے تلامذہ میں شامل تھے۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل انہی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ واصل کو اپنے استاد سے بہت عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنا دیوان مرتب بھی کیا تھا جس کا تاریخی نام "نغمۂ عندلیبِ دکن" رکھا گیا تھا لیکن اسے محض اس خیال سے نہیں طبع کرایا کہ خود استاد کا دیوان اس وقت تک نہیں چھپا تھا۔ اسی عقیدت کے جذبہ کی بنا پر واصل نے استاد کی وفات پر کہا تھا۔

صفی نے تو سدھارے جہاں سے سفر کیا ۔۔۔ واصل یہ کیا کہ جیتے رہے تم ہزار حیف

استاد سے واصل کی یہ عقیدت بیکار ثابت نہیں ہوئی۔ ان کا مذاقِ سخن رفتہ رفتہ سنورتا رہا اور استاد نے ان کے فطری ذوق کو ایسی جلا دی کہ بہت جلد ان کے کلام میں انفرادیت کی نشان پیدا ہوگئی چنانچہ چند ہی دنوں میں واصل کے اور انکے استاد بھائی مائل کے کلام میں وہ پختگی اور روانی پیدا ہوگئی کہ شاگرد بجائے خود استاد بنگئے۔

پختہ مشقی :- ڈاکٹر زور نے اپنے مضمون "مائل اور ان کی شاعری" میں ذیل کا واقعہ لکھا ہے جس سے واصل و مائل کے کمالِ فن اور انکی پختہ مشقی پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔۔۔۔۔۔

"۔۔۔۔۔۔ ایک مشاعرے میں مائل اور انکے استاد بھائی واصل نے (جو ہمیشہ مشاعروں میں انکے ساتھ ساتھ رہتے تھے) اپنی اپنی غزلیں سنائی تو جہاں اکثر اصحاب نے تعریف کی بعض حاسدوں نے آوازے کسنے شروع کئے اور کہا کہ ۔۔۔ "یہ تو اپنے استاد سے لکھوا لاتے ہیں" اس واقعے سے یہ دونوں اتنا متاثر ہوئے کہ ترکِ شاعری کا تہیہ کرلیا اور دوسرے روز استاد کے ہاں اپنا تمام اثاثہ شاعری لئے ہوئے پہنچے اور کہا کہ ۔۔۔۔ "یہ سب اب آپکے حوالے ہے، ہم آئندہ سے شاعر نہیں" استاد نے نہایت شفقت و دلسوزی سے کہا کہ "آئندہ کا ارادہ تو آئندہ پر رہا

مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر یہ برہمی کیوں ہے؟ کیا واقعہ گزرا جو تم اتنے متاثر ہوئے۔" سائل نے رات کے مشاعرے کا واقعہ سنانے کے بعد کہا کہ اگرچہ عموماً بعض اساتذہ اپنے شاگردوں کو بوقت اصلاح دو ایک شعر بھی دیدیا کرتے ہیں، مگر حضرت کا یہ حال ہے کہ ایک آدھ مصرعہ اور شعر تو بڑی چیز ہے ایک لفظ بھی دینا پسند نہیں فرماتے، اور ہمارے ایسے اشعار قطعاً قلمزد فرمادئے جاتے ہیں جو ایک لفظ کی الٹ پھیر سے بہت چست ہوسکتے ہیں۔ اور بعد اصلاح صرف وہی شعر چھوڑ دیئے جاتے ہیں جن میں ایک لفظ بھی نہ بنایا گیا ہو۔ اس طریقۂ عمل کی یہ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ اس طریقہ سے طبیعت بڑھتی ہے حقیقت حال تو یہ ہے، اور ہم کو جو صدمہ پہنچتا ہے وہ یہ کہ ہم استاد کا کلام اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھتے ہیں۔"

یہ واقعہ سن کر استاد متبسم ہوئے اور مبارکباد دی۔ شاگرد حیران تھے کہ یہ مبارکباد کا کیا محل ہے۔ پھر خود ہی استاد نے کہا کہ شکرانہ کا دوگانہ ادا کرو اور خوشی مناؤ کہ اللہ نے تمکو یہ درجہ عطا فرمایا کہ اب لوگوں کو تمہارے اور تمہارے استاد کے کلام میں امتیاز نہ رہا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے کہ تمہارے کلام کو تمہارے استاد کا کلام قرار دیا جاتا ہے ——"

مشاعروں میں شرکت: یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حیدرآباد کی علمی اور ادبی چہل پہل زوروں پر تھی اور مشاعرے کثرت سے ہوا کرتے تھے ان میں ہمیشہ واصل کی آؤ بھگت ہوا کرتی تھی، اور ان کا شمار حیدرآباد کے ممتاز شاعروں میں ہونے لگا تھا۔ ایک بار جب واصل نے یہ مطلع پڑھا۔

گو تاب نظارہ نہیں رکھ لے تو مری لاج ۔۔۔ موسیٰ کی طرح کہتا ہوں میں بھی ارنی آج

تو سارا مشاعرہ چونک اٹھا اور ان کی غزل کی شہرت دور دور ہوگئی تھی۔ مولوی عبدالمقتدر صاحب افضل سابق پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ کے مکان پر ایک مشاعرہ ہوا تھا جس میں واصل نے یہ شعر پڑھے تھے۔

قابل قدر تمہاری قدر اندازی ہے ۔۔۔ تیر جنبش ہی میں تھا گڑ گیا پیکاں دل میں

درد ہی بن کے اٹھو داغ ہی بن کر چمکو! ۔۔۔ آرزو ہے کہ رہو تم کسی عنوان دل میں

ان اشعار کو سن کر حیدرآباد کے مشہور صوفی منش بزرگ حضرت خواجہ صدیق علی شاہ صاحب قبلہ مرحوم (جو حیدرآباد کے مشہور پیر طریقت سید شاہ محمد عمر صاحب قادری حسینی مرحوم کے مرشد تھے) جو بہت کم کسی کی تعریف فرماتے تھے۔ بے اختیار پھڑک اٹھے اور اس قدر تعریف کی کہ مشاعرے بھر میں کسی کو نصیب نہیں ہو سکی۔ اسکے بعد انھوں نے خود اپنے پاس ایک مشاعرہ ترتیب دیا اور واصل کو خاص طور پر دعوت دی ان سے طرحی کلام کے علاوہ غیر طرحی کلام بھی سنا اور دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔

صنفِ نعت میں قادر الکلامی: یوں تو واصل نے مثنوی کے سوا تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے زورِ طبیعت کا پتہ سب سے زیادہ انکی نعتیہ غزلوں سے چلتا ہے۔ انکی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت سرائی انکی شاعری کا اصلی محور بنی رہے، اور انکے شاگرد بھی اسی روش کو اختیار کریں جس کی بنا پر واصل نے اپنے تمام معصروں میں امتیاز حاصل کر لیا تھا۔ ذیل کے اشعار سے اسی قسم کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

مادحِ نبی میری طرح ہوں مرے شاگرد　　　پھولے پھلے اس طرح سے واصل شجرِ فیض
وہ پاؤں صلۂ نعت کا دامن سے ابھر جائے　　　ہر نقطہ ترے فیض کا ہو صد گہرِ فیض
تری نعت واصل بنے تو اہو قبولِ بارگہِ خدا!!　　　جو سنیں اسے کہیں مرحبا، ہو کچھ ایسے اثر سے نوش
مرے دیوان کا عنوان ہے نعتِ نبی واصل　　　سرِ مصحف پہ ہو جس طرح بسم اللہ کی صورت
یہ بھی ہے فیض ثنائے شہ دیں آہ واصل　　　دوست لاکھوں میں غنیمت ترا دم جانتے ہیں
رخِ احمد کا ہوں مدحت سرا کیا پوچھنا میرا　　　مرے اشعار واصل نور کے سانچے میں ڈھلتے ہیں
نام کے مداح ہیں کب مدح کر سکتے ہیں ہم　　　بے کمالی ہے یہ آہ واصل ہنر کچھ بھی نہیں!

بیان کی نزاکت اور معنی کی لطافت کے لحاظ سے واصل کی نعت انکی شعر گوئی کی بہترین خوبیوں کی مظہر ہے۔ نعت کے محدود مضامین میں اپنی قادر الکلامی سے انھوں نے ایک ایسا لوچ اور گداز پیدا کیا ہے جس سے انکی شاعری کو ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اشعار ذیل سے حسنِ بیان، لطفِ زبان، رفعتِ تخیل اور واصل کی قادر الکلامی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

عشقِ احمد کے سوا آتی جو کچھ ہے ہیچ ہے　　　عالمِ فانی میں سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں
جلوۂ زینتِ عالم ہے یہ کچھ طور نہیں　　　دیکھ موسیٰ ہمہ تن چشم تماشا بن کر
آوارۂ صحرائے مدینہ ہوں میں واصل　　　اب مجھ کو نہیں رنجِ غریب الوطنی کا
مدحِ شہِ دیں سے یہ ملی نعمتِ عظمیٰ　　　باتوں میں ہے تاثیر زباں میں ہے اثر آج
کیوں دل کو لگا کر نہ رکھوں سینے سے واصل　　　یہ چاہنے والا ہے رسولِ مدنی کا!!

مری وحشت سے عالم یہ ہے ہنر کے بیاباں کا　　　کہیں ٹکڑا ہے دامن کا کہیں پرزہ گریباں کا
وہ دل پاؤں کہ جس میں داغِ عشقِ سرورِ دیں ہو　　　نگیں ایسا ملے جس میں ہو خود نقشِ نگیں پیدا
طیبہ کا سفر اور سفر بھی سفر ایسا　　　قدموں کو مرے چومتی ہے بے وطنی آج
گریۂ ہجرِ نبی ہے آج پھر کل کی طرح　　　کیوں جھما جھم آنکھیں برسیں گی نہ بادل کی طرح
تعالیٰ اللہ وہ تنویرِ سیاہی ہے ترے در پر　　　دمِ سجدہ قدم سے دو قدم آگے مرا سر ہے

چین سے عشق محمد میں گزرتی ہے عمر   اپنے گھر میں ہمیں حاصل ہے فراغ جنت

واصل نے بڑی سخت اور سنگلاخ زمینوں میں نعت لکھی ہے مگر کلام کی شگفتگی، روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا، ان زمینوں میں بحر ایسی مترنم اور الفاظ ایسے دلکش استعمال کئے ہیں کہ اشعار خود بخود دل میں اتر جاتے ہیں۔ ذیل کے اشعار اردو شاعری میں صنف نعت کے بہترین نمونوں کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

سبحۂ تو ہی ہے زاہد و کیا کریں لے کے زمزم   عشق نبی اگر نہ ہو بندگی خدا عبث   شاد ہے قافلہ سبھی تجھ کو نہیں ہے چین ابھی   آ گیا وہ در نبی چیخ نہ لے درا عبث

بہتر کہیں ہو باغ سے دور اور شکستہ پر   بلبل تو ہوں فراغ سے دور اور شکستہ پر   کب ہے زباں کوتاہ صفات و حضور   قمری ہے سرو باغ سے دور شکستہ پر

بہتر ہے بغیر بلبل دل کو ہو چین کیا   گل سے جدا ہے باغ سے دور اور شکستہ پر   کیوں بجھ نہ جائے دل کہ ہے پروانہ لگا   گنبد کے ہر چراغ سے دور شکستہ پر

تری جلوہ گاہ دکھائی دے کبھی ہم کو اپنا جو خواب میں   ترا روضہ جس میں نظر پڑے ہو یہ ایسا جگر سے گوشِ   یہ ہجر، ہجر رسول حق ہے ارے زنگ رو سے کیوں ہو ذوق   جو سیاہ تا ما تھا وجود یا میں ہم اپنے دیدۂ تر سے چشم

غم ہجر سرورِ دیں ہے یہ کوئی وجہ رنج نہیں ہے یہ   کبھی داغ دل ہے ہو شاد ما کبھی آدرد جگر سے گوش   جنہیں عشق سرور دیں ہوا انہیں ہر بلا مزا ملا   کوئی دل کے داغ سے شاد ہے کوئی اپنے زخم جگر سے خوش

مرا حال اس تباہی سے مرا ساتھ بار گناہ سے   کوئی راہزن سے اٹھ گیا نہیں ہوا سفر سے خوش   تو رحمت عالم ہے کرم تیرا ہے شیوہ   افسانہ ترے رحم کا سچ ذکر غفر جھوٹ

مذہبی رواداری اور رباعیاں:

اس کے علاوہ واصل نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں بھی کئی اشعار لکھے ہیں جو ہر طرح ان کی قادر الکلامی کے آئینہ دار ہیں۔ واصل اہل سنت والجماعت سے تھے لیکن کالے ڈیرے کے قیام کی وجہ سے اکثر مہدویوں سے دوستانہ برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ واصل کی مذہبی رواداری ہر طرح لائق تحسین ہے کہ انہوں نے اپنے احباب کی خاطر امام مہدی کی شان میں عقیدت کے ساتھ رباعیاں لکھی ہیں۔ فرماتے ہیں:

سرسبز ہو اس قوم کا گلشن یارب   پر ہو گل مقصود سے دامن یارب
مہدی کی عنایت سے ہوا دِ علے   غنچہ ہو چمن اپنا ہو خرمن یارب

کیا پوچھتے ہو کہ یہ کدھر سے پایا   مہدی و رسول حق کے در سے پایا
فیضان رسالت و امامت کے نثار   کچھ ہم نے ادھر سے کچھ ادھر سے پایا

اصلاحی رباعیاں:

اصلاحی رباعیاں بھی موجود ہیں جو ایک ایسے دردمند دل کی پردہ دری کرتی ہیں جو قوم کی بے راہ روی پر خون کے آنسو روتا ہے:

ہم اپنے ہی ہاتھوں سے ہوئے آپ تباہ   ظاہر میں بڑے نیک ہیں باطن میں سیاہ
اس دعوی اتحاد پر دل میں نفاق!!   لاحول ولا قوۃ الا باللہ

اب ہوتی ہیں افسوس بلائیں نازل   جس قوم پہ قرآں کا ہوتا تھا نزول   دارین کی تھی نعمتیں اس کو حاصل   اسلام کی قسمت تھی کچھ ایسی واصل

اللہ کے گھر میں یہ علامات اُف   دل خانۂ حق ہے دل میں کینہ ہے ہے!!   آپس میں ہے کینۂ بغض و عداوت افسوس   باہم نہیں ہمدردی و الفت افسوس

سچ کہتے ہیں سولی پہ بھی نیند   شورش کا زمانہ ہے مگر سوئے ہیں ہم   کھو دیتے ہیں جو فائدہ ذاتی ہے   غفلت ابھی قوم سے نہیں جاتی ہے

کیوں روشنی طبع یہ کیا ہے اندھیر   اس زور و فراست پہ تنزل ہے ہے   حکمت میں فلاطون شجاعت میں شیر   ہے قوم کا ہر فرد عقیل اور دلیر

نشیب سے ہیں نا ریں کس طرح ہم   ہم آپ ہی غافل ہیں جب اے واصل   غفلت میں ہیں خود کریں نصیحت کس کو   کیا راہ پہ ہم لائیں کسی خائن کو

رونا تو اسی کا ہے کہ رونے نہیں   ناکامی تقدیر یہ ہے ہے واصل   کچھ فکر ترقی نہ تنزل کا ہے غم   عشرت میں فزوں سے ہیں دولت میں کم

تصوف: متصوفین کے دو گروہ ہیں۔ (۱) شہودی (۲) وجودی توحید شہودی کے قائل کے نزدیک خدا کا سلسلۂ کائنات سے بالکل الگ ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

"وجودیوں" کا خیال ہے کہ کائنات صرف خدا ہی کی ہستی مطلق کے مظاہر کا دوسرا نام ہے۔ ذات تو ایک ہے لیکن تعدد جو محسوس ہوتا ہے وہ محض اعتباری ہے جس طرح حباب، اور موج دو مختلف ذاتیں خیال کی جاتی ہیں لیکن حقیقت میں ان کا وجود بجز پانی کے اور کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح بظاہر اس عالم ظاہری کا اور خدا کا وجود مختلف اور جداگانہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔

حکمائے یورپ نے کائنات کی تقسیم، مادہ، قوت، اور "عقل کل" پر کی ہے، مادہ اور قوت کے مباحث ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہیں لیکن "عقل کل" کی جس طرح تعبیر کی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تخیل مشرقی تصوف سے ہی لیا گیا ہے۔

"عقل" تمام اشیا میں اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح انسانی جسم میں جان ہوتی ہے۔ اسی "عقل کل" کی وجہ سے تمام نظام کائنات میں تسلسل اور ہم آہنگی قائم ہے۔ اس عالم کی مثال ایک شخص واحد کی سی ہے جس کی ہستی باوجود متعدد الاعضا ہونے کے ایک شے تصور کی جاتی ہے عالم بھی ظاہری تعدد اور تجربے کے باوجود بھی ایک ہی شئے ہے جس طرح انسان کی عقل اس کے تمام اطوار و عادات پر حاوی رہتی ہے اسی طرح عالم کی "عقل کل" سے نظام کائنات قائم ہے ——— اور اسی کو خدا کہتے ہیں۔

مسئلہ وحدت الوجود کی اس تشریح سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ حد درجہ نازک ہے جس سے سر مو انحراف بھی الحاد کی طرف لے

کر دینے کے لئے کافی ہے۔ یہاں پہنچ کر واصل کے دل و دماغ کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ انہوں نے اگرچہ اپنے دیوان میں اکثر اپنے اس مسلک کیطرف اشارہ کیا ہے لیکن ان کا انداز اسلوب اسقدر سلجھا ہوا ہے کہ گمراہی کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ فرماتے ہیں۔

ترے جلوے کے تصدق، تو نہیں جلوہ فروش　　جس سے دیکھا نہ گیا اس کو دکھایا نہ گیا
لن ترانی تو فقط بات تھی معشوقانہ　　ذرہ ذرہ میں ہو تم جلوہ نما آپ ہی آپ

اسلئے ہے جلوہ دیدہ وحدت نگر میں آج　　میرے سوا کوئی نہیں میری نظر میں آج
چشم حق میں ہے یکساں وحدت و کثرت کی شان　　ایک کو دو کس طرح سمجھوں اہل ظاہر کی طرح

لگاکے باتوں میں دھوکا نہ دو کلیم کو تم　　یہ کیا کیا کہ چھپا بھی حجاب میں آ کر
دیکھ دیوانے اک ایک ذرے میں ہے جلوہ اس کا　　یہ وہ لیلیٰ ہے جسے حاجت محمل ہی نہیں

ایک عالم ہو تمہارا ہی ہے مشتاق جلوہ　　ایک میں ہوں کہ مجھے تاب نظر کچھ بھی نہیں
ہر شے میں وہ جلوہ ہے جو ہم کا تماشا طور　　صد حیف کہ ہم کرتے نہیں غور زیادہ

لفظ وحدت کی نشان ہے کثرت　　دیکھنا بات کیا نرالی ہے!
میں ہوں اک دیوانہ وحدت شہر کے لئے　　ہو کا عالم ہو جہاں ویرانہ ایسا چاہئے

اے دیدۂ حق بیں ترے قربان ترے صدقے　　ہے عین خدا ہستی اشیا دم بھر کے

تغزل:- یہ عجیب بات ہے کہ واصل کا طبعی رجحان نعت اور مدحت کیطرف ہونے کے باوجود انکی غزل کا رنگ پھیکا نہیں معلوم ہوتا۔ داغ کیطرح انکے کلام میں شوخی اور عریانی تو نہیں ہے لیکن کبھی کبھی انکی "سنجیدہ شوخی" بھی لطف سے خالی نہیں ہوتی کہیں کہیں تو لطف زبان اور شوخی بیان کے لحاظ سے انکی غزلوں میں وہی لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے جو داغ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ فرماتے ہیں۔

اسے مارا، اسے تاکا، ادھر دیکھا ادھر گھورا　　عجب شوخی ہے کیا کہنا تمہاری چشم پرفن کا
مانا کہ تم سے کھل نہیں سکتے فلک کے بند　　اچھا جو دست شوق ہمارا چل گیا!

میں جو کہتا ہوں ترا آیا ہے میرا دل تم پر　　وہ یہ کہتے ہیں غلط ہے کوئی آیا نہ گیا
صدقے صدقے ترے اے جوش جوانی صدقے　　کھل رہی ہے گرہ بند قبا آپ ہی آپ

سنتے تھے کہ جاؤ گے ہو تم غیر کے گھر آج　　اس آن کے قربان چلے آئے کدھر آج
بے نیازی ہو چکی بندہ نوازی کیجئے　　اک ذرا ہنس دیجئے عاشق کو نالاں دیکھ کر

قادر الکلامی:- واصل نے شاہ نصیر اور ذوق کیطرح نہایت کڑی اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس مختصر مضمون میں موازنے کی تو گنجائش نہیں ہے لیکن ذیل کے اشعار سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ واصل کی قادر الکلامی کا کیا عالم تھا اور سخت زمینوں میں کہنے والوں میں انکا کیا درجہ ہو سکتا ہے۔ ایک ذو قافیتین غزل کے چند شعر ہیں۔

تمہیں خبر بھی ہے کیا ہے انجام کار گیسو و لالۂ عارض　　یہ کبھی غرہ کہ عاشقی ہے یہاں گیسو و جمال عارض
گئے تو ہیں آج سوئے گلشن پہ ہیچ فن میں بڑے ہی فتنہ　　سکھا نہ دیں سنبل و گل کہیں شعار گیسو خصال عارض

کہاں کی کنگھی کہاں کا شانہ ہنوز نازک کو ہم نے سمجھانا　　سنوار سنوار کر بیٹھنے نہ پائے کہ آ گیا گیسو و بال عارض
رخ مصفا پہ عکس افگن ہوئے ہیں گیسو انکی چشم پرفن　　مجھے تو ڈر ہے کہیں نہ اب ہو شکار گیسو غزال عارض

تصورِ رخ سے بندِ پیرو پڑ رہیگا سودا زلف کے نکمر ہمارا ذمہ نہ ہوگا یوں تو سمائے گیسو خیالِ عارض
رخِ منور سے کیا ہی خفا ہی ہوا پہ اڑ اڑ کے جا رہا ہے؟ یہ عقدہ کیا ہے کہ آج ہی نا گوار گیسو وصالِ عارض

نظارہ بازوں کی آتی کثرت نہ کیوں ہوئی آج نیتی نفرت نگاہیں ہم ہم کے بنگئی ہیں عیار گیسو، بالِ عارض
تمہیں جو منظور ہے ستانا رقیب کو بھی ستم سکھانا نگہ کی خصلت ستم کی عادت شعار گیسو خصالِ عارض

ہم اپنے ہیں بدنصیب واصل ہوا بدل سے بھی کچھ نہ حاصل بنی ہماری سیاہ کاری نہ تار گیسو نہ خال عارض
کیوں ڈھونڈتے ہو تم نہ ملیگا سراغِ داغ تو یہ شبِ وصال ہو روشن چراغِ داغ

اشکوں کے ساتھ خونِ تمنا ٹپک پڑے ہے لطفِ صبح سے جو چھلکے ایاغِ داغ
اے یاس کر ستم نہ دلِ داغدار پر خانہ خراب لوٹ نہ لے خانہ باغِ داغ

چمک کے رنگ ہوا زرد پیرِ عتاب میں رقیب کھلی جو دھوپ نظر آئی آفتاب میں برق
ہم ناتواں کہیں کیونکر اڑے ہوا پر اڑ کر گرے زمیں پہ گر کر اڑے ہوا پر

وعدے پہ تم نہ آئے تو نالے یہ رنگ لائے مثلِ شہابِ ثاقب شب بھر اڑے ہوا پر
بلبل کو خبر آمدِ صیاد کی دیں گے کچھ آئے ہیں اڑ کر جو چمن میں پرِ طاؤس

آہِ دلِ پر داغ نے پائی ہے بلندی آتا ہے نظر چرخِ کہن پر پرِ طاؤس
یاد آ گیا کھویا ہوا واصل دلِ پر داغ دیکھا جو کبھی صحنِ چمن میں پرِ طاؤس

رعایتِ تخلص :- اردو کے نازک خیال شاعر مومن کی طرح واصل عموماً اپنے مقطع میں تخلص کی رعایت رکھتے ہیں اسمیں اگرچہ مومن کی سی لطافت نہیں ہوتی لیکن بجائے خود یہ مقطع دلچسپ ہوتے ہیں مثلاً :-

عشقِ بت نے واصل حق کر دیا کام گو ادنیٰ تھا اعلیٰ ہو گیا
شبِ وصال ہے واصل ہے تم ہو خلوت ہے بھلا یہ ہے کوئی موقع تمہارے جانیکا

وصل کی رات ہے یہ چھیڑو نہ اتنا واصل روٹھ جائیں وہ اگر انکو منا بھی نہ سکو
میرے پہلو سے جدا تم ہو یہ ممکن ہی نہیں نام واصل ہے میرا جانتے ہو تم مجھکو

مجھ سا ہجر زدہ اس نام کے قابل ہی نہیں وصل حاصل ہی نہیں جسکو وہ واصل ہی نہیں
وصل سے محروم ہوں ہجر سے مغموم ہوں پھر میرا واصل خطاب دیکھئے کب تک رہے

نمونۂ کلام :- اب تک ہم نے واصل کے کردار اور انکے طبعی رجحانات کی روشنی میں انکے کلام کا مطالعہ کیا اور انکے تصوف تغزل اور قادر الکلامی کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا۔ اب انکے کلام سے مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے جس سے ہر ذوق بہرہ ور ہو سکے۔

ساری خدائی وسعتِ دل میں سما گئی اللہ یہ مکان ہے کس عرض و طول کا
دل تو پہلو میں ہے دل میں ہیں عالم کے راز ہیں محیطِ صفحۂ ہستی ہوں جدول کی طرح

کیسی نالش داد کیسی کیا سبب فریاد کا ہم سبکدوش ہوں یہ تو احسان ہے جلاد کا
موسیٰ اسی کا نام حمیت بجا درست! تم دیکھتے ہی رہ گئے اور طور جل گیا

غم نہیں درد ہی درد نہیں داغ ہی کچھ تو ہو لطف و کرم مجھ پہ دلِ آزار کا
وہ چلی شعلہ رخسار سے چلمن وہ چلی کون اب روکنے والا ہے نظاروں کا

کچھ تو ارماں نکالو خنجر کا نہ سہی قتل دیے چلو چرکا
داورِ حشر بھی دل تھام کے بولا واصل کیسا پردرد ہے کمبخت فسانہ تیرا

مری جاں سیکھ لے پہلو میں رہنا بلا سے دردِ دل ہی بن کسی کا!!
ہائے ارمان بھری جان شبِ غم چلی آگئی موت مگر آپ سے آیا نہ گیا

نواب میر اسد علی خان نظام یار جنگ حسام الملک خانخانان آصفی مرحوم

آصفی

نواب سید میر علیخان نظام یار جنگ حسام الملک خانخاناں مرحوم

سنہ ۱۱۸۳ھ تا سنہ ۱۲۴۳ھ

از سید عباس حسین حسنی بن رضا الموسوی

نواب میر سید علیخان آصفی کا نسبی سلسلہ حضرت امام رضا علیہ السلام تک پہونچتا ہے۔ انکے آبا و اجداد زمانۂ ماضی میں ایران صوبہ خراسان کے صدر مقام مشہد میں رہتے تھے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

رہتے تھے مشہد میں جو اپنے بزرگ — ان بزرگوں کی نشانی ہم بھی ہیں

جب سے وہ آکر بسے ہیں ہند میں — آصفی ہندوستانی ہم بھی ہیں

حضرت آصفی میر غلام حسین خاں صفدر جنگ حسام الدولہ فخر الملک کے خلف اکبر اور میر عباس علیخان نظام یار جنگ نظام الدولہ

حسام الملک حسام الامرا خانخاناں کے پوتے ہیں ان کے جد اعلیٰ میر کاظم علیخاں تھے جن سے میر عالم کی ہمشیر منسوب تھیں۔ اس عالی خانوادہ کی

ابتدا میر مجی اور میر ابو القاسم سے ہوتی ہے جو عبد اللہ خلف محمد سلطان والئی توران کے ساتھیوں میں تھے میر مجی حکمرانی ریاست خراسان اور کلید داری حرم

مطہر حضرت امام رضا علیہ السلام مشہد سے سرفراز تھے۔ اسی خاندان کے بعض ذی رتبہ ارباب خاندان عہد اکبری و عالمگیری میں گرانقدر

خدمات جیسے دیوانی، بخشی گری، وقائع نگاری، صوبہ داری پر حسن وجوہ انجام دیکر منصب عالیہ و صدر العالی تک یہاں سے مفتخر ہوئے ہیں جب حضرت

نواب میر قمر الدین علیخاں نظام الملک آصفجاہ اول سریر آرائے ریاست ہوئے تو اس خاندان کے ذی وقار افراد صوبہ داری برار اور دکن پر مامور ہوئے۔

* عہد عالمگیری میں میر حسین امانت خاں جو اس خاندان کے مشہور علی تھے صوبہ گجرات کی صوبہ داری اور قلعہ سورت کی حکومت پر متعین تھے۔ میر عبد الرزاق

شاہنواز خاں صمصام جنگ صمصام الدولہ (مولف مآثر الامرا) جو مدت تک نواب ناصر جنگ شہید کے وزیر اعظم تھے اور ۳ رمضان سنہ ۱۱۷۱ھ

فرانسیسیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے وہ بھی اسی خانوادہ کے ایک فرد تھے۔

اسی سلسلہ میں ایک مفتخر ہستی نواب میر کاظم علیخاں کی ہے جن کی تیسری پشت میں حضرت آصفی ہیں۔ انھوں نے اپنی دو نشانیاں چھوڑیں ایک نواب میر عباس علیخاں دوسرے نواب میر عسکری علیخاں۔ اول الذکر خانخانان اولیٰ کہلاتے ہیں جو منصب ہفت ہزاری و پنج ہزار سوار اور خطابات حسام الدولہ، نظام یار جنگ، حسام الملک سے سرفراز تھے۔ میر غلام حسین المخاطب نواب صفدر جنگ، حسام الدولہ، فخر الملک ان ہی کے اکلوتے فرزند ارجمند تھے جنکے خلف حضرت آصفی خلد آشیاں ہیں۔

حضرت آصفی کی ولادت روز جمعہ، جمادی اول ۱۲۷۱ھ میں ہوئی۔ مادۂ تاریخ "فخر العصر" (۱۲۷۱ھ) ہے نیز "نیر اعظم" سے بھی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ ۱۲۷۸ھ میں مشفق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اسلئے انکے بہنوئی نواب سالار جنگ اعظم نے اپنی خاص نگرانی میں قابل اور لائق اساتذہ سے اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تعلیم گھر ہی پر دلوائی۔ حضرت آصفی نے اپنے ذوق سے سواری اسپ، نشانہ اندازی اور دیگر مردانہ کھیلوں میں کافی مہارت حاصل کی۔ فنون سپاہ گری میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ فن چوب بازی کے بھی مسلم الثبوت استاد تھے۔ ۱۲۷۹ھ میں پیشگاہ حضرت نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس سے خطاب خانی، بہادری اور جنگی عطا ہوا۔ ۱۲۸۶ھ ہجری نواب مختار الملک کی معیت میں پہلی مرتبہ کلکتے تشریف لیگئے۔ ایک سال بعد واپسی عمل میں آئی۔ پھر ۱۲۹۱ھ میں کلکتہ کا سفر کیا اور واپسی کے بعد اسی سال جاگیرات کا انتظام سپرد ہوا۔ ۱۲۹۳ھ نواب سالار جنگ اعظم کے ہمراہ عازم سفر یورپ ہوئے۔ ۱۰ ربیع الثانی کو روم، ۱۸ کو پیرس اور ۰ مر جمادی اول وارد انگلستان ہوئے۔ بندرگاہ پر اعاظم و عمائدین رؤسائے ملک اور امرائے سلطنت انگلستان کا ہجوم تھا۔ استقبالیوں میں ڈیوک آف سدرلینڈ اور مارکوئس آف ٹوئیڈیل قابل ذکر ہیں۔ ملکہ معظمہ جہانی کوئن وکٹوریہ نے اپنے خاص ڈنر میں شرکت کی عزت بخشی۔ غرض یورپ میں دو ماہ قیام رہا۔ اسی دوران سفر میں کچھ دنوں پیرس میں مقیم رہے اور ۱۶ رمضان المبارک کو بلدہ واپسی عمل میں آئی۔

۱۳۰۰ھ میں حضرت آصفی غرض زیارت مقامات مقدسہ و سیاحت ممالک اسلامیہ کی غرض سے عازم سفر ہوئے۔ واپسی پر اسی سال نظام یار الدولہ، حسام الملک، خانخانان کے خطابات اور چہار ہزاری منصب و سہ ہزار سوار سے سرفراز ہوئے۔ ۱۳۲۰ھ میں سفر دہلی میں سرکار کی معیت کا شرف حاصل ہوا جہاں جشن تاجپوشی ایڈورڈ ہفتم میں شرکت کے لئے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ ۱۳۲۵ھ وزیر باج منتخب ہوئے۔ حسب فرمان واجب الاذعان ۷ جمادی الآخر ۱۳۲۹ھ اعلیٰحضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی ہمرکابی میں دربار تاجپوشی کی شرکت کا شرف حاصل ہوا۔

۱۵ شوال ۱۳۳۱ھ کو وزارتِ فوج اور معین المہامی متفرقات سے سبکدوشی اختیار کی علاوہ ان اعزازات کے مذکورہ کینٹ کونسل کی رکنیت سے بھی ممتاز رہے۔

حضرت آصفی کو عنفوانِ شباب ہی سے شاعری کا اعلیٰ ذوق اور اس میں یدِطولیٰ حاصل تھا ابتدا میں اسد تخلص فرماتے تھے چنانچہ قلمی دیوان میں ایک ہی شعر اس تخلص کا ملتا ہے:-

جوانی گئی پیری آئی اسد　　به در و جوانی ہے پیری نہیں

لیکن بعد میں اس خیال کے تحت کہ دولتِ آصفیہ ابد قرار کی نمک خواری کا شرف زمانہ دراز سے حاصل ہے آصفی تخلص اختیار کیا۔ فرماتے ہیں:-

یہی ہے آرزو دل کی یہی ہے مدعا دل کا　　رہے سایہ ہمیشہ آصفی کے سر پہ عثماں کا

اکثر مشاعروں اور رسالوں میں ان کا پاکیزہ کلام پڑھا جاتا تھا جو اربابِ بصیرت کے لئے سرمایۂ مسرت ہوتا تھا۔ ان کا شمار سرزمینِ حیدرآباد کی ان چند ہستیوں میں شمار ہو سکتا ہے جن کی ذات پر اردو زبان کی شاعری بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ شاعری میں استاد الملک سلطان العلماء حضرت آغا سید علی شوستری طوطیٔ ہند سے اصلاح فرماتے تھے۔ کلام میں بھرتی کے اشعار نہیں پائے جاتے۔ اشعار زبانِ حال سے گویا ہیں کہ کہنے والے کی حساس نکتہ فہم اور محبت سے لبریز دل رکھنے والی ہستی ہے۔ انھوں نے لکھنؤ اور دہلی کے مشہور اساتذہ کا کلام بنظرِ عمیق ملاحظہ کیا ہے میر تقی میر کی سحرنگاری نے ان کے قلب پر خاصہ اثر کیا چنانچہ فرماتے ہیں:-

آصفی دہلی کی ہی اچھی زباں　　مجھ کو بھاتا ہے طریقہ میر کا

حضرت آصفی علمِ عروض کے بھی جید عالم تھے۔

حضرت آصفی نے دنیائے فانی سے کبھی دل نہ لگایا۔ ان کے اشعار پند و نصیحت کا مجموعہ ہیں کہیں دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ ہے تو کہیں صحبتِ بد کی خرابیاں بیان کی ہیں کہیں قلبی احساسات اور عقائد پر روشنی ڈالی ہے تو کہیں ملک و مالک کی تعریف و ثنا میں پھول برسائے ہیں:-

ایک دن خاک میں ملنا ہے ضرور　　شوکت و شان نہ دکھلائے گا
ہم ہوئے پیدا تو کیا ہی قضا　　ساتھ میرا اور تیرا ہو گیا!!
ہو تخصاً قصر بناتے میں بہت کچھ منعم　　کیا خیالِ لحد اس کو دمِ تعمیر نہ تھا
اے غافلو نہ سمجھو رہنے کی جا ہے دنیا　　ہم آئیں جہاں میں یا جہاں سرائے دنیا

دار البقا ہے عقبیٰ دار الفنا ہے دنیا — راحت کی جا ہے عقبیٰ عبرت کی جا ہے دنیا — کر دیتی ہے دیوانہ ہر بشر کو — لیلیٰ اسے نہ سمجھو کالی بلا ہے دنیا

جو دین کا ہے سالک اس سے ہے اتنی متنفر — جو دین کا ہے تارک اس پر فدا ہے دنیا — دی ہے طلاق جس کو اولیائے جہاں نے — وہ بیسوا ہے دنیا وہ بے وفا ہے دنیا

حضرت آصفی کا اعتقاد نہایت قوی تھا مسلمانوں کے فرقہ شیعہ سے تعلق رکھتے اور محبت اہل بیت کے گرویدہ تھے۔

اشعار میں اپنے اعتقادات اور قلبی احساسات کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں ؎

نہیں کوئی خدا اپنا مگر ہے خالق یکتا — یہی کلمہ ہے ایمان کلی ہر مسلمان کا

نماز کے لیے ہم پیشوا کو کیوں ڈھونڈیں — ہمارے دل کے برابر کوئی امام نہیں

دین کا کام ہوا کونسا مجھ سے اچھا — لوگ کیوں مانتے ہیں صاحب ایماں مجھ کو

نہ آیا کبھی آصفی دل بتوں پر !!! — کٹی عمر میری خدا کہتے کہتے !!

صحبت بد سے پرہیز کے مضمون کو کس خوبی سے بیان فرمایا ہے :-

پسر نوح صحبت بد سے — خاندان پیمبری سے گیا

لے گیا اس کو میخانے میں آج — کر رہا ہے شیخ کو شیطان خراب

کچھ راز حق کھلا نہ کھلا اشعار پر — آخر چڑھا دیا گیا منصور دار پر

انسان اچھی طرح اپنے نفس سرکش کی تربیت کر سکتا ہے نہیں کہا جا سکتا کہ تہذیب نفس ناممکن ہے ؎

جلدی اس نفس کی اصلاح میں ناممکن ہے — دیر کچھ چاہیے قطرہ کو گہر ہونے تک

اپنے عصیاں پہ ہمیں چاہیے رونا دن رات — دیر تو ہوگی دعاؤں کا اثر ہونے تک

ملک اور مالک کیلئے دعائیہ شعر بہت لکھے ہیں لیکن ذیل کا شعر مرصع ہے :-

یارب تمام اہل دکن کی ہے یہ دعا !!! — از قاف تا بہ قاف ہو جھنڈا نظام کا !!

تعلّی بھی کی ہے تو کس انداز میں کی ہے۔

ہم بھی پیدا کرتے ہیں مضموں نئے — مستحق قدر دانی ہم بھی ہیں !!

ہوگیا دنیا میں خاقانی کا نام! — یوں تو خلاق معانی ہم بھی ہیں!!!

اے آصفی تمھارا سخن سب کو ہے پسند — چرچا ہے اب جہاں میں تمھارے کلام کا

پھر زمانہ کی وسعت اور انحطاط شاعری کا خیال آتا ہے تو فرماتے ہیں ؎

آصفی اب تو قدرداں کوئی نہیں — شاعری سے دل کو نفرت ہو گئی

حضرت آصفی کو جناب امیر علیہ السلام سے دلی عقیدت اور وجدانی تعلق تھا کہ ان کے دیوان میں کثرت سے اشعار اس رنگ کے ملتے ہیں۔

وہ نبی ہے جسکو خالق نے کیا اپنا رسول — وہ علی ہے جانشیں جو مصطفے کا ہو گیا

ہاں وہی والا جو پیغمبر کا بھائی ثابت ہوا — جسکے گھر پر چرخ سے نازل ستارا ہو گیا

اسم اعظم تو نہیں نام علی نام خدا — نام لیکر آپ کا میں نے جو چاہا ہو گیا

لا بلد کے گھر میں دیکھو مرتضے پیدا ہوئے — یہ وہ ولد ہے کہ مولد جسکا کعبہ ہو گیا

دیکھ کر شان علی حیرت سے سب کہنے لگے — تو نصیری کا خدا بندہ خدا کا ہو گیا

میں نجف میں جاؤنگا جس دن کہو دیکھو گیا — مدعا میرا جو تھا وہ آج پورا ہو گیا

مستند ہوئے ولا جناب امیر ہوں — عالم ہے دل میں تیرے نشے کا جام کا

کیونکر نہ شوق ہو مجھے دار السلام کا — میں ہوں غلام شاہ نجف کے غلام کا

کھلے گا عقدۂ مطلب اس آصفی کا ضرور — ہے دست شاہ نجف میں معاملہ دل کا

آتے ہی شہر نجف میں آصفی — خلد میں جانے کا رستہ کھل گیا

آصفی کے برے تھے سب اعمال — خلد میں عشق حیدری سے گیا

وہ ہے بندۂ خاص خلاق عالم — علی کو نہ جانو خدا ہے کسی کا!!

مدد میں غیر سے کسطرح آصفی چاہوں — بجز علی کوئی مشکل کشا نہیں ہوتا

حضرت آصفی کی طبیعت سمندری ہوا کی بہت خوگر تھی موسم گرما میں خصوصاً ساحل سمندر پر چلے جاتے تھے اکثر ان کا مقام

والطیہ ساحل مدراس ہی میں ہو رہا ہے چنانچہ وطن کی کشش نے انھیں ایک شعر اس طرح انشا کرنے پر مجبور کیا۔

آصفی چل ہے وطن اپنا دکن!
ہے وہ مدراس کے ساحل میں کیا

نواب آصفی نے سلام، رباعی، مرثیوں، نوحوں اور قصائد وغیرہ میں بھی طبع آزمائی فرمائی ہے ان کو باعث حصول سعادت دارین اور سرمایۂ آخرت تصور فرماتے ہیں چنانچہ ؎

مل گیا مجھکو صلہ مداحی شبیر کا
آصفی بخشا خدائے پاک نے خلد بریں

حضرت امام مظلوم سید الشہدا علیہ السلام کی مدینہ سے بعزم سفر روانگی کے مرثیہ کے چہرہ کے چند بند یہ ہیں ؎

گھر سے جب بہر سفر حضرت شبیر چلے
سر کٹانے کے لئے مالک تقدیر چلے
روتے اور پیٹتے سب صاحب توقیر چلے
کہا صغرا نے کہ ہے ہے شہ دلگیر چلے
آپ کا چین مجھے ہجر پدر میں کیونکر
جی لگے گا مرا کیا جانے گھر میں کیونکر

مل کے صغرا سے گئے قبر پیمبر پہ حسین
عرض کی آیا ہے اب آپکا یہ نور العین
سن نہیں سکتا ہوں میں زینب و کلثوم کے بین
قبر میں اپنی بلا لیجئے تو آئے چین
ہر گھڑی دغدغۂ طفلی مجھے یاد آتا ہے
کوئی مقتل کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے

سلام بالکل منقبت و مدح میں ہیں اور نہ نوحہ کی صورت میں مدحت اور حالات شہادت دونوں پہلو نمایاں ہیں چند منتخب شعر یہ ہیں ؎

عزیز قتل ہوئے اس جناب سے پہلے
ستارے ڈوب گئے ماہتاب سے پہلے

کیا ہے قصد گل فاطمہ کی مدح کا جب
زباں دھوئی ہے میں نے گلاب سے پہلے

ہے رونے والوں میں نسخہ جو آصفی کا شمار
تو بخشا جائیگا روز حساب سے پہلے

طریقہ کربلا میں ہے عجب جہاں نوازی کا
جو پیاسے ہیں انھیں آب دم خنجر پلاتے ہیں

قصیدہ — حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ولادت باسعادت پر جو برجستہ قصیدہ لکھا ہے اُسکے چند شعر یہ ہیں ؎

جا چکا دور خزاں باغ میں آئی ہے بہار
پھول پیدا ہوئے ہر شاخ میں پھولا گلزار

ایک اک نخل پہ گلزار میں ہیں سینکڑوں پھول
ایک اک شاخ پہ بلبل نظر آتے ہیں ہزار!

گدگداتی ہے انھیں باد بہاری آ کر
پھول اس وجہ سے ہنستے ہیں چمن میں ہر بار

اور ہی اور ہی جو گلستاں پہ گھٹائیں چھائیں
اور ہی کچھ نظر آنے لگا رنگ گلزار!

منشی شمس الدین محمد امیر حمزہ حمزہ مرحوم محتسب قندھار

حمزہ

منشی شمس الدین محمد امیر حمزہ مرحوم

۱۲۷۶ھ تا ۱۳۳۷ھ

از محمد اکبر الدین صاحب صدیقی

نام محمد شمس الدین ہے لیکن انکے عرف امیر حمزہ نے اتنی شہرت حاصل کرلی کہ اصل نام پر پردہ پڑ گیا، اسکا سبب یہ ہے کہ وہ "داستان امیر حمزہ" کے حافظ تھے۔ اور جہاں جاتے امیر حمزہ کے نام سے پکارے جاتے۔ اعزہ میں، دوست احباب میں حتی کہ دفاتر سرکاری میں بھی وہ شمس الدین کے بجائے امیر حمزہ ہو گئے۔

حضرت حمزہ ۵ ربیع اول ۱۲۷۶ھ میں بمقام قندھار شریف (ضلع ناندیر) پیدا ہوئے سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ انکے جد اعلیٰ قاضی عبدالرحمٰن بن قاضی محمود کے پوتے قاضی جیر الدین بہ عہد شاہجہاں ۱۰۷۹ھ میں منصب قضاءت و خطابت سے سرفراز ہو کر قندھار آئے اور موضع پڑلی بطور جاگیر عطا ہوا۔ چنانچہ اب تک ان کی اولاد اس پر قابض ہے۔

انکی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ کیونکہ ان کے والد محمد سالار غیور نے جو خود ایک جید عالم اور مدرس تھے اپنے لڑکوں کی تعلیم کا انتظام اپنے ہی ذمہ لیا تھا۔ حضرت حمزہ ذہین اور بڑے ذکی الطبع تھے چنانچہ بہت جلد فارسی پر عبور حاصل کر لیا۔ شاعری بھی انہیں ورثہ ہی میں ملی تھی۔ غیور خود ایک اچھے شاعر تھے اور اپنے ہر تلمیذ رشید کو اچھا شاعر دیکھنا چاہتے تھے لیکن ان کا بیشتر زمانہ اضلاع میں گزرا اسلئے شہرت نہ حاصل کر سکے۔ قطع نظر اسکے وہ قدیم طرز کے عالم تھے اور فارسی زیادہ مرغوب تھی۔ اردو میں انھوں نے اپنا کوئی دیوان مرتب نہیں کیا۔ مثل مشہور ہے کہ "ہونہار بروا کے چکنے پات"۔ حضرت حمزہ نے جب شاعری کی دنیا میں قدم رکھا تو بلحاظ رجحان زمانہ انھوں نے اپنی توجہ اردو پر صرف کی۔ نہ صرف شاعری پر بلکہ اردو ادب پر بھی ابتداً حضرت حمزہ نے اپنے والد ہی سے شعر و سخن میں اصلاح لی اور پھر حضرت مظفر الدین معلی کے شاگرد ہو گئے۔ زمانہ طفولیت سے شعر کہنے اور انہیں حفظ کرنے خاص محفلوں اور رنگا رنگ تقاریب میں خوش ہو ہو کر سنایا کرتے۔

ملازمت اور ادبی ذوق: حضرت حمزہ نے ابتداً محکمۂ اول تعلقداری ضلع نظام آباد میں ملازمت کی لیکن کچھ عرصہ بعد ہی اس کو خیرباد کہہ دیا اور حیدرآباد آکر شاہ علی بنڈہ میں مقیم ہوگئے دوبارہ ۱۲۹۱ف میں سررشتۂ پیمائش میں ملازم ہوئے تو ایسے پھنسے کہ تمام عمر وہیں گزار دی۔ دورانِ ملازمت میں بہ تقریب دورہ انھیں اکثر مقامات دیکھنے کے مواقع ہاتھ آئے اور معلومات میں اضافہ ہوتا گیا وہ ان لوگوں میں نہ تھے جو دنیوی علایق میں پھنس جانے کے بعد ادبی خدمت چھوڑ بیٹھتے ہیں انھیں ادبیات سے فطری لگاؤ تھا وہ آخر دم تک طالب علم رہے کتب بینی کا بیحد شوق تھا۔ ان کے شوق علم و ادب کو ملازمت کم کرسکی اور نہ انکی دیگر مصروفیت، وہ سرکاری امور میں بیحد مصروف رہتے لیکن کچھ نہ کچھ وقت ادبی کام کے لئے ضرور نکال لیتے۔ ایسے زمانہ میں جب تعلیم اس قدر عام نہ تھی حضرت حمزہ نے جو ادبی خدمات انجام دیں اس کا ہر اہلِ ذوق کو اعتراف ہے انھوں نے نہ صرف متعدد اعلیٰ پایہ کتابیں لکھیں بلکہ سرزمین دکن کے تعلیم یافتہ طبقہ میں تصنیف و تالیف کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ ان کے حالات زندگی اور خاندان و اولاد وغیرہ کا تذکرہ ہم نے اپنی کتاب "مشاہیر قندھار" میں تفصیل سے کیا ہے

ادبی کارنامے:۔ ان کے ادبی کارنامے تین ابواب پر منقسم ہوسکتے ہیں۔

(الف) تاریخ　　(ب) ڈرامہ نگاری　　(ج) شاعری

تاریخ قندھار دکن:۔ حضرت حمزہ نے ایک مورخ کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی ہے "تاریخ قندھار دکن" ان کا ایک زرین کارنامہ ہے جو ان کی کئی سال کی کد و کاوش کا نتیجہ ہے۔ قندھار کی سیاسی حیثیت قدیم زمانے میں جیسی کچھ تھی اسکے تاریخی قلعہ اور فصیل سے اب بھی ظاہر ہوتی ہے بزبانِ حال سے اپنی عظیم الشان داستان سنا رہے ہیں۔ اسکی عظمت کا اندازہ صرف ایک نظر میں کیا جاسکتا ہے۔ اسکی بلند چوٹی، اسکی عمیق خندق اور اژدہا نما توپیں (جو اب بھی چند موجود ہیں) اسکی سطوت و جبروت کی شاہد ہیں۔

"تاریخ قندھار دکن" کی وجہ تصنیف انکے دیباچہ میں یہ لکھی ہے:۔

"قندھار دکن" میرا آبائی وطن ہے اور محتسبی کی خدمت میرے خاندان میں مخصوص ہے۔ اور اس قصبہ کی جاگیر و مقطع سے حصہ پاتا ہوں انعامداری اور زمینداری کی عزت بھی حاصل ہے اس لئے مجھے اس کے ساتھ خاص تعلق ہے"

یہی وجہ تھی کہ حضرت حمزہ نے "قندھار کی آبادی اور اس کے عروج و زوال کے واقعات کو جو کتب تاریخ میں پراگندہ اور متفرق" تھے ایک کتاب میں جمع کردیا ہے۔ اور جو دقتیں اس راہ میں حائل ہوئیں اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:۔

"اس کے واقعات مختلف کتابوں میں اس قدر پریشان تھے کہ ان کا جمع کرنا اور کتاب کی صورت میں اہل وطن کے سامنے پیش کرنا نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا لیکن دل میں جو شوق ایک بار پیدا ہو چکا تھا نہ رکتا تھا...... میں نے دکن کے متعدد کتب تاریخ سے قندھار کے متعلق جو مضامین پائے چن لئے ...... قلمی کتب اور بیاضوں سے جو میرے جد بزرگوار مولانا مولوی محمد امین الدین صاحب کثرت نے کتب خانے میں رکھ چھوڑے تھے اور جسکو میرے والد ماجد مولانا محمد سالار صاحب عینو نے میرے تفویض کیا۔ اسکے علاوہ اور کاغذات و اسنادِ قدیم جن کا ذخیرہ میرے خاندان میں میرے چچا زاد بھائی مولانا مولوی حاجی محمد بہاء الدین صاحب محتسب قندھار کے پاس موجود ہے ان سے بھی عند الضرورت بہت مدد لی ہے۔ آخر زمانہ کے راجاؤں کے عہد حکومت کے حالات کا مواد مولانا شاہ صاحب حسینی صاحب ابن حاجی سید شاہ حیدر علی صاحب کے پاس موجود تھا اور اسکی تصدیق قدیم دفاتر سرکار عالی صیغہ مال و دیوانی اور دفتر مقدم پٹواری سے کر کے واقعات صحیح درج کتاب کئے گئے محکمہ بندوبست اور محکمہ مالگزاری کی رپورٹوں سے بھی ہمارے قندھار کے متعلق ہم نے مضمون اخذ کر کے لکھ دیا ہے۔ اور قدیم سفرنامے اور نیز بزرگانِ دین کے تذکروں سے بھی حالات لے لئے ہیں ......

غرض جہاں تک ہو سکا معتبر اور صحیح واقعات لئے گئے قصے اور نقلیں جو عوام کی زبان زد تھیں چھوڑ دی گئیں .... میں نے اور بھی مختلف کتابوں سے مضامین کی صحت کی اکثر مقامات پر قلمی کتابیں جنکی مجھ کو تلاش تھی دستیاب ہوئیں میں نے اپنی کتاب کے مندرجہ واقعات کی صحت میں کوتاہی نہیں کی اور اس کو درست کرتا گیا اور ۱۳۲۱ھ میں اسکی پوری تکمیل ہوئی۔"

اس کتاب کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس امر کے اظہار کے بعد ہو جائے گا کہ اکثر موقعوں پر اہل خدمات اور جاگیرداروں کی وراثت وغیرہ کے مقدمات کے سلسلے میں اس کتاب کے بیانات کو بطور سند قبول کیا گیا ہے۔ اور دوسری اہمیت اس کتاب کی یہ ہے کہ ریاست حیدرآباد کے کسی شہر یا قریہ کے متعلق ایسی مبسوط محققانہ اور مستند تاریخ آج تک نہیں لکھی گئی حالانکہ عہد حاضر میں بڑے بڑے انشاپرداز اور محققین مصروف کار ہیں۔ یہ کتاب دراصل ۱۳۱۵ھ میں تکمیل پا چکی تھی لیکن حضرت ہمزہ کی ملازمت نے اسکو چھ سال تک شائع ہونے کا موقع نہ دیا جب ۱۳۲۱ھ میں شائع کی گئی تو اس قدر مقبول ہوئی کہ آج بھی اس کی مانگ ہے۔

"تاریخ قندھار" جیسی ادبی خدمت کو ملک و بیرون ملک کے اہل ذوق نے بھی شوق سے خریدا اور تبصرے لکھے چنانچہ شبلی جیسے مایہ ناز ادیب نے اس پر ان الفاظ میں تنقید کی :۔

"یہ کتاب نہایت سلیقہ سے لکھی گئی ہے، زبان صاف اور شستہ ہے اور صحیح اردو کی پابندی کی گئی ہے"۔
مولوی عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ "زیادہ تعریف کی بات یہ ہے کہ زبان نہایت سادی اور بے تکلف اور انشاپردازی کی شان لی ہوئی ہے"۔

اس تصنیف کی قابل قدر بات یہ ہے کہ قندھار میں جتنے بزرگان دین کے مزار ہیں ان سب کے سوانح حیات اس کتاب میں تفصیل سے ایک علحدہ باب میں درج کر دئے گئے ہیں۔ اور ہر واقعہ کے متعلق کتب قدیم کے بھی حوالے دئے گئے ہیں یہی چیز ہے کہ اس نے خاص و عوام میں بہت مقبولیت اور مستند ہونے کا درجہ حاصل کر لیا۔

تاریخ کولاس ۔ حضرت حمزہ نے ایک اور تاریخ بھی لکھی جو "تاریخ کولاس" کے نام سے موسوم ہے کولاس حیدرآباد سے شمال مغربی جانب ۱۰۶ میل اور نظام آباد سے جنوب کی جانب ۳۶ میل کے فاصلہ پر سلسلۂ بالاگھاٹ پر ایک قصبہ ہے جسکی زمانہ سابق میں عظمت اور خوشحالی کے لحاظ سے خاص اہمیت اور شہرت تھی۔ اسکی اہمیت میں اضافہ کرنے والا اس کا مستحکم قلعہ تھا لیکن اب وہاں کی ہر چیز ہونے نہ ہونے کے برابر ہے۔

"تاریخ کولاس" قندھار کی تاریخ سے بیس سال بعد لکھی گئی ہے اس کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصہ میں کولاس کی بنیاد پڑنے کے بعد سے نواب آصفجاہ اوّل کے آغاز حکومت تک کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں کولاس کا دور آصفی میں تاریخی کیا مرتبہ تھا اسکو واضح کیا گیا ہے۔

حضرت حمزہ نے دونوں تاریخوں کے لکھنے میں نہایت محنت اور اہتمام سے کام لیا ہے۔ عموماً مورخ ہمیشہ جانبداری کا پہلو اختیار کرتے رہتے ہیں لیکن ان دونوں تاریخوں میں کہیں یہ محسوس نہیں ہو سکتا کہ مورخ ہندو ہے یا مسلمان، دکنی ہے یا شمالی ہند کا باشندہ۔

روضۂ شہید یعنی سوانح حیات حضرت شاہ عالم شاہ عنایت اللہ حسینی شہید۔ زاید غریق اسکا تاریخی نام ہے۔ یہ کتاب دراصل حضرت شاہ عالم سید شاہ عنایت اللہ حسینی شہید کی سوانح حیات ہے جو مصنف کے ماموں زاد بھائی تھے اور رود موسیٰ کی مشہور طغیانی سنہ ۱۳۲۶ھ میں غریق رحمت ہو کر آپ نے شہادت پائی۔ اس تالیف میں ممتاز رود موسیٰ کی ان ۲۹ طغیانیوں کا ذکر ہے جو دفعتاً حیدرآباد میں نازل ہوئیں تھیں اور وہ طغیانی جو آج تک قیامت صغریٰ کے نام سے مشہور ہے اور جو سنہ ۱۳۲۶ھ کا واقعہ ہے اسکے حالات زیادہ وضاحت سے لکھے گئے ہیں۔

روضۃ الشہدا کی زبان و بیان بھی نہایت صاف اور پاکیزہ ہے۔ اس میں حضرت صاحب عالم شہید کے خاندان، تعلیم، حالات زندگی اور سلوک و عرفان کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

"مکاشفات سروری": "تاریخ قندھار" کے سلسلۂ تالیف میں بعض عائدین قندھار کے سوانح زندگی سے متعلق جو چند قلمی نسخے اور کاغذات دستیاب ہوئے تھے ان میں ایک جلیل القدر بزرگ حضرت حاجی سیاح سید سعیدالدین رفاعی سروری قدس سرہٗ کے فارسی مکتوب بھی تھے اور یہ مکتوب تصوف جیسے اہم اور مشکل مسائل پر لکھے گئے تھے حضرت حمزہ نے بڑی محنت سے اسکا ترجمہ عام فہم سلیس اردو میں کیا تھا چونکہ اس کا تعلق مسائل تصوف سے تھا اس لئے حیدرآباد کے ایک مشہور واعظ و صوفیٔ عالم حاجی سید محمد عمر شاہ صاحب قادری کی نظر ثانی کے بعد یہ کتاب طبع ہوئی۔

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد صوفی مدظلہ نے اس ترجمہ کی خوبی کے متعلق کیا خوب فرمایا ہے۔ قطعہ:-

کیا ترجمہ مکتوب کا جو حمزہ نے — مکاشفات سروری رکھا ہے نام اسکا

دوئی کے رنگ میں وحدت کا نور ہی پیدا — عجب مزے کا ہے اے شاد یہ کلام اسکا

ڈرامہ نگاری: دکن کی ڈرامہ نگاری کے مدارج ارتقا میں حضرت حمزہ کا اولین حصہ ہے۔ انھوں نے متعدد ڈرامے لکھے جنہیں سے اکثر کلکتہ کی الفنسٹن تھیٹریکل کمپنی کی جانب سے اسٹیج پر پیش کئے گئے تھے اور یہی ڈرامے کمپنی مذکور کی شہرت اور شاندار کامیابی کا باعث ثابت ہوئے۔

انکے اکثر ڈرامے منظوم ہیں اور نہایت لطیف پیرائے میں پیش کئے گئے ہیں چند ڈراموں کا اجمالی طور پر یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے

سحر سامری: اس کے دو حصے ہیں پہلا طلسم جمشید اور دوسرا طلسم توقلموں دونوں حصے زیادہ تر ظرافت آگین ہیں یہ ابتداً ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئے اور جب انکی مانگ زیادہ ہونے لگی تو ۱۳۲۱ھ میں طبع کئے گئے عام مقبولیت کی وجہ سے تیسرا ایڈیشن بھی شائع کرنا پڑا۔

غنچۂ دلبری: یہ ایک سماجی ڈرامہ ہے اور سماج کے اخلاقی اور معاشرتی عیوب کی اصلاح کا بہترین کارنامہ

ساحر سبھا :- یہ زیادہ تر معاشرتی ہے اسکی مقبولیت کے لئے اسقدر کہنا کافی ہے کہ دو دفعہ طبع ہوا۔

دیگر ڈرامے :- انکے علاوہ سحر سوسن، گل و بلبل، شہر عشق اور جوہر خنجر انکے مذاق سلیم کے آئینہ دار ہیں اور عوام میں بہت مقبول رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ آج ان ڈراموں کا کوئی ایک نسخہ بھی بازار میں نہیں ملتا۔ سنا گیا ہے کہ انھوں نے تارک الدنیا ہونیکے بعد اسکو لہو لعب خیال کر کے ملتفا و ضائع کر دیا اور ڈرامہ کا ایک نسخہ بھی اپنے کتب خانہ میں چھوڑنا گناہ سمجھا۔

شاعری :- انکے ادبی کارناموں کا سب سے اہم جزو شاعری ہے جو عمر بھر ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ حضرت حمزہ نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلیات، قصائد، ٹھمریاں، نظمیں وغیرہ سبھی لکھی ہیں لیکن نعتیہ اشعار کی تعداد زیادہ ہے ٹھمریاں اور قصائد عموماً سب نعتیہ ہیں اور نثر مع تحریر ان اختیار کی گئی ہو۔

چمنستان حمزہ :- انکے نعتیہ کلام کا مجموعہ جسمیں صرف قصائد و ٹھمریاں شامل ہیں "چمنستان حمزہ" کے نام سے شائع ہوا تھا ملک اور بیرون ملک نے اسکا اس جوش کیساتھ خیر مقدم کیا کہ اس مجموعہ کو دو سال کے بعد ہی خریداروں کے تقاضے پر دوبارہ شائع کرنا پڑا اس وقت ہمارے پیش نظر طبع سوم (۱۳۴۹ھ) کا نسخہ ہے حضرت حمزہ نے بیرون ملک جو شہرت حاصل کی ہے اس کا اندازہ ذیل کے فقرہ سے ہو سکتا ہے جو روزنامہ "منشور دکن" میں بائیس سال قبل ۲۴ جمادی الاول ۱۳۳۳ھ کے صفحہ دوم پر شائع ہوا ہے۔ مالاوٹا کنڈ و نیلگیری کے سلسلے میں نامہ نگار رقم طراز ہے:-

"آجکل "انجمن اسلامیہ" ترقی پر ہے اس انجمن نے ایک میلاد کی جماعت قائم کی ہے..... مولوی محمد امیر حمزہ صاحب المتخلص حمزہ حیدرآبادی سررشتہ دار نظامت ٹپہ گزشتہ جمعہ کو یہاں تشریف لائے یہاں کے بہت سے حضرات آپکے استقبال کے لئے اسٹیشن تشریف لے گئے تھے کیونکہ یہاں پر صاحب موصوف ہی کے قصائد کثرت سے پڑھے جاتے ہیں چنانچہ جب صاحب موصوف گزشتہ سال ناظم صاحب ٹپہ کے ہمراہ یہاں تشریف لائے تھے اسی وقت سے "انجمن اسلامیہ" نے متذکرہ بالا میلاد کی جماعت کا نام "چمنستان حمزہ" رکھا ہے۔ اور اس کی رجسٹری بھی کروائی ہے۔ یہ خاص حیدرآبادیوں کیلئے فخر کی بات ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ و شعراء وغیرہ کی دوسرے شہروں میں بھی وقعت کی جاتی ہے۔"

نعتیہ ٹھمریاں لکھنے میں اعظم علی شائق کے بعد دکن میں حمزہ ہی کی شہرت ہے آج بھی اضلاع و بلاد وغیرہ میں میلاد کی مجلس

منعقد ہوتی ہیں اور عموماً حضرت حمزہ کا کلام نہایت شوق سے پڑھا جاتا ہے حضرت حمزہ اپنا کلیات شائع نہ کر سکے لیکن ان کے صاحبزادے مولوی عبد العظیم صاحب اس کی اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں کاش وہ جلد شائع ہو کر منظر عام پر آجائے اور حمزہ کی غزلیات کی اہمیت بھی معلوم ہو سکے یہاں ہم چمنستان حمزہ سے انکے چند نعتیہ اشعار کا انتخاب پیش کرتے ہیں ۔

نمونۂ کلام :- "چمنستان حمزہ" کا آغاز حمد سے ہوا ہے جسکے چند اشعار یہ ہیں ؎

یارب یہ سب ہے کام تیرا — عالم میں ہے انتظام تیرا
جن ہوں کہ ملک ہوں یا بشر ہوں — ہے سب کی زباں پہ نام تیرا
گو شان تیری ہے بے زبانی — موسیٰ نے سنا کلام تیرا
دوزخ نہ کیوں حرام اس پر — لے نام جو صبح و شام تیرا

اس کے بعد نعت کے میدان میں حضرت حمزہ کے رہوار قلم نے خوب خوب جولانیاں دکھلائی ہیں فرماتے ہیں :-

اللہ کی پناہ پناہ رسول ہے — ظل خدا ہے سایۂ دیوار مصطفےٰ
ملکی سی کوئی چیز ہے حوروں کے واسطے — دنیا سے اٹھ گیا نہ ہو بیمار مصطفےٰ

نعت میں عموماً مضمون آفرینی کلام کی تاثیر کو ضائع کر دیتی ہے اس نکتہ سے حضرت حمزہ واقف تھے انکی نعت کا ایک ایک مصرع کیا ایک ایک لفظ عقیدت و محبت میں ڈوبا ہوا ہے ؎

رحمت بلائیں لے گی شفاعت کریگی پیار — دیکھے گی خلق شان گنہگار مصطفےٰ

سوز و گداز اور اظہار عقیدت تو ان کے کلام کا مخصوص رنگ ہے تاہم انکے کلام میں شاعرانہ رنگ بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے

دامن صبح قیامت دھجیاں ہو کر رہے — حشر میں پہنچیں اگر دیوانگان مصطفےٰ!
عشق محبوب خدا کی رہنمائی دل نے کی — مل گیا اللہ کے گھر سے نشان مصطفےٰ
لے خودی نے دیکھنا اللہ تک پہنچا دیا! — ڈھونڈنے نکلے تھے ہم گھر سے نشان مصطفےٰ
خاکساری تھی طبیعت میں تو ہمت تھی بلند — اک زمین مصطفےٰ اک آسمان مصطفےٰ!

علامہ سر اقبال کا ایک شعر ہے :۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

یہی تخیل حضرت حمزہ نے عجب پیرایہ سے نظم کیا ہے ؎

خدا کی شان کہ رحمت بھی ہو گئی محجوب　　کچھ ایسا حشر میں میں عرقِ انفعال آیا

علامہ سر اقبال کا ایک اور شعر ہے :۔

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن !!　　کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن

حضرت حمزہ کا یہ شعر ؎

گلوں کا راز یہ کرتی ہے افشا !　　صبا گلشن میں مارِ آستیں ہے

اس مقابلہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی مقصود نہیں ہاں تمثیل کی اولیت کا درجہ حضرت حمزہ کو حاصل ہے اور اسلوبِ بیان کی عمدگی سامعین کے مذاق سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت حمزہ کی شاعری کا اصلی میدان نعتیہ کلام ہے۔

نعتیہ کلام سے چند متفرق اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

میں آستانِ گنبدِ خضرا پہ گر پڑوں　　باد صبا سے چلتی ہے آ و جگر کی چوٹ

مرہم ہے زخمِ دل کو مرے سنگِ در کی چوٹ　　نامہ بری میں تیز روی کا ہے آ دعا

نگاہِ چشمِ تصور ہے روئے انور پر　　رہ طیبہ میں تھی پائمالی ہوتی جاتی ہے

سر فرازی ہوئی جاتی ہے تہی ہی جل شانہ　　مگر نہ ختم ہوئی آج تک نظر کی طمع

ہوا سے دو قدم جاتا ہوں آگے　　اس لئے زیرِ کفن چھپ کر چلے !!!

کثرتِ جرمِ معاصی کی ہے شرم　　نقاہت میری شہپر فرشتہ

عام طور پر قصیدہ گو شعراء ناصحانہ طریقہ اختیار کرکے واعظ بن جاتے ہیں لیکن چمنستانِ حمزہ خار و خس سے پاک ہے چند اشعار انھوں نے خود اپنے متعلق کہہ لئے ہیں گویا تمام دنیا پل صراط پر گھوڑے اڑاتی جائیگی اور حمزہ ہی کو اس امتحان میں کامیاب ہونے کیلئے زیادہ محنت کرنی پڑیگی وہ اپنے نامۂ اعمال کی فردِ سیاہ کو اشکِ ندامت سے دھو ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور گریہ سے مخاطب ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی کا اظہار اکثر سادہ لیکن موثر الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

حضرت حمزہ نے چند قصائد طویل بحر میں لکھے ہیں ان کا لطف تو کچھ محفلِ میلاد ہی میں آتا ہے لیکن یوں بھی ان کا مطالعہ کیف و سرور کا عالم پیدا کر دیتا ہے :-

میں تڑپ کے سسک کے مر گیا ابھی فدا جان میں اپنی کر دونگا ابھی — تو چھپا کے نقاب تھا آئینہ رخ مجھے خاک میں تسکینِ قمر نہ ملا

وہ جمال جو حمزہ دکھائی دیا مجھے ہوش تن کا ذرا نہ رہا — مجھے میری بھی گھڑی یوں نہ ملی یہ نہیں ملی ابھی وہ دوپہر ملا

عارض پہ گیسو کی لٹک — گیسو میں پھولوں کی مہک — دانتوں میں بجلی کی چمک

قربان ہیں جس پر ملک — ایسی چمک ایسی دمک — دیکھی نہ ہم نے آج تک

کہتے ہیں یہ شام و سحر — شمس و قمر لعل و گہر

آج جبرئیل امیں — خندہ جبیں آ کے قریں — چوم کے چوکھٹ کی زمیں

عرض کناں ہیں بہ ادب — اٹھو اے فخرِ عرب — خاصۂ رب آج کی شب

حق نے طلب تم کو کیا — با سر و سامانِ بہار

اے شہنشاہِ امم — نورِ قدم لوح و قلم — مارے جو دم ہو نہ رقم

وصف ترا حق کی قسم — تو وہ ذبیحا ہے واللہ — شہنشاہ ہے درگاہ

تیری کیوں نہ ہو پھر — روکشِ ایوانِ بہار

حضرت حمزہ نے بعض سخت زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے یہ کام کسی نومشق شاعر سے سرانجام نہیں پا سکتا وہ سخت سے سخت ردیفوں میں آسانی سے کلام موزوں کر لیتے ہیں مثلاً :-

اس نے پہلے اول تو اس دعوتِ اسلام دی — وہ خدا اور یہ نبی نذیر ہیں دونوں کی ایک

دل بنایا حق نے اور کعبہ خلیل اللہ نے — جلوہ گر دونوں میں ہے تجلی تیرے دونوں کی ایک

والضحیٰ رخِ نبی واللیل زلفِ مصطفےٰ — یوں جدا سمجھو مگر تفسیر ہے دونوں کی ایک

انھوں نے چھوٹی بحر میں اس طرح ایک قصیدہ لکھ کر اپنے کمال کا ثبوت دیا ہے :-

قدِ حضرت کے آگے سرو چمن!!! — بے سر و پا نہیں تو پھر کیا ہے

دل میں ارمان و شوق حسرت کا — حشر برپا نہیں تو پھر کیا ہے

اپنی آنکھوں کے سامنے ہر دم — اس کا جلوہ نہیں تو پھر کیا ہے
داغ مہجوری رسول اللہ !!! — گل لالہ نہیں تو پھر کیا ہے

اشعار میں تکرار الفاظ سے جو خوبی اور لطافت پیدا ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں حضرت حمزہ نے اس صنعت میں کئی اشعار لکھے ہیں جنمیں سے چند یہاں درج ہیں :-

کبھی چشم سپہر کو پیارے نبی کوئی تجھ سا حسین بشر نہ ملا — کہیں تیری نظر کو نظر نہ لگے کہ کسی کی نظر کو نظر نہ ملا

پیغمبر خدا کی ولادت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں -

زلزلہ محلوں میں کسریٰ کے پڑا بت گر گئے — جب وہ محبوب خدا نام خدا پیدا ہوا !!

ایک قصیدہ بھی اسی صنف میں لکھا ہے جس کے تین شعر درج ہیں :-

ہوئی ہے زندگی برباد گردش میں پس مردن — ہمارے کاسۂ سر کو فلک گردش نہ در در دے

بشر بوجہل تھا خیر البشر نور الٰہی تھے !! — تعجب کچھ نہیں گر نور کو ناری بشر شر دے

چلے ہیں قافلے یاروں کے ہم بھی جائینگے اک دن — نہیں کچھ فکر عقبیٰ کی پڑے ہیں آنکھ پر پردے

حضرت حمزہ کو اپنے وطن سے اتنی گہری الفت تھی کہ اسی جذبہ نے انھیں "تاریخ قندھار" لکھنے پر مجبور کیا اور اپنے وطن کو شہرت دینے کے لئے انھوں نے مختلف غزلوں اور متعدد اشعار میں قندھار کا لفظ باندھا ہے اور اپنے قندھاری ہونے پر فخر کیا ہے جہاں کی خاک سے ایسے علما اٹھے جنکا جواب اب حیدرآباد نہیں دے سکتا۔ ان میں زیادہ مشہور حضرت سانگڑے سلطان مشکل آسان قدس سرہٗ مولانا ربیع الدین قدس سرہ مولانا فضیلت جنگ رحمتہ اللہ علیہ (بانی مدرسہ نظامیہ و استاد اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ) اور حاکم وہ قندھار جسکو عوام "حاجی سیان کا قندھار" کہتے ہیں اور جو عہد بہمنیہ سے آج تک مرد خیز ثابت ہوا ہے۔

قلعۂ قندھار کی زبانی جو عرضداشت حضرت حمزہ نے خسرو دکن آصف جاہ سادس کی خدمت میں پیش کی ہے اسکے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں :-

اے مرے والی مرے سلطان عالی منزلت — عہد میں تیرے زمانہ اک گل بے خار ہے
تو ہے سلطان دکن تیری رعایا ہیں سبھی — تیرے نخل فیض کا ہر ایک برخوردار ہے

ہے زمانہ پر ترا ابر کرم سایہ فگن — اک مگر محروم بخشش قلعۂ قندھار ہے
اک زمانہ تھا کہ میں تھا مامن و ملجائے خلق — اور اب آفت میں خود ہی بیکس و جاں زار ہے

تھا کبھی اک گوشۂ امن و اماں میرا عصا | اب مجھی کو امن ملنا کس قدر دشوار ہے | رحم کے قابل ہے میرا حال زار اب کیا کہوں | اک نگاہ لطف ہو جائے تو بیڑا پار ہے

سر مہاراجہ بہادر وہ یمین السلطنت | جو وزیر اعظم شاہ نکو اطوار ہے | وہ مبارک عہد ہے عہد وزارت شاد کا | شاد ما جس سے کہ ہر اک بیکس و لاچار ہے

ہو خدارا اب تو میری خستہ حالی پر نظر | بس یہی اک التجائے قلعۂ قندھار ہے

یہ الفاظ جن اثرات کے تحت حیطۂ تحریر میں آئے ہیں انکے اظہار کی ضرورت نہیں شاعر نے یہاں اپنے دلی جذبات کا اظہار کر دیا ہے

اور یہی اثرات ”چمنستان“ میں بھی جگہ جگہ گل کھلا رہے ہیں۔ اسکی ایک دو مثالیں درج ذیل ہیں ایک قصیدہ کا مقطع ہے ؎

ہاں سرِ شوق تصور کا اثر تو دیکھو | گو ہوں قندھار میں پیش نظر ہے طیبہ | حمزہ وہ جو ساکن قندھار ہے | نقد دل لیکر کھڑا ہے نذر کو!!!

ٹھمریوں میں بھی انھوں نے حب وطن کا جذبہ کا اظہار کیا ہے اسکی بھی ایک مثال پیش کیجاتی ہے ؎

دھیان آ جاتا ہے جب اپنی سیہ کاری کا | منہ لگا کر تا ہوں یا رب تری غفاری کا | ہو شفاعت یقین ہے جب کہ سب ساری کی | بول بالا ہو نہ کیوں حمزہ قندھاری کا

ہو لطف شبانہ ، تجھ سے یگانہ ، پڑھ لے دوگانہ ہے شب معراج

اور بھی متعدد اشعار اس جذبہ کے تحت لکھے گئے ہیں جن کا پیش کرنا باعث طوالت ہے ۔

حضرت حمزہ کی شاعری کا ابتدائی رنگ یعنے جب وہ ڈرامہ نگاری چھوڑ کر نعت گوئی کی طرف مائل ہوئے نظر آتا ہے اور اسکے بھی دو تین اشعار ملاحظہ ہوں ۔

محبت رنج و غم درد نہاں ہیچ | مری ہر بات ہے کیا میری جاں ہیچ | اگر چاہیں تو آئیں گردن کر!!! | بٹھا رکھا ہے در پر پاسباں ہیچ

حضرت خضر کو یہ کس نے دعا دی ہوگی! | عمر پوری نہ ہوئی وعدۂ فردا کی طرح

حضرت حمزہ کے آخری دور کا رنگ بھی ملاحظہ ہو جب کہ حمزہ ڈرامہ نگاری نعت گوئی اور نعت گوئی سے بڑھکر صوفی ہو گئے ہیں صرف ایک غزل کے چند شعر ہدیہ ناظرین ہیں ؎

تو ڈھونڈ خدا سے دل میں گر تجھکو تجسس ہے | کعبہ میں ہے کیا رکھا مندر میں دھرا کیا ہے | بندہ کسے کہتے ہیں کہتے ہیں خدا کس کو | نقطہ کی ہے ایک گردش دونوں میں جدا کیا ہے

کعبہ میں کلیسا میں ہے یاد تری ہر دم | الفت کا تری یا رب یہ شور بپا کیا ہے | ہر چیز میں اس کا ہی جلوہ ہے نہاں حمزہ | سمجھوں جو بھلا بت کو تو اسمیں برا کیا ہے

اب ہم انکی ٹھمریوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو محفل میلاد میں قصائد سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں اور ہم جہانتک سمجھتے ہیں یہی ٹھمریاں قصبہ قصبہ اور موضع موضع میں حمزہ کی شہرت کا باعث ہوئیں۔ انکے مطالعے کے بعد ناظرین کو اندازہ ہو جائیگا کہ حمزہ کس پایہ کے شاعر تھے اور انھیں خیالات کی ترجمانی کرنے میں کتنا عبور حاصل تھا۔ وہ ہندی سے کہاں تک واقف اور ہندی الفاظ کے استعمال پر کتنے قادر تھے ہم چار پانچ بند مختلف ٹھمریوں سے پیش کرتے ہیں۔

نبی جی کی کہانی   جب میں دنیا میں آئی   پر وہ نزدیک مجھکو بلاتے نہیں

میں نے کیا کی برائی   ان سے جو دل لگائی   کوئی دنیا میں کیا دل لگاتے نہیں

تلپت کلپت بیتی رتیاں نیند اچٹ گئی ہائے (۱) پلک پلک سے ناہیں لاگیں نین چلیں پیچ درس نہ پائے

سکھی تم ہی بتاؤ   کیسا ہوگا نبھاؤ   کس سے بولوں ، ملاؤ ،

وہ تو آتے نہیں اور بلاتے نہیں !!!   کوئی دنیا میں کیا دل لگاتے نہیں

دیس میں رھکر پردیسی پرجی سے ہوئی بلہار (۲) جسکی چاہ میں ڈوب رہی ہوں وہ ہے سمندر پار

خضر ملیں گر ، ناؤ چڑھا کر ، بولوں گی رہبر ،

بتلاؤ جی خواجہ اس رہ گزر کو !!   دکھلاؤ جی روئے خیر البشر کو !!

پیت پیت سب کوئی بولیں پر نہیں جانیں پیت کی ریت   تن من دھن کو آگ لگا دے گیان گنوا دے وہ ہے پیت

نیہا کی بتیا سکھی من مانی ہے مورے   لے کے سپنے میں داغ جگر جاؤں گی

گورا مکھڑا چندر ماتھا نین میں ہیں ڈورے لال ! (۳) بل بل جاؤں سلیں نبی پر گھونگر والے گہنے بال !

کاکل کا سکھی انکے قصہ یہ چھیڑو   دیکھو زلفوں سے پڑھکر بکھر جاؤں گی

بار گینہ سے ڈوب رہی ہے آن پڑی ہے منجدھار (۴) نبی جی موری نیا کردو پار ۔

بالا پن اور چڑھی جوانی دونوں گئے برباد   بوڑھے پن میں حرص بڑھی تھی کیا قصہ یاد

اب تو چھوٹ چلے گھر بار   نبی جی موری نیا کردو پار ۔

نواب سید محمد مہدی خاں مہدی مرحوم

مہدی

نواب میر محمد مہدی خاں مرحوم

سنہ ۱۲۷۷ھ تا سنہ ۱۳۳۷ھ

از سید محمد نقی صاحب رضوی

میر محمد مہدی نام مہدی تخلص سادات عابدی سے تھے سلسلۂ نسب حضرت امام زین العابدین علیہ السلام تک پہنچتا ہے سنہ ۱۲۷۷ھ میں حیدرآباد دکن میں تولد ہوئے۔ انکے جد اعلیٰ نواب سمیع الدولہ دہلی سے نواب آصف جاہ کیساتھ دکن میں آئے اور جاگیرات و مناصب سے سرفراز رہے ۔

انکے اجداد مادری جنہیں علی یاور خاں اقبال خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں بنگالے کے شاہی خاندان سے تھے۔ بنگالے کی تباہی کے بعد حضرت اقبال حیدرآباد آگئے۔ بڑے عالم و فاضل متقی اور پرہیزگار تھے۔ مرزا مہدی نام علی یاور خاں خطاب، اور اقبال تخلص تھا فارسی میں شعر کہتے تھے زیادہ تر مدح اہل بیت میں ذاکر او خطیب اس پایہ کے تھے کہ جب وہ منبر پر جاتے ناممکن تھا کہ مجلس بیخود نہ ہو جائے صاحب گلزار آصفیہ حیدرآباد کے عشرۂ محرم کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ (۸۰۵) پر حضرت اقبال کے احوال میں یوں رقم طراز ہیں :-

"اما روضہ خوانی در ہمہ جا ست علی الخصوص در مکان علی یاور خان اقبال تخلص کہ مشہور بہ مرزا مہدی بودند کہ نبیرۂ مرشد قلی خان بنگالی عالی خاندان و رئیس بلاد و امصار مانند ایشان در این کمال روضہ خوانی، واقعہ خوانی و بیان احوال امام شہید معصوم امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام بنظر احدی نہ آمد ہر گاہ بالائے منبر برآمدہ فاتحہ میخواند خلقت خدا از ہندو مسلمان ہزار ہا مردم را بمجرد بیان احوال بسیار رقت عظیم دست میداد۔ میخواستند کہ خود ہا را از دست خویش ہلاکت کنند تا بہ بیان چہ رسد بیانش لابیان طلاقت لسان و فصاحت زبان از ہزاراں ہزار کہ خارج از بیان و اظہار بودہ، قوت بیانیہ و انداز کلام سلک در شاہوار فرد فرید منتخب روزگار بودہ تمامی خاصان بلدہ از امیر و فقیر مسلمان و ہندو ہمہ یاد رعاشور خانہ اش حاضر می بودند ۔

حضرت اقبال نہایت پرگو شاعر تھے چنانچہ گلزار آصفیہ میں انکے کلام کی نسبت لکھا ہے :-

وفات اور باقیات الصالحات :- تریسٹھ برس کی عمر میں حضرت مہدی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور باقیات الصالحات میں علاوہ تصنیفات کے آٹھ اولادیں چھوڑیں جن کی صلاحیت و قابلیت آپس کی رواداری اور اتفاق و اتحاد قابلِ ستائش اور لائقِ تقلید ہے۔

"مہر سما ذاکری" آپ کی تاریخ ولادت حضرت اشہر نے کہی تھی۔ تاریخ وفات یادگار زمانی واشہر حضرت جعفر نے کہی کہ "مہر سما ذاکری آہ آہ چھپ گیا" ۱۳۰۰ ہجری ۱۳ — انکی مختصر سوانح حیات کے بعد اب ہم حضرت مہدی کے کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں حضرت مہدی کی شاعری تمام تر مداحیِ اہلِ بیت سے تعلق رکھتی ہے مراثی ہیں سلام ہیں اور رباعیات۔ اس شوق کا ذکر انھوں نے خود اپنے ایک ابتدائی مرثیہ میں اسطرح کیا ہے۔

بعض احباب کا یہ مجھ پہ صد العنہ تھا | وجہ اس مرثیہ گوئی کی سنیں اہلِ عزا
روضہ خوانی میں تو ہر سمت ہی ان کا شہرا | مرثیہ لکھیں تو معلوم ہو جوہر ان کا
کہہ کے کچھ بند کمال اپنا دکھائیں تو سہی | جا کے ممبر پہ انہیں پڑھ کے سنائیں تو سہی

انکے بعد اس طریقِ عزاداری کا ذکر فرمایا ہے جو دکن میں حضرت اقبال کے آنے سے پہلے رائج تھی۔ اسی سلسلے میں اپنے بزرگوں کے مساعی کو بھی نظم فرمایا ہے جو اشاعتِ عزا سے متعلق انھوں نے انجام دے۔ اسلوب بیان اور سلاست زبان قابلِ ملاحظہ ہے۔

۱
ہند میں شاہ کے مداح یہی تھے سب جدا | جن سے راضی تھے نبی خوش تھیں بنت خیر الورا
اب سنو میرے بزرگوں کا بھی احوال ذرا | جن سے اس شہر میں ہے تعزیہ داری کی بنا
ان سے پہلے نہ یہ ترکیب عزاداری تھی | نہ یہ ممبر تھا، نہ ذاکر تھا، نہ یہ زاری تھی

۲
چند گھر ایسے تھے جنمیں کہ عزا ہوتی تھی | مجلسِ ماتمِ شاہِ شہدا ہوتی تھی
گریہ ہوتا تھا شہِ دیں پہ بکا ہوتی تھی | صرف دس روز عزا اس کی بپا ہوتی تھی
عاشقِ شاہ ہر اک محو بکا ہوتا تھا | سوز خوانوں کی طرح ذکرِ عزا ہوتا تھا

۳
جدِ اعلیٰ مرے اقبال "علی" یاور خاں | جن سے اس شہر کا واقف ہے ہر اک پیر و جواں
والۂ آلِ نبی عارفِ ربِّ دو جہاں | عالم و زاہد و ابرار و فرید دوراں
حافظِ مصحفِ حق قاریِ قرآں تھے وہ | شہ کے مداح تھے، ذاکر تھے ثنا خواں تھے وہ

۴
کون اقبال سا مداح زمانے میں ہوا | نظم اور نثر کے جاری ہوئے جن سے دریا
سب وضیع و شریف و امرا اور رؤسا | فخر ان سب کو تھا اقبال کی شاگردی کا
شہِ مظلوم کو سب خلقِ خدا روتی تھی | ان کی تصنیف پہ ہر گھر میں عزا ہوتی تھی

۵
ان کے والد بھی تھے مداحِ شہِ ہر دو سرا | محمد مردان کا تخلص تھا سخن سا
دونوں فرزند بھی مداح تھے ان کے بخدا | اک کا قابل تھا تخلص تو قبول ایک کا تھا

ذاکر شاہ تھے مداح شہ والا تھے
جنکا قابل تھا تخلص وہ مرزا نا تھے

میرے والد بھی تھے مداح امام دوجہاں
صاحب علم و ہنر واقف اسرار نہاں ۶
عابد و زاہد و ابرار و مسیح دوراں
فخر بقراط و فلاطون و ارسطوئے زماں
ذاکر بادشہ عرش پناہی تھے وہ!
رات دن محو عبادات الٰہی تھے وہ

ایک دوسرے مرثیہ کے تمہید کے چند بند درج ذیل کئے جاتے ہیں ؎

پھر جلوہ نما چہرۂ سلمائے سخن ہے
پھر نور فشاں عارض لیلائے سخن ہے ۱
پھر سایہ فگن زلف چلیپائے سخن ہے
پھر حسن بیاں انجمن آرائے سخن ہے
پرتو نظر آتا ہے عروسان سخن کا
الفاظ کا پردہ ہے کہ گھونگھٹ ہے دلہن کا

خوبان مضامیں کا وہ حسن اور وہ نزاکت
ہے بار گراں جسم پہ الفاظ کا خلعت ۲
ابطال سے تنفر ہے تو تعقید سے نفرت
مرغوب اگر ہے تو فقط اپنی بلاغت
ترکیب و اضافت تو جواہر ہے سخن کا
اعراب ہیں حرفوں کے کہ زیور ہے دلہن کا

تشدید ہے یا تاج سر شاہد مضموں
مد ہیں کسی محبوب کے یا ابروئے موزوں ۳
دل کو ہو سکوں جزم کی تشبیہ وہ گیسوں
یہ چاند وہ ہیں جن پہ فدا ہے مہ گردوں
الفاظ ہیں یا پھول ہیں گلزار سخن کے
نقطے ہیں کہ افشاں ہے یہ چہرے پہ دلہن کے

اس طرح سے مضمون ہے الفاظ میں پنہاں
جس طرح سے تو آنکھوں میں اور جسم میں ہے جاں
عشاق کے یا دل میں نہاں نقش خوباں ۴
یا پھول میں بو رگ میں لہو قلب میں ارماں
معشوق کی جو شکل تو دلہن ہوتی ہے جیسے
شرم آنکھیں گھونگھٹ میں دلہن ہوتی ہے جیسے

اب ہم چند بند مدح پنجتن میں اسی مرثیہ سے نقل کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ لطف زبان، شوکت الفاظ، سلاست بیان ان کے کلام کے خصوصیات ہیں :-

معراج سخن نعت رسول دوسرا ہے
سرتاج سخن منقبت شیر خدا ہے ۱
مصباح سخن وصف بتول عذرا ہے
مفتاح سخن آل محمد کی ثنا ہے
مداح ہے رب دوجہاں آل نبی کا
قرآن قصیدہ ہے رسول عربی کا

واللیل کا سورہ ہے کہ گیسوئے محمد
والشمس ہے یا آئینہ روئے محمد
بسم اللہ قرآن ہے کہ ابروئے محمد ۲
خوشبو ہے جہاں جس سے وہ خوشبوئے محمد
سینہ ہے کہ گنجینہ ہے یہ فتح و ظفر کا
پیشانی انور ہے کہ سورہ ہے قمر کا

پیدا ہوئے یہ کون و مکاں آپکے باعث
پھولی گئی مخلوق ہے جہاں آپکے باعث
ہر شئے کو ملی تاب و تواں آپکے باعث ۳
قائم ہوئی دنیا میں اماں آپکے باعث
مخلوق اگر سید لولاک نہ ہوتے
پیدا کبھی یہ گنبد افلاک نہ ہوتے

۴
نام آپ کا ہے طرۂ دستارِ نبوت کام آپ کا گمراہوں کو کرنا ہے ہدایت
ذات آپ کی ہے باعثِ ایجادِ خلائق خلق آپ کا ایسا ہے کہ نازل ہوئی آیت
انجم سے سپہ، مہر علم، عرش خیم ہیں
خورشید و قمر آپ کے دو نقشِ قدم ہیں

۵
ہے شاہِ ولایت ہیں وہ سلطانِ رسالت ختم ان پہ نبوت یہاں آغازِ امامت
حق نے انھیں بخشا ہے گہر تاجِ شفاعت (عصمت) حیدر کو عنایت ہوئی ہیم کرامت
واں عرش پہ معراجِ سعادت ہے نبی کی
یاں خانۂ کعبہ میں ولادت ہے علی کی

۶
وہ نائبِ حق کا ولی تیغِ غضنفر سردارِ امم ہیں یہ تہمتن فاتحِ خیبر
قتالِ عرب سیفِ خدا قاتلِ عنتر بازوئے نبی دستِ خدا حیدرِ صفدر
رتبے میں بڑے بادشہِ ارض و سما کے
استاد ہیں جبریل کے شاگرد خدا کے

۷
مشہور جہاں فاطمہ زہرا کی ہے عصمت خالق نے عطا کی ہے جسے چادرِ عصمت
خاتونِ جناں بنتِ نبی مبدأ عفت سردارِ زناں زوجۂ سلطانِ ولایت
جبریل امیں مدح و ثنا کرتے تھے انکی
تعظیم رسولِ دوسرا کرتے تھے انکی

۸
فرزند ہر اک ان کا ہے اللہ کا پیارا جن کے لئے خالق نے دو عالم کو سنوارا
بخشش کا گنہگاروں کی ہر ایک سہارا اک زیورِ کرسی ہے تو اک عرش کا تارا
زہرا کے جگر بند ہیں بیٹے ہیں علی کے
اللہ کے پیارے ہیں نواسے ہیں نبی کے

۹
اک قبلۂ دیں ہے تو ہے اک کعبۂ ایماں اک حجتِ حق ہے تو اک قدرت کی ہے برہاں
اک لولوئے تر ہے تو ہے اک گوہرِ غلطاں اک سورۂ یٰسیں ہے تو اک سورۂ رحماں
اک جوشنِ بازو ہے رسولِ دوسرا کا
تعویذ ہے اک گردنِ محبوبِ خدا کا

یہ چند بند ایک اور مرثیہ سے اقتباس ہیں جن کی ابتدا مضامینِ بہاریہ سے ہوئی ہے۔

(۱)
وہ وقتِ سحر اور وہ غنچوں کا چٹکنا پھولوں کا دمِ صبح وہ کھلنا وہ مہکنا
وہ سبزۂ نوخیز کا صحرا میں لہکنا وہ گل کے قریں بلبلِ شیدا کا چہکنا
مرغانِ ہوا و عندلیباں نغمہ سنج تھے
طاؤسِ چمن رقص کناں چار طرف تھے

(۲)
وہ سرد ہوا صبح کی وہ پھولوں کی خوشبو گلشن میں وہ سنبل کی پریشانیٔ گیسو
جب سرو پہ قمری نے کہا وجد میں یا ہو بے ساختہ دیتی تھی صدا فاختہ کو کو
قدرت کا عجب رنگ زمانے پہ چڑھا تھا
آوازِ عنادل سے چمن گونج رہا تھا

(۳)
وہ صبح کا ہونا وہ شفق کا آنا وہ شرم سے مہتاب کا رخ اپنا چھپانا
ذروں کا چمک کر وہ ضیا اپنی دکھانا انجم کا خجالت سے وہ آنکھوں کا چرانا
بھرنا وہ دمِ سرد نسیمِ سحری کا
عالم تھا زمانے پہ عجب جلوہ گری کا

وہ صانع قدرت کی چمن بندیاں سحر　　اتنا وہ تجھے صنعتِ یزداں ہے جو سرو لب جو
۴　سنبل کے ہے ہوا جو الجھ جاتے تھے گیسو　　شمشاد کو سلجھا دیے کامل ہیں جیا ماتھے پہلو
سب دستِ جبل قدرتِ خالق سے ہر تھے　　شبنم سے کٹورے ورقِ گل کے بھرے تھے

اب ہم دوسرے اصنافِ سخن سے بھی اقتباسات بطور نمونہ درج کئے دیتے ہیں ۔

رباعی

بے مثل تری ذات ہے یکتا ہے تو　　لاریب کہ بے عدیل ہے تنہا ہے تو
عاجز ہے تری کنہ میں عقلِ انساں　　کیا بندۂ ناچیز کہے کیا ہے تو!

(دیگر)

دنیا میں محمدؐ سا پیمبر نہ ہوا　　اور حیدرؑ کرار سا رہبر نہ ہو
پیغمبر مختار ہیں افضل سب سے　　حقا کہ کوئی آپ کا ہمسر نہ ہوا

(〃)

سرکارِ محمدؐ کے ہیں فرزند حسنؑ　　اور حیدرؑ و زہراؑ کے ہیں دلبند حسنؑ
قرآنِ خدا سے انکی ہی شان عیاں　　ہیں چادرِ تطہیر کے پیوند حسنؑ

(〃)

نورِ نظرِ حیدرؑ والا ہے حسینؑ　　لختِ جگرِ احمدؐ و زہراؑ ہے حسینؑ
منہ چومتے تھے اور کہتے تھے نبی　　یہ چاند مرا عرش کا تارا ہے حسینؑ

سلام

سوائے شبّر خدا کوئی بوتراب نہ تھا　　بجز علی کے کوئی مالک الرقاب نہ تھا
خدا نے یوں تو بہت سے بشر کئے پیدا　　مگر علی کا بجز مصطفیٰ جواب نہ تھا
گئے فلک پہ جو معراج میں رسولِ کریم　　سوائے روح الامیں کوئی ہمرکاب نہ تھا
نبی کے سر پہ جو رہتا تھا ابر کا سایہ　　وہ ظلِ خالقِ کونین تھا سحاب نہ تھا

قصیدہ در مدح حضرت ابو الفضل العباس ابن امیر المومنینؑ

کیا وصف ہو اس ہاشمی و مطلبی کا　　جو پھول ہے گلزارِ رسولِ عربی کا
یہ روز مبارک ہے یہ دن بھی ہے مبارک　　روشن ہوا گھر آج محمدؐ کے وصی کا
پیدا ہوئے عباسِ علی گھر میں علی کے　　بازو ہے وہی آج حسینؑ ابن علی کا
یہ جعفرِ ثانی ہے یہ ہے حمزۂ ثانی　　پیارا یہ بھتیجا ہے رسولِ عربی کا
ہیں دستِ خدا شیرِ خدا حیدرِ صفدر　　عباس بھی بازو ہے حسینؑ ابن علی کا
منہ پھیر کیا بچپن میں طمانچہ جسے مارا　　وہ دستِ زبردست ہے عباسِ علی کا
جب نعرۂ شیرانہ کیا بھاگ گئے سب　　کیا تاب کہ میداں میں جمے پاؤں کسی کا
جعفر تھے علمدار رسولِ عربی کے　　عباس علمدار حسینؑ ابن علی کا
ہے ماہِ بنی ہاشم و خورشید قریشی　　یوسف کا جمال ان کے مقابل ہو پھیکا
وہ سرو سا قد چاند سا منہ شیر کی گردن　　اخلاق حسن خو ہے نبی رعب علی کا

بازو بھی علی کے ہیں کلائی بھی علی کی　　سینہ بھی علی کا قدِ زیبا بھی علی کا
چتون بھی علی کی ہے اور آنکھیں بھی علی کی　　آواز علی کی لب و لہجہ بھی علی کا

اس قصیدے کے چالیس شعر ہیں بخوفِ طوالت اختصار کیا گیا۔ اب نوحہ جات میں سے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

مومنو جو سپہر کینہ پرور دیکھنا　　چل گئی باغِ نبی میں بادِ صرصر دیکھنا
لٹ گئی دولت نبی کی کربلا میں ہائے ہا　　کٹ گیا تیغِ ستم سے باغ حیدر دیکھنا
دل پکڑ کر گر پڑے لاشے پہ سرور دیکھنا　　چاند سی چھاتی پہ برچھی کھا کے اکبر مر گئے

ان کے تمام اصناف کلام پر تنقید و تبصرہ کے لئے وقت کی ضرورت ہے اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ انکے کلام کا شمار ہزاروں تک ہے جسکی تفصیل جدولِ ذیل سے واضح ہوگی۔

نمبر سلسلہ	صنفِ کلام	تعدادِ اشعار	کیفیت
۱	۲	۳	۴
۱	مراثی	۴۳۹۵	جملہ بارہ [۱۲] مرثیے ہیں۔
۲	مسدس دیگر	۲۷۹	دو [۲] مسدس ہیں ایک "اعتصام" دفع طاعون کیلئے دوسرا "انجام"
۳	سلام	۶۲۲	جملہ پچیس [۲۵] سلام ہیں۔
۴	رباعی	۳۸	انیس [۱۹] رباعیاں ہیں
۵	قصائد	۱۹۴	تین [۳] قصیدے ہیں۔
۶	قطعات	۱۸۴	متعدد قطعات ہیں۔
۷	نوحہ جات	۱۷۴	پندرہ نوحے ہیں۔
۸	مخمس و ترجیع بند	۶۸	یہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں۔
۰	جملہ	۵۹۵۴	یہ وہ تعداد ہے جو محفوظ صورت میں موجود ہے۔

اشرف الحکماء نواب لقمان الدولہ بہادر دل

ذیل

اشرف الحکما نواب محمد حمید خاں افلاطون جنگ لقمان الدولہ مرحوم

۱۲۷۷ھ تا ۱۳۴۰ھ

از میر عزیز الحق صاحب

نواب لقمان الدولہ معززین حیدرآباد میں ممتاز اور سربلند تھے۔ اعلیٰحضرت غفران مکاں کے بذل و نوال نے ان کو جاں نثارانہ خدمات کے صلہ میں اس درجہ نوازا کہ وہ اپنے ہمسروں میں ایک امتیازی حیثیت کے حامل ہو گئے۔ نواب لقمان الدولہ خانوادۂ شاہی کے طبیب خاص تھے انھیں فن طب میں کامل دستگاہ حاصل تھی اسی لئے اعلیٰحضرت غفران مکاں کو ان کے طبی مشوروں پر ہمیشہ اعتماد رہا۔ انکی تعلیم یورپ کی کسی جامعہ میں نہیں ہوئی بلکہ وہ حیدرآباد ہی کی ایک درسگاہ مدرسۂ طبابت کے مایۂ ناز فرزند تھے۔

مدرسۂ طبابت ۱۲۶۱ھ میں بہ عہد غفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر قائم ہوا۔ اس درسگاہ میں ڈاکٹری کی تعلیم اردو زبان میں دیجاتی تھی، یہی سبب تھا کہ نواب لقمان الدولہ انگریزی سے نابلد رہے لیکن اس کے باوجود علم طب کے متعلق یورپ اور امریکہ کے نئے نئے انکشافات سے اپنے آپ کو باخبر رکھنے کا انھوں نے استعجاب انگیز اور قابل تحسین انتظام کیا تھا اس دور میں حیدرآباد کی فنی درسگاہوں سے بعض اوجوہر قابل نکلے مثلاً مولوی کاظم علی صاحب سابق معتمد تعمیرات نواب ارسطو یار جنگ بہادر سابق مہتمم دواخانۂ افضل گنج ڈاکٹر انتظام جنگ اور ڈاکٹر شاد یہر جنگ ہمارے ملک کے مدرسۂ انجینری اور مدرسۂ طبابت کی پیداوار ہیں۔

نواب لقمان الدولہ ان عظیم المرتبت ہستیوں میں سے تھے جنھیں سفر و حضر اور سیر و شکار میں اعلیٰحضرت غفران مکان کی ہمرکابی کا شرف حاصل رہتا اور جن پر بارگاہ سلطانی سے الطاف و نوال کی بارشیں ہوتیں تھیں۔ ۱۳۱۹ھ میں لارڈ کرزن کی دعوت پر حضور آصف سادس عزیمت فرمائے کلکتہ ہوئے تو نواب لقمان الدولہ ہمراہ رکاب تھے انھیں اہم دید و باز دید کے مواقع پر بھی بندگان اقدس کی ہمشایعت کا شرف حاصل رہا۔

اس امر سے کون واقف نہیں کہ حضرت غفران مکاں کے جود و سخا نے وابستگان دولت کو نہال کر دیا اعلیٰحضرت نہ صرف زر و

جواہر سے خانہ زادوں کے دامن امید بھر دیتے بلکہ بمراحم خسروانہ مقربان خاص کے یہاں تقریب میں جلوہ افروز ہو کر انھیں سرفراز فرمایا کرتے۔ نواب لقمان الدولہ اس اعزاز سے محروم نہ رہے ان کے بڑے صاحبزادے قادر اشرف کی تقریب بسم اللہ میں خدام سلطانی نے ان کے مکان کو رونق بخشی اور ایک سہرا اور ہیرے کا سرپیچ مرحمت فرمایا جسکی قیمت کا تخمینہ ڈیڑھ لاکھ روپئے کیا جاتا ہے اعلیٰحضرت آصف سادس کی یہ خادم نوازی نواب لقمان الدولہ کی پشت ہا پشت کے لئے سرمایہ افتخار بنی رہیگی قادر اشرف کا عین عالم شباب میں انتقال ہوا انکے دو لڑکے عثمان اشرف اور کرامت اشرف علی الترتیب جامعہ عثمانیہ اور گرامر اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔

نواب لقمان الدولہ کی وفادارانہ خدمات کے صلہ میں حضرت غفران مکان نے انکے بھتیجے اور بھانجے محمد وزارت اشرف اور فیض محمد خان کو کمسنی ہی میں اشرف نواز جنگ اور فیض جنگ کے خطابات سے سرفراز کیا اب نواب اشرف نواز جنگ بہادر نائب ناظم بلدیہ کے عہدہ پر فائز ہیں اور فیض جنگ بہادر افواج سرکار عالی کے میڈیکل افسر ہیں۔

لقمان الدولہ حیدرآباد کے عہد تاریک میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک ایسے ماحول میں زندگی کے منازل طے کئے جو انگریزی کی تعلیم کا یکسر مخالف تھا۔ اور جسکی دانست میں انگلستان جانا ایک ناقابل معافی گناہ تھا لیکن وہ اس ماحول سے متاثر نہ تھے انکی دوربیں عقل اقتضائے زمانہ سے آگاہ ہو چکی تھی اس قدامت پرست فضا کا ان پر الٹا اثر ہوا۔ انھوں نے معاشرہ کی ان فولادی زنجیروں کو توڑنے کا عہد کر لیا، اور باوجود اعزہ و احباب کی مخالفتوں کے قادر اشرف کو فارسی، عربی، دینیات کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی دلائی اور جب انھیں بقدر ضرورت استعداد حاصل ہوگئی تو فنی تعلیم کے حصول کی غرض سے انگلستان بھیجدیا جہاں خدام جہاں پناہی کے اثر سے انھیں معززین انگلستان کے لڑکوں کی درسگاہ پبلک اسکول آف ہیرو میں جگہ مل گئی قادر اشرف نے اس مدرسہ سے ثانوی اور فوقانی نصاب کی تکمیل کی اور جامعی تعلیم ٹرینٹی کالج کیمبرج میں حاصل کی۔ قادر اشرف کے چھوٹے بھائی محمد اشرف بی۔ایس سی (درہم) مددگار مہتمم تعمیرات کیخدمت پر مامور ہیں محمد اشرف نے ادبی ذوق اپنے محترم والد سے ورثہ میں پایا ہے ان کے کتب خانہ میں انکے والد مرحوم کی جمع کی ہوئی کرم خوردہ نایاب کتابیں بحفاظت تمام موجود ہیں جس سے انکی علم دوستی کا اظہار ہوتا ہے۔ اشرف نواز جنگ اور فیض جنگ کو بھی لقمان الدولہ ہی نے انگلستان بھیجا اور انھیں ملازمتوں کے حصول میں بھی مدد دی۔

۱۳۰۹ھ میں نواب لقمان الدولہ شاہی طبیب مقرر ہوئے سلک ملازمت میں داخل ہونے کے دو ہی سال کے بعد

بیشگاہ خداوندی سے اشرف الحکما، فلاطون جنگ نعمان الدولہ کے خطابات سے معزز و مفتخر فرمایا گیا دو ہزار روپئے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور (لوازماتِ خانی و بہادری) نوبت، روشن چوکی، اور عماری سے بھی سربلند کیا گیا وہ اکیس سال تک اپنے فرائض بطریق احسن انجام دیتے رہے سنہ ۱۳۳۳ھ میں وظیفہ حسنِ خدمت پر علحدہ ہوئے اور دس سال تک وظیفہ پاتے رہے سنہ ۱۳۴۴ھ میں وفات پائی۔ درگاہ شاہ خاموش علیہ الرحمۃ میں دفن ہیں۔ قریشی النسب تھے۔ ایک نامعلوم مدت سے حیدرآباد انکا اور انکے آبا و اجداد کا وطن مالوف ہے۔

نواب نعمان الدولہ ملک کے مایۂ ناز ڈاکٹر ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک بلند پایہ مصور بھی تھے ان کی بنائی ہوئی تصویریں زبانِ حال سے اس امر کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ ایک باکمال آرٹسٹ کے موقلم کی رہین منت ہیں اعلیحضرت آصف سادس کی جو تصویریں نواب صاحب نے بنائی ہیں وہ شبیہ سازی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں

نواب نعمان الدولہ مرحوم موسیقی کے فنی اسرار و رموز سے بھی واقف تھے انھوں نے اس موضوع پر ایک جامع کتاب لکھی تھی۔ علمِ طب سے متعلق بھی آپکی ایک اعلیٰ پایہ تالیف "ہدایت الرضا" شائع ہوی ہے یقین کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی غیر معمولی ہستیاں جلد جلد پیدا نہیں ہوتیں حیدرآباد میں پرلیس کے فقدان اور رسائل کی عدم موجودگی نے نواب نعمان الدولہ کو گوشۂ گمنامی میں رکھا ہمارے ملک میں تعلیم جسقدر عام ہوتی جائیگی اور فنونِ لطیفہ کا ذوق جس قدر ترقی کرتا جائیگا اسی قدر نعمان الدولہ کی عظمت بے نقاب ہوتی جائیگی۔

وہ باوجود ظاہری جاہ و حشم کے ایک صاحب دل فقیر تھے۔ انھوں نے عرفان و تصوف کے دشت کی بھی بادیہ پیمائی کی۔ بزرگانِ دین سے انھیں بیحد عقیدت تھی فرماتے ہیں:۔

دل خطابات سے القاب سے مسرور نہیں فخر ہے مجھکو پکاریں جو غلامِ صابرؔ

نعمان الدولہ سید جلیل سے علوم عرفان و تصوف کا درس لیتے تھے۔ مہاراجہ یمین السلطنت بہادر اور نواب ظفر جنگ انہی سید جلیل کے شاگرد تھے وہ حیدرآباد کے برگزیدہ ولی حضرت شاہ خاموش علیہ الرحمۃ کے مرید بھی تھے وہ حفیظ الدین یاسؔ سے مشورہ سخن کرتے تھے جو استاد الاساتذہ حضرت فیضؔ کے تلامذہ میں ممتاز تھے۔

نواب نعمان الدولہ فارسی شعرا میں حافظؔ، مولانا روم، ملا جامی کے پرستار تھے اور اسی جذبۂ پرستاری کے زیر اثر انھوں نے سنہ ۱۳۳۱ھ میں یوسف زلیخا جامی کا منظوم اردو ترجمہ "تجلیات دل" کے نام سے شائع کیا سنہ ۱۳۳۵ھ میں مذہب سے متعلق آپکی دوسری

منظوم کتاب شائع ہوئی جس میں نماز کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے اس کتاب کے مطالب مولانا روم کی مثنوی سے ماخوذ ہیں اردو کے شاعروں میں مومن کے کلام سے انہیں عشق تھا یہی سبب ہے کہ اس معجز بیان شاعر کے کلام کی جھلکیاں انکے دیوان میں جابجا نظر آتی ہیں ملاحظہ ہو:۔

در کو تمھارے چھوڑ کے کس در پہ جائیں ہم | منہ پھیر کے یہاں سے کسے منہ دکھائیں ہم | گر اُف کریں تو آگ فلک کو لگائیں ہم | کھینچیں جو آہ سرد جہنم بجھائیں ہم

معشوق گر خفا ہو تو منت سے خوش کریں | دل اپنا روٹھ جائے تو کیونکر منائیں ہم | اے موت زندہ باش کہ بر وقت آگئی | کرتے تھے کبریا سے بہت التجائیں ہم

دل کا آنا جی کا جانا ہو گیا!! | آنکھ کا لڑنا بہانا ہو گیا!!! | دیگر — کھلتا نہیں یہ بند ہے کیوں باب مدعا | ضد ہے در قبول کو دست دعا کے ساتھ

وہ خمار نرگس مست ہے یہ خبر نہیں کہ کہاں ہیں ہم | یہ حرم ہے یا در میکدہ کہ فدائے چشم بتاں ہیں ہم

نعمان الدولہ کی شاعری کسی انقلابی پیام کی حامل نہیں اور نہ ان میں فلسفیانہ اور عمیق حقائق زندگی کو پیش کیا گیا ہے ملٹن شاعری میں سادگی جوش اور اصلیت چاہتا ہے اور یہی عناصر دل کی شاعری کا جوہر ہیں ملاحظہ ہو:۔

نگاہ چشم مست یار دیکھو!! | یہ غفلت میں بھی ہے ہشیار دیکھو | یہ حسن لم یزل کے آئینے ہیں! | حسینوں میں جمال یار دیکھو

مجھے بیخود بنایا چشم بد دور | یہ تاثیر نگاہ یار دیکھو!!! | مرے عصیاں ہوئے داماں رحمت | یہ شان حضرت ستار دیکھو

ضبط تپش آہ و فغاں ہو نہیں سکتا | وہ درد جگر ہے کہ بیاں ہو نہیں سکتا | دیگر — کیونکر ہو شگفتہ گل پژمردہ خزاں میں | پیری میں کوئی شخص جواں ہو نہیں سکتا

زاہد سجدۂ بے ریب و ریا مشکل ہے | سہل ہے یاد صنم یاد خدا مشکل ہے | دیگر — آفتیں بڑھتی ہیں بڑھتی ہے محبت جتنی | جس کو الفت ہے سوا اسکو سوا مشکل ہے

دل صد پارہ کی ہم سے تباہی پوچھئے | غضب ہے تیشۂ نازک کا گر کر چور ہو جانا

ایسا مبالغہ جو شاعری میں حسن پیدا کرتا ہو انکے کلام کا جزو ہے:۔

وہ خمار نرگس مست ہے یہ خبر نہیں کہ کہاں ہیں ہم | یہ حرم ہے یا در میکدہ کہ فدائے چشم بتاں ہیں ہم | دیگر — دن رات یہاں جوش پہ ہے دیدۂ خونبار | دریا کے مقدر میں یہ طوفان کہاں ہے

حضرت شاہ خاموش علیہ الرحمہ کی غزل پر دل کے خمسہ کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

شل ہوا اڑ گئے سب چاہنے والے بلبل | تجھکو اللہ مصیبت میں نہ ڈالے بلبل | اب چمن میں ترے بیکار ہیں نالے بلبل | آشیاں اپنا گلستاں سے اٹھا لے بلبل

باغ کو چھوڑ دے جنگل کی ہوا لے بلبل

گل کی صورت کو تصور میں جما لے بلبل | اس تصور ہی کو گلزار بنا لے بلبل | اپنی لیلیٰ کو تو محمل میں بٹھا لے بلبل | آشیاں اپنا گلستاں سے اٹھا لے بلبل

باغ کو چھوڑ دے جنگل کی ہوا لے بلبل

مشکل بحروں میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے جس سے زبان اور بیان پر ان کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔

شمل نقش پا برباد، اپنا کیونکر نشاں ہوتا ہم نہ خاک میں ملتے تو جو مہرباں ہوتا
سچ نہ جانتا ہرگز شرط عہد و پیماں کو مصحف رخ جاناں گر نہ درمیاں ہوتا

تیر بے کماں اس کا زخم بے نشاں اپنا ظلم اس ستمگر کا کس طرح عیاں ہوتا
کچھ تو دل سنبھل جاتا کچھ تو جی بہل جاتا کوئی چارہ گر ہوتا کوئی مہرباں ہوتا

زخم دل ہے بے مرہم لب ہی نغمہ زن ہر دم وقت رنج و غم ہم پر کون مہرباں ہوتا

انکے بعض اور شعر سرسری انتخاب کے بعد یہاں نقل کئے جاتے ہیں —

اس نے تربت کو مری آکے جو پامال کیا خاکساروں کو زمانہ کا چلن یاد آیا!
کسی دن آرزوئے زندگانی مار ڈالیگی تلاش خضر و عمر جاودانی مار ڈالیگی

تجاہل سے نشاں کیا پوچھتے ہو بے نشانوں کا جسے روند کیا تم وہی تربت ہماری تھی
کیونکر شکست توبہ سے توبہ کرے کوئی عذر گناہ ہوتا ہے بدتر گناہ سے

کوئے جاناں کی ہوا خلد میں بھولی نہ گئی کیسی غربت میں مسافر کو وطن یاد آیا
نیم بسمل چھوڑ کر جاتا ہے او قاتل کہاں کام پورا کر کہ باقی اک رگ جاں اور ہے

کوئے قاتل میں چلو جو ہو سو ہو جان اک دن جانے والی جائیگی
خاک اڑتی ہے جہاں تھے گل خنداں لاکھوں اس خزاں نے کئے برباد گلستاں لاکھوں

منزل ہے دور ہم ہیں کہیں کارواں کہیں محمل کہیں ہے ناقہ کہیں ساربان کہیں
نکلتا ہے مرا سینہ سے دم آہستہ آہستہ مسافر ہے رواں سوئے عدم آہستہ آہستہ

فنا ہو چکے جستجو ہو گئی!! بس اے آرزو آرزو ہو گئی!
حسن و جمال خوباں عشاق کا ہی حوا ہاں اہل کرم ہمیشہ سائل کو ڈھونڈھتے ہیں

آنکھیں ہیں ان کی جو یا اٹھا ہوا ہے دریا طوفاں میں اہل کشتی ساحل کو ڈھونڈھتے ہیں
وہ گل ہوں میں نہیں ہے مرا بوستاں کہیں بلبل وہ ہوں کہ جسکا نہیں آشیاں کہیں

زلفوں میں اس کے روئے منور کو دیکھکے مغرب سمجھ کے دیتے موذن اذاں کہیں
کیا پوچھتے ہو تم دل گم گشتہ کا پتہ اس کا نشان یہ ہے کہ نہیں ہے نشاں کہیں

انتظار وصل جاناں جاں کنی سے کم نہیں موت سے بڑھکر ہے میری آس ہو گئی نا بھی

تصوف کے چند شعر ملاحظہ ہوں —

نقش پا ملا اس کا آستاں نہیں ملتا آرہی بوئے گل گلستاں نہیں ملتا
رہ نہ عقل نے پائی ہے کہاں وہ ہرجائی کس جگہ وہ ملتا ہے اور کہاں نہیں ملتا

زاہدا دیدۂ بصیرت میں!! خود نمائی خدا نمائی ہے!!!!

صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے متعلق فرماتے ہیں —

یہ زندۂ جاوید ہیں کچھ حال نہ پوچھو ہے خنجر تسلیم کے کشتوں کی قضا اور

آخری عمر میں تصوف کا رنگ بہت غالب ہوگیا تھا۔ اس حصۂ زندگی کے کلام میں یہی رنگ سب سے نمایاں ہے۔

لقمان الدولہ کے کلام میں مثنویاں بھی ہیں اور قصیدے بھی لیکن انکی شاعری کا بیش قدر سرمایہ انکی غزلیں ہیں۔ انکی مثنوی سلوک معنوی یا نماز دل فلسفۂ نماز سے متعلق ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں —

بے جانے خدا کو سجدہ بیکار ا سجدہ نہ ہوا ہوا وہ بیگار ا یہ ظلم کو رام رام ٹھیرا!!!! ایسا سجدہ حرام ٹھیرا!!!

تیری جو نماز تجھ پہ ہے فرض تو نے تو سمجھ لیا اسے قرض سجدہ ہے کہیں نظر کہیں ہے دل اور کہیں ہے سر کہیں ہے

یہ صدرِ صدور کا ہے فرماں گر اس پہ عمل بصدِ دل و جاں دل میں نہ رہی اگر حضوری ہوگی نہ تری نماز پوری

گر دل میں یقیں کہ رب ہے حاضر منظور ہے وہ، تو اس کا ناظر آنکھوں سے جمال یار دیکھو گل سے گل کی بہار دیکھو

ٹھہری جب ایسی دو بدو کی باہم دونوں نے گفتگو کی حق کے آگے کھڑا ادب سے گویا کرتا ہے بات رب سے

تو رعب سے حق کے رو رہا ہے فرمانِ خدا یہ ہو رہا ہے!! ہم نے تجھے زندگی جو دی تھی تجھکو مہلت بہت ملی تھی!!

اب سامنے میرے تو جو آیا!!! کچھ میرے لئے بھی ساتھ لایا؟ کام آیا کسی کی بیکسی میں؟ تھاما کس کس کو مفلسی میں!

بندہ جواب میں عرض کرتا ہے ؎

یارب غفّار ہے تو میرا اور میں ہوں گناہگار تیرا ہوتا نہ اگر کوئی گنہگار کہتا پھر کون تجھکو غفّار

بندوں کے نہ عیب گر چھپاتا ستار لقب کہاں سے پاتا تو نے لا تقنطو کہا ہے بڑھکر امید اس سے کیا ہے

رحمت تری بڑھ گئی غضب سے بڑھ کر ہے یہی امید سب سے رحمت کا امیدوار ہوں میں تقصیر سے شرمسار ہوں میں

عاصی ترا کس کے پاس جائے اس شکل سے کس کو منہ دکھائے

نواب احمد عبدالعزیز شمس العلماء عزیز جنگ ولا مرحوم

ولاؔ

شمس العلما احمد عبد العزیز نواب عزیز جنگ بہادر مرحوم

سنہ ۱۲۷۰ھ تا سنہ ۱۳۴۲ھ

از محمد عمر صاحب مہاجر

نواب عزیز جنگ بہادر ولاؔ ان چند بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی بیش بہا علمی خدمات کیلئے وقف کر رکھی تھی۔ انھوں نے عمر کے آخر وقت تک مطالعہ جاری رکھا، چنانچہ جب وہ گاڑی میں گھر سے نکلتے تو اس وقت بھی ان کے ہاتھ میں کتاب ہی ہوتی۔ اور حقیقت یہی ہے کہ جو حقیقی ذوق علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں ان کو مطالعے سے ایک سرمدی سکون اور اس میں ایک ابدی راحت محسوس ہوتی ہے جو رہ رہ کر علمی خدمات کے لئے اکساتی رہتی ہے۔ انھوں نے بڑھاپے میں بھی جس مستعدی اور جوانہمتی سے کام کیا ہے اس کی مثال نوجوانوں میں بھی بہت کم نظر آتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے خود ایک مقام پر لکھا ہے کہ ؎

آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ ولاؔ — کیا بڑھاپے میں جواں ہو گئی ہمت تیری

کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانے کا واحد ذریعہ حیدرآباد میں صرف نواب عزیز جنگ کی ذات تھی، اس زمانے کے مصنفین اور مؤلفین کو ان کے وجود سے گرانقدر مدد ملتی رہی ان کی زندگی حیدرآباد کی ایک ایسی زندہ تاریخ تھی جس میں یہاں کی معاشرت یہاں کے رسم و رواج اور یہاں کے علمی کارناموں کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔

نواب عزیز جنگ کی ولادت سنہ ۱۲۷۰ھ میں ہوئی وہ نو برس کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ساتھ حیدرآباد آئے، اور یہیں علوم عربی و فارسی کی تکمیل کی فارسی شاعری میں ذکاؔ، معنیؔ، راقمؔ، افضلؔ، اور سنجر طہرانی سے تلمذ تھا علاوہ فارسی کلیات کے انھوں نے فارسی زبان میں حضور رسالت مآب کا سراپائے مبارک بھی لکھا ہے جس کا نام "تصویر بلاغت" ہے "محبوب السیر" ان کی ایک اور فارسی زبان کی تصنیف ہے جس میں حضرت غفران مکاں کے عہد حکومت کے تاریخی حالات درج ہیں، ان تصانیف کے

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ان کو فارسی زبان پر حیرت انگیز قدرت بیان حاصل تھی، "آصف اللغات" بھی فارسی زبان کی لغت ہے جس کا سلسلہ چند جلدوں کی اشاعت کے بعد ان کی وفات کی وجہ سے رک گیا اسمیں فارسی الفاظ کا اردو میں ترجمہ ہے، اور فارسی محاوروں کے مقابل اردو محاورے درج ہیں، اگر اس لغت کی تکمیل ہو جاتی تو ہمارے خیال میں ادب میں قابل لحاظ اضافہ ہو جاتا لیکن مولف کی موت نے اس کو بھی ختم کر دیا اور وہ اس آرزو کو اپنے ساتھ لے گئے۔ کون کہتا ہے کہ ان کے دل میں اور کیا کیا منصوبے ایسے تھے جو وجود میں نہ آسکے غالباً ان کا یہ شعر انکی دلی تمناؤں کا آئینہ ہے۔

منصوبہ ہائے دل تو بہت کچھ تھے رات دن   کرنے کا تھا خیال مگر کچھ نہ کر سکے!!!!

اس خیال کے باوجود بھی انھوں نے چودہ تالیفات اور تصنیفات چھوڑی ہیں جن میں سے ایک تالیف مذکورہ بالا "آصف اللغات" بھی ہے جو اٹھارہ جلدوں اور نو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

اردو شاعری میں ان کو کمال لکھنوی، قدر بلگرامی، داغ دہلوی اور جلیل مانک پوری وغیرہ سے تلمذ رہا ہے لیکن کلام کا اکثر و بیشتر حصہ جلیل اور اختر ہی کی اصلاح کا نتیجہ ہے، اصلاحات کا اثر جو ان کی زبان پر ہوا اس کے متعلق وہ خود ایک مقام پر لکھتے ہیں :۔

"جن الفاظ کی تانیث و تذکیر میں سلف سے جو اختلاف چلا آتا ہے، ان کے استعمال میں مری خوب گت بنی۔ جس قدر میرا کلام داغ مغفور کے ملاحظہ میں پیش ہوا اس میں میں دلی کی بول چال کا پیرو بنایا گیا اور جن غزلوں کو استاد جلیل اور اختر مینائی کے ملاحظہ کی عزت ملی، میں ان میں زبان لکھنوی کا پیرو ہوں، اور یہ میری دو عملی یک بام و دو ہوا کی مصداق ہے، آئندہ زمانے میں میرا کلام اس مخمصے سے نجات پائیگا اس لئے کہ میں نے الفاظ مختلف فیہ کا تصفیہ اپنی تالیف التانیث التذکیر میں ایک ایسے اصول عام پر کر دیا ہے جو کل الفاظ زبان پر حاوی ہے۔"

"**کلیات نظم ولا**" کے نام سے ان کا کلام اردو میں شائع ہوا ہے، جسمیں انکی خود نوشتہ سوانحعمری اور رسالہ "معیار فصاحت" بھی شامل ہے معیار فصاحت میں الفاظ اور محاوروں پر بحث کی گئی ہے، کلیات میں علاوہ ۲۹۰ غزلوں کے سلطان العلوم اعلیحضرت بندگانعالی کی مدح میں قصائد اور رباعیات بھی شریک ہیں، اردو زبان میں بھی حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم

کا سراپائے مبارک بھی نظم کیا جس کا نام "تصویر نور" ہے اور ایک کتاب موسوم "تاریخ النوائط" بھی ان کی تالیف ہے جو مشاہیر قوم نوائط کی سوانح حیات پر مشتمل ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ولاؔ پر گو شاعر بھی تھے اور نثار بھی۔ انکے دیوان میں ایک ہی زمین میں کئی کئی غزلیں ملتی ہیں چونکہ انکی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی اس لئے کلام میں رنگینی اور کیف زیادہ نہیں تاہم انکے دیوان میں ڈھونڈنے والے کو ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو حسنِ بیان، حسنِ زبان، اور حسنِ خیال کے اچھے نمونے ہیں

دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی ایک ایسی علیحدہ دنیا بنالی ہے جو صرف شاعر ہی کے لئے موزوں ہوسکتی ہے، اور جس سے عام لوگ بہرہ ور نہیں ہوسکتے۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں شاعر عام انسانوں سے الگ ہوکر فطرت کی رعنائی کو بے حجاب دیکھتا ہے، اور دوسروں کے سامنے بھی وہی عالم پیش کرتا ہے جو اس کی بیباک نظروں کے سامنے ہوتا ہے، نظر کی اس رسائی کی مثال ان کے اس شعر میں موجود ہے ؎

طلعتِ جاناں سے چلتا ہی ترا کام آفتاب اسکے پرتو سے ہے عالم میں ترا نام آفتاب

یوں تو سورج ہر صبح کو نکلتا ہے اور ہر شام کو ڈوبتا ہے، اور اہلِ سائنس نے بھی سورج کے اس طرح طلوع اور غروب ہونے کی کافی توجیہہ کی ہے لیکن سورج کو دیکھکر شاعر کا یہ معلوم کرنا، کہ سورج میں اپنی چمک کچھ نہیں ہے بلکہ کسی اور قوت کی کارفرمائی ہے جسکی وجہ سے سورج روشن نظر آتا ہے اس کی ذہن کی رسائی کو انتہائی پرواز ہے۔ متصوفین کے دو گروہ ہیں ایک گروہ تو وہ ہے جو کائنات اور ہستی باری تعالیٰ کے علیحدہ علیحدہ وجود کا قائل ہے، اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو خدا کو کائنات سے جدا نہیں سمجھتے، اس گروہ کے نزدیک قدرت کا ہر مظہر سبحانی خود ایک تجلی گاہ ہے اور دیکھنے والی آنکھ کے لئے ایک ذرے کے قیام میں بھی وہی قوت کارفرما ہے جو تمام نظام عالم کو سنبھالے ہوئے ہے۔ ولاؔ نے اپنے شعر میں اسی قسم کی جھلک دکھائی ہے، فرماتے ہیں کہ "طلعتِ جاناں"، اور محض "طلعتِ جاناں" کے پرتو ہی سے دنیا میں آفتاب کا نام آفتاب ہے۔

اقبالؔ نے شاعر کو "دیدۂ بینائے قوم" سے تشبیہ دی ہے جو ہر ایک کی مصیبت پر اشکباری کرتا ہے، ولاؔ دو شعر میں کہتے

ہے اگر گل کو تلاشِ ترجمانِ عندلیب! ایک میں ہوں جو سمجھتا ہوں زبانِ عندلیب

ڈر خزاں کا باغباں کا خوف ہے صیاد کا آفتیں سہتی ہے کیا کیا ایک جانِ عندلیب

ان اشعار سے شاعر کے ان جذبات ہمدردی و غمگساری کا پتہ چلتا ہے، جو عندلیب کے لئے اسکے دل میں پیدا ہوئے ہیں ان اشعار میں جو تاثیر و سوز و گداز ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ذیل میں ایک اور شعر درج کیا جاتا ہے جو سادگی الفاظ کیساتھ تاثیر بھی رکھتا ہے ؎

نادم ہے وہ جو اپنی غریب الوطنی پر　　　　افسوس ہے عاشق کی تری طعنہ زنی پر

کیا اس شعر کے پڑھنے کے بعد ایک نہایت ہی یاس انگیز صورت حال کا مرقع نظروں کے سامنے نہیں آجاتا؟ یہ شعر تمام عاشقانہ سہی لیکن اس میں جو درد کی آگ چھپی ہوئی ہیں، وہ پڑھنے والوں کی توجہ اس عالم کیطرف بھی منعطف کرتی ہیں، جہاں سرمایہ داری اور افلاس کی جنگ ہوتی رہی ہے، اور جہاں "خوش باش دمے کہ زندگانی این است" کے فلسفے کا مفہوم سمجھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا ــــ ولاؔ کا ایک اور بلند پایہ شعر ہے ؎

بہنے جو لگی سیل مرے اشکِ رواں کی　　　　پانی پہ بنا نقش جہانِ گزراں کا!!!

اس شعر میں صنعت معنوی کے علاوہ خیال کی وہ بلندی ہے جسکا رجحان قنوطیت کی طرف معلوم ہوتا ہے ــــ "پانی پہ بنا نقش جہانِ گزراں کا" میں جو حقیقت ہے اور جس شاعرانہ انداز میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے اس کی مثالیں دنیا کے شاعری میں کم یاب ہیں۔

اس موقع پہ ولاؔ کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں جنمیں قنوطیت، یاس و حسرت، سوز و گداز پایا جاتا ہے۔

بجھ کر رہا فراق میں اسکے دل حزیں　　　　شب ہجر میں ہو گئے تھے چراغ سحر سے ہم　　　　ہم رو رہے تھے بزم میں جب جل رہا تھا دل　　　　اشکوں کو دل نے بادۂ احمر بنا دیا!!!

غم سے چھلک اٹھی آنکھ تو پینے لگے ہم اشک　　　　ضبط الم نے آنکھ کو ساغر بنا دیا!!　　　　دشت جنوں میں عمر بھٹکتے گزر گئی　　　　لیکن دلِ حزیں سے نہ نکلی وطن کی یاد

بے تکلف وہ تماشا اب کہاں ہم کو نصیب　　　　تو ستاروں کی طرح آب مجھ چھپکانے لگا　　　　مانند اشک آنکھ سے اپنی چکیدہ ہوں　　　　شبنم کی طرح ہیچ تن ابد بدیدہ ہوں

ان اشعار میں عاشقانہ سوز بھی ہے اور شاعرانہ رنگ بھی، اور یہ ولاؔ کی شاعری کا وہ بلند تخیل ہے جسکی جھلکیاں انکے دیوان میں کم پائی جاتی ہیں۔

ولاؔ کے اشعار میں جدت مضامین اور طرفگی خیال اگرچہ مفقود ہے تاہم نفسیات عامہ انکی روش شاعری کی حد سے علیحدہ نہیں ہوتی گو محض قافیہ بندی کی خاطر انھوں نے اکثر غزلیں کہی ہیں لیکن ذوق علمی اور کثرت مطالعہ کی وجہ سے انکا کلام بڑی حد تک نقائص شعری سے

پاک و صاف نظر آتا ہے۔ یہ چیز مشق و مزاولت اور کثرت مطالعہ کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتی۔

ولا کی شاعری کا خاص پہلو انکی اپنی زبان، بے تکلفی اور روانی میں نظر آتا ہے وہ محاوروں کے استعمال کے شائق نظر آتے ہیں، اکثر مقامات پر تو مصرعے کے مصرعے محاورات میں نظم ہو گئے ہیں مثلاً ؎

بوسۂ لب میں ہے تکرار　　لینا ایک نہ دینا دو!　　زلف میں ہم ہو گئے نہ اسیر　　"اور کسی کو فقرا دو"!!!!

اس کے علاوہ ولا نے اپنی رباعیوں میں بھی اسکا خاص طور پر التزام کیا ہے کہ ضرب الامثال و کہاوتیں نظم ہو جائیں اور وہ اسمیں ایک حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں مثلاً

یوں ہم سے نہ آنے کا کرو تم نہ گلا　　ملنے، جلنے سے ہمکو نفرت ہے ولا　　بھاتی ہے بہت گوشہ نشینی دلکو　　"ہم آپ بھلے اور اپنا گھر ہمکو بھلا"

کیوں بکتے ہو اب نہیں ہے سننے کی ہوس　　آگے نہ بڑھو زبان سنبھالو بس بس　　ضرب المثل زبان کا قائل ہے ولا　　"گر ایک کہو گے تو سنو گے تم دس"

کیا سنگدلی ہے اے بتِ غارتگر!　　کچھ بھی تو پرستش کا نہیں تجھ پہ اثر　　ہے تیری جدائی سے جبر وار ولا　　"مانئے تو دیو ہے نہیں تو پتھر"!!!

ولا نے اکثر اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، چنانچہ مومن کی مشہور غزل "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کی زمین میں انکی ایک غزل ہے جسمیں "حسن و عشق" کا دلچسپ مکالمہ ہے اور اسمیں انکا طرز بیان زیادہ دلکش نظر آتا ہے۔

ہوا ذکر وعدۂ وصل کا تو کہا کہ یاد نہیں ذرا"　　"میں کبھی نہ چھوڑوں گا واہ وا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"

کہا "بھولتا ہوں میں لو بھلا وہ عدو سے کیا تھا معاملہ"　　وہ بگڑ کے کہتے ہیں مجھکو کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"

حضرت ولا کو حیدرآباد سے خاص عقیدت اور محبت رہی ہے انکے اشعار میں جابجا انکے جذباتِ وطن پرستی کی جھلک نظر آتی ہے وہ دکنی تھے اور ہمیشہ دکنی رہنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے کلام میں جابجا اس فخر کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں،

دلی سے ہے کچھ غرض نہ ہمیں لکھنؤ سے کام　　ملکِ دکن ولا ہے وطن اپنے یار کا　　دلی پہ فخر ہے نہ ہمیں لکھنؤ پہ ناز　　ہے شوق ہمکو اپنے وطن کی بہار کا

گو لکھنؤ کی سیر میں محو سرور رہوں　　رہ رہ کے مجھکو آتی ہے اپنے دکن کی یاد　　حیدرآباد پہ فائق نہ ہوا فیض آباد　　گرچہ گزرے ہیں وہاں زندہ ولا کے پہلے

انھوں نے اپنے کلام میں دکنی محاورات کا بھی بے تکلف استعمال کیا ہے اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں :-

"میں نے اپنے کلام میں خال خال محاورات دکن کا بھی استعمال کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا اشارہ بھی

کر دیا مجھ کو یقین ہے کہ بہت تھوڑے زمانے میں دکن کے بعض محاورات' اہل زبان کے کلام میں داخل ہو جائینگے صرف اس کا انتظار ہے کہ مجتہدین زبان، جیسا کہ ترک الفاظ ردو پر تلے ہوئے ہیں اسی طرح اضافۂ الفاظ پر آمادہ ہو جائیں' اور ایسا زمانہ بہت قریب آنے والا ہے"

نواب عزیز جنگ متروک الفاظ کے بارے میں بہت زیادہ وسیع الخیال تھے" ایک مقام پر رسالہ "معیار فصاحت" میں لکھتے ہیں۔

"ہماری رائے میں فصحا کا کلام معیار فصاحت ہے، اور ہم متقدمین، متاخرین اور متوسطین کو فصیح مانتے ہیں اور معاصرین سے صرف ان استادوں کو جو اردو کے سوا عربی و فارسی زبان سے واقف اور استادان سلف کے پیرو ہوں، استادان معاصر جنکا بالاتفاق کسی لفظ کو متروک نہ قرار دیں، ہم اسکو متروک نہیں سمجھتے اور جس لفظ کو اتفاق نے متروک قرار دیا ہو اگر اس کا استعمال استادان سلف کے کلام میں ہے تو ہم اسکو غیر صحیح اور غیر فصیح نہیں کہتے، بلکہ ایسے ترک کو معاصرین کا خاص ذوق خیال کرتے ہیں، شعرائے معاصر کو کامل اختیار ہے کہ ترک الفاظ کے متعلق اپنے ذوق سلیم پر عمل کریں اور شعرائے سلف سے جن کا طرز انکو پسند ہو اسکو اختیار کریں یہی رنگ ہے استادان معاصر فارسی و عربی کا لیکن اردو کی بدقسمتی سے بعض معاصرین اہل زبان نے بعض الفاظ مستعملۂ استادان سلف پر غیر فصاحت کا جو دھبہ لگایا ہے، جس کے ذریعہ سے حلقۂ زبان کو تنگ کرنا چاہا ہے انکا یہ طرز ہمارے نزدیک ناپسند ہے۔"

اس عبارت کو یہاں نقل کرنے سے ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ ان کا کلام متروک الفاظ سے معمور رہے بلکہ ان کے کلام میں سلاست ہے اور شعرائے لکھنو کے انداز بیان کی شان بدرجۂ اتم موجود ہے چنانچہ جہاں انھوں نے روزمرہ استعمال کیا ہے ایک ایسے معشوق کی تصویر سامنے آجاتی ہے جسکی بیباک شوخیوں سے ہر وقت ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے، مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں

انشاءاللہ شرط پہ یہاں!! کیوں کہتے نہیں کہ تم جو چاہو

میں ہنسنے لگا تو دے کے گالی کہتے ہیں یہاں سے دور ابھی ہو"

میں رونے لگا تو ہنس کے بولے گستاخ! "نہ ایسا پھر کبھی ہو"

نواب عزیز جنگ ایک پکے مسلمان تھے، انھوں نے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا مبارک فارسی اور اردو زبانوں میں لکھے ہیں، فارسی زبان میں حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام کا ایک طویل مرثیہ "داستان غم" کے نام سے منظوم ہے، اردو

سراپائے مبارک سے انکی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے یہ سراپا زبان کی سلاست اور روانی کی حیرت انگیز مثال ہے اسمیں کثرت سے نادر تشبیہیں اور لطیف استعارات موجود ہیں، درحقیقت یہ انکی شاعری کا بہترین نمونہ ہے مثال کے طور پر "تصویر نور" کے دو بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

یہی گیسو بکھرے رو منہ پہ چمن منور ہیں — یہی گیسو حسینوں کیلئے چہرے کی زینت ہیں
یہی گیسو مری آنکھوں میں تصویر نزاکت ہیں — اسی گیسو پہ قرباں گیسوئے حوران جنت ہیں
اسی گیسو سے پیشانی ہے یا طرۂ کاکل — اسی گیسو سے عارض ہیں یا زلفیں باغ میں سنبل
اسی گیسو میں ہیں گیسوئے پیچاں گیسوئے پرخم — اسی گیسو سے تشکیل ہے تصدق گیسوئے عالم
بنے ہیں موقلم نازک تا نفس باہم — سر مو فرق میں تصویر بن جاتے ہیں پیچ و خم
شب معراج میں پایا ہے رتبہ جہاں کو — انہیں سے منزل گلگوں ہاتھ آتی ہے سخنداں کو

ایک اور جگہ کاکل کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ؎

نہ سمجھا شاعروں نے ہائے فرق زلف و کاکل کو — سمجھنے والے زلف عروس افسوس سنبل کو
بلا یا بال کیسے پھندے ہیں کیوں شاہیں کے تیر گل کو — بھلا کاکل سے کیا نسبت ہے زلفوں کے تسلسل کو
دکھایا فرق نازک کو دلانے اس سے آیا ہیں — اسی کاکل کا سایہ ملے گا اس کو عقبیٰ میں

اب بھی ماہ ربیع الاول کے موقع پر انکے افراد خاندان میں یہ سراپا پڑھا جاتا ہے، اور جس وقت سراپا جوان لحن کے ساتھ اسکو پڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے قلب کی آواز سے مجبور ہوکر اپنے دماغ کا بہترین حصہ حضور اکرم کے سراپا مبارک کے لکھنے میں صرف کردیا ہے ۔

یہاں تک ہم نے نواب عزیز جنگ کی زندگی کا مطالعہ انکے ادبی اور علمی کارناموں کی روشنی میں کیا ہے غالباً یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نواب عزیز جنگ کی علمی اور ادبی زندگی کے علاوہ ایک اور زندگی بھی تھی ہماری مراد انکی قومی زندگی سے ہے خود اپنی سوانح حیات میں، اپنی بعض قومی اور پبلک خدمات کا ذکر کیا ہے ہم اس میں سے کچھ اقتباس یہاں پیش کرتے ہیں :۔

"نایاب قلمی اور مطبوعہ کتب کی صدہا جلدیں اپنے صرفے سے فراہم کیں اور علیگڈھ محمڈن کالج، مدرسہ عالیہ کلکتہ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کتب خانہ نظامیہ مدراس اور بورڈ آف اگزامنرس کلکتہ کے ہاتھ بذریعہ گورنمنٹ آف انڈیا وقف کیں۔ اسکے سوا اپنے ذاتی کتب خانہ کی جلدیں بھی اسی تنزیل کے ساتھ بھیجیں۔ طغیانی زدگان رود موسیٰ کی امداد میں جب سلطنت نے بقرار نے چندہ وصول کیا تو میں نے چندے کے علاوہ اپنی تالیفات کی کئی سو جلدیں نذر کیں اور صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنی پنشن کا ایک حصہ بھی مدت العمر کیلئے وظائف میں وقف کیا"

اسی سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ذیل الفاظ نوجوانان ملک کیلئے مشعل ہدایت ہیں، اور اس قابل ہیں کہ نواب عزیز جنگ کی سوانح میں زریں حروف سے لکھے جائیں فرماتے ہیں
"ان کاموں میں جن جن زحمتوں اور دقتوں کا سامنا ہوا اور جو جو تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں ان سے میرا دل ہی واقف ہے یا مرا خدا اپنی اولاد کو مری نصیحت ہے کہ پبلک کاموں میں وہ صرف خدا پر بھروسہ کرکے کوشش کریں اور ان مشکلات و دقتوں سے ہرگز نہ ڈریں جن کا مقابل ہونا ان کاموں کیلئے لازمی ہے"

اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے مسلمان جس عہدِ انتشار سے گزر رہے تھے اسکا اثر نواب عزیز جنگ کے دل پر بھی ہوا اور سرسید کی تحریک بیداری کے پرجوش حامیوں میں شامل ہو کر مسلمانوں کی علمی ترقی اور اصلاح کے دل سے خواہاں تھے اور ہر وقت قوم کی زبوں حالی پر متاسف رہتے تھے۔ وقار الملک مشتاق حسینؒ کی رحلت پر انہوں نے ایک دردناک مرثیہ لکھا ہے جو ان کے قومی خلوص اور جذبہ ہمدردی کا پتہ دیتا ہے۔ مرثیے کی ابتدا اس مشہور شعر سے ہوتی ہے کہ ؎

مٹایا اے فلک چن چن کے تو نے اہلِ دانش کو ہمیشہ خانہ بربادی ہی داخل تیری عادت میں

آگے فرماتے ہیں ؎

نہ سرسید رہے باقی نہ محسن قوم کا ہادی نذیر احمد پڑے سوتے ہیں اپنی تربت میں
کہاں ہیں حالی و شبلی کدھر ہیں وہ سمیع اللہ نہ چھوڑا ایک کو تو نے مسلمانوں کی خدمت میں

نواب عزیز جنگ مسلمانوں کے قحط الرجال کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور قوم کو بیدار کرتے ہیں کہ ؎

مسلمانو اٹھو جاگو خبر لو اپنی قسمت کی پڑے سوتے ہو تم کیوں بے خبر اس خوابِ غفلت میں

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں نے انکی آواز کہاں تک سنی لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انکے پہلو میں ایک ایسا دل تھا جو قوم کے درد سے خالی نہ تھا ___ ہم نے اس مضمون میں ولا کی زندگی اور کلام پر ایک مختصر تبصرہ کیا ہے۔ اس مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حیدرآباد میں ایسی ہستیاں بھی گزری ہیں جنکا مطمحِ نظر صرف بے لوث علمی خدمت تھا اور جنکو ظاہری نام و نمود کی مطلق پروا نہیں رہی تھی اب ہم ولا کے کلام سے اور چند شعر درج کرنے کے بعد مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

تو نے کر پھول گریباں میں لگایا اس نے!! خیر گزری کہ ولا تو عنادل نہ ہوا
ہوں وہ آزاد کہ زنداں کے اسیرِ جنوں قید میں بھی کبھی پابند سلاسل نہ ہوا!!
کیا ثبوت اس سے ہو بڑھ کر تری یکتائی کا سارے عالم میں کوئی تیرے مماثل نہ ہوا
گو صفحۂ ہستی سے مٹا ہے ترا عاشق!!! لیکن کبھی بے نام و نشاں ہو نہیں سکتا
مستی میں تری نرگسِ مخمور کا ہمسر!! محفل میں کبھی ساغرِ جم ہو نہیں سکتا
مری صورت سے لی بہزاد نے تصویر وحشت کی بگولا دامنِ صحرا کا خاکہ میری وحشت کا
ابر کا رونا تھا بجلی کی ہنسی تھی رات بھر تھا یہ عالم میری آہ و گریہ کی تاثیر کا
لن ترانی جو زباں سے نہ نکالا ہوتا۔ ترے جلوے کا کوئی دیکھنے والا ہوتا!!
آج کیوں چہرۂ خورشید لبِ بام ہے زرد تو نہ کوٹھے سے سرِ شام اترا ہوتا
آپ اگر بت ہیں تو ہم بت پرست ہم نکالیں گے ارمان آپ کا!!
اس طرح بڑھتی چلی جائیگی جب زلفِ دراز! عاشقِ ہجراں کا قصہ مختصر ہو جائیگا
ہمارے سوزِ دل کو دامنِ دل کا سہارا ہے بجھا سکتا نہیں کوئی چراغِ زیرِ دامن کو
عاشق کے دل میں آج ہے عالم بہار کا کیا ہو گیا ہے عشق کسی گلعذار کا
کیا انتہا ہے ہستیِ ناپائیدار کا!! کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا!!
آنکھیں لگی ہیں راہ پہ جھپکی نہیں پلک اے بیوفا برا ہو ترے انتظار کا
ہر اک قطرے کو دعوائے انا البحر کہو منصور کی آنکھیں کھلا کیا!!!
میں محو تماشا ہوں تری ایک نگہ کا ہے میرے تماشے پہ دو عالم کی نظر آج
کبھی بھولا نہیں میں اپنی پریشانی کو یاد ہے زلف کو الجھا کے اٹھانا تیرا
سماتا بزمِ عشرت آج دامنگیر تھا ورنہ جو ہم روٹھے تو محفل کو رلا اپنی آنکھوں سے
بگڑنا تعلق سے جب تم نے پوچھا ہم کو کیا سمجھے خدائی خود کا دعویٰ خدا سمجھے خدا سمجھے
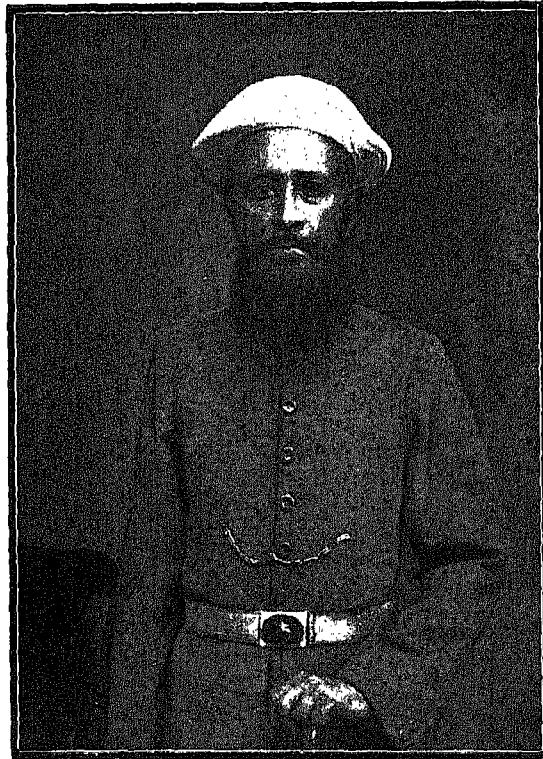
مولانا محمد عبدالغفور خاں نامی

نامی

مولانا محمد عبدالغفور خاں صاحب

ولادت ۱۲۸۲ھ

از محمد وحید اللہ خاں صاحب ناصر ایم اے ایل ایل بی (عثمانیہ)

حضرت نامی کا سلسلۂ نسب حضرت عباسؓ ابن علیؓ تک پہونچتا ہے انکی والدہ سید شاہ محمد احمد الحسینی کی صاحبزادی تھیں (جو حضرت امام حسین ابن علی کی اولاد ہیں) جنکا مقبرہ اور خانقاہ جیلانیہ منتعد پورہ میں مشہور ہے۔ اس طرح وہ اجداد کی طرف سے علوی سید اور ننھیال کی طرف سے فاطمی ہیں۔

خاندانی حالات۔ انکے بزرگ سلاطین عباسیہ سے مغلیہ تک امرائے دربار رہے خلیفہ ہارون رشید نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے نام ایک ہزار درہم کی جاگیر عطا کی تھی اور حسن بن عبداللہ بن عباسؓ شیخ ابن الشیخ کے خطاب سے سرفراز اور شعرائے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے فرزند سادات میں پہلے شخص ہیں جو مکہ و مدینہ کے امیر تھے۔

مورثان اعلی۔ سب سے پہلے احمد العجان وارد ہندوستان ہوئے جو میر جاگیر جنہوں نے سنگڑھ بسایا آپ کی اولاد میں ہیں میر جاگیر کے پوتے میر شاہ بیگ میر ملتانی نے سلطان بلبن کے دربار سے ۶۸۶ھ میں وزیر خان کا خطاب پایا ان کے پوتے میر شہداد خاں کے ایک فرزند میر بہرام خان نے سندھ پر حکمرانی کی اور دوسرے فرزند نے سنگڑھ پر قبضہ کیا میر جاگیر کی اولاد میں میر بہار محمد المخاطب بہار خان اکبر بادشاہ دہلی کے دو صدی منصبداروں میں شامل تھے اور انکے پوتے میر وارث محمد عالمگیر بادشاہ دہلی اور احمد شاہ غازی کے عہد تک تعلقدار رہے۔

نامی کے والد۔ مولانا نامی کے والد میر فیض محمد خاں نے (جو میر وارث محمد خان تعلقدار کے پوتے ہیں) غدر دہلی کے بعد حیدرآباد دکن میں ہجرت کی نواب افضل الدولہ کے دربار سے خطاب خانی و بہادری سے سرفراز اور دربار ملکہ وکٹوریہ سے خلعت خاص سے ممتاز ہوئے مسٹر فریزر رزیڈنٹ نے انکو کمشنر برار مقرر کیا اس خدمت پر عرصہ تک رہے بعد میں مسٹر ڈیوڈسن اور نواب شمس الامرا کے درمیان

عہدۂ وکالت پر اُن کا تقرر ہوا اور پائیگاہ شمس الامرا آصف سے موضع اور اد محاصلی چودہ ہزار سالانہ بطور جاگیر عطا ہوا نواب محمد رشید الدین خان شمس الامرا ثالث نے مواضع کنیال محمد نگر فیض آباد وغیرہ محاصلے تیس ہزار کی مزید جاگیرات عطا کیں جنکے حاصل سے اب تک افراد خاندان تنخواہیں پاتے ہیں مولانا ناصی نواب لطف الدولہ بہادر کی پائیگاہ کے ناظم امور مذہبی کی ممتاز خدمت سے بھی سرفراز ہیں۔

ولادت و تعلیم و تربیت ۔ سنہ ۱۳۸۲ھ میں ناصی حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ انکے ابتدائی معلم مولوی اشرف حسین تھے۔ فارسی کی تکمیل محمد حسین زماں خانی اور مولوی عبید اللہ سے کی۔ نواب شمس جونیہ جاہ کی ہمراہی میں مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی سے شرف بیعت سند اٹھارہ برس کے سن میں حاصل ہوا اور علوم عربی کی تحصیل کیطرف منہمک رہے مولوی محمد عباس خاں پشاوری سے صرف نحو فقہ حدیث تفسیر مولانا عبدالصمد قندھاری سے علم ہیئت مولوی نادرالدین سے علم منطق مولوی عباس علیخاں سے فلسفہ معقول مولانا عبدالرحمان سہارنپوری سے علم ادب اور حدیث اسطرح اکتیس سال کی عمر میں دستار فضیلت ایک خاص مجمع علماء و مشائخ میں انکو عطا ہوئی مولانا نے استادالملک وحید الدولہ آغا سید علی شوشتری سے عربی ادب معانی بیان بلاغت وغیرہ کو حاصل فرمایا اور عربی فارسی شاعری میں مشاورت سخن آغا صاحب مرحوم سے ہوتی رہی۔

شاعری ۔ حضرت ناصی کو نو دس برس کی عمر سے شاعری کا مذاق تھا اور لڑکپن ہی سے اردو فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن کلام یا تو ادھر ادھر پھینکدیا یا دوستاں احباب نے لے لیا لیکن جب جہاں استاد فصیح الملک داغ دہلوی سے زبان کی اصلاح لی تو اُن کا کلام جمع ہونے لگا۔ فارسی عربی میں بھی آپکا بہترین کلام ہے استادالملک سید علی شوشتری سے تلمذ تھا۔

طب ۔ فن طب میں بھی انکو خاصہ دخل حاصل ہے اس کی تعلیم حکیم محمود علیخاں دہلوی سے حاصل فرمائی اور حکیم عمر خاں رامپوری کے مطب میں نسخہ نویسی کی مہارت حاصل کی۔

تعبیر خواب و علم جفر ۔ اسرار علم جفر سینہ بسینہ کی تعلیم انھوں نے حبیب حداد علوی سے حاصل کی اور فن تعبیر خواب میں صاحبزادہ میر محبوب علیخاں عرف دولہ پاشاہ کے شاگرد رشید ہیں اب اس فن میں ناصی ہی بہت مشہور ہیں۔

خوشنویسی ۔ خوشنویسی کی ابتدا زرین رقم ثانی سے پھر امیر پنجہ رجنگ سے کی اور محمود نواز خاں سحر رقم سے نادر رقم ثانی کا خطاب پایا۔

تصنیفات

ناؔمی کے کُل تصنیفات لائق طبع حسب ذیل ہیں۔

(۱) جواہر الصلوٰۃ (بزبان عربی) (درود و سلام ہیں)
(۲) آیات الکبریٰ (〃) (آیات قرآنی کے خواص ہیں)
(۳) دلائل الخیرات (〃) (سارو رسا ضرب دلائل الخیرات کے)
(۴) دلیعتہ المحمود (بزبان فارسی) (مجرب اعمال کا ذخیرہ)
(۵) تکسیرات و تسخیرات (〃) (علم جفر میں)
(۶) بستان ناؔمی (بزبان فارسی) (چشم دید واقعات منظوم بطرز بوستان سعدیؒ)
(۷) دلستان ناؔمی (〃) (چشم دید حکایات منثر بطرز گلستان سعدیؒ)
(۸) احادیث خیر الانام فی التیقظۃ والمنام (فارسی زبان میں لیے گئے ہیں)
〃 مجموعہ جسمیں حضرت صلعم سے اولیاء اللہ نے استفادہ علوم کیا ——

(۹) مناجات ناؔمی (بزبان فارسی) (ذاتی خوابوں کا مجموعہ)
(۱۰) تعبیرات ناؔمی (〃) (ذاتی تعبیروں کا مجموعہ)
(۱۱) فرائض ناؔمی (〃) (قابل کتاب خوشنویسانہ نظم و نثر)
(۱۲) فردوس دکن (〃) (گمنام اولیاء اللہ کے حالات جو ملک دکن میں آسودہ ہیں)
(۱۳) الدرجات العلیٰ (بزبان اردو) (اعمال اشغال احمدانی کا مجموعہ)
(۱۴) ریحان الارواح (〃) (متفرقات اشعار ہیں)
(۱۵) مجربات ناؔمی (〃) (مجرب ادویہ کا مجموعہ)
(۱۶) کشکول (〃) (مختلف عمال و ادویہ صنعت و کوفت وغیرہ کا ذخیرہ)
(۱۷) اقلام الابجدی (〃) (حروف ابجد کی مختلف صنعتیں مختلف زبانوں میں)
(۱۸) ملکۂ دکن (〃) (عورتوں کی تعلیم و تربیت میں)

ان کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں مختلف رسائل بھی ہیں اور متعدد سفر نامے بھی جو نواب لطف الدولہ بہادر کے ہمراہی سفروں میں تحریر فرمائے گئے ہیں اس وقت انکا ایک تقریباً کامل دیوان عربی میں اور دو دیوان اردو میں ہیں۔

حضرت ناؔمی فطری شاعر ہیں اور تفنع اور آورد سے اُن کا کلام پاک ہے سلاست زبان شیریں بیان معاملہ بندی اور موسیقیت اُنکے کلام کے خصوصیات ہیں۔ اُن کے اشعار میں نازک خیالی اور سنجیدگی کیساتھ الفاظ کی نشست ایسی ہوتی ہے گویا نگینے جڑ دیئے ہیں۔ آپ نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں قادر الکلامی ثابت ہے مولانا کے کلام کا زائد حصہ غزل پر مشتمل ہے لیکن ان کی غزلیں ثقیل الفاظ، دور از کار تشبیہات، اور مناسبات لفظی کے بے ہنگام آرائش سے زیربار نہیں بلکہ سادگی مضمون آفرینی اور برجستگی کی آئینہ دار ہیں۔ مثلاً

ہوئی ہیں غصہ سے لال آنکھیں غضب کے تیور بدل رہے ہیں ۔ بہو رہی ہیں کفنیاں خنجر کے میان سے نکل رہی ہیں ۔ کمر بتاتا نہیں ہے کہہ کر چھپا ہیں تو بھی چھپا کے ۔ زبان وعدہ کر گیا ہے اب اسکے پہلو بدل رہے ہیں

بتاؤ تو کسے ناصح سے آشنائی تھی۔ نگہہ لڑائی تھی...... تمہارے چاہنے والوں میں تھا کہنا تو کہا کوئی کہیں ہو گا......

مولانا ناصح کیسے قادر الکلام تھے غزل صرف غزل تک محدود نہیں ہے انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے قصائد میں نظمیں رباعیات میں قطعات ہیں تاریخات ہیں لیکن بخیال طوالت یہاں صرف ایک قصیدے سے جو سلور جوبلی کے موقع پر لکھا گیا ہے۔ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں جو مختلف مقامات سے منتخب کئے گئے ہیں ؎

مست خواب شکر آلود و شیشہ و چنگ | دہن غنچہ کی ہو تو فدا جس پہ تنگ | ہاتھ اور پاؤں کو پھیلا کے سوتے ہیں | ہائے کیا خواب جوانی میں نشہ کی ترنگ

گورے گالوں پہ ہیں بکھری ہوئی کالی زلفیں | روز روشن پہ شب تار ہے لایا ہے رنگ | چونک اٹھی جو لگی میری نظر کی چوٹ | گر گئی کام نہ تھی میری نگہ گرچہ خدنگ

لے کے انگڑائی وہ ملتی ہوئی آنکھیں اٹھیں | حسن کو آرسی میں دیکھ کے خود رہ گئی دنگ | دست بستہ یہ کہا میں نے کہ اے ماہ جبیں | ہیں ترا عاشق دلگیر ہوا اور جان سے تنگ

پہلے تو اتنا بتا دے یہ نشہ تھا کیسا | خواب کی کیسی ادا کیسے یہ بیداری کے ڈھنگ | خفتہ بختوں کو جگاتا ہے مرا خواب نشاط | میری بیداری بدل دیتی ہے عالم کا رنگ

اے سلیمان حشم بادشہ آصف جاہ | رونق ملک دکن زینت تاج و اورنگ | سینہ وہ گنج ترا جس میں ہزاروں ہیں نقود | دل وہ آئینہ ترا جس میں نہیں کوئی زنگ

علم کے آگے ترے قلزم عمان قطرہ | حلم کے آگے ترے تنگ عقیلان فرنگ | ہے فرح بخش ترا ظاہر و باطن ایسا | گل میں بو جیسے نہاں جیسے عیاں گل میں رنگ

تری تصویر ہے الملک العدل کی مثال | دیکھ کر حسن ترا آئینہ دہر ہے دنگ | تری تلوار کی وہ کاٹ کہ اللہ کی پناہ | [illegible]

تیز رفتار ترا اسپ کب تازی ایسا | کہ ہوا پیچھے رہے جس کے ہزاروں فرسنگ | جس کے پھیرے کے لئے وسعت دنیا کم ہے | جس کے کاوے کے لئے عرصۂ دنیا ہو تنگ

رباعیات کے نمونے بھی ملاحظہ ہوں۔

نیکی جو نہ ہو سکے بدی بھی نہ کرے | لازم ہے انسان کو آتا تو مگر | مانا کہ کسی کی دلدہی بھی نہ کرے | مانا کوئی دوست دوستی بھی نہ کرے

[illegible] | رونا ہے شرافت کو ہنر کو ہر ایک | بی بی ہے نہ بھائی نہ پسر دختر ہے | دنیا میں نہ کچھ باپ نہ کچھ مادر ہے

مولانا کا کلام کل اصناف شعر میں موجود ہے مثلاً واسوخت و مثنوی منظوم خطابات عبرت و پند کی نظمیں تعزیے و قطعات پہیلی ٹھمری وغیرہ۔ بہرحال ان کا کلام کیا ہے بحر ذخار ہے اور اس میں ایسے ایسے انمول موتی پنہاں ہیں کہ غواص ہی کو اس کا پتہ چل سکتا ہے۔

ڈاکٹر میر مہدی حسین الم

الم

ڈاکٹر میر مہدی حسین علم و شوہر

(ریختی)

ولادت ۱۲۸۳ھ

امر تیا شیر سنگھ صاحب

۹ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ بروز یکشنبہ پیدا ہوئے میر جعفر علیخاں ابن میر حسمت علیخاں کے چشم و چراغ اور یادگار ہیں انکے جد اعلیٰ نواب میر ہاشم کرمانشاہان ایران سے حیدرآباد آئے تھے جنہیں سرکار آصفیہ سے بارہ ہزار کی جاگیر رسول پور (مصافات بیدر) عطا ہوئی تھی ۔ اور بیدر میں قلعہ دار (قلعہ دار) مقرر ہوئے ۔ انھوں نے بیدر ہی میں وفات پائی اور ضلع بیدر میں دفن کئے گئے ۔ الم کا رشتۂ قرابت من جانب اب و جد خاندان میر عباس علیخاں عرض بیگی اور از طرف والدہ خانوادۂ میر عالم دیوان دکن سے ملتا ہے انکے خاندانی حالات گلشن جعفری مولفۂ نواب میر نثار حسین خاں اور تزک محبوبیہ میں تفصیل سے درج ہیں ۔

تعلیم الم بچپن سے ذہین اور ذکی الطبع واقع ہوئے ہیں تحصیل علم کا شوق ہمیشہ رہا ابتداً خانگی طور پر فاضل اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ۔ اور پھر مشہور آفاق مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہوئے ۔ فقہ مولوی میر کاظم علی اور مولوی میر صادق علی سے پڑھی اور منطق میں مولوی حسنو میاں سے کسب فیض کیا ۔ تیرہ ۱۳ سال کی عمر میں میڈیکل انسٹیٹیوٹ میں داخل ہوئے اور سند حاصل کی تو جج باغات گولکنڈہ میں اسسٹنٹ سرجن کی خدمت پر مامور ہوئے ۔ بوجہ کبرسنی و ثقل سماعت وظیفہ پر علحدہ ہوئے بعض مجرب ادویہ موجد ہیں مثلاً "عرق آب حیات" "الم نرواسن ٹانک پلز" "الم بام وغیرہ"

ذوق شعر گوئی الم فطری شاعر ہیں بچپن سے شعر کہنے کا شوق ہے ۔ ابتداً مرزا مہدی حسین خاں مولوی منشی میڈیکل انسٹیٹیوٹ سے مشورۂ سخن رہا ۔ آخر ۱۳۰۵ھ میں نواب فصیح الملک داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا پہلی غزل جو استاد کو سنائی اسکا مقطع یہ ہے ؎

الم بعد حنا کیوں شعر اور وں کو دکھلاتے ہم ۔ مقدر میں تو اپنے داغ سا استاد ہونا تھا ۔

استاد داغ نے غزل پسند کی اور ذہین پا کر حسب درخواست زمرۂ تلامذہ میں شامل کر لیا۔

آلم کا رتبہ فارسی شاعری میں بھی بلند ہے۔ فارسی میں مولوی عبدالعلی واآلہ سے بعدازاں آغا سید علی شوستری طوبی سے مشورۂ سخن رہا۔ اولاً آلم تخلص کرتے تھے ایک مرتبہ ایک رباعی تہنیت میں لکھکر حضرت طوبی کی خدمت میں بھیجی جسمیں تخلص الم ہی تھا طوبی نے کہا کہ تہنیتی قصائد وغیرہ میں الم تخلص کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اسلئے الم کے علاوہ ملہم تخلص بھی اختیار کیا گیا۔ ریختی میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں گاہی ماہی طبع آزمائی کرتے ہیں اور تشوہر تخلص ہے۔

تصانیف ۔ الم کے چار دیوان ہیں، اُردو دیوان میں غزلیات، رباعیات، مخمسات، مسدسات، ترجیع بند، قطعات، مطائبات، ہزلیات، سہرے، تواریخ، قصائد، تقریظات و متفرقات ہیں یہ دیوان بہت ضخیم ہے۔ ایک مثنوی عقیدۃ الخالصہ ہے جو بحث مساوات میں لکھی گئی ہے۔ دوسرے دیوان میں مراثی اور سلام ہیں۔ اس کا نام "قبالۃ الجنان" رکھا گیا ہے۔ تیسرا دیوان ریختی کا ہے اسمیں غزلیات، رباعیات، قطعات، مناجات، مثنویات اور نوحے ہیں۔ چوتھا دیوان فارسی کا ہے جو غزلیات، رباعیات اور تواریخ پر مشتمل ہے۔ اس کا تاریخی نام ریاض فارسی ہے۔ اعلیٰحضرت غفران مکاں کی جوبلی مبارک کے موقع پر آلم کے قصائد تواریخ کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اسکا نام "محبوب القصائد" ہے۔

ان کے علاوہ آلم کی اور دوسری تصنیفات بھی ہیں،۔

(۱) گلبن تاریخ۔ فن تاریخ گوئی پر یہ بہت ہی قابل قدر بسیط و ضخیم تالیف ہے۔ یہ پورے ہندوستان میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی اور اب کمیاب ہے۔

(۲) رسالہ معاشرت۔ اس میں عزیز و اقارب کے حقوق، اور حسن سلوک و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۳) رسالہ ہادی معلم نسوان کے لکچر متعلق خلاف پردہ مولفہ محب حسین صاحب کا رد ہے۔

(۴) رسالہ تذکیر و تانیث اللسنہ کے طلبہ کیلئے بہت مفید و کارآمد ہے لیکن گلبن تاریخ کے سوا جملہ کتب مذکورہ صدر ہنوز زیر طبع نہیں۔

شاگرد ۔ الم ایک قادر الکلام شاعر ہیں اور ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع ہے ۔ چند قابلِ ذکر یہ ہیں۔
سید عباس حسین صمصام، تبسم رازمی، سید ضیاء الدین عالی، فضل اللہ حسینی اثم، حفیظ الدین حفیظ، تائید حسین حباب
تائید، ابوالقاسم ہرمز، کرنل نشرف الحق عریاں، واشرقی (دیر سخنی) فخر الدین خان برق، ناطق، رحمت، وغیرہ۔

اخلاق و عادات ۔ حضرت الم سراپا مجسم اخلاق ہیں۔ ہر کوئی ان کے اخلاق حمیدہ کا گرویدہ ہو جاتا ہے
انکا سلوک ہر کس و ناکس کیساتھ مخلصانہ اور دوستانہ ہوتا ہے۔ آداب مجلس کا بڑا خیال رکھتے ہیں طبیعت متواضع اور مرنج و مرنجاں
واقع ہوئی ہے ۔

دوستوں کی صحبت میں چراغ محفل بنے رہتے ہیں۔ ہمیشہ شاعری اور ادب کے چرچے رہتے ہیں ۔ دوستوں کا کلام
شوق سے سنتے اور اپنا کلام سناتے ہیں ۔ بڑے مذہبی، متقی، خدا ترس اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں ۔ باوجود کبر سنی نماز کبھی
قضا نہیں ہوئی ۔ روزانہ بعد نماز صبح قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں۔ دل آئینہ سے زیادہ صاف ہے۔ خیالات نہایت ہی
پاک اور سنجیدہ کبھی کسی کے درپئے آزار نہیں ہوتے۔ شاگردوں کے ساتھ اولاد کی طرح برتاؤ کرتے ہیں۔

حضرت الم کو اپنے استاد سے بے حد عقیدت ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

الم یہ فیضِ تعلیم جہاں استاد ہے سارا	ہر اک شعر اپنا ہو جائیگا دیوان ہیچ سمجھا تھا
کیوں آج الم بھی طوطی باغ دکن نہو!!!	استاد اس کا بلبل ہندوستان نہ تھا!

انکی شاعری ۔ الم ایک کہنہ مشق پرگو شاعر ہیں کلام صاف و ستھرا حشو و زوائد و تعقید سے پاک ہوتا ہے
زبان دہلی کی پابندی کرتے ہیں کلام اردو کے محاورات کا گنجینہ ہے ۔ مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد کے یہاں جو مشاعرے
ماہانہ ہوتے ہیں ہمیشہ شریک ہوتے ہیں ۔ اور مہاراج بہادر نے انکی خوش گوئی اور پرگوئی کی سر مشاعرہ اکثر تعریف فرمائی ہے۔
ایک مشاعرہ میں مہاراجہ بہادر نے فرمایا کہ "یہ زبان کے استاد ہیں لیکن افسوس ہے کہ بوجہ ثقل سماعت کے اوروں کا کلام سننے سے مجبور ہیں"

مرثیہ و سلام "غزل کو آپ بیتی کہتا ہے اور مرثیہ کو جگ بیتی" الم کی غزلیات انکی شاعری کی عظمت
کا سکہ پڑھنے والوں کے دل پر بٹھا دیتی ہیں تو ان کے مرثیے انسانی جذبات اور لطیف احساسات کا مرقع ہیں۔ انھیں مرثیہ میں بھی

خاص مہارت ہے۔ سلاست و روانی، زورِ کلام، شکوہِ الفاظ، شوکتِ مضامین، مضمون آفرینی، تکنیک غم آگین واقعات کی ترجمانی ایسے پُر درد اور موثر الفاظ میں کرتے ہیں کہ سننے والے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ الم نے پانچ مرثیے لکھے ہیں جن میں رزمیہ بینیہ ہیں۔ کئی سلام بھی کہے ہیں مناقب و مصائب کے بیان میں اعتدال سے تجاوز نہیں کیا۔ آئمہ اطہار کی منقبت میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مداحِ شبیر ہونے پر فخر کرتے ہیں اور اپنے بلند مرتبہ کی یہی وجہ خیال کرتے ہیں ؎

کیا جبر تھی لے الم مداحی شبیر سے ہم صفیرِ بلبلِ شیراز تو ہو جائے گا !!!!
نظم گر مدح شہنشاہ ولایت ہو جائے شعر کی مجھ سے لاریب امانت ہو جائے

ایک رزمیہ مرثیہ حضرت حر ابن یزید ریاحی کی لڑائی اور شہادت میں کہا ہے۔ اس مرثیہ کے چہرہ میں صبح روزِ عاشور کا سماں سب سے بجا کر باندھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

کیا صبحِ قتلِ تشنہ کی انوکھی بہار ہے گویا خزاں رسیدہ ہر اک برگ و بار ہے پھولوں کے ڈھیر پر جو گماں مزار ہے نالاں ہے عندلیب پریشاں ہزار ہے
ہے لالہ زار سینہ پُر داغ کی طرح جو داغ کی طرح ہے وہی باغ کی طرح وہ صبح کا سہانا سماں ہائے کیا ہوا چلنے نسیم بادِ خزاں ہائے کیا ہوا
سنسان ہے جو کوئی مکاں ہائے کیا ہوا کیوں اوس بن رہی ہے دھواں ہائے کیا ہوا ہوتے ہی صبح آج ہوا کیوں بگڑ گئی باغِ جہاں پہ دیکھو اک بجلی جو پڑ گئی
آبِ رواں ہے اشکِ رواں کی طرح رواں زنجیر ہو رہی ہے ہر اک موج بیکراں ہے ہر حباب آبلۂ قلبِ تفتہ جاں پیاسے ہی بے قرار ہیں پانی میں مچھلیاں
تشنہ ہے خاندان جو رسالت مآب کا آبِ فرات پر بھی ہے عالم سراب کا کیا تلملا ہوا ہے لرزہ میں آفتاب کیوں تھرتھرا کے اٹھتا ہے چادر سحاب کا
پو پھٹی وہ دھوپ پھیل گئی ہر طرف شتاب نکلا ہے آفتاب کھلا زرد با گلاب آواز آئی غم سے پریشاں ہو گیا اسکو طلوعِ صبح سے یرقان ہو گیا

اسکے بعد امام حسین علیہ السلام کا میدان میں تشریف لانا اور عمر ابن سعد سے مکالمہ اور ابتدائے جنگ حر کا امام حسین کی نصرت کے لئے حاضر ہو کر جہاد کیلئے جانا وغیرہ بیان کیا ہے ؎

جہانِ کربلا کا جو حر میہماں ہوا وہ دوزخ سے نکلا داخلِ باغِ جناں ہوا ایسا بلند بخت کسی کا کہاں ہوا یوسف سے بڑھ گیا کہ عزیزِ جہاں ہوا
کیا تھا اور ایک آن میں کیا ہو گیا ہے حر پڑھتے درود آتو صلِ علیٰ ہی حر عباس اسکو لینے گئے اے زہے نصیب اکبر جلو میں اس کے چلے آ زہے نصیب
حضرت پکار اٹھے بھائی آئے زہے نصیب رومال شہ نے اشک تو پونچھے زہے نصیب زینب پکاری راحتِ قلب و جگر ہے حر آئی صدا فاطمہ میرا پسر ہے حر

صفران نامی پہلوان کو عمر سعد نے حر کے مقابلے کو بھیجا۔ اس نے آتے ہی نیزے کا وار کیا ـــ

وار اس کا روک کر کہا حر نے کہ ارے شقی　　چھوٹے سے منہ سے کرتا ہے باتیں بڑی بڑی
سر پر ترے ہے اجل تجھے سوجھی ہے دل لگی　　پہلے یہ میرا وار بھلا روک تو سہی

ہرچند فن جنگ میں نامی وہ بھی تھا　　نیزے پہ اس لعین کو حر نے اٹھا لیا
جاتا تھا یوں اٹھائے ہوئے نیزہ پر شریر　　جس طرح بیخ اکھاڑ کے جاتی ہے تیز وا

لشکر کی سمت پھینک کے اسکو بصد نیاز　　کہنے لگا کہ شکر خداوند کارساز
نازاں بہت تھا قوت بازو پہ یہ شریر　　حاصل ہوئی ظفر مجھے اس شیر پر

بعد اسکے لی نیام سے شمشیر جاں ستاں　　تلوار تھی کہ تھی ملک الموت کی زباں
فوق السما جو نور کے لب پر تھی لا الہ　　تحت الثریٰ میں گاؤ زمیں کو تھا خوف جاں

قہر خدا کا وہم جو تھا جوش خلاف پر　　جنات سارے حیرت سے تھے کوہ قاف پر
بجلی کہوں تو اس میں یہ جلوہ گری کہاں　　جلوے میں اسکے ناز و ادا پری کہاں

اسکی طرح وہ خون عدو میں بھری کہاں　　کشتہ تھی فوج ستم وہ جری کہاں
جلوہ نما فلک پہ وہ کٹ کر گری رہی　　اعدا کی جان لینے پہ یکسر تلی رہی

تیغ نگاہ ناز میں بھی ہوتی ہے ادا　　لیکن وہ دلربا ہے یہ ظالم ہے جاں ربا
سفاک وہ ہوئی جو کبھی خواہش حنا　　خون عدو سے رنگ لئے اپنے دست و پا

تھی ہو دنمائی اسکے جو دلہن بنی ہوئی　　رہتی تھی رزم میں بھی دلہن بنی ہوئی

گھوڑے کی تعریف میں یوں رقم طراز ہیں ـــ

جب باگ اٹھائی ہو گیا یہ باد پا ہوا　　صرصر نے گئی اڑان یہ سوچا تھے صبا
اک رو ہی جست میں صف اعدا کو آگیا　　پہنچا وہیں جہاں کا ارادہ جری کو تھا

جس طرح تیز پر تھا خدنگ اور تیر سے　　واقف بھی تھا سوار کے مافی الضمیر سے

علم کی تعریف میں میر انیس کی استادی کے معترف ہیں ـ

تھا یہ علم عباس دلاور نظر آئے　　حمزہ کبھی جعفر کبھی حیدر نظر آئے
میدان میں دو تیر انور نظر آئے　　خیبر تمہیں سب آنکھیں ہمیں کیوں نظر آئے

پنجے کی طرح ماہ میں بھی آب نہ ہوگی　　خورشید قیامت میں بھی تاب نہ ہوگی
کیا چہرہ تاباں درخشاں نہیں ملتا　　پا سبز قبہ سا قد موزوں نہیں ملتا

سرسبز کوئی گلشن امکاں نہیں ملتا　　میں بھی تو ہوں مداح مجھے کیوں نہیں ملتا
ہاں آس لئے او عصا علم چھوڑ دیئے ہیں　　سید نے خدا جانے قلم توڑ دیئے ہیں

قصائد ۔ فانی کے قصائد جس طرح دلچسپ اور معنی خیز ہوتے ہیں اسی طرح الفت فانی دکن کے قصائد فصاحت و بلاغت کے بہترین نمونے ہیں۔ تشبیب دلچسپ گریز معنی خیز اور انداز بیان پختگو ہے ان میں شاندار الفاظ فارسی بندش برجستہ محاورات، معنی خیز ترکیبات، بدیع تشبیہات سے کام لیتے ہیں مبالغہ کی حد سے گزر کر غلو اور اغراق کی سرحد تک نہیں پہنچتے۔

اعلیحضرت غفران مکاں کی انتیسویں سالگرہ مبارک کے مسعود موقع پر ایک قصیدہ لکھا تھا جب استاد داغ کو سنایا

تو انھوں نے دل کھول کر داد دی۔ اور کہا کہ "استاد ذوق خاقانی ہند تھے تم قاآنی دکن ہو" اس عطائے خطاب کے شکریہ میں ایک رباعی لکھ کر پیش کی وہ یہ ہے ؎

استاد کا دنیا میں نہیں ہے ثانی | استادی آپ کی ہے سب نے مانی
کی سولہ سال جب میں نے پا بوسی | بخشا ہے خطاب اب مجھے قاآنی

قصیدہ از اول تا آخر بہت دلچسپ ہے۔ کوئی شعر بھرتی کا نہیں۔ بندش الفاظ نہایت برجستہ ہے۔

پورا قصیدہ صنعتوں جو لف و نشر وغیرہ سے مالا مال ہے چند اشعار یہ ہیں ؎

آئی ہے قبل از وقت جو اب کے باغ جہاں میں فصل بہاراں | پھولی سماتی ہی نہیں بلبل جامہ سے باہر ہے گل خنداں
غنچۂ نازک اور گل تر سنبل پیچاں دیدۂ عبہر | ہے لب رنگیں عارض خوباں زلف مسلسل چشم غزالاں
دست چنار و سرو و صنوبر برگ گل تر لالۂ احمر | ہے ید بیضا قامت زیبا اور لب لعلیں عارض تاباں
سبزہ اور اس پر قطرۂ شبنم دلبر و دلکش تشبیہ بھی ہم | یا خط سبز دلبر نازک تس پہ کہیں موقع پہ عرق افشاں
چشمۂ شیریں چشمۂ حیواں چشمۂ تیر ہے چاہ ذقن ہے | پنجۂ مرجاں دزدگار ہیں چاہ سنبلان ماہ کہ قمر کا
ماہ سے لیکر تا سر ماہی تحت ثریٰ سے تا بہ ثریا | نور کا عالم ہوید ہے جسکی چشم بصیرت دیدۂ حیراں
دل نے کہا اے عزت و حشمت تو بھی تو کر اظہار عقیدت | آج کا دن ہے روز مسرت آج کا دن ہے عید محباں
آج کے دن مسعود ہوا ہے آج کے دن مولود ہوا ہے | خسرو دوراں حاکم گیہاں آصف ثانی رشک سلیماں

مطلع ثانی

ذات ہمایوں تیری ہے بیشک ظل خدا اس آیۂ بیہا | وائے عظمت مایۂ ہیبت آیۂ رحمت سایۂ رحماں
روئے کتابی گردن بیضا سینۂ انور قلب مصفا | مصحف ناطق قاضی بیضا معدن حکمت مخزن ایماں
ہاتھوں میں تیرے دولت دیں ملک جہاں ہے زیر نگیں ہے | شیشۂ دل میں ہے مئے وحدت کاسۂ سر میں بادۂ عرفاں
حامی دین و مالک دولت راعی ملک و داعی دولت | ماحی کفر و تمکین سنت و مدح حافظ شرع و عامل قرآں
تیرے ہیں وہ اوصاف حمیدہ زیدہ و چیدہ اور گزیدہ | عشر عشیر ان کا نہ رقم ہو درج کرے تا حشر جو انساں

رباعیات : آلم کی رباعیات وسیع اور جامع مضمون کی ہوتی ہیں ۔ چار مصرعے رباعی کی تکمیل کے لئے نہیں بلکہ ان میں کا ہر ایک مضمون کی وضاحت میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ کوئی مصرعہ غیر ضروری اور بھرتی کا نہیں ہوتا۔ عموماً چوتھا مصرعہ پورے مضمون کا لب لباب ہوتا ہے۔ آلم نے وسیع مضامین کو اس چھوٹے ظرف میں بند کیا ہے۔ اخلاق اور تصوف کے موضوع میں کئی رباعیات ہیں مثلاً

(۱)

اپنا سا بیاد رو جو پاؤں یا رب — جی کھول کے حال اسکو سناؤں یا رب
محشر میں بلا کر نہ خجل کر مجھکو!!! — کس منہ سے ترے سامنے آؤں یا رب

۲

غفلت سے جو حل عقدۂ مشکل نہ ہوا — جز تیرے رجوع اور سے دل نہ ہوا
غافل ہوتا تو چارہ جوئی کرتا!!! — ہے شکر الٰہی کہ میں غافل نہ ہوا!!

۳

اپنے سے جو کم ہو اس کی دنیا دیکھو! — اچھی نہیں دولت کی تمنا دیکھو!!
فوارے کی مانند آلم دنیا میں! — اونچے ہو کر کہیں نہ نیچا دیکھو!!!

اپنی کمی بصارت اور ثقل سماعت کی نسبت کہتے ہیں ؎

۴

پیری سے جو کم ہوئی بصارت اسکی — فی الجملہ بڑھی اور بصیرت اسکی
سنتا نہیں اب آلم کسی کی غیبت — یہ ثقل سماعت بھی ہے رحمت اسکی

تاریخ گوئی ۔ آلم نے تاریخ گوئی جیسے مشکل فن پر غضب مہارت حاصل کی ہے زبر آسان ہے زبر و بینات اس سے مشکل اور بینات مشکل ترین ہے ۔ آلم کو اتنا عبور حاصل ہے کہ بینات میں بھی کئی تاریخیں کہی ہیں بعض بہت دلچسپ طغرے پر مربع دار خانے بنا کر یا دائرے بنا کر جو انہیں کی ابجاد سے تاریخیں نکالی ہیں ۔ اعلیٰحضرت غفران مکاں کی سالگرہ مبارک کی کئی تاریخیں لکھی ہیں ۔ مادے کے مصرعے میں تقریب کا ذکر اکثر ہوا کرتا ہے اور یہی تاریخ کی خوبی ہے ؎

اس سالگرہ میں ہوئے جیسے جلسے — تا حشر اسی طرح رہیں گے ہوتے
بالفعل یہ تاریخ آلم نے کی عرض — سلطان زماں کو سال ۳۵ تینتیس ہوئے
۱۳۱۶ھ

استاد داغ مرحوم کے انتقال کی کئی تاریخیں کہی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے ؎

اے ستمگر اے جفا جو اے بد اختر افلاک　　ہیں ستم تیرے نرالے جو ہیں تیرے عجب

ہائے استاد جہاں سہہ کے تیرے ظلم و جور　　ہو گئے دار محن سے دور جنت سے قریب

روتے روتے مصرع تاریخ آلم نے یہ کہا　　بلبل ہندوستاں جا دو بیاں جنت نصیب
۱۳۲۲ھ

آلم کے ہاں قلعہ میں تین مرتبہ چوری ہوئی ۔ دوسری چوری جس سال ہوئی ان پر بڑی بڑی مصیبتیں پڑی ہیں چنانچہ اس بپتا کے مصائب کو پچاس بیت کی ایک مثنوی میں گنوایا ہے ۔ پہلے فلک کی تباہ کاریوں کا رونا رویا ہے پھر اسکے بعد نقصان کی فہرست بتلائی ہے ۔ اور تاریخ کا مصرعہ یہ ہے ؎

شکر ہے لٹ گیا دوبارہ مکان
۱۳۳۰ھ

محرم سنہ ۱۳۳۹ھ میں چھ مہینے کی رخصت لیکر زیارت عتبات عالیات کے ارادے سے بلد آئے ۔ اربعین کے بعد جب قلعہ جا کر دیکھا تو گھر میں کچھ باقی نہ رہا تھا ۔ ابتدائی اشعار میں کیفیت سرقہ بیان کی ہے تاریخ کی بیت یہ ہے ؎

سال اس خانہ خرابی کا آلم نے یہ کہا　　آہ ! کنگال کر دیا ہے تیسری چوری نے اب
۱۳۳۹ھ

اس سرقہ سے پریشان ہو کر وظیفہ کی درخواست دیدی اور خدمت سے سبکدوش ہو گئے ۔
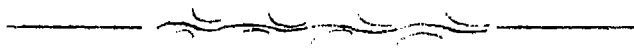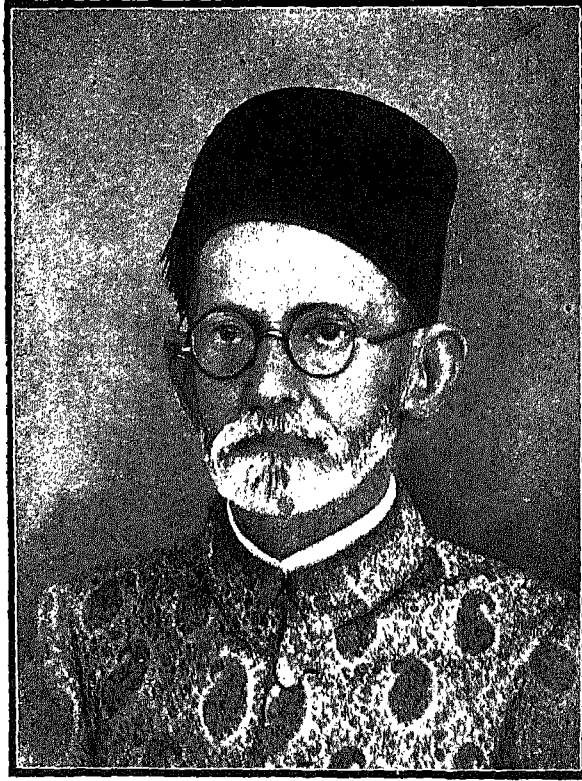
محمد قادر حسین قادر مرحوم

قادر

قادر حسین مرحوم

سنہ ۱۲۸۶ھ تا ۱۳۵۱ھ

از عبد القادر صاحب دبیر

قادر ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ میں ہگن پلی میں پیدا ہوئے "پسر فرخ قدم" سے تاریخ پیدائش نکلتی ہے۔ دس سال کی عمر میں اپنے والد محمد غوث صدیقی کے ہمراہ حیدرآباد آئے اور یہیں کے ہو رہے قیام مغل پورہ میں تھا فارسی اور طب کی تعلیم حاصل کی اگرچہ والدین کی غربت کے باعث تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا لیکن زبان اردو کا فطری ذوق تھا۔

نو عمری سے شعر و شاعری کا شوق تھا طبیعت بھی موزوں پائی تھی۔ ہر بات میں شعریت پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ابتداً انہیں اصلاح کلام کے لئے مولوی محمد احمد سپہری سہارنپوری پھر مولوی نیاز احمد خاں ہوش بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن انکی شاعری کا مستقل دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ جہاں استاد داغ دہلوی کو حضرت غفران مکاں کی فیاضی اور علم دوستی نے حیدرآباد کا بنا لیا۔ یہ ان کی خدمت میں پہونچے اور شوق شاگردی کا اظہار کیا لیکن حضرت داغ نے انہیں بوجہ کم عمری کچھ دن باز رہنے کی تاکید کی۔

قادر دو سال تک داغ کی خدمت میں رہے اور دو سال بعد شاعری کی اجازت ملی ایک مرتبہ غزل کی اصلاح ہو رہی تھی قادر نے یہ شعر سنایا؂

بات بھی نازک ہے انکی کس قدر!! جیسا ان کا منہ ہے ویسی بات ہے

استاد داغ اس وقت لیٹے ہوئے تھے بے ساختہ اٹھ بیٹھے بے حد تعریف کی اور کہا میاں قادر تم ہونہار نظر آتے اس زمین میں سیکڑوں غزلیں ہوئی ہیں مگر تم نے کیا خوب شعر سب سے الگ کہا ہے!

استاد داغ کی وفات کے بعد قادر نے استاد ظہیر دہلوی سے بھی استفادہ کیا ہے ظہیر دہلوی استاد داغ کے خواجہ تاش تھے اسلئے بھی استاد ظہیر کی قادر پر خاص عنایت رہی اور اکثر استاد ظہیر کے ہمراہ خاص خاص مشاعروں میں شریک ہوتے رہے طرحی غزلیں پڑھیں اور شہرت حاصل کی۔

قادر یار باش اور رند مشرب انسان تھے، ہمدردی اور ایثار انکی فطرت ثانیہ تھی فراش خانہ سرِ خاص مبارک کی داروغہ گیری پر مامور تھے سنہ ۱۲۹۸ھ سے انکی ملازمت کا زمانہ شروع ہوتا ہے پہلے تحویلدار کی خدمت انجام دیتے تھے بعد میں ترقی پاکر داروغہ ہوگئے مگر پابندی سے فرائض ملازمت بجالانے سے ہمیشہ بے نیاز رہے قناعت کے ساتھ بالکل سادہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن اس غربت اور بے مایگی کے باوجود اپنی اعلیٰ شاعری اور بہترین اخلاق کے سبب بڑے بڑے امراء اور احباب کمال کے پاس رسائی رکھتے تھے۔ قادر کی زندگی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اپنے آپ کو خوش رکھتے تھے اپنی اس فطرت کو انھوں نے ایک رباعی میں بیان کیا ہے :۔

اک قوم تمنائے زر و مال میں خوش ہے
اک قوم تماشائے خط و خال میں خوش ہے
رکھتے ہیں اگر دونوں یہ اسباب خرابی
خوش حال وہ ہے جو کہ ہر اک حال میں خوش ہے

وہ حلقۂ احباب میں بہت ہر دلعزیز تھے آدمی بہت بے لاگ تھے جو کچھ کہنا ہوتا منہ پر کہہ دیتے تھے۔ بڑے حاضر دماغ تھے کسی دوست نے کچھ فرمائش کی اور فوراً اس کی تعمیل ہوگئی نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز سے انکے گہرے تعلقات تھے ایک مرتبہ نواب عزیز یار جنگ کے دولت سرا پر گئے تو دیکھا کہ وہ خلاف معمول تہ بند باندھے بیٹھے ہیں قادر کو بہت پسند آیا اسی وقت ایک نظم لکھی جس کے اشعار یہ ہیں :۔

چشم بد دور مبارک ہو یہ جلوہ پیکر
نور کے سانچے میں ڈھالا ہے مگر یہ پیکر
تا ذرہ زمیں سے ہے اک شعاع خورشید
بلکہ خورشید سے بڑھ کر ہے اسکا جوہر
اور جس چیز کو کرتا ہے رخ پاک پسند
اسکی ہر چیز سے لیتے ہیں مگر شمس و قمر
ہر چیز کی بات تو آتی نہیں کوئی مجھکو
صاف کہہ دیتا ہوں تو آئی اک کے نذر

رخ انور پہ یہ دنیا ہے جوانی کی بہار
دیکھ کر جس کو تصدق ہی ہر اک رشک قمر
جب نظر آتا ہے دلوں کو بیتابیِ شباب
رگ جان رشتۂ دل تار نظر سے ملکر
کیوں نہ رکھیں تجھے بار جہاں آنکھوں پر
بیچ میں اس کی کیوں آئے ہر اک بیچ کر
زیب تن جو ہو لباس اس کے وہ جھکتا ہو
جانے نہیں آتی مدح یہ ہی ختم مگر

"باتیں وروبش صفت دار کلاہ تیری | خامہ بھی شل ہے مرا آقا یہ مگر
دور جتنک مہ خورشید کا عالم میں ہے | تو اگلن یونہی تنملہ رہے اس کے سر پہ
میرا ممدوح ہی دلہا تھا کلاؤن کا عزیز | اوس کی قادر پہ عنایت کی رہی یونہی نظر"

ایک محفل میں قادر کے ایک دوست نے ذیل کے فارسی قطعہ کو اردو میں ترجمہ کر دینے کی فرمائش کی ہے

نہ باید ہشت چیز از ہشت کس خواست | کہ تا آں را ز مشکل آید وقت دادن
ز رعنا گل، ز دانشمند کاغذ | ز کاتب کلک، ز جیاط سوزن
سلح از غازی و ناں از گرسنہ | وفا از روستائی، زر ز دشمن

قادر نے اسی وقت فرمائش پوری کی ہے

آٹھ چیزیں آٹھ شخصوں سے طلب نہ کر | یہ نصیحت یاد رکھ قادر کی تو صبح و مسا
گل بت رعنا سے کاتب سے قلم درزی سے سوئی | روٹی بھوکے شخص سے غازی سے تیغ خوشنما
خوش خطوں سے کاغذ خوش رنگ زر دشمن سے پا | اور دیہاتی سے وفا اور نیکی دشمنوں سے بے وفاؤں سے وفا

یوں تو قادر کو اس وقت کے ہر چھوٹے بڑے شاعر سے جو دکن میں رہتا تھا تعارف تھا مگر صفی اورنگ آبادی سے انکی گہری دوستی تھی سالہا سال تک دونوں میں برادرانہ تعلقات رہے مگر نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ وفات سے چند ماہ قبل دونوں میں کچھ نہ کچھ رنجش پیدا ہو گئی تھی ۔

قادر نے ۶۵ سال کی عمر میں ۱۸ جمادی الاول ۱۳۵۱ھ میں وفات پائی انکے فرزند اکبر محمد غوث صدیقی نے "قادر حسین قادر جنت نصیب بادا" سے تاریخ وفات نکالی ہے ۔ انکے باقیات الصالحات میں ایک غیر مطبوعہ دیوان ہے جس میں غزلوں کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار پانچ سو سے زیادہ ہے نظمیں اور رباعیاں اس کے علاوہ ہیں ۔ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے چند غزلیں فارسی کی بھی ان کے غیر مطبوعہ دیوان میں شریک ہیں ۔

قادر کے اردو کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں استاد داغ کا تتبع کیا ہے انکا کلام استاد کے رنگ میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ قادر کو اگر دو چند روز حضرت داغ کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملتا تو نہ معلوم انکی شاعری کہاں سے کہاں پہنچ جاتی اس قلیل عرصہ میں بھی انھوں نے شاعری میں جو کمال حاصل کیا ہے وہ کچھ کم تعجب خیز نہیں ۔

قادر تھے تو دکنی نژاد مگر انکے کلام میں دہلی کے روزمرہ کا رنگ نظر آتا ہے یہی وجہ تھی کہ جب انھیں دہلی جانے کا اور وہاں ایک مشاعرہ میں جس میں شمالی ہند کے استادان سخن موجود تھے غزل پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اہل محفل نے بہت تعریف کی اور کہا ان کے کلام میں دہلی کا انداز بیان ہے ۔ اور زبان انھوں نے اتنی سلیس اور سادہ استعمال کی ہے کہ سارے دیوان میں مشکل سے

چند اشعار ایسے ہوں گے جن کا سمجھنا مشکل ہو حقیقت یہ ہے کہ سلاست زبان اور محاورہ بندی کلام کا جوہر ہے اور یہی دو چیزیں انکے کلام میں نمایاں ہیں۔ شوخی کے ساتھ ساتھ کلام میں سوز و گداز کی بھی کمی نہیں۔ انکی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چھوٹی بحروں میں بڑے بڑے مضامین ادا کرتے تھے اور اس فن میں استاد مانے جاتے تھے جیسے اشعار ذیل :۔

بے گنہ بھی ہے خدایا گنہگار بھی ہے ۔ یعنی قادر ترا مجبور بھی مختار بھی ہے

دل میں روشن جو داغ ہے اپنا ۔ وہ لحد میں چراغ ہے اپنا

کل پسِ مرگ دیکھئے کیا ہو ۔ آج کیا کچھ دماغ ہے اپنا

آئی پیری گئے شباب کے دن ۔ ٹمٹماتا چراغ ہے اپنا

تو جب اپنا ہے ساقیٔ مہوش ۔ خم ہے اپنا ایاغ ہے اپنا

مست ہیں میکدہ میں ساقی ۔ ایک خالی ایاغ ہے اپنا

گل خدا جانے گل ہوا کہ بجھے ۔ آج روشن چراغ ہے اپنا

آگ لگ جائیگی یوں آہ شرربار نہ کھینچ ۔ وقت بیتابی نالے دل بیمار نہ کھینچ

تجھکو رونا ہے تو دل کھولکے رو لے کیا ۔ یوں تو رہ رہ کے تو آہیں دل بیمار نہ کھینچ

ترا قادر ترا مقتول ادا ہے قاتل ۔ اس پہ ہر بار خدا کے لئے تلوار نہ کھینچ

قادر کا تمام کلام حسن و عشق کے جذبات سے پر ہے لیکن عشق حقیقی نہیں بلکہ ہر شعر عشق مجازی کا آئینہ دار اور تغزل کی جان ہے ! ان کا دیوان غیر مطبوعہ ہے اور اس میں ساڑھے پانچ ہزار شعر موجود ہیں ۔

اعلیحضرت آصف سادس غفران مکان کی غزل پر جستہ ؎

ہیں تو پیدا ہی ہوا رنج اٹھانے کیلئے ۔ جور کیا کچھ نہیں کرتے وہ ستانے کیلئے

دل دکھانے کیلئے اور رلانے کیلئے ۔ غیر پر ہیں وہ فدا میرے جلانے کیلئے

دل میں اچھے برے انساں کو نہیں جانتے کیا

پہلے آراستہ اپنے کو بہت خوب کیا ۔ جب یہ دیکھا کہ بنا غیرت گلشن چہرہ

پھر تو انداز سے ہنس ہنس کے بصد ناز و ادا ۔ دیکھکر آئینہ میں اپنا دہن اس نے کہا

خضر اس چشمۂ حیواں کو نہیں جانتے کیا

جس کو ہم چاہتے ہیں دل سے دکھاتے ہیں ۔ سو بگڑ دیتے ہیں بس جان و دیتے ہیں

کچھ تو ہے بات جو دل مفت سے دیتے ہیں ۔ تم سے ہم حضرت ناصح یہ کہے دیتے ہیں

ورنہ ہم نفع کو نقصاں کو نہیں جانتے کیا

نمونۂ کلام

تم نزع میں جو آگئے نقشہ بدل گیا ۔ میں جاتے جاتے ہاتھ سے اپنی سنبھل گیا

لاؤں کہاں سے میں کہ وہ اسیری کا ہی ۔ آئے میرے اب آنکھ کا جب تیل جل گیا

ناصح کی چھیڑ چھاڑ سے بس تھمو یاد رکھو ۔ اتنا ہوا کہ باتوں میں کچھ جی بہل گیا

دم تھا کہ نالہ تھا کہ فغاں تھی کہ آہ تھی ۔ ہنگامہ نے جو دی کوئی سینے سے نکل گیا

تا حشر مجھ کو بھی کا ڈر لگا تار ہے　　اب کے اگر مرا دل مضطر سنبھل گیا　　کیا یاد آ گیا کہ مری قبر پر وہ آج　　کچھ منہ ہی منہ میں کہہ گیا اور ہاتھ مل گیا

لے لیگا آسماں کی خبر نالہ رسا　　دو چار ہاتھ اور جو آگے نکل گیا　　قادر کہاں گیا ہے سو اس کی خبر نہیں　　اتنا سنا ہے شہر سے باہر نکل گیا

کسی نے فتنہ گر سمجھا کسی نے سحر فن جانا　　مگر ہم نے نگاہ ناز کو ناوک فگن جانا!!

بکھر جانا بگڑنا روٹھنا بے وجہ تن جانا　　اسی کو آپ نے جان جہاں کیا بانکپن جانا

بلایا ہے نہیں مقتل میں قادر آج قاتل نے　　اگر جانا تو سر پر باندھ کر اپنے کفن جانا

مرے سر سے کسی کی زلف کا سودا نہیں جاتا　　نہیں جاتا، نہیں جاتا، نہیں جاتا نہیں جاتا

وہ جب ہوتے نہیں نزدیک تو سب کچھ میں کہتا ہوں　　وہ جب نزدیک ہوتے ہیں تو کچھ بولا نہیں جاتا

بجھا دینا ہماری پیاس بھی ساقی بجھا دینا　　سنا ہے بزم سے تیری کوئی پیاسا نہیں جاتا

کبھی تو رحم کر مجھ پر کبھی او پتھر کے دل والے　　مرا وہ حال ہے دشمن سے بھی دیکھا نہیں جاتا

شک آتا ہے مجھے الجھی ہوئی قامت کی باتوں　　خدا جانے وہ جاتا ہے وہاں تک یا نہیں جاتا

محبت میں نہ آئیگی قضا کیا　　نہیں اس ابتدا کی انتہا کیا!　　عنایت پر تمہاری ہے یہ موقوف　　مرا دل کیا مری جنس وفا کیا

میں اب وہ یاد کر کے کچھ خجل ہوں　　کہا تھا اپنے خود ہی میں حال کیا کیا　　دھر اک تھا نشیمن میں ہمارے　　اڑا کر لے چلی باد صبا کیا

یہ چاروں دل کے قاتل ہیں مقرر　　حیا کیا، شرم کیا، ناز و ادا کیا　　کھٹک گیا تیر نظر اک آن میں　　دل میں سینے میں جگر میں جان میں

ان کا جھنجھلا کر وہ کہنا وصل میں　　آدمیت چاہیئے انسان میں　　آج سنتا ہوں وہ آئینگے ضرور!　　آگئی پھر سے جان میری جان میں

نامہ بر موقع سے کرنا بات چیت　　واں بدلتی ہے طبیعت آن میں　　دشمنوں میں سر خرو رکھنا مجھے　　زہر ہی دینا ملا کر جام میں

حیرت فزا جو آنکھ ہیں وہ رشک حور ہو!　　جس ذرہ پر نگاہ پڑے کوہ طور ہو!!

جب تک نہ تیرے بندوں سے سرزد قصور ہو　　کیونکر ترے کرم کا الٰہی ظہور ہو!!!

ہوں آپ عرض وصل پہ برہم نہ اس قدر　　ہیں ہاتھ جوڑتا ہوں کہ عفو قصور ہو!!

تم ہم سے کیا چھپاتے ہو قادر حسین آج　　آزردہ دل فسردہ طبیعت ضرور ہو!!

زلف یا ہم اگر حور شمائل آئے ماہ آئے نہ ترے پھر مقابل آئے کہہ کے یہ کر دئے آئینہ کے اس نے ٹکڑے کس لئے بن کے کوئی مد مقابل آئے

یہ دغاباز فسوں ساز بلا ہوتے ہیں ان حسینوں پہ کسی کا نہ کبھی دل آئے یوں نبانے لگے واعظ کو سبو کش ہر دم دیکھنا دیکھنا وہ رونق محفل آئے

حریص بادہ جب کوئی سوئے میخانہ آتا ہے
تو پر لگ جاتے ہیں اڑتا ہوا پیمانہ آتا ہے

مرے رونے نے مالا مال کر رکھا ہے دامن کو
کہ ہر ہر اشک بن بن کر دُرِ یکدانہ آتا ہے

یہ کیسے لڑکھڑاتے ہیں قدم ساقی کی محفل میں
تجھے کچھ بھی ادب اے لغزش مستانہ آتا ہے

لکھا ہے خط میں اس نے لے لے رب ہی نامہ بر تیرا
یہ جب آتا ہے میرے پاس بیباکانہ آتا ہے

رلاتا ہے مجھے ہر عید میں شوق ہم آغوشی
یہی غم ہے جو حصہ میں مرے سالانہ آتا ہے

وہ دل میں لے پردہ پھر دیدۂ مشتاق میں آئے
کہ جیسے اپنے گھر میں کوئی صاحب خانہ آتا ہے

کہاں کا صبر کرنا صبر کو بدنام کرنا ہے!
ہمیں یہ کام آتا تھا نہ آئیگا نہ آتا ہے

علاوہ اسے بد زباں کو چاہیئے روکے زباں اپنی
یہ منہ کی کھائیگا منہ تم سے گستاخانہ آتا ہے

وہ تھا مجنوں کہ جس نے جان دی صحرا الفت میں
مجھے رہ رہ کے پاس ہمت مردانہ آتا ہے

جو کچھ رونق تھی انکی بزم کی تھا درکے دم سے تھی
کہاں اب شمع جلتی ہے کہاں پروانہ آتا ہے
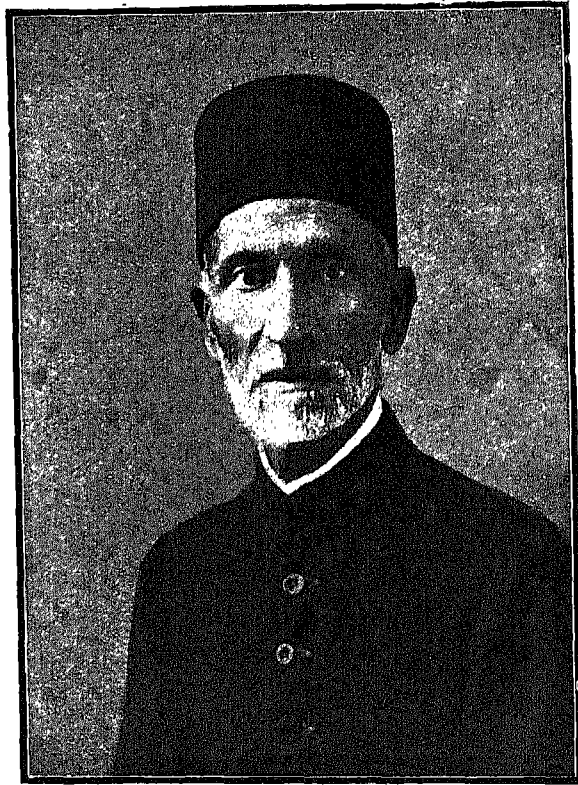
مولوی سید عبدالصمد صاحب واصفی

واصفیؔ

مولوی سید عبدالصمد صاحب

ولادت ۱۲۸۸ھ

از محمد عمر صاحب مہاجر

سید عبدالصمد واصفیؔ ۱۲۸۸ھ میں شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے ان کے والد ماجد مولوی سید عبدالمنان اور جد امجد مولوی سید فاضل قادری السنۂ شرقیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے مولوی محمد مہدی واصف ابن عارف الدین خاں رونقؔ واصفیؔ کے ماما تھے۔ اسطرح گویا واصفیؔ کو شعر و ادب کا ذوق اپنے اجداد سے ترکہ میں ملا۔ اور وہ ابتدائے سن شعور سے شعر کہنے لگے۔

واصفیؔ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی وہ کسی جوہر قابل کو راہ پر لگانے کے لئے بے حد موزوں تھا دلی اور لکھنو کی شعر و سخن کی محفلیں اجڑ چکی تھیں اور حیدرآباد کو پھر مرکزیت حاصل ہونے لگی تھیں اعلحضرت غفران مکاں کے زمانے میں جب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی حیدرآباد آئے واصفیؔ بھی انکے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے اور بہت جلد انھوں نے طبیعت کی فطری مناسبت اور داغ مرحوم کی خاص توجہ کی بنا پر اپنے ہمعصر شاعروں میں امتیاز حاصل کرلیا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں ؎

کیونکر مرا سخن نہ ہو مقبول واصفیؔ
پایا ہے میں نے بلبل ہندوستاں سے فیض

اپنی شاعری کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں "میرے استاد مرحوم کے انتقال کے بعد میں نے یہ مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اب شعر نہ کہونگا مگر ایک رات استاد مرحوم کو خواب میں دیکھا فرماتے ہیں۔ "کہو" اور ایک طرح بھی بتائی جس کا مصرعہ یہ تھا ؎

تمھارا جور و ستم کچھ مزا نہیں دیتا

اس خواب کے دیکھنے کے بعد پھر میری ہمت بڑھی اور شعر کہنے لگا اور اتبک بھی کہہ رہا ہوں بہرحال یہ سب استاد مرحوم ہی کا فیض ہے جو میں کچھ کہہ لیا کرتا ہوں۔ ورنہ میں کہاں اور شعر گوئی کہاں ؎

عالم میں واصفی کو کوئی جانتا نہ تھا   فیضِ جنابِ داغ سے مشہور ہو گیا

واصفی داغ کے فیضِ صحبت سے تقریباً بارہ سال مستفید ہوتے رہے اور ان کی پختہ اور فنکارانہ اصلاحوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ داغ کی اصلاحوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اشعار میں بہت کم تبدیلی کرتے اور شاعر کی فطری صلاحیتوں کے اجاگر ہونے کا موقع دیتے۔ ایک بار واصفی نے ایک شعر کہا تھا ؎

کیا نہ غیر سے اے بے وفا کبھی حیلہ!   ہمارے پاس ہی آنے تجھے بہانہ ہوا!

داغ نے اس شعر کو سن کر کہا کہ اس میں اصلاح ہوگی اور ایک نقطہ کی یعنی "آنے" کو "آنے" کر دو۔

اس خاص توجہ سے واصفی کا شمار بہت جلد حیدرآباد کے ممتاز شاعروں میں ہونے لگا۔ احسن مارہروی نے جو داغ کی سوانح خود ان کی زندگی میں لکھتے تھے انہیں واصفی کا خاص طور پر دکن کے شاگردوں میں ذکر کیا ہے۔ حیدرآباد کے شاعروں میں واصفی کی خاصی آؤ بھگت ہوا کرتی ابراہیم خاں کے مکان پر جو حضرت غفران مکاں کے طرحی مصرعہ پر مشاعرہ ہوا کرتا تھا اس میں واصفی شریک ہوا کرتے تھے یمین السلطنت مہاراجہ بہادر کے ایوان میں جو خاص مشاعرہ ہوا کرتا تھا اس میں بھی خاص طور پر واصفی مدعو ہوا کرتے تھے۔ محبوب الکلام، معیار، ادیب، زبانِ دہلی اور اکثر گلدستوں اور اخباروں میں ان کی غزلیں بار بار شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کرتی رہی ہیں۔ حیدرآباد کے مشہور و مقبول شاعر عظمت اللہ خاں مرحوم کو بھی واصفی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

واصفی کی شاعری میں قدیم دبستانِ سخن کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں۔ اندازِ بیان اور لطافتِ زبان کے اعتبار سے ان کا کلام ہماری قدیم شاعری کی ساری خصوصیات کا بہترین مظہر ہے۔ داغ کی طرح ان کا کلام تصنع سے بالکل معرا ہے۔ زبان نہایت سادہ ہوتی ہے لیکن اندازِ بیان میں ایک شوخی سی ہوتی ہے جو قدیم طرزِ سخن کی جان ہے۔ مثالاً چند شعر درج کئے جاتے ہیں

واصفی تو جو خوش نہیں ہوتا!!!   تجھ کو کیا ایسے پیر یا رہیں رنج!!

قصور وارِ محبت ہیں سامنے انکے   کھڑے ہیں سر کو جھکائے گناہگار سے ہم

بر سرِ پرخاش ہم سے غیر ہوتا ہی مدام   دیکھ لینا ایک دن یا وہ نہیں یا ہم نہیں

واصفی کا کلام اکثر و بیشتر سہل ممتنع ہے سہلِ ممتنع کلام کی خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق بالراست لطیف جذبات سے ہوتا ہے

الفاظ نہایت سادہ اور آسان ہوتے ہیں مطلب بھی بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن تاثیر اور سوز و گداز کے اعتبار سے اس قسم کے اشعار خود بخود دل میں اترتے جاتے ہیں۔ میر تقی میر کی شاعری کا خاص وصف یہی تھا کہ ان کے پاس سودا کی بلند آہنگی بالکل مفقود تھی لیکن انکی فطری سادگی کو کچھ ایسا قبولِ عام نصیب ہوا کہ سودا کی تمام صناعی اس کے سامنے بیکار ہوگئی۔ مصحفی کے پاس بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے۔ کیف اور سوز و گداز کے اعتبار سے ذیل کے اشعار انکی شاعری کی بہت اچھی نمایندگی کرتے ہیں،

مصحفی اس سے نہ رکھ کوئی دوا کی امید — بہت بیگانہ منش کا ہے یہ اپنا گویا
بے ساختہ آنکھوں سے نکل پڑتے ہیں آنسو — کیوں آج بھر آتا ہے جو کہہ نہیں سکتا

نکالوں کیونکر خیال انکا بھلاؤں کس طرح انکو آج — جو بیٹھے آنکھوں میں بس رہے ہیں جو میرے دل میں سما رہے ہیں

سب گریہ نہاں میں تھے کیا اے ہمدم — جی بھر آتا ہے تو ہم اشک بہا لیتے ہیں
پوچھو جو مری عالم امکان میں حقیقت — بس اتنی ہی ہستی کہ بگڑنے کو بنا ہوں

بخیہ گر کو بھی مری وحشت سے وحشت ہوگئی — چاک دامن کر لیا میں گر گریباں دیکھ کر!!

بڑھ کے راحت سے سمجھتا ہوں میں اس تکلیف کو — کوئی میرے جی سے پوچھے لذت آزار دوست

یاد نے تیری اے بت کافر! — میرے دل سے ہر اک بھلائی بات
ذکر چھیڑا پھر اس کا ناصح نے — بات پر یاد مجھکو آئی بات!

یاس پر بھی تری محبت میں — دل ہے امیدوار کیا باعث

مصحفی نے مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں نہایت کامیابی کیساتھ طبع آزمائی کی ہے اور اس میں اپنی شاعری کے فطری رنگ کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے، ایک ذو قافتین غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

ہیں مرے دل کو الم ایک سے دو، دو سے چار — رنج و قلق و درد و غم ایک سے دو، دو سے چار
کوچۂ دلدار میں ہم نے رقیبوں کے بھی — دیکھے نشانِ قدم ایک سے دو، دو سے چار
تم جو خفا ہیں خفا جان خفا دل خفا — ہوگئے پابندِ غم ایک سے دو، دو سے چار

ہرچند انھوں نے مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے جن میں اردو زبان کے اکثر شاعروں کے قدم اکھڑ جاتے ہیں لیکن ان میں بھی مصحفی کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے:۔

صبر و شکیب کرے تو نہیں حسن جان پسند — دل کو پسند درد ہے لب کو فغاں پسند — نہ کرے کیوں وہ رشک ہو جو گھمنڈ — حسن پر بے جا ہے ضرور گھمنڈ

دامِ الفت بن گیا اپنا قفس　　مر کے بھی ہم سے نہ یہ چھوٹا قفس
خاطرِ صیاد تھی ورنہ ابھی　　میں سوئے گلزار لے اڑتا قفس

رہِ عشق میں واصفی تم نہ جاؤ!　　قیامت کا چکر ہے آفت کی گردش

اُردو زبان کے شاعروں کے متعلق یہ شبہ رہے کہ اُنکے کردار، حالات اور کلام میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہوتی لیکن چند دنوں سے واصفی کی زندگی خود سراپا ایک الم انگیز شعر بن گئی ہے۔ اس ضعیف العمری میں ان کو اپنے ایک جوان بیٹے کی موت کا داغ اٹھانا پڑا۔ اس سانحے کے بعد ان کے کلام میں درد و غم کے تاثرات کی جھلکیاں بہت نمایاں نظر آنے لگی ہیں۔ جناب واصفی جس وقت اپنے فرزند کو رعشہ دار ہاتھوں سے سپردِ خاک کر رہے تھے، انھوں نے نہایت صابرانہ انداز میں ایک رباعی پڑھی ؎

ہر چند جہاں کی خاک ہم نے چھانی!　　جانی تو آخر یہ حقیقت جانی!!
اللہ اللہ ہے، بندہ بندہ　　باقی باقی ہے، فانی فانی

واصفی نے غزلوں کے علاوہ مسلسل نظمیں بھی کہی ہیں۔ ایک قصیدے سے کچھ چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جو داغ مرحوم کی فرمائش کے مطابق حضرت غفران مکاں کی سالگرہ کی تقریب میں لکھا گیا تھا ؎

گردوں پہ نمودار ہوا ابرِ بہاراں　　عالم میں نظر آتا ہے ہر سمت گلستاں
غنچے سے جو چٹکے تو گل گل سے ہے ہمدوش　　گلشن سے ہے گلشن تو خیاباں سے خیاباں
اک سبزۂ روئیدہ کا ہے چار طرف فرش　　ہر رنگ چمن سے ہے جبل و دشت و بیاباں
مستی کا وہ عالم کہ شجر جھوم رہے ہیں　　رندی کا وہ عالم ہے کہ سب نشے میں غلطاں
آنکھ اس کی جھپکتی ہے کسی غیرتِ گل پر　　حیرت سے ملاتی ہے نگہ نرگسِ حیراں
عشوہ وہ کہ غمزہ وہ، یہ دونوں ہیں قیامت　　اک دل کا طلبگار ہے اک جان کا خواہاں
گر دیکھ لے ان کے رخِ پرنور کا جلوہ　　پروانہ فدا ہو نہ سرِ شمعِ شبستاں
لٹتا ہے کوئی تو کوئی دل ہے سرشار　　کیا عیش کے اسباب ہیں کیا جشن کے ساماں

ہر ایک طرف دیکھ کے آثار خوشی کے — جب مجھ کو ہوئی سوچ تو دل نے کہا مارا

محبوب علی خاں کی جو ہے سالگرہ آج — یہ عیش طرب کا ہے اسی واسطے ساماں

وہ شاہ جو ہر ایک کا ہے شاہد مقصود — وہ شاہ کہ دل جس پہ رعایا کے ہیں قرباں

وہ شاہ کہ آتی ہے نظر جس سے حقیقت — وہ شاہ کہ دل جس کا ہے آئینۂ عرفاں

وہ شاہ جو ہے فخر سلاطین زمانہ — وہ شاہ جو ہے غیرت فغفور و سلیماں

(مطلع ثانی) زہی حوصلہ زہی دبدبہ زہی مرتبہ زہی شاں — ہے غیرت خاقان ترے محبوب علیخاں

آپ کی مسلسل نظموں میں ایک نظم موسومہ "مثنوی حسن" قابل ذکر ہے اس کے بھی چند شعر درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

اے حسن ترا ہوا اُجالا — پردے سے جو تو نے منہ نکالا

ہر ایک نے فروغ اس سے پایا — عالم میں جو تیرا نور چمکا

گردوں پہ شفق تجھی سے پھولی — تیری ہی ضیا ہے صبح میں بھی

ذرّوں میں ہے آفتاب تجھ سے — ہے جلوۂ آفتاب تجھ سے

کس شیشے میں نہیں ظہور تیرا — ہے شمس و قمر میں نور تیرا

پرتو ہے ترا ہی کہکشاں پر — تو ماہ میں ہے آسماں پر

تیرے ہی تو جلوے ہیں یہ سارے — روشن ہوئے تجھ سے سب ستارے

تو ہی ہے چراغ انجمن میں — تو بن کے رہا ہے گل چمن میں

تھی طور پہ بھی تری تجلّی — جس سے موسیٰ کی آنکھ جھپکی

اب ہم واصفی کے کلام سے ایک سرسری انتخاب پیش کرتے ہیں جس سے ان کے رنگ سخن کا ایک عام خاکہ ذہن میں آسکتا ہے۔

میں اپنے دل سے کرتا رہا باتیں تا سحر — شام فراق جب نہ کوئی ہم سخن ہوا

تری برق حسن بلا ہوئی مجھے تاب دید کہاں رہی — کوئی شعلہ تھا کہ وہ آگ تھی ترے دل کو جس نے جلا دیا

یکساں ہے آدمی کے لئے ہستی و عدم — اتنی سی بات ہے ادھر آیا ادھر گیا

نہ دل دکھاؤ غریبوں کا دردمندوں کا — بتو! خیال کرو کچھ خدا کے بندوں کا

کوئی ان کے حسن پہ مٹ گیا کوئی ان کے ناز پہ مر گیا — یہ کرشمے عشق کے ہیں عجب کہ ہر ایک جی سے گزر گیا

جگر میں داغ ہیں سینہ میں داغ دل میں داغ

اس کے وعدہ کا اعتبار رہا — تا دمِ مرگ انتظار رہا

یا ہو گی خوشی حاصل یا رنج سوا ہو گا — میں اس پہ رہوں گا خوش جو مجھ کو عدو دے گا

احسان کیوں میں دیدۂ تر کا نہ مانتا — میرے نصیب میں یہی اک اشک تھا

ہے خوشی میں بھی میرے غم شامل — جب ہنسا ہوں تو اشکبار ہوا

دل لگا کر عذاب دیکھ لیا — رنج و غم بے حساب دیکھ لیا

کچھ عجب عالم تصویر ہے میخانہ پر — آنکھ ساقی کی طرف ہاتھ ہے پیمانہ پر

ساقیا ہو کشش بادہ فراوانی پہ — ہم گنہگاروں کی ہے زیست اسی پانی پہ

بہارِ عشق نے بھی گل کھلائے ہیں کیا کیا

دلِ مضطر کو دی بہت تسکیں — پھر بھی کمبخت بے قرار رہا

مجھ سا نہ پائمال کوئی زینہار تھا — میں نقش پا تھا تو خاکِ سر رہگذار تھا

دیکھنا اس کی نگاہِ مست کو — میرے دل کو جام صہبا کر دیا

آئینہ بے حجاب دیکھ لیا — تو نے اپنا جواب دیکھ لیا

تعالیٰ ہیں اس طرح سے فنا ہو کر — مٹے بھی ہم تو رہے خاک نقش پا ہو کر

کون پیاسا گیا روتا ہوا میخانے سے — اوس ہی پڑ گئی ساقی ترے میخانہ پر

اگر کرے کوئی انصاف دونوں ہیں مجبور — نگاہ شوخ سے ہم قلب بے قرار سے ہم

وہ کر گئے تیغ ادا سے بسمل جو میرے دل کو ستا رہے ہیں

فقط یہ میری ہی کم نصیبی جو زہر تشنہ کام ہوں میں

نمود و بود اپنی کیا کہیں ہم عبث عدو کو ہی رشک اسکا

نہ مُردوں میں ہی شمار اپنا نہ زندوں میں ہے حساب اپنا

مل جائے تو باقی نہ رہے فرق جز و کل

تپش کے بھی لطف اٹھا رہا ہوں مزے تڑپنے کے آرہے ہیں

دگر نہ پھر پھر کے جام مے سے ہر ایک کو وہ پلا رہے ہیں

کسی کے کوچہ میں ہم زمیں پر تو صورت نقشِ پا رہے ہیں

کسی کی فرقت میں رو رو آنکھیں ہم رہے جو زندہ تو کیا جیے ہیں

قطرہ ہوں جبھی تک کہ میں دریا سے جدا ہوں!

نہیں پرواہ جو آتا صبحِ محبت میں اٹھا — ہزاروں کام دنیا میں بگڑ کر ہی سنبھلتے ہیں

کیا راز عشق کے گھر کا بتا پوچھتے ہیں آپ — رہتے ہیں ایک مقام پہ جس کا نشاں نہیں

اے شوق جبہہ سائی دکھا تو ذرا ہمیں — سجدے کرے ہزاروں ہمت جان بندگی میں

بات کرنے کی مجھ کو تاب نہیں! — خامشی کا مری جواب نہیں

واقعی لوگ تو خوشی کے ہیں ہزار دوستا — کیا کروں اس دل ناشاد کو یہ شاد نہیں

اظہار مدعا کچھ ہم کر سکے نہ آہ سے — افسوس رہ گئے سب ارمان جی کے جی میں

ہنس رہے ہیں وہ غیر سے سر بزم

میری ہستی میں اک حقیقت ہے

اپنی قسمت کو رو رہا ہوں میں!!!

منتظر قدرت خدا ہوں میں!!!

حسرت

حضرت محمد عبدالقدیر صاحب صدیقی

سنہ ۱۲۸۸ھ

از حسن محی الدین صاحب صدیقی بی۔اے (عثمانیہ)

مولانا محمد عبدالقادر صدیقی ناظم امور مذہبی کے جامع الکمالات صاحبزادے سنہ ۱۲۸۸ھ میں بمقام بلدہ حیدرآباد دکن پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم انکے والد محترم ہی کے زیر نگرانی ہوتی رہی۔ اس وقت اعلیٰ تعلیم کا مرکز دارالعلوم تھا۔ وہیں سے حضرت حسرت بھی فارغ التحصیل ہوکر نکلے مولوی، مولوی عالم، منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات میں پنجاب یونیورسٹی سے امتیازی کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن علم کی پیاس نہ بجھ سکی آخر شہر کے یکتائے روزگار علما جیسے ابوبکر بن شہاب اور مولانا فادالدین وغیرہ سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ لیکن آج بھی جب کہ مولانا حسرت علما کے استاد جانے جاتے ہیں۔ ان کو اپنی طالب علمی ہی پر ناز ہے اور ہر نئی چیز کے سیکھنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ادب عربی، فارسی، منطق، فلسفہ، ہیئت، فقہ، حدیث اور تفسیر کے زبردست ماہر مانے گئے ہیں لیکن ان کا خاص موضوع تصوف ہے اور یہی وجہ ہے کہ تصوف ان کی شاعری پر بھی چھایا ہوا ہے اور اس میں وہ شیخ ابن عربی کو سب سے بڑا استاد سمجھتے ہیں۔

حضرت خواجہ میاں صاحب قبلہ سے فیوض ظاہری و باطنی پائے اور انھی سے اجازت ارشاد بھی ملی۔

تحصیل علم کے بعد دارالعلوم ہی میں مدرس ہوئے۔ جب دارالعلوم نے کالج کی صورت اختیار کی تو حسرت ادب عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام پر شعبۂ دینیات کے صدر مقرر کئے گئے۔ ۲۷ سالہ ملازمت کے بعد ۱۳۴۳ف میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ حیدرآباد دکن ان کی قابلیت اور علمی خدمات پر ہمیشہ فخر کرتا رہیگا۔

موسیقی اور شعر گوئی سے بچپن ہی سے شغف تھا آواز کے خراب ہونے سے موسیقی میں کمال پیدا نہ کر سکے۔

لیکن مکمل طور پر فنی معلومات حاصل کیں۔ بنوٹ کشتی وغیرہ فنون حرب سے بھی خاص دلچسپی اور مہارت رکھنے کی وجہ سے وہ (جس طرح علماء و مشائخین کے استاد ہیں) سپاہیوں کے رہنما بھی ہیں۔

مولانا حسرت کی تصانیف متعدد ہیں۔ (۱) "الدین" فن حدیث میں۔ جس میں متعدد مسائل کے متعلق قرآنی آیات اور احادیث کو یکجا کردیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس سے واضح ہوگی کہ اسکو جامعہ کے حدیث کے نصاب میں داخل کرلیا گیا۔ (۲) "حکمت اسلامیہ" علم کلام کی ایک بہترین کتاب ہے جو جامعہ کے نصاب فلسفہ میں داخل ہے۔ (۳) "معیار الکلام" علوم عقلیہ و نقلیہ میں "شرح فصوص الحکم" شیخ اکبر کی اسی نام کی کتاب کی تفسیر۔ شیخ کی تقریروں کو سمجھنے کے لئے اب تک ایسی جامع شرح ناپید تھی۔ تصوف کے طالب علم کے لئے یہ ایک خاص چیز ہے۔ (۴) "معارف" مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوتے تھے بیشتر تصوف کے مسائل پر ہیں۔ ان کے مطالعہ سے حضرت کی اعلیٰ نثر نگاری ظاہر ہوتی ہے "طلسم حقیقت" جو بطور چیستاں لکھا گیا ہے اپنی آپ مثال ہے۔

(۵) التعلیم الطبعی فی اللسان العربی عربی کا رسالہ بطور ڈیریکٹ میتھڈ

شاعری۔ حضرت حسرت عربی، فارسی، اردو اور ہندی چاروں زبانوں میں شعر کہتے ہیں لیکن ہم یہاں صرف اردو شاعری سے بحث کریں گے۔

کلام حسرت کو ہم سہولت کے خیال سے چند قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔

مدح و قصائد۔ اس کے تحت وہ قصائد آتے ہیں جو انھوں نے سلطان العلوم اور حضرت غفران مکاں کی شان میں کہے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً پانچ ہے۔ غفران مکاں کی چونتیسویں سالگرہ کی مبارکباد کے قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں ___ افواج آصفی کی تعریف ۔

یہ فوج ظفر موج کے دستے ہیں رواں یا ابر چلے آتے ہیں از جانب کہسار
سرمست شجاعت سے کھڑے ہیں تن تنہا یا ہوتے ہیں باغ میں اشجار ثمردار
یہ شور عنادل نہیں جانبازوں کی تیغ بے ساختہ ہے نعرۂ یا حیدر کرار
لیتے ہیں بہادر لب شمشیر کا بوسہ جس طرح کہ جو میں اب معشوق ہوس کار

اس کے بعد حضرت غفران مکاں کی توصیف یوں شروع کی ہے۔

محبوب علی شیر خدا حیدر کرار　　منظور نبی ختم رسل سید ابرار　　وہ شیر کہ جو صف شکن و قلعہ شکن ہے　　ہے باج ستاں او جہانگیر و جہاندار

دہشت سے جگر کانپ اٹھے ترک فلک کا　　گر غیظ میں ہو شاہ دکن برسر پیکار

(۲) دوسری قسم میں نعت رسول اللہ صلعم اور اولیاء کرام کی مدح داخل ہے۔ بحیثیت ایک مسلمان کے حضرت حضرت مدح نبی کو اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ ان کے دیوان کے اس حصہ کا نام نغمہ محبت ہے۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے اس پر ناز کیا ہے کہ نعت نبی و آل نبی ان کا ایمان ہے اور اس نسبت پر اپنے آپ کو مبارکباد دی ہے۔ حضرت نبی اکرم کی شان پاک میں جو شعر لکھے ہیں ان میں سے چند بند بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ؎

تم پہ سو جان سے قربان رسول عربی　　تم مری جان کی ہو جان رسول عربی

سواد دیدہ بنکر جائے لی ہے چشم انساں میں　　زمیں پر کس طرح سایہ گرے قد محمد کا

ہوا اجمال ذاتی جلوہ گر تفصیل علمی میں　　ہوا جذر اصم یوں حل احد کا اور احمد کا

آجا آجا سرو سامان غریباں آجا　　اے تسلی وہ دلہائے پریشاں آجا

(۳) نصائح اور حکم تیسری قسم میں آتے ہیں۔ یوں تو ہر غزل میں نصیحت اور حکم کے شعر ملتے ہی ہیں لیکن اسکے ساتھ یہاں ہم تحفۃ الاطفال کا ذکر بھی کریں گے جو تقریباً ۸ شعر پر مشتمل ہے۔ مولانا نے تحفۃ الاطفال کی خصوصاً اور عام نصائح کی عموماً زبان سادہ اور سلیس لکھی ہے تاکہ زیادہ سمجھ میں آسکے۔

تحفۃ الاطفال میں سورہ فاتحہ کو بچوں کے لئے نظم کیا ہے ؎

میرا خدا باقدرت ہے　　جس کی اعلیٰ قدرت ہے　　سارے عالم کا رب ہے　　سب پر اس کی رحمت ہے

روز جزا کا مالک ہے　　جس کا نام قیامت ہے　　اپنے مالک سے مانگو　　جو کچھ تم کو حاجت ہے

ہم کو سیدھی راہ چلا　　جس میں تیری ہدایت ہے　　ان لوگوں کی راہ چلا　　جن پر تیری عنایت ہے

راہ سے گمراہوں کی بچا　　جن پر تیری لعنت ہے

عام اشعار میں اکثر جگہ نصائح و حکم اور تجربات ملتے جاتے ہیں ان کی سادگی کی خصوصیت ہر جگہ باقی ہے

حکمت اور تجربہ کے چند شعر نمونۃً پیش کئے جاتے ہیں ؎

دوستی زبانی تھی ساری بادہ خوانی تھی ۔۔۔ کوئی بھی نہیں نکلا وقت امتحاں اپنا

بوالہوس تیغ محبت سے ہو کس طرح شہید ۔۔۔ کار ہر سنگ نہیں لعل بدخشاں ہونا!!

ایک "ہاں" مادر دہر کو نہ بلا ہائے جہاں ۔۔۔ کیا قیامت ہے یہ پابستۂ پیماں ہونا!

یوں تو نصیحتوں کا ایک ذخیرہ حضرت حسرت کے کلام میں موجود ہے لیکن یہاں چند شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے

بعض شعر تو ایسے صاف ہیں کہ ضرب المثل معلوم ہوتے ہیں ۔

تعریف وہ ہے کریں جو اغیار ۔۔۔ اچھی نہیں اپنی خود ستائی

جب تک نہ کہے ہے بات تیری ۔۔۔ منہ سے نکلی ہوئی پرائی

اے تنگ دلی ترا برا ہو ۔۔۔ ورنہ میری تھی سب خدائی

ہم اخلاص دل یار لطف خدا کو ۔۔۔ ہمیشہ قدم با قدم دیکھتے ہیں

وادی حرماں میں کیوں رنج و پریشانی اٹھا ۔۔۔ گر سبق لینا تو یک رنگی محکم کیرکا

اب یہ وحدت کا بن گیا ارماں ۔۔۔ وہم باطل بھی کیا قیامت ہے

نہ کھلا راز زندگی حسرت ۔۔۔ زندگی اک طلسم حیرت ہے

(۴) اب ہم حضرت حسرت کی شاعری کے ایک اہم حصہ کی طرف آ رہے ہیں انکے اشعار سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں تجربہ ہے ۔ زبان کی صفائی اور شاعرانہ بلند خیالی ان کی شاعری کے اہم اجزا ہیں ؎

یا دِ نگہ مست میں تھا بے خبر ایسا ۔۔۔ بیکار رہے ساغر و مینا مرے آگے

ہیں جلوۂ محبوب میں یا بت کھڑے ہیں ۔۔۔ وہ کچھ ہیں کھڑے محو تماشا مرے آگے

باہر آؤ تو یہ صورت کی بلائیں لو ں ۔۔۔ کیسے نا قدر ہو کیا شوق ہی تنہائی

یہ امید بد ہی نے کیا مجھ کو گوارا ۔۔۔ مری جان ہنست کے کی تھی جو لیں نہار ہو

ذیل کے اشعار زبان اور شاعری کے محاسن کا نمونہ ہیں ؎

ہم سمجھتے ہیں ہم کو بھول گئے ۔۔۔ تازہ فتنہ اگر بپا نہ ہوا

روز کی جاں کنی سے چھوٹ گئے ۔۔۔ مر گئے ہم تو کچھ برا نہ ہوا!

آدمی آدمی سے ملتا ہے ۔۔۔ تم ملو گے تو کیا برائی ہے

درد تو لا علاج ہے تا شب غم دراز ہو ۔۔۔ میں رہوں اور بیکسی کوئی نہ چارہ ساز ہو

تیر نگاہ بے پناہ خنجر غمزہ جان ستاں ۔۔۔ جمع عاشقاں میں آ مشق فنون ناز ہو

حسرتِ مبتلا ہوں میں مجھ کو کسی سے کیا غرض
تو رہے اور میں رہوں ناز ہو اور نیاز ہو

مضغۂ گوشت کے سوا نہ ہوا
دل اگر دردآشنا نہ ہوا!!!

عشق ہے دل لگی نہیں کھیل نہیں ہنسی نہیں
دل کو جو اپنے ہاتھ سے دیجیے یہ ہاہا ئے بھول

عشق ہے اک بلائے جاں حسن ہے آفتِ جہاں
داد ہی حسن و عشق میں جان کے کوئی جلائے کیوں

تو کمالِ حسن سے سرفراز مجھے تیرے عشق میں انتہا
نہ تری نظیر ہے ناز میں نہ مری نظیر نیاز میں

ہیں دفن میرے ساتھ مرے دل کی حسرتیں
شکرِ خدا کہ قبر میں تنہا نہیں ہوں میں

ساقی میں ترے دستِ کرم پر نثار ہوں
اک جام اور دے میں ابھی ہوشیار ہوں

خودستائی کے تو قایل نہ کبھی ہم ہوں گے
واولیکن ہو تو پردے سے نکلنا ہوگا

کیوں یہ درد کی خلش ہوتی ہے اس میں حسرت
رہ گیا ہو نہ کوئی ٹوٹ کے پیکاں دل میں

بلانوشوں میں دُردِ تہ نشیں تقسیم ہوتی ہے
سلامت باکرامت یا الٰہی پیر میخانہ

بے مزہ جینے سے ہے موت ہی بہتر زاہد
چاہیے لذتِ حسن نمکین تھوڑی سی

اٹھ گئے مجالسِ علم و کمال سے
حسرت ہیں قصۂ محفلِ زنداں کئے ہوئے

ہے بوالہوسی یار کے ظلموں کی شکایت
جو لطفِ ستم پاتے ہیں شکوہ نہیں کرتے!

جان دینے کا محبت نام ہے　عشق کرنے کو کلیجہ چاہیے　مجھے ڈر ہے مری وارفتگی سے　کہیں چرچا نہ ان کا کو بکو ہو!!!

آئینِ محبت ہے عشاق کی عادت ہے　ہر ایک کا کہا سننا اور دل کا کہا کرنا　یہ طرزِ ستم کیا ہے یہ تلخِ جفا کیا ہے　خود چھیڑ کے عاشق کو انگشت بلب کرنا

کیا آنکھ چرائی ہے کس لطف کا چھپنا ہے　آنکھوں سے تو چھپ جانا اور دل میں رہا کرنا　آستانِ یار تکیہ اور بستر فرشِ خاک　یوں بسر کرتے ہیں اپنی زندگی آزاد ہم

پیوندِ خاک ہوگا نقشِ قدم بچے گا　حسرت یہ جان کر ہی آیا تری گلی میں　کچھ نشہ نہیں ہوتا ساقی مئے خالص سے　ایسا غمِ دنیا میں کچھ زہر ہی ملوا دے

دور جب تک رہے ہم یارِ ایذا دہ سے　پاس ہم تختۂ مشقِ ستم ایجاد رہے　ہم وہی دورِ فلک بھی ہے وہی　جمع کیا اسباب ہوں آرام کے

(۵) **تصوف**۔ ہمارے خیال میں مولانا کی شاعری کا یہ جزو سب سے اہم ہے۔ کیونکہ اسی کی بنا پر

وصوفی شاعروں کی صفِ اولین میں آتے ہیں۔ ہر شاعر کا ایک مقصد ہوتا ہے جس کو وہ شاعری میں استعمال کرتا ہے۔
حضرت حسرتؔ کا مقصد عبد اور معبود کے تعلقات کو واضح کرنا اور اس طرح اس رابطہ میں بندوں کو مربوط کر دینا ہے۔
ہم یہاں ان چند مسائل کا ذکر کرتے ہیں جن کو حضرت نے اپنی شاعری میں آسان کر کے پیش کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ سکے۔

جبر و اختیار کا مسئلہ یعنی یہ کہ انسان اپنے افعال کا مختار ہے یا ہر فعل پر مجبور ایک معرکۃ الآرا مسئلہ رہا ہے۔
اور اسی مسئلہ کی وجہ سے معتزلہ وغیرہ کی الگ جماعت پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا نے اسے اس خوبی سے سمجھایا ہے کہ اس کے
بعد کوئی تشنہ باقی ہی نہیں رہتا ——— فرماتے ہیں ؎

مقصد مرا وہی ہے جو مطلب ہے یار کا　　　　میں اپنے اختیار میں بے اختیار ہوں

نیرنگی اشکال ہے بیرنگ سراپا　　ہر رنگ میں ہے ایک ہی جلوہ گر ہر رنگ　　بقدر وسعت آئینہ ہوا آئینہ گر ظاہر　　بنا کر آئینہ خانہ وہی محو تماشا ہے

وجود بالذات صرف خدا کا وجود ہے اور انسان کا وجود، وجود بالعرض ہے! فرماتے ہیں ؎

ہوں بھی میں یا نہیں ہوں اے حسرتؔ　　　　آج تک طے یہ مسئلہ نہ ہوا!

چند اور اشعار بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اس کو دل میں چھپا کے رکھا ہے　　جو کسی سے نظر نہیں آتا!!　　غایت معرفت و علم ہے نادان ہونا　　سرمۂ دید تحقیق ہے حیراں ہونا
جستجو میں اس کی ہم خود کھو گئے　　چاہتے کیا تھے مگر کیا ہو گئے　　بیقراری میں ہے برق تجلی کی تڑپ　　میری آہوں میں شرر ریز ہے شعلۂ طور
مقصد خلق جہاں مرآت اسماء و صفات　　زینت افزائے سر و افسر شاہانہ ہم　　جو نہ ہو اسی کی نمود ہو نہ نمود اس کا وجود ہو　　کوئی کیا بتائے کمال ہے جو خیال اس کا ہے شعبدہ میں
ہاتھ میں ان کے ہوں میں کٹھ پتلی　　جو وہ چاہیں وہی کرتا ہوں میں　　دنیا کے سب کمال ہیں مجھ پر بکھر گئے　　حسرتؔ یہ کیا بات ہی اپنا نہیں ہوں میں

نیستی میں ہوں نہ ہستی میں ہوں　　　　بے نشانی ہے نشانی میری
نہ ٹلائے سے ٹلے گی ہے بلائے آسمانی　　　　مرا غبار حسرتؔ مرا غبار ہوتا!

مولوی سید اعظم اللہ حسینی صاحب اطہر

اطہر

مولوی سید اعظم اللہ حسینی صاحب

(ولادت سنہ ۱۲۸۹ھ)

از محمد فاروق حسین صاحب بی۔ اے

اطہر ۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۹ھ کو دوشنبہ کے دن پیدا ہوئے ان کے والد سید عبداللہ حسینی افسر منصبدار و جاگیردار تھے۔ اطہر کے نام سے سن ولادت نکلتا ہے یہ نام ان کے والد کے رشتہ کے برادر حضرت مظفر الدین معلی نے رکھا ہے۔ افسر اور معلی دونوں حیدر علیخاں حیدر کے شاگرد تھے۔

اطہر کی تعلیم جس ماحول میں ہوئی وہاں صرف مذہب اور دینداری کی روح کام کر رہی تھی ان کے والد نے سب سے اوّل مذہبی تعلیم کا انتظام کیا نو سال کی عمر میں قرآن شریف ختم ہوا۔ اور پھر مدرسہ نظامیہ میں شریک ہوئے۔ سنہ ۱۲۹۹ھ میں ان کی والدہ محترمہ نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور اپنی یادگار دو لڑکے چھوڑ گئیں ایک تو جناب اطہر دوسرے ان کے چھوٹے بھائی سید محمد حسین ابھی ماں کا غم تازہ تھا کہ دوسرے سال سنہ ۱۳۰۰ھ میں ان کے چھوٹے بھائی نے داغ مفارقت دیا۔ سنہ ۱۳۰۱ھ میں ان کے والد نے حج و زیارت کا قصد کیا اس سفر میں اطہر بھی ان کے ساتھ تھے چنانچہ لڑکپن ہی میں زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کی وطن پہونچے تو ان کو دوبارہ مدرسہ نظامیہ میں داخل کیا گیا جہاں انھوں نے مولوی سید ابراہیم صاحب، مولوی عبیداللہ صاحب اور مولوی نظام الدین صاحب سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ایک عرصہ تک مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی جہاں فارسی، حساب، اقلیدس، جغرافیہ وغیرہ اور دوسرے مضامین کی تکمیل کی۔ بہرحال شفیق اساتذہ کی نگرانی میں اطہر نے علوم مروجہ میں کافی دستگاہ پیدا کی۔

انتخاب اشعار کا مادہ بچپن سے ان کی طبیعت میں تھا۔ اکثر اپنے والد کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے

اور اچھے شعر کی داد دیتے تاریخی مادے نکالنے کا ان کے والد کو بہت شوق تھا چنانچہ وراثتاً اطہر کو بھی یہ ذوق ملا ہے۔ فرصت کے اوقات میں اکثر خود شعر کہتے اور اپنے والد سے اصلاح چاہتے۔ ان کے والد زمانہ شناس تھے انھوں نے ہمیشہ اس سے باز رکھا اور کبھی ان کے اشعار کی داد نہ دی اور ہمیشہ ناپسندی ظاہر کی تاکہ اس شوق سے باز آئیں۔

۱۳۰۳ھ میں ان کے والد نے ہندوستان کی سیاحت کا قصد کیا اور اطہر کو گرامر اسکول میں داخل کیا تاکہ انگریزی تعلیم حاصل کریں لیکن ۱۳۰۴ھ میں وہ ہیضہ میں مبتلا ہو گئے۔ تعلیم رک گئی مرض کی سختی نے ان کو ناتوان کر دیا چھ ماہ میں صحت ہوئی ابھی اس بلا سے نجات نہ ملی تھی کہ ان کے والد علیل ہو گئے ایک طویل علالت کے بعد ۸ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ روز یکشنبہ کو اس دار فانی سے رحلت کی باپ کے انتقال نے زندگی تتر بتر کر دی تعلیم رک گئی فکر معاش دامن گیر ہوئی ساری ذمہ داریاں ان پر عاید ہو گئیں چالیس روپیہ ماہوار پر ان کا تقرر دفتر خزانہ عامرہ میں ہوا۔ فرصت کے اوقات کو اطہر نے بیکار گزارنا فضول سمجھا پہلے مولوی محمد اسمٰعیل وکیل سے کچھ تیاری کی اور پھر مولوی عبید اللہ جاگیردار کی قانونی کلاس میں شرکت کی ۱۳۰۵ف میں قانونی سند حاصل کی یکم رمضان ۱۳۰۹ھ کو شاہ سید عنایت اللہ حسینی صاحب عالم قندھاری کی دختر سے عقد ہوا جن کے بطن سے دو لڑکیاں موجود ہیں۔

۱۳۱۶ف میں خزانہ دار پربھنی مقرر ہوئے جہاں ۲ سال تک کارگزار رہے وہاں سے دفتر خزانہ عامرہ میں منتقل ہوئے ان کی قابل قدر کارگزاری سے خوش ہو کر بابو منڈلال سیل صدر محاسب وقت نے ان کو اپنے دفتر میں متعین کیا تین سال تک انھوں نے اس خدمت کو انجام دیا۔ حبیب الدین صاحب صدر محاسب وقت کے زمانہ میں ضلع نلگنڈہ کی صدر محاسبی پر ترقی ہوئی۔ ماہانہ ایک سو پچاس تنخواہ ملتی تھی۔

۱۳۲۲ف میں سخت علیل ہوئے علالت کی طوالت اور کمزوری کے اضافہ نے وظیفہ لینے پر مجبور کیا۔ صحت ہونے پر وکالت شروع کی مولوی سید حیات الحسن صاحب ناظم عدالت پربھنی سے تعلق خاطر تھا وکالت کا کام خوب چل رہا تھا اسی اثنا میں ناظم صاحب کا تبادلہ ضلع آصف آباد پر ہوا یہ بھی ان کے ہمراہ آصف آباد چلے گئے دو سال تک وہاں قیام رہا۔

۱۳۵۰ھ میں دوسری مرتبہ حج وزیارت کی سعادت حاصل کی ۱۳۵۳ھ میں قاضی زین العابدین صاحب عابد ایچ۔ سی۔ ایس کے ساتھ آصف آباد میں ایک سال تک قیام کیا اسی سال انکا لڑکا تھوڑی سی علالت کے بعد انتقال کر گیا اسکا حضرت اطہر کو بہت رنج ہوا ۱۳۵۴ھ اسٹیٹ کے تحصیلدار ہوئے ۱۳۵۵ھ میں دفتر نظامت کورٹ آف وارڈز میں منتقل ہوئے یہاں سے چرک پلی تعلقہ حضور آباد ضلع بیدر میں انکی تعیناتی عمل میں آئی طبیعت میں جدت اور مذاق زیادہ ہے فن موسیقی سے زیادہ واقفیت ہے۔ وضع وقت اور وعدہ کے پابند ہیں اطہر کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی چنانچہ مشاعروں کی شرکت نے انکے جذبات کو اکسایا اور وہ شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ انکا کلام نہایت سادہ ہے اور دوسرے اصناف سخن سے غزلوں کی تعداد زیادہ ہے انکے کلام کے مطالعہ سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ انکی شاعری اکتسابی یا فنی نہیں ہے بلکہ وہ ایک فطری شاعر ہیں شاعر کا کلام سچے جذبات اور کردار کا حامل ہوتا ہے۔ اطہر کے کلام میں یہ چیز خاص طور پر پائی جاتی ہے انکا کلام انکے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اسمیں شاعرانہ محاسن، فصاحت بلاغت اور پرشکوہ الفاظ کے بجائے سادہ سلیس زبان اور پاکیزہ خیالات ملتے ہیں اسکا اصلی سبب انکی سادگی پسند طبیعت ہے شاعری سے اطہر کا مطلب ذوق کی تکمیل ہے خراج تحسین حاصل کرنا نہیں۔ نہ تو انکے کلام میں فلسفہ کے حل طلب مسائل ہیں نہ مجاز اور حقیقت کے مشکل معمے۔ انکے جذبات خود الفاظ کا جامہ پہن کر جلوہ گری کرتے ہیں پرشکوہ الفاظ اور شاعرانہ تکلفات کی جستجو میں انہوں نے اپنے اصلی رنگ کو نہیں چھوڑا۔ مذہبی رنگ ان پر چھایا ہوا ہے صوفیانہ خیالات حب رسول اور حب اہل بیت انکا مسلک ہے اس پر سادگی انکے کلام میں چار چاند لگاتی ہے کہیں کہیں ناصحانہ انداز کی جھلک نظر آتی ہے انکے نعتیہ کلام کا ایک مجموعہ باغ فردوس کے نام سے چھپ چکا ہے جو خاص طور پر مقبول ہوا انکی نظمیں اور غزلیں ابھی تک ایک جگہ شایع نہیں ہوئیں پیام یار اور گلدستہ فیض وغیرہ میں انکا کلام برسوں شایع ہوتا رہا ہے یہاں نمونہ کلام درج کیا جاتا ہے ؎

کونین کا جلوہ مجھے ہر سو نظر آیا — سب رنگ نظر آگیا جب تو نظر آیا !!
بے پردہ بالی نے ہمکو کیا ہی بے پروا کیا — اب خزاں کا خوف باقی ہے نہ ڈر صیاد کا

رنج واندوہ غم وحسرت ویاس وارماں — مجھکو کیا کیا مرے قسام ازل نے نہ دیا
گل پہ تھا بلبل فدا اور شمع پر پروانہ تھا — قیس تھا شیدائے لیلیٰ میں ترا دیوانہ تھا

کیا ہی پچھتایا ہے دل زلف پہ مائل ہو کر — عقل آتی اسے پابند سلاسل ہو کر !
بگڑوں میں بناوٹ سے تو ہنس ہنس کے ملانا — یاد آتی ہے وہ آپکی گفتار شب و روز !

کروگے یاد ہم کو تم یہ کہہ کر ! — کسی نے اپنا دل دے کر لیا داغ
عشق زلف ورخ جاناں کی مصیبت کبتک — دیکھئے صبح نہ ہوگی شب فرقت کبتک

بن بن کے اور بگڑے وہ جب التجا ہوئی — میری وفا ہی حق میں مرے اک جفا ہوئی
وحدت پسند ہو گئے آخر فراق میں — درگاہ عشق سے یہ کرامت عطا ہوئی

اختر پہ اعتماد نہ گردوں پہ اعتبار ! — عشاق کو کسی پہ بھروسہ نہ چاہئے
مرے حال زبوں پر کون تھا جسکو نہ رحم آیا — زمیں کانپی فلک رویا گری بجلی شرر ٹپکے

حق اگر پوچھتے ہو تم اطہر
حق نعمت کبھی ادا نہ ہوا !!

ہنسے لعل لب تو نظر آئے موتی
مزہ دے گیا مسکرانا کسی کا !

وہی اچھے رہے جو مر گئے پہلے اطہر
رنج دنیا نہ غم فرقت یاراں دیکھا

اس نے وعدہ کیا ہے آنے کا !
رنگ بدلا ہے کچھ زمانے کا !

نیکی کا کوئی کام نہیں ہوتا ہے اطہر
دنیا میں گذر جاتے ہیں بیکار شب و روز

رحمت پہ بھروسہ نہ کریں ہم تو خطا ہو
یارب جو گنہ گار نہ ہو اس کو سزا ہو

ہے جسمیں شرافت وہ تواضع کا ہے خوگر
جھکتی ہے وہی شاخ ثمر دار ہمیشہ

تڑپتے تڑپتے بسر ہو گئی !!!
قیامت کی شب تھی سحر ہو گئی

نہیں قید علایق سے رہائی !!
غضب کی پاؤں میں بیڑی پڑی ہے

یوں بسر ہو زندگی انساں کی !
ہو بغل میں یار اور ساغر چلے !

کچھ نہ پوچھو حالت دیوانگی !
جس طرف کو ہم چلے پتھر چلے !

چلا کرتے تھے تن تن کے سر اٹھائے ہوئے
ہم ان کو دیکھتے ہیں گردن اب جھکائے ہوئے

تارے گن گن کے کب سحر نہ ہوئی
کون سی رات یوں بسر نہ ہوئی

ساقی رکے نہ دور مئے لالہ فام کا
ٹھنڈی ہوا ہے باغ ہے آمد گھٹا کی ہے

کیا کام بھلا آئیگی فریاد کسی کی !
سنتا ہی نہیں وہ ستم ایجاد کسی کی

شکل انساں میں ہے سر رمز حقیقت پنہاں
ہر بشر راز ہے اور راز کا اظہار بھی ہے

پیر و جوان و طفل ہیں خواہان زندگی
کسکو نہیں جہان میں ارمان زندگی

جو ساتھ مرے دفن دل بے قرار ہے
چھوٹا سا اک مزار کے اندر مزار ہے

مری صحرا نوردی دیکھ کر وحشت بھی کہتی ہے
ابھی پیروں میں گردش ہے ابھی قسمت میں چکر ہے

جس کا پختہ کلام ہوتا ہے ! — وہی مشہور عام ہوتا ہے

تم مجھ کو ٹھکانے سے لگا کیوں نہیں دیتے — مٹی مری مٹی میں ملا کیوں نہیں دیتے

اس زنگ کدورت کو مٹا کیوں نہیں دیتے — دل آئینہ سا صاف بنا کیوں نہیں دیتے

حب وطن میں اہل وطن مرمٹا ہوں میں — بہتر یہ ہے کہ دفن ہو میری وطن میں لاش

مرد کو چاہیئے ہرگز نہ ہراساں ہونا!! — کوئی مشکل نہیں مشکل کا بھی آساں ہونا

یہ رنج کسی طرح گوارا نہیں ہوتا — ہم سب کے ہیں کوئی ہمارا نہیں ہوتا

نخل ارماں میں پھول آئے نہ پھل — کبھی یہ شاخ بارور نہ ہوئی!

درد دل کس سے کہوں کون اب اپنا دمساز ہے — جان تک جو آشنا تھی اُڑ پرواز ہے

اطہر کا نظموں کا دیوان غزلوں کے دیوان سے کم نہیں ہے ان کی اکثر نظمیں اصلاح معاشرت سے متعلق ہیں اکثر عہدہ داروں اور خاص خاص طبقوں کی ہجو، انہوں نے ہجویں لکھی ہیں جو ان کے دوست احباب میں اکثر زبان زد ہیں افسوس ہے کہ اس موقع پر ہم ان کو نقل کرنے سے قاصر ہیں۔ البتہ ان کی رباعیوں میں سے پانچ بطور نمونہ منقول ہیں

دنیا غرضی ہے

دیکھا اس دور کا تماشہ دیکھا! — اپنے بیگانے سب کو جانچا دیکھا!

ہر جا پایا غرض غرض کا چرچا! — جس کو دیکھو غرض غرض کا دیکھا!

ہے عقل نہ علم اور ہنر پر موقوف — نیکی نہ شرافت [illegible] پر موقوف

جتنے کہ ہنر ہیں وہ کہتے ہیں یہی! — عزت ہے کچھ آجکل تو زر پر موقوف

صانع تو ہے حکیم و خلاق ہے تو!! — جو چاہے کرے مالک آفاق ہے تو!

دنیا ہے تو بے ہنر کو اتنی روزی! — سب اہل ہنر کہتے ہیں رزاق ہے تو!

احسان نہ کرنے کی عذرداری

مجھ پر نہ کبھی رحم مہرباں کرنا — احسان یہ کرنا کہ نہ احسان کرنا

احساں کا تمہارے ہے اٹھانا مشکل — مشکل کو مری آپ نہ آساں کرنا

اہلِ زمانہ کا غرور

کس کس کے جگر پہ تیغ بیداد نہیں ہے کون کہ درماندۂ و فریاد نہیں
تھا اگلے زمانے میں کوئی اک شداد یاں کتنے ہیں ایسے کہ جو شداد نہیں

حیدرآباد میں نعت گوئی کے میدان میں شاہ معین الدین خاموش ۔ مولوی مظفرالدین معلی منشی امیر حمزہ حمزہ اور مفتی اعظم علی شائق کا اردو کلام بہت مشہور رہے ۔ اس سلسلہ میں اطہر کا نعتیہ کلام بھی اہل ذوق میں ضرور مقبولیت حاصل کرے گا جسکا مجموعہ باغ فردوس کے نام سے کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکا ہے ۔ اس مجموعہ کے حسب ذیل اشعار بطور نمونہ درج ہیں ؎

دل میں تمہاری پریت بھری تم بن سونی دل کی نگری قسمت ہے مری کھوٹی نہ کھری کرپا سے اسے چمکا دینا
غفلت میں تو ساری عمر گئی بیکنٹھ کی چاہت جی میں بھی چھٹکارے کی دھن دن رین رہے اور دتوں کو آپ ہی مٹا دینا
آئینگے فرشتے گور میں جب پوچھیں گے ہمارے گن کرتب ہوتا ہے کوئی داں لاگو کب تم ان کو دیا سے منا دینا
حضرت کے چرن جو پاؤں میں آنکھوں سے اپنے لگاؤں میں اس خاک کو سُرمہ بناؤں میں یا رب وہ دن دکھلا دینا

محرم راز کبریا ہے تو جانتا ہے خدا کہ کیا ہے تو
تو ہی مقصود خلقتِ کونین سارے عالم کا مدعا ہے تو
کونسا تجھ سے راز مخفی ہے جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
کرسکے کیا تری ثنا اطہر خاص ممدوح کبریا ہے تو

جس سمت نظر جائے نظر آئے مدینہ یا رب مری آنکھوں میں سما جائے مدینہ
گر جلد نہ نکلے گی تمنائے مدینہ مر جاؤں گا کہتے ہوئے میں ہائے مدینہ
منہ ان کا تکا کرتا ہوں حسرت کی نظر سے دیکھو آئے ہیں جو روضۂ مولائے مدینہ
ہے آپ کی فرقت میں مری جان لبوں پر او جلد خبر میری مسیحائے مدینہ

وفائی

صاحبزادہ میر جہاندار علی خاں صاحب

۱۲۹۱ھ

از۔ صاحبزادہ میر محمد علیخاں صاحب میکش

مشرب ہے خاکساری تو ملت ہے عاجزی ۔۔۔ اک مشت خاک ہوں یہ مری کائنات ہے (وفائی)

عصر حاضر کی علمی بیداریوں کا تقاضہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان ملک کے ایسے گمنام شاعروں اور ادیبوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ارباب ملک سے متعارف کریں جو خاموشی کے ساتھ ادبی مشاغل میں مصروف ہیں، اور جن کے کارناموں پر اسلئے پردہ پڑا ہوا ہے کہ وہ نام و نمود سے بے نیاز ہیں

صاحبزادہ میر جہاندار علیخاں وفائی کا نام شاعر کی حیثیت سے غالباً بہت کم لوگوں نے سنا ہوگا۔ نہ انکا کلام رسائل میں شائع ہوتا ہے اور نہ وہ مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں لیکن ان کے اشعار اس قابل ہیں کہ اہل ذوق کے سامنے پیش کئے جائیں۔

حضرت وفائی خانوادہ شاہی سے وابستہ ہیں۔ انکے والد صاحبزادہ میر جہانگیر علیخاں مرحوم نے طبقہ صاحبزادگان میں سب سے پہلے ایک ایسے زمانہ میں سرکاری ملازمت اختیار کی جب کہ اس طبقہ کے افراد نوکری کو اپنی عزت کے دامن پر ایک بدنما داغ سمجھتے تھے۔ اور اسطرح ایک طرف تو صاحبزادوں کی اقتصادی ترقی کی ایک نئی راہ کھولدی اور دوسری طرف ان میں ملک کی خدمتگذاری کے احساسات پیدا کرائے

انکے دادا صاحبزادہ میر ہدایت علیخاں ہدایت بڑے اچھے شاعر تھے۔ کہتے ہیں کہ انکے کئی دیوان تھے لیکن اب صرف ایک ہی قلمی دیوان رہ گیا ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر ان کے چند شعر یہاں درج کئے جائیں ؎

خانۂ دل مرا ویران نہ ہوا تھا سو ہوا ۔۔۔ آتش عشق سے سوزاں نہ ہوا تھا سو ہوا

صبح دلدار جو گل زار میں گذرا تھا صبا! ۔۔۔ چاک بس گل کا گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا

دیکھ کر زلف پریشاں کو ہدایت اس کی ۔۔۔ دل کبھی اتنا پریشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

کس کی تو یاد میں یہ ابر بہتا ۔!!!! ۔۔۔ روئے ہے چشم زار کی سی طرح !!!

برق باعث بیتابی تڑپنے کا!!!　　اِس دلِ بے قرار کی سی طرح!!!

یہ گل کے چاک گریباں سے صاف ظاہر ہے　　گئی نہ بلبلِ نالاں کی رائیگاں فریاد!

ہم قفس میں بند ہیں گلشن میں آتی ہے بہار　　کیوں گرفتاروں کا ناحق دل دکھاتی ہے بہار

جب نکلتی ہے زباں گل گیر کر دیتا ہے قطع!　　بزم میں بے چرب گوئی کی سزا پاتی ہے شمع!

لا سکے کب تاب سورج شعلہ خو کے ہجر میں!　　دیکھ کر جلتا ہوا عاشق کی حسرت کا چراغ

شعلۂ عشق سے گلزار ہوں، اللہ اللہ!!!　　تری آنکھوں میں مگر خار ہوں، اللہ اللہ!

بے خود اتنا ہوں ہدایت نہیں اپنی بھی خبر　　نشۂ عشق سے سرشار ہوں، اللہ اللہ!

حضرت ہدایت خلف نواب مشرف یاب جنگ مرحوم نواب ہمایوں جاہ مغفور کے پوتے اور نواب آصفجاہ اوّل کے پرپوتے ہوتے تھے۔

حضرت وفاتی سنہ ۱۲۹۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں پائی۔ اس کے بعد مدرسۂ اعزہ میں شریک کئے گئے جو اس زمانہ میں صرف صاحبزادوں کے لئے مخصوص تھا۔ چند سال تک مدرسۂ اعزہ میں تعلیم پائی اور اس کے بعد ذاتی مطالعہ سے اردو فارسی میں کافی قابلیت پیدا کی۔

ان کے دل میں ملازمت کا خیال پیدا ہوا تو انہوں نے حضرت غفراں مکانؒ کی خدمت میں ایک معروضہ گذرانا جس کی ابتداء اس شعر سے ہوئی تھی۔ ؎

کریم سائل خود را غنی کند اک بار!　　دوبارہ لب نہ کشا ید صدف زابر بہار!

اعلیحضرت مرحوم نے اس پر تجویز فرمائی کہ تحصیل پیشی تو جا بجا خالی ہو۔ اس پر معروضہ گذار کا تقرر کیا جائے۔ چونکہ انکی قسمت میں تحصیلدار ہونا لکھا تھا۔ اسلئے وہ تحصیلدار کی حیثیت سے سرکاری ملازمت میں منسلک کئے گئے۔ اور اپنی مفوضہ خدمات کو بہ احسن الوجوہ انجام دیکر سنہ ۱۳۲۹ف میں وظیفۂ حسن خدمت حاصل کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح انکے والد نے صاحبزادوں میں سب سے پہلے ملازمت اختیار کی اسی طرح یہ وہ پہلے صاحبزادہ ہیں جن کو اس طبقہ کے افراد میں سب سے پہلے وظیفۂ حسن خدمت ملا۔

انہوں نے حضرت آغا محمد داؤد صاحب صحوؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور انکو اپنے مرشد سے ایسی دلی عقیدت ہے کہ انکے اوقات کا ایک حصہ حضرت موصوف کی درگاہ میں گذرتا ہے۔ وہ ہمیشہ نماز، تلاوت قرآن اور وظائف خوانی میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن اس زہد و تقویٰ کی

زندگی کے باوجود ان کی طبیعت میں بلا کی سادگی ہے اور وہ بامذاق اور شگفتہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔

حضرت وفائی کا کلام قدیم رنگ کا آئینہ دار ہے اور اسمیں قدیم دبستان کی وہ ساری خصوصیتیں موجود ہیں جن میں تغزل کی لطافتیں اپنی پوری لذتوں کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

حضرت وفائی کی وہ غزلیں جو عہد شباب میں لکھی گئیں ان امنگوں اور ترنگوں کی آئینہ دار ہیں جو زندگی کو ایک کیف آفریں اضطراب میں غرق کر دیتی ہیں۔ ہر نفس ، شباب و شعر کی رنگینیوں سے معمور نظر آتا ہے۔ اور ہر لمحہ "حسن و عشق" کی اس روحانیت نواز فضا میں گذرتا ہے جہاں سکون سے زیادہ تڑپ میں مزا ملتا ہے۔ طبیعت کی آزادیاں ، زہد و تقویٰ کی پابندیاں گوارہ نہیں کرتیں۔

کام کرتے ہیں سب زبانِ ہند ! نام ہی نام ہے خدائی کا !!!!

عاشق کو جب اپنے محبوب کا دیدار نصیب ہوتا ہے تو وہ اپنی ہستی سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسکا مدعائے حیات صرف نظارۂ حسن ہوتا ہے اور اس نظارہ میں وہ ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اپنے وجود کا بھی اسے خیال نہیں رہتا۔

دل کو واپس لیا نہیں جاتا !!! ایک اقرار کر کے ہار رہے ہیں !!!!

پہلے تو اپنی کافرماجرائیوں سے بندۂ بے دام بنادیا ، اسکے بعد وہ داد بے نیازی دی کہ نہ طالب کی رسوائیوں کا بھی لحاظ نہیں کیا اسلئے

بندہ پرور ! دور سے لینا سلام !!! بندہ کر کے آپ نے رسوا کیا !!!

زبان نے اس شعر کے تیور میں ایک ایسی لذت پیدا کر دی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

حسن کی مقناطیسی کشش دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور دل ہمیشہ حسن کی وسعتوں میں کروٹیں لیتا ہے کسی نے کہا ہے۔

ایسا نہ دے کسی کو بھی پروردگار دل !!! آشفتہ دل ، فریفتہ دل ، بے قرار دل !!

لیکن حضرت وفائی نے اس مضمون کو کس قدر شگفتہ بنادیا ہے۔

جہاں پایا حسیں کو رہ گیا دل ! نہ دے ایسا کسی کو اے خدا دل !

شاعر کا دل ، ایک کمسن خوبرو پر مائل ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اسکی طرح آتشِ الفت میں اور تین چار جل رہے ہیں تو وہ کہہ اٹھتا ہے

اس کمسنی میں لے لئے دل تین چار کے ! ہو کر جوان تو چھیں ہی لو گے ہزار کے !

شاعر کی پیشین گوئی اس کے مجروح جذبات کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔

محبوب شرطِ وفا باندھتا ہے۔ لیکن اسکی بے نیازی ان پابندیوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ وہ اپنا عہدِ وفا بھول جاتا ہے۔

کیا اسی کا ہے نام شرطِ وفا! تم نے دل لے کے بے وفائی کی!!

حضرت آصف نے بھی بڑے اچھے انداز میں اس مضمون کو ادا کیا ہے۔

دل لیتے ہی مزاج تمہارا بدل گیا! پھر کیا غرض کسی سے جو مطلب نکل گیا!

محبوب کے حسن نے سارے عالم کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہر ایک اسکا دوست نظر آتا ہے۔ لیکن شاعر اسکی بے التفاتیوں سے شاکی ہے۔

سارا عالم ترا رفیق ہوا!!!! ذکر کس سے ہو بے وفائی کا!!!!

کشتگانِ خنجرِ تسلیم کی گرمجوشیوں کا یہ صلہ کہ

آتشِ ہجراں کو میری دیکھ کر!!!! شعلۂ دوزخ بھی ٹھنڈا ہو گیا!!

محبوب کی سرد مہریوں کا اعجاز ہے۔

فرقت کی الم انگیزیوں سے مجبور ہو کر موت چاہی لیکن بے اختیاری نے یہ تمنا بھی پوری نہ ہونے دی۔

فرقت میں تیری اس کو بلایا ہے لاکھ بار مجبور ہوں بلائے سے آتی قضا نہیں!!

سنا تھا سانپ ہوتے ہیں بہت برسات میں پیدا ہمیشہ ابر سا رویا، نہ دیکھا زلفِ پیچاں کا!

اس تشبیہہ نے تغزل کو فطرت سے جس طرح قریب کر دیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

تدبیر پر تقدیر کو غالب بتانے کی کوشش کی ہے۔

گمراہ ہیں جو راہ پہ ہرگز نہیں آتے!!! ہر چند خضر آتے رہے راہ بتانے!!!

اس کے بعد حضرت وفائی کی طبیعت اس کیف و شباب سے ہٹ کر اپنا ایک دوسرا رنگ اختیار کرتی ہے۔ پہلے تو وہ کہتے ہیں کہ

میری یہ تمنا ہے میخانۂ ساقی میں!!! دن رات پڑے رہنا اور یادِ خدا کرنا!!!

اور اس کے بعد ان کے اشعار میں شوخی اور سرشاری کی بجائے متانت و سنجیدگی نظر آتی ہے۔

خدا رکھے کسی نے خوب کی تعمیر مے خانہ! ملائی عرش کی زنجیر سے زنجیر مے خانہ!

پلا ہوں خم کدہ میں، ہیں تری پروا ہیں ساقی (خشت) پس مردن بھی پہلو میں رہے تصویر مے خانہ

یہ اور اسی قسم کے اشعار بتاتے ہیں کہ ان کے کلام پر صوفیانہ رنگ غالب آ گیا۔

دو ضد کا اجتماع ہے، یارب بخیر ہو گھر میں ہمارے زہد بھی ہے پارسا بھی ہے

نہ زہد و تقویٰ ہے میرا مشرب، نہ بت پرستی ہے میرا مذہب نہ دیر و کعبہ سے میرا مطلب، نہیں کسی میں شمار میرا!

دنیا میں رہ کے ناصحا دوزخ کا ذکر کیا تعبیر مجھ کو دیتے ہو پہلے ہی خواب سے!

جب خودی میں اپنی ہوتے ہیں فنا آپ کو اپنے ہی میں پاتے ہیں ہم!!

اے وفائی کیوں تلاش یار میں! ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتے ہیں ہم!

ہو مبارک عرصۂ محشر جہاں چہرۂ انور دکھایا جائے گا!

میں جدھر دیکھتا ہوں تو ہی نظر آتا ہے اب جدا حال ہے سب سے میری بینائی کا

کیوں نہ سٹ جاتا زمانہ دم رفتاران پر ان کے ہر ناز میں پہلو تھا دل افزائی کا

ملی ہے میں نے دربار پر جبیں برسوں! رہا ہوں خاک نشینوں کا ہم نشیں برسوں

اچھا برا ہے ایک ہماری نگاہ میں اب دور ہی سے دیکھتے ہیں خیر و شر کو ہم دانا ہو تم دے دو جلدی مدت گذری بھر ار ہے ہو!!

اہتمام مشغلہ اچھا کیا اک مٹایا داغ، اک پیدا کیا حضرت انساں کو دے کر عقل کل اپنا دانا اپنا دیوانہ کیا

برہمن بت کو پوجے شیخ کعبہ کو کرے سجدہ میرے مذہب میں کافی ہے فقط تو قیر میخانہ

میں جدھر دیکھتا ہوں تو ہی نظر آتا ہے اب جدا حال ہے سب سے میری بینائی کا

کلام وفائی کا ایک حصہ انکے عقائد سے متعلق ہے۔ اس قسم کے اشعار ان باطنی احساسات کی غمازی کرتے ہیں جو جذبۂ عقیدت نے اُن کے دل میں موجزن کر دئے ہیں۔

اے وفائی شہ لولاک کے صدقے میں تری! بات بھی بن کے رہی کام بھی بن کر نکلا!

ساقی سے دور میں نہیں بالکل قریب ہوں — مے خانہ جس جگہ ہے وہاں میرا گھر بھی ہے

اعمال دے چکے ہیں جواب نفی تو کیا — دل میں ہے درد، درد میں میری نجات ہے

غیور شیشہ کی پی رہا ہوں، شراب خواری میں مبتلا ہوں — بلائیں ساقی کی لے رہا ہوں، ہے بوالعلائی خمار میرا

اپنے مرشد طریقت حضرت آغا داؤد صاحب قبلہؒ کے فیض صحبت نے انکے خیالات کو تصوّف کے رنگ میں رنگدیا۔ چنانچہ بعد کے اشعار میں تصوف کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی جولانی طبع ایک ہی رخ پر بہے جا رہی ہے۔

اسطرح ہم حضرت وفائی کی شاعرانہ زندگی کے تین دور قائم کرسکتے ہیں۔ پہلے دور میں شاعر کا شباب اس کے اشعار میں بھی زندگی بن کر نمایاں ہوتا ہے اور اسطرح شبابیات کے باعث اشعار شوخ و رنگین نظر آتے ہیں۔ دوسرے دور میں شاعر کی فطرت زمانے کے ساتھ کروٹ بدلتی ہے اور شباب شعر کی کیف آفرینیاں متین و سنجیدہ صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ دل کی دھڑکنوں میں وہ جوش نہیں رہتا بلکہ خاموش جنبشوں میں وہ ایک ایسے دور کا پیام سناتی ہیں جو تدریجی دور پر شاعری کی طرف آرہا ہے۔ تیسرے اور موجودہ دور میں شاعر صرف ایک ہی ذات سے لو لگائے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کا خاموش جذبۂ محبت تصوف کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے۔ اس طرح طبعی رجحان کا صحیح عکس اشعار کی صورت میں نمایاں نظر آتا ہے۔

حضرت وفائی فارسی میں بھی خوب کہتے ہیں اور ان کے کلام کا غالب حصّہ فارسی غزلوں پر مشتمل ہے۔

افسوس ہے کہ ان کی صرف چند غزلیں مل سکیں، ورنہ ہم تفصیلی طور پر ان کے کلام کا تجزیہ کرکے زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھ سکتے۔ بہرحال انکے مختصر مجموعۂ کلام کے یہ چند اشعار، ایک ایسے شاعر کی خاموش زندگی کے ادبی کارناموں کا نمونہ ہیں جو ہنگامہ پسندیوں سے دور اپنے ذوق شعری سے خود ہی لطف اندوز ہوتا ہے۔
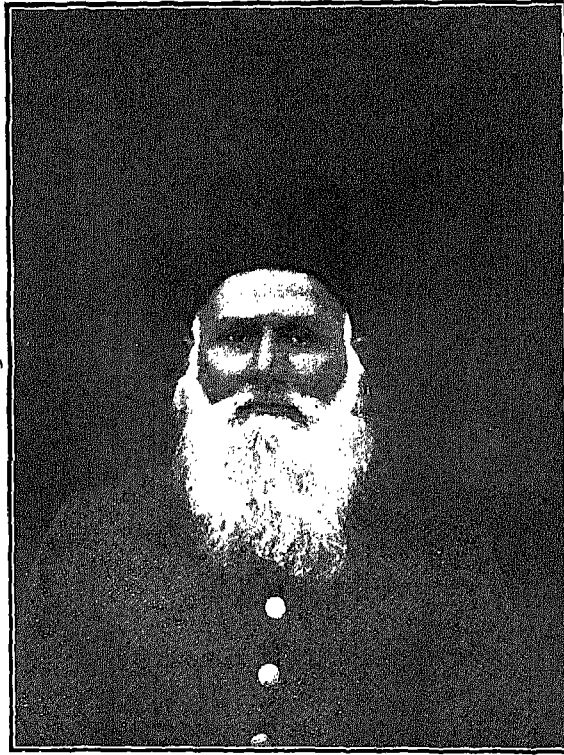
صاحبزادہ میر محمد معین الدین علی خاں صاحب شباب

صاحبزادہ میر معین الدین علیخاں شبابؔ ان وضع دار شعراء میں سے ہیں جن کا ذوق شعری جدید شعری رجحانات سے متاثر نہ ہوسکا۔ انکی قدامت پسند طبیعت نئے دبستان کی طرف پلٹ نہ سکی۔ وہ اب بھی قدیم رنگ میں شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں

جناب شبابؔ خانوادۂ آصفیہ سے وابستہ ہیں۔ انکے والد صاحبزادہ میر نجم الدین علیخاں نجمؔ بھی شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور اپنی نعت گوئی کے باعث ارباب سخن میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے دادا صاحبزادہ میر معز الدین علی خاں، نواب مشرف یار جنگ کے فرزند اور ناصر الملک ہمایوں جاہ کے پوتے تھے۔

۱۷ ربیع الاول ۱۲۹۶ھ کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں پائی۔ اس کے بعد مدرسۂ اعزہ میں شریک ہوئے۔ اپنے ہمدرس صاحبزادہ میر اشرف علیخاں مدہوشؔ کی رندانہ شاعری کے کیف آگین اثرات نے انکو بھی متاثر کیا اور طبیعت کی موزونی نے ان سے بھی شعر کہلوائے۔ چنانچہ انہوں نے جناب مدہوشؔ کے توسط سے انکے استاد جناب حبیبؔ کنتوری کو اپنا کلام دکھایا۔ جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

اہل سخن کا قول ہے فیض حبیبؔ سے!! — تو اے شبابؔ مالک ملک سخن ہوا

مقبول خلق کیوں نہ ہو اس کا کلام پھر — شاگرد ہے شبابؔ جناب حبیبؔ کا

جناب حبیبؔ کی وفات کے بعد جناب ضامنؔ کنتوری سے مشورہ کرنے لگے۔

صاحب اخلاق، ہمدرد اور یار باش ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی ان کا مطمح نظر ہے۔ انکو اپنے خاندان کی بہی خواہی کا

بڑا خیال ہے اور اسکی فلاح وبہبود کیلئے ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔

اپنے استاد کی یادگار کے طور پر اور حضرتِ غفراں مکاںؒ کی سالگرہ کی تقریب میں نہایت اہتمام کے ساتھ مشاعرے منعقد کرتے تھے اور ان غزلوں کے گلدستے بھی شائع کرتے تھے جو ان مشاعروں میں پڑھی جاتی تھیں۔

انکا دیوان مکمل ہوچکا ہے۔ کئی غزلیں اور مسدس لکھ چکے ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب طبع ہو جائیگا۔ اور اسطرح ان کا تمام کلام اربابِ نظر کو دعوتِ ملاحظہ دے گا۔

انکے کلام میں ادابندی اور صاف گوئی کے ساتھ سادگی ہوتی ہے۔ بعض وقت زبان کی لطافت سے خاص لذت پیدا کرتے ہیں

سنتے ہیں کہ الفت میں ہر گام پہ سختی ہے
کیوں ہمتِ مردانہ کچھ کام بنادے گی!

ہم کو دونوں جہان سے کھویا
یاخدا ہو برا محبت کا!

آپ اُف اُف جو کر رہے ہیں شبابؔ
کیا کلیجے کے داغ جلتے ہیں!

ترا دل ہو سنگ سے سخت تر نہیں میری آہ بھی بے اثر
مجھے اس نہیں کا نہیں ہے ڈر تجھے ہاں کہے سے مفر نہیں

کہیں کا بھی نہ رکھا تیری اس بے اعتنائی نے
اگر تو مہرباں ہوتا، زمانہ مہرباں ہوتا!

نہ تو لے کے حسنِ طلب گیا، نہ تو لے کے ذوقِ نظر گیا
وہ ہوائے بے خبری چلی، گیا بے خبر میں جدھر گیا

ان کو ہم یاد بھی آتے نہیں بھولے سے کبھی
یاد میں جس کی دو عالم کو فراموش کیا

ہر گھڑی تیرے کرم پہ رہی نظر!
کب مجھے اندیشۂ دشمن رہا!

کہتے ہیں اپنے چہرے سے سرکا کے زلف کو
لو آج آفتاب گہن سے نکل گیا

ہم اور ستم شعار کہیں، سر بسر غلط!
یہ آپکی زباں ہے ہماری زباں نہیں

پچھلی باتوں کی یاد آئے گی کام!
خواب ہی کا سہی خیال تو ہو

بعض وقت بندشوں کی نزاکت سے ان کے اشعار میں ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے اور اس جوش میں بھی شعریت کی تمام سرشاریاں موجود ہوتی ہیں۔

نغمۂ تارِ نفس میں سوز پیدا ہوگیا — بن گئی مضراب یاد اسکی رگ جاں کیلئے

گرم محفل فروغ مے سے ہے — کشتیوں میں ایاغ جلتے ہیں

یارب قبول دستِ دعا کے اثر میں ہے! — شکر خدا کہ اتنی تو قدرت بشر میں ہے

ناامیدی بن کے بیٹھی سوگوارِ آرزو — داغ دل مرا چراغ خانۂ ماتم ہوا

ان کے اشعار کی تخیل آفرینی بھی قابلِ تحسین ہوتی ہے۔

کسی کا جلوہ دل کے آئینہ میں دیکھ لیتا ہوں — ہیں کوہِ طور پر اے حضرت موسیٰ نہیں جاتا

اس کے اٹھ جانے سے برہم ہوگیا سامانِ عیش — شمع جل کر بجھ گئی اور خاک پروانہ ہوا!

لائی ترے در تک کششِ الفتِ صادق! — اِس راہ میں میرا کوئی رہبر نہ ہوا تھا

اس کو سنائے کون مرا حالِ دردِ وغم! — اس بزم میں صبا سے بھی جایا نہ جائیگا!

عبرت انگیز ہے یہ بحرِ جہاں! — اِس کے ڈوبے کہاں ابھرتے ہیں

دن نکل آئے جو الٹے شب کو وہ رخ سے نقاب — گیسوئے مشکیں بکھر جائے جو دن میں شام ہو

اللہ رے شوق دید میں قبلہ نما بنا — آنکھیں اسی طرف کو پھریں تم جدھر گئے

وہ بے قرار ہو کے چلے آئے میرے گھر — تردید نارسائی آہِ رسا تو کی!!!!

بعض اشعار شوخی کا پہلو لئے ہوئے ہیں ؎

وہ کہتے ہیں میں کیا جانوں کسی کی کیا تمنا ہے — نہ جب تک حرفِ مطلب کا لبِ سائل سے نکلے گا

عدو سے مشورے کرتے ہیں جب بے داد کرتے ہیں — ستم ایجاد ہیں ہر دم ستم ایجاد کرتے ہیں

نہ آہیں لب پہ آتی ہیں نہ ہم فریاد کرتے ہیں! — بتوں کے ظلم سہتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں!

ان کے اشعار میں پیام بھی ہوتا ہے۔ وہ کبھی کسی کو مخاطب کر کے کچھ کہتے ہیں اور کبھی خود اپنے پردے میں نصیحت کرتے ہیں۔

ہے طالبِ عزت گر مخلوق کی خدمت کر — اِک روز یہ خدمت ہی مخدوم بنا دے گی

جو بھی کرنا ہو تمہیں کام کرو ہمت سے خاک جینا ہے جہاں میں اگر ایسا نہ کرو!
دیکھنا پھر بہار آزادی! دور پابندیوں کا جال تو ہو

انکی رباعیاں بھی خوب ہوتی ہیں اور بڑے دلکش انداز میں کوئی ایسا نکتہ بیان کر جاتے ہیں جس سے ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

دنیائے فسوں ساز کو یوں چھوڑ دیا!!!! خم توڑ دیا، جام و سبو چھوڑ دیا!!!!
کرنے تھے یہاں کام بہت ہم کو شباب ناقدری احباب نے دل توڑ دیا!!!

ایک دوسری رباعی میں کہتے ہیں ؎ اب تو ہے شباب یہ زمانے کا رنگ ہے اشرفی جس کے پاس اشراف ہے وہ

مسدس کے دو بند بہ طور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

کیوں دل میں نہ انساں کے وطن کی ہو محبت! ہر شخص کو لازم ہے کرے گھر کی حفاظت!
اولاد ہیں ہم اس کی جو ہے بانیٔ دولت! حاصل یہ ہوئی جس کی بدولت، ہمیں عزت!
ہم نسل ہیں آصف کی ہیں دم تیرا بھریں گے!
ہم تیرے اشاروں پہ فدا جان کریں گے!

ہم سے کیوں یہ لی رخی الفت کا رشتہ جوڑ کر ساقیا جاتا کہاں ہے ہم سے تو منہ موڑ کر!
ساقیا جاتا کہاں ہے میکدہ کو چھوڑ کر! ساقیا جاتا ہے کیوں جام و صراحی توڑ کر
یہ بتا دے تشنگانِ علم کس کے ہو رہیں
یہ بتا دے اپنا ساقی آج سے کس کو کہیں!

ان کے سلاموں میں بھی اثر ہوتا ہے۔ ایک سلام کے تین شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

حُر کے دل میں جب فروغ نور ایماں ہو گیا کفر کے بادل سے نکلا مہر تاباں ہو گیا
جاگ اٹھی تقدیر تیری نثار زارِ کربلا! ہُو کا جو میدان تھا رحمت کا داماں ہو گیا
کیا شبابِ خوش بیاں کی تھم نے تکمیل سلام خاطر احباب سے کہنے کو تو ہاں ہو گیا

ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت شاد

محمد محی الدین محفوظ

میر افتخار علی شاہ وطن

حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

یہ درحقیقت اُردو کی سرپرستی کا عہد زریں ہے۔ سلطان العلوم آصف جاہ سابع خود بلند پایہ شاعر اور قدر دان سخن ہیں۔ شہزادہ والاشان اعظم جاہ بہادر اور شہزادہ والاشان معظم جاہ بہادر شجیع کے علاوہ دوسرے شہزادگان لاتبار کو بھی شعر و سخن سے کافی دلچسپی ہے اور خاص کر نواب معظم جاہ بہادر شجیع نے تو قلیل عرصہ میں شاعر کی حیثیت سے اسقدر شہرت حاصل کرلی ہے کہ مرقع سخن کی اس جلد میں مبارک عہد عثمانی کیلئے دو دادوار قائم کرنے پڑے ایک اُن شعراء کا جو اپنی عمر کے چالیس سے زیادہ سال گزار چکے ہیں اور دوسرا نوجوان شعرا کا جس کو چھٹا دور قرار دیا گیا ہے اور جس کا آغاز شہزادہ والاشان شجیع کے حالات زندگی اور نمونہ کلام سے کیا جارہا ہے۔

شہزادگان والاتبار کے علاوہ حضرت ملکۂ دکن اعجاز دام ظلہا کو بھی شعر و سخن کا اچھا ذوق ہے۔ خانوادۂ شاہی کے علاوہ امرائے سلطنت میں مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت شاد، نواب معین الدولہ معین اور نواب لطف الدولہ لطف وغیرہ کو بھی شعر و سخن کا خاص ذوق رہا ہے۔

اس وقت حیدرآباد میں سینکڑوں اردو شاعر موجود ہیں لیکن مرقع سخن کی پہلی جلد میں بعض شعرا کے نام اور تصویریں شریک کی گئی تھیں جو اس وقت اپنی عمر عزیز کے چالیس سال گزار کر پختہ مشق ہوگئے تھے اور اُن میں سے بعض اپنی تاریخ پیدائش کے

لحاظ سے چوتھے دور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انھوں نے شاعر کی حیثیت سے دورِ عثمانی ہی میں شہرت حاصل کی ہے۔

مرقع سخن کی پہلی جلد میں اس دور کے صرف پانچ شاعروں یعنی میر محمد علی مسرورؔ، محمد حبیب الدین صغیرؔ، سید احمد حسین امجدؔ، نواب تراب یار جنگ سعیدؔ اور محمد ہبتو علی صفیؔ کے حالات اور انکی شاعری پر تبصرہ اور نمونہ کلام شائع کیا جا چکا ہے مرقع سخن کی اس جلد میں پندرہ شعرا کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام شامل ہے۔ ان شعرا میں سب سے اول اعلیحضرت ظل سبحانی نواب میر عثمان علیخاں بہادر سلطان العلوم آصف جاہ سابع خسرو دکن و برار خلد اللہ ملکہ کے نطق ہمایونی کے نمونے اور فنکار پروری نیز علم و فضل و شعر و سخن کی سرپرستی کے اجمال کو پیش کرنے کی عزت حاصل کی جا رہی ہے۔ پھر اس دور کے دیگر شعرا کو تاریخ پیدائش کے لحاظ سے یکے بعد دیگرے پیش کیا گیا ہے انکے نام حسب ذیل ہیں

۱۔ لطفؔ نواب لطف الدولہ بہادر۔ ۲۔ معینؔ نواب معین الدولہ بہادر۔ ۳۔ عالیؔ راجہ نرسنگ راج بہادر۔ ۴۔ تصورؔ سید علی نواز امانت خانی ۵۔ ذہینؔ سید غلام مصطفےٰ۔ ۶۔ آزادؔ گورسرن لال۔ ۷۔ جعفرؔ مرزا علی جعفر۔ ۸۔ آبرؔ غلام دستگیر۔ ۹۔ وفاؔ محمد حبیب اللہ۔ ۱۰۔ شہیدؔ نواب شہید یار جنگ بہادر۔ ۱۱۔ مہرؔ صاحبزادہ میر فضاب علیخاں۔ ۱۲۔ آزادؔ سید محمد حسین۔ ۱۳۔ نیرؔ قاضی محمد منیر الدین۔ ۱۴۔ محبوبؔ راجہ محبوب راج

اس دور کے دیگر شعرائے حیدرآباد جو اپنی عمر عزیز کے چالیس سے زیادہ سال گذار چکے ہیں یا جو وفات پا چکے حسب ذیل ہیں۔

محب اللہ خاں عالیؔ۔ عظمت اللہ سرمدؔ۔ قدرت نواز جنگ قدرتؔ۔ اعجاز علی شہرتؔ۔ خواجہ غلام غوث عشقؔ۔ بدیع اللہ قیسؔ۔ عبدالوہاب عندلیبؔ۔ ابوالحسن قیصرؔ۔ ابوالاشرف مجیدؔ۔ راگھویندر راؤ جذبؔ۔ رگھوناتھ راؤ دردؔ۔ مجاہد الدین مجاہدؔ۔ ریاض الدین ریاضؔ۔ عبدالرزاق شمیمؔ۔ عبدالرزاق بسملؔ۔ عبدالرزاق راشدؔ۔ قاضی زین العابدین عابدؔ۔ محتشم شاہ امیدؔ۔ غلام شاہد شاہدؔ۔ اللہ بخش توحیدؔ۔ اکرام الدینخاں اکرامؔ۔ راجہ راجیشور راؤ اصغرؔ۔ نصیر الدین اصغرؔ۔ وحید اللہ وحیدؔ وغیرہ۔ اس عہد کے نوجوان شعرا چھٹے دور میں شامل ہیں۔

جو شاعر اس دور میں حیدرآباد آئے۔ وحید الدین سلیمؔ۔ مرزا محمد ہادی رسواؔ۔ نظیر حسین سخاؔ۔ صادق حسین غبارؔ۔ نظام شاہ لبیبؔ۔ امین الحسن بسملؔ۔ ناظر الحسن ہوشؔ۔ شبیر حسن خاں جوشؔ۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ سید علی شبیر شبیرؔ۔ کاظم علی باغؔ۔ نثار یار جنگ مزاجؔ۔ سید ہاشمی ہاشمیؔ۔ واجد حسین یگانہؔ۔ عظمت اللہ خاں عظمتؔ۔ تصدق حسین خالقؔ۔ جالبیؔ۔ شوکت علیخاں فانیؔ ـــــ اس دور کے شمالی ہند کے مشہور شعرا۔ جعفر علیخاں اثرؔ۔ اصغر حسین اصغرؔ۔ علی سکندر جگرؔ۔ عبدالباری آسیؔ۔ فضل الحسن حسرتؔ۔ سر شیخ محمد اقبالؔ۔ نارائن پرشاد ورما مہرؔ۔ رضا علی وحشتؔ۔ برج موہن دتاتریہ کیفیؔ۔ ابوالاثر حفیظؔ۔ اقبال احمد سہیلؔ۔ ناطقؔ لکھنوی۔ دلؔ شاہجہانپوری۔ ثاقبؔ لکھنوی۔ بیباکؔ شاہجہانپوری۔ آزادؔ لکھنوی۔ جوشؔ ملسیانی ـــــ

ہز اکزالٹڈ ہائینس سلطان العلوم خسرو شیریں سخن اعلحضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر
ظل اللہ آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ

عثمان

اعلیحضرت ظلِ سبحانی سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر

آصفجاہ سابع خسروِ دکن و برار خلد اللہ ملکہ

از

میرزا ہادی علی صاحب کامل بی۔ اے ال۔ ال۔ بی و میر سعادت علی صاحب رضوی ام۔ اے

حضرت ظلِ سبحانی کے حالاتِ زندگی اور عہدِ میمنت مہد کے متعلق اس وقت تک متعدد کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں، ہر سال ملک اور بیرون ملک میں رسائل و اخبارات کے سالنامے اور سالگرہ اقدس کی مبارکباد کے خاص نمبر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب میں حضرت بندگانِ عالی کی عظیم الشان شخصیت، آپ کے بے مثال تدبر و سیاست، ذاتی علم و فضل شعر و سخن کی دلچسپیوں اور ذہنی و اخلاقی محامد وغیرہ کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اگر ان سب کو ایک جگہ کر دیا جائے تو اعلیحضرت سلطان العلوم کی قابلِ تقلید ہستی سے متعلق کئی جلدوں کی سوانح حیات مرتب ہو جائے۔ حضرت جہاں پناہی کے اردو کلام اور شاعری کی خصوصیات کے متعلق بھی اس سے قبل مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر اور مولوی عبد القادر صاحب سروری پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ نے نیز فارسی شاعری پر مولوی عبد القیوم خاں صاحب باقی ام۔ اے اور دیگر اصحاب نے صبح دکن کے سالناموں میں مضامین شائع کئے ہیں۔ خود سلسلہ ادبیات اردو کی طرف سے "مرقع سخن" کی جو پہلی جلد شائع ہوئی اسکی "تقریب" اور پانچویں دور کی تمہید نیز اسکے مدیر عمومی کی کتاب "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" میں اعلیحضرت آصفجاہ سابع کے شعر و سخن کی دلچسپیوں اور اردو نوازیوں کا تذکرہ شائع ہو چکا ہے "مرقع سخن" کی اس جلد میں

اس امر کا التزام کیا گیا ہے کہ خانوادۂ آصفی کے ان جملہ ارکین پر جداگانہ مضامین لکھے جائیں جنہوں نے اُردو شعر و سخن کی سرپرستی کی۔ اور اُردو میں بھی اپنا کلام یادگار چھوڑا چنانچہ گذشتہ فصلوں میں حضرت آصف جاہ اول، نواب صر جنگ شہید، حضرت غفران مکاں آصفجاہ سادس، صاحبزادہ آصف یاور الملک وزیر اور دیگر صاحبزادگان کے حالات اور کلام کے نمونے درج کئے گئے ہیں دودمان آصفی میں اعلیحضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلداللہ ملکہ کی ذات والاصفات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور علم و فضل و شعر و سخن کی سرپرستیوں میں حضرت جہاں پناہی نے خاص توجہ فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ سلسلۂ ادبیات اُردو نے اعلیحضرت بندگانعالی کے پچیس سالہ عہد حکومت کے جشن سیمیں کی تقریب میں حیدرآباد کے شعرائے اُردو کا باتصویر تذکرہ مرقع سخن شائع کیا ہے اور اُسکی اِس جلد میں اجمالی طور پر حضرت ظل سبحانی کے عہد میمنت مہد کے درخشاں کارنامے اور کلام فصاحت التیام کے نمونے پیش کرنے کی عزت حاصل کیجارہی ہے۔

اعلیحضرت سلطان العلوم خلداللہ کی مکمل سوانح حیات لکھنا کسی شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کئی جلدوں کی مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے اگر موقع ملے تو خود سلسلۂ ادبیات اُردو کی طرف سے اس موضوع پر نہایت اجمال کے ساتھ پانچ ابواب میں ایک نذر عقیدت پیش کیجائیگی اس سوانح شاہانہ کا پہلا باب حیات سلطانی اور دوسرے چار ابواب ۲۔ اُردو شاعری۔ ۳۔ اُردو نثر ۴۔ فارسی شاعری اور ۵۔ ہندی شاعری پر مشتمل ہوں گے۔ اِس وقت صرف دوسرے باب (یعنے اُردو شاعری) کا ایک خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

مدیر عمومی

اس عہد میں راحت کی فراوانی ہے — رحمت ہے کرم ہے فضل رحمانی ہے

سیپارۂ دل کے جمع ہوتے ہیں ورق — اللہ غنی وہ دور عثمانی ہے (عثمان) خلد اللہ

تاریخ دکن میں سن ۱۳۰۳ھ کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہیگی کیونکہ اعلیحضرت ظل سبحانی خلد اللہ ملکہٗ اسی سال تولد ہوئے اور سارے ہندوستان میں خوشی اور مسرت کا اظہار کیا گیا۔ ۵ سال کی عمر میں بڑی دھوم دھام سے رسم تسمیہ خوانی ادا کی گئی اور ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ عربی اور دینی تعلیم کیلئے، نواب عماد الملک اور سید علی شوستری فارسی اور مسٹر اجرٹن انگریزی کیلئے مقرر ہوئے۔ زمانۂ طفولیت محل مبارک حویلی قدیم میں اعلیٰ نگرانی کے تحت گزرا اور مشہور اساتذہ اور اتالیقوں کے فیض صحبت نے ظل سبحانی کی خداداد ذہنیت پر سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ سواری شکار اور دوسرے سپاہیانہ فنون نواب سر افسر الملک کے تفویض ہوئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیحضرت علم و فضل کے ساتھ شہسواری اور سپہ گری میں بھی کامل ہو گئے۔

اس اعلیٰ تعلیم و تربیت کے علاوہ اعلیحضرت ظل سبحانی نے اوائل عمر ہی میں سیر و سیاحت کا تجربہ حاصل کیا اور ممالک محروسہ کے اکثر اضلاع کے علاوہ بمبئی کلکتہ اور اجمیر کا بھی سفر کیا۔ سن ۱۹۰۳ء کے مشہور دہلی دربار میں حضرت غفران مکاں کے ہمراہ شریک تھے۔ غرض ابتداہی سے امور سلطنت کا عملی تجربہ حاصل ہوگیا تھا اور جب ۱۳۲۹ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوئے تو ملک کے پورے حالات آپ کے سامنے آئینہ تھے۔ تخت نشینی سے پانچ سال قبل ہی یعنی سنہ ۱۳۲۴ھ میں نواب جہانگیر جنگ بہادر کی دختر بلند اختر سے حضور پر نور کا عقد ہوا اور تخت نشینی سے قبل شہزادگان والاشان نواب اعظم جاہ بہادر اور نواب معظم جاہ بہادر پیدا ہوئے۔

اعلیحضرت بندگانعالی کے عنان سلطنت ہاتھ میں لیتے ہی حیدرآباد نے پلٹا کھایا اور یہاں علمی اور مادی حیثیتوں سے ایک انقلاب رونما ہوگیا۔ نظم و نسق سلطنت میں اعلیحضرت نے غیر معمولی محنت اور جانفشانی سے حصہ لیا اور علوم و فنون کی سرپرستی نیز جامعہ عثمانیہ کے قیام کا حکم صادر فرماکر دکن کے علمی مستقبل کو تابناک بنادیا۔ باب حکومت کا قیام مجلس بلدیہ اور رعایا کے دوسرے حقوق کی پابجائی، ظاہر کرتی ہے کہ اعلیحضرت بندگانعالی کس قدر روشن خیال و بیدار مغز فرمانروا ہیں۔

امور مملکت کو چھوڑ کر خود اعلیحضرت کے فقید المثال کردار، عدل و انصاف، مذہبی رواداری، سادگی، اور

بذل و نوال و محامد ہیں جن کی نظیر دنیا کے بہت کم حکمرانوں میں مل سکتی ہے۔

"اعلیحضرت کو اوائل عمر ہی سے شعر کا ذوق تھا اور اسی وقت سے اُردو کے باکمال شاعروں کے دیوان آپنے جمع کئے اور متقدمین اور متاخرین کے کلام کا اپنی پسند کے موافق انتخاب بھی فرمایا۔ یہ انتخاب مہاراجہ بہادر کی نظر سے گذرا ہے جس کی تعریف میں آپ یوں رطب اللساں ہیں۔

" زمانۂ شہزادگی میں حضرت نے متقدمین و متاخرین کے کلام سے اشعار منتخب فرماکر جو ذخیرہ فراہم کیا ہے اسکے دیکھنے سے تعجب ہوتا ہے کہ ہر شعر چوٹی کا انتخاب ہوا ہے ــــ"

(صبح دکن سالگرہ نمبر بابتہ ۱۳۴۷ھ صفحہ ۳۲)

مہاراجہ بہادر نے اپنے مضمون میں اعلیحضرت کی شاعری کے آغاز کے متعلق یوں تحریر کیا ہے۔

"حال کے سفر بمبئی میں جس کو تقریبًا پانچ ماہ ہوتے ہیں۔ اعلیحضرت نے پہلے ہی ناسخ کی غزل سے ابتدا کی جس کا مطلع یہ ہے

یہ اگر آئینۂ صورتِ جاناں ہوتا لاکھ میں ایک ہمارا دل حیراں ہوتا

ناظرین اس طبیعت خداداد کا اندازہ کرسکتے ہیں اور بلا کسی تصنّع اور خوشامد کے کہہ سکتے ہیں کہ کیا ہر کوئی مبتدی خواہ کیسا ہی عالم و فاضل ہو اپنے کلام کو ابتدا ہی میں انتہائی کمال کا جامہ پہنادے جب تک فضل آلٰہی شامل حال اور سعادت ابدی حاصل نہ ہو، ایسا مطلع روشن کہہ سکتا ہے ؟ واللہ یہ امر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است"

(سالنامہ صبح دکن بابتہ ۱۳۴۰ف صفحہ ۱۴)

اعلیحضرت خسرو شیریں سخن کی اُردو شاعری کو دو جداجدا حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک عاشقانہ، دوسری مذہبی۔ پہلے ہم اعلیحضرت کی پہلی قسم کی شاعری کا ذکر کرینگے کیونکہ مذہبی شاعری بہت اہم ہے اور اسکا آغاز نسبتًا بعد میں ہوا ہے۔

دنیائے شاعری کی ابتدا عشق سے ہوتی ہے اگر عشق نہ ہو تو کچھ نہیں اور عشق بھی پہلے عشق مجازی جس کیلئے صرف نظر کا لڑجانا کافی ہے۔ اسکے ساتھ ہی عشق و محبت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگرچہ سب شاعر اس منزل پر پہنچتے ہیں مگر ساتھ ہی اس ایک نگاہ میں صبر و قرار کھو کر بدحواس اور عشق مجازی میں گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اگر اس منزل میں کامیابی حاصل ہوگئی تو سالک منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

داستان عشق کی ترتیب عموماً ایک ہی ہے ان جذبات کے مد و جزر کا سلسلہ جس کے تلاطم کا باعث محض نگاہ فتنہ ساز ہوتی ہے ہمیشہ ایک رہتا ہے چنانچہ ہر شاعر اسی ترتیب سے اظہار حقیقت کرتا ہے۔ اس اظہار سے متعلق اعلیحضرت بندگان عالی کے حسب ذیل اردو شعر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نگہ کی چوٹ کھائی ہے تو کر پہلے جگر پیدا — اگر ذوق تماشا ہے تو کر ذوق نظر پیدا

ادائے حسن کی ہے شور قیامت منفعل ہر دم — کرے گی فتنۂ محشر یہ چشم فتنہ گر پیدا

اس کج ادا کے ایک خدنگ نگاہ سے — دل ہوگیا جو صید تو بسمل جگر ہوا

پھر اس خدنگ نگاہ کی تعریف یوں کی ہے کہ

اس طرح پیوست ہے پیکاں دل مجروح میں — سو جگہ سے تیر بے ٹوٹے نکل سکتا نہیں

جب کوئی ایک دفعہ وادئ عشق میں قدم رکھ لیتا ہے تو پھر اس سے پلٹنا غیر ممکن ہے۔ جذبۂ عشق بڑھتا جاتا ہے۔ یہانتک کہ زبان دل کی حالتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

ہو گئے ہیں بند رستے انکے رعب حسن سے — اپنے گھر سے آئنہ باہر نکل سکتا نہیں

پہلو سے بس ادہر وہ اٹھے اور اس طرف — دل ہل گیا وہ شدت درد جگر ہوئی

جب فراق کی کٹھن گھڑیاں شروع ہو جاتی ہیں تو عشق کے حقیقی معنی سمجھ میں آتے ہیں اور اس سے لطف اندوزی شروع ہو جاتی ہے اور اکثر دفعہ تو یہی موقع شاعری کی بنیاد کا ہوتا ہے فراق کے مضمون میں حضرت ظل سبحانی کے شعر ہیں۔

پھر صدمۂ فراق کا دل پر اثر ہوا — پھر آفتاب داغ جگر جلوہ گر ہوا

اس درجہ بے اثر مری آہ جگر ہوئی — اس بے خبر کے دل کو نہ مطلق خبر ہوئی

خیر گزری آنکھ سے ٹپکا نہ کوئی اشک خوں — آشکارا راز پنہاں ہوتے ہوتے رہ گیا

مگر اس صبر و انتظار کی انتہا تا بہ کجا؟

دل ہے مچلا چشم تو محو لقا ہو میں نہ ہوں — جان بے کل ہے کہ جس پر دل فدا ہو میں ہوں

گوندھی ہے موتیوں کی لڑی نذر یار کو — رشتہ بنی مژہ تو ہر آنسو گہر ہوا

فروغ لے گیا ہجراں میں ابر نیساں پر — گہر فشاں یہ مرا دیدۂ پر آب ہوا

برس رہا ہے جو ہجراں میں روز و شب یکساں — ہماری چشم کا بادل ہے یہ سحاب نہیں

تڑپ کے سینہ سے میرے نکل گیا آخر — شب فراق میں دل کو یہ اضطراب ہوا

ہوش کو عقل کو تقوی کو مرے ساقی نے — دے کے اک ساغر صہبائے کہن لوٹ لیا

نہ داغ مٹتے ہیں دل کے نہ زخم بھرتے ہیں — بنا ہوا ہے مرا سینہ لالہ زار ابھی

مدتوں کی بے راہ روی کے بعد جب عاشق کی طبیعت اکتا جاتی ہے تو وہ قدم شوق کو سوئے چمن لے جاتا ہے مگر وہاں

چمن کا رنگ جو دیکھا تو یہ کھلا عقدہ — یہ داغ لالہ میں میرا ہے گل میں بو میری

جب وہاں سے بھی دل بے قرار کو تسلی نہیں ہوتی ہے تو عاشق اپنے دل کو یوں تسلی دیتا ہے کہ

جھوٹی سچی خبر وصل سنا کر اے کاش — دل بے تاب کو تسکین دلائے کوئی

کیونکہ۔ نمایاں دل سے میرے اس طرح رنگ محبت ہے — چھلکتی ہے شراب سرخ گویا آبگینے سے

اس تمام عشق مجازی کے بعد اگر کچھ سمجھ میں آتا ہے تو بس یہی کہ

عشق گیسو میں کبھی دل نہ پھنسائے کوئی — مار کے منہ میں نہ یوں جان کے جائے کوئی

ان تجربوں کے حاصل کرنے کے بعد یا تو عاشق وہیں بھٹک جاتا ہے یا پھر عشق حقیقی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اعلیحضرت بندگان عالی کی شاعری آخر میں عشق حقیقی کی طرف مائل ہو جاتی ہے جس کی مثالیں آپ کی

مذہبی رنگ کی شاعری میں پیش کیجائیگی - لیکن اس سے قبل ضروری ہو کہ بندگان اقدس کی عاشقانہ شاعری کے چند اور بھی نمونے درج کئے جائیں

محبت میں نہ دل باقی نہ ہے تاب و تواں باقی
ابھی حصہ میں ہے کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی

گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہو گئے رخصت
مگر بلبل کے لب پر رہ گئی آہ و فغاں باقی

شب دوشینہ کی بدمستیاں میں کیا کہوں ساقی
نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گراں باقی

زبانِ شمع سے سنتا ہوں قصہ سوزِ الفت کا
شب آخر ہو گئی لیکن ابھی ہے داستاں باقی

کیا رسائی ہو گئی اس کی بھی چشم یار تک
نیند آتی ہی نہیں اب دیدۂ بیدار تک

ہم پہ کیا موقوف پروانے کی حالت دیکھ لو
شمع کی صورت جلا، پہنچا جو بزم یار تک

موئے مژگاں کے مقابل ہو نہ تو اے چشم شوق
یہ فغاں ناداں نکل جاتی ہے دل کے پار تک

کون اے زاہد نہیں وابستۂ عشق بتاں
رشتۂ الفت تو ہے تسبیح سے زنار تک

آبلہ پا کوئی کیا آتا ہے اے دشت جنوں
خون کی رنگت نظر آتی ہے نوکِ خار تک

دشوار ہے تحمل دردِ جگر مجھے
جی کھول کر تڑپنے دے اے چارہ گر مجھے

صیاد سے امید رہائی تھی یوں کہاں
چھوڑا قفس سے جان کے بے بال و پر مجھے

ہے برہمی بزم کا اندیشہ واعظا
آثار صبح آتے ہیں کچھ کچھ نظر مجھے

نقش وفا ہوں صفحۂ ہستی پہ جان لو
ہرگز مٹا سکیں گے نہ بیداد گر مجھے

شمع حریم عشق ہوں میں سوختہ جگر
عثماں بجھا سکے گی نہ باد سحر مجھے

پیچ میں رکھے گی سب کو زلف پیچاں کوئی ہو
طوق ہو چکر میں یا زنجیر نالاں کوئی ہو

رنگ جم سکتا ہے کس کا لعل لب کے سامنے
گل ہو یا لالہ ہو یا لعل بدخشاں کوئی ہو

ہوتی ہے عبرت گل و شبنم کا عالم دیکھ کر
کیا تماشا ہے، کوئی گریاں کوئی خنداں کوئی ہو

پنجۂ دست جنوں کو چاک کرنے سے غرض
دامن عاشق ہو یا گل کا گریباں کوئی ہو

اپنے غمزوں کو سکھاتے ہیں بہر قتل عام　　تیغ کوئی ہو سنان کوئی ہو پیکاں کوئی ہو
کیوں نہ کھل جائیں بہ رنگ گل ہر اک زخم جگر　　صورت باد بہاری جب خراماں کوئی ہو
سامنے تیرے ہیں سب طفل دبستان جنوں　　قیس ہو وامق ہو یا فرہاد غنماںؔ کوئی ہو

سر سے چلکر کیوں نہ جاؤں کوئے قاتل کی طرف　　دل میں ہے شوق شہادت اور یہ تابانہ ہے
مرغ دل کیا خال و خط سے یار پھانسا جائے گا　　راز دار حیلۂ دام و فریب دانہ ہے
ہے خزاں کے بعد آنا موسم گل کا ضرور　　کل وہی آباد ہوگا آج جو ویرانہ ہے
کوچۂ دل میں تلاش یار کرنا چاہیئے　　پھر رہا ہے دشت میں مجنوں بھی اک دیوانہ ہے
سوز دل کو سوختہ جانوں سے غنماںؔ پوچھیئے　　شمع کیا جانے کہ جلنا کس لئے پروانہ ہے

دل میں ہے وہی میرے جو آئے لب پر ہے ۴　　تلوار جو کھنچی ہے حاضر ہے گلا میرا　　ساقی ہے نہ مطرب ہے شیشہ ہے نہ ساغر ہے ۱　　کیا محفل ہستی کا نقشہ متغیر ہے
چتون ہے کہ ناوک ہے غمزہ ہے کہ خنجر ہے ۵　　انداز ترے قاتل سب جان کے دشمن ہیں　　دل ہے تو عجب دل ہے سر ہے تو عجب سر ہے ۲　　غم سے نہ فراغ اسکو سودے سے نہ وہ خالی
جو دل کو پھنساتی ہے وہ زلف معنبر ہے ۶　　جو برق گراتی ہے وہ ہی نگہ جاناں　　وہ فتنۂ خوابیدہ جو فتنۂ محشر ہے ۳　　سوتے سے جب اٹھے گا اک حشر بپا ہوگا

مرہم جو عشق کا خلش تیر ہوگئی　　کچھ کچھ تسلی دل نخچیر ہوگئی　　پابندی جنوں ہوا کرکے لو کا سلسلہ　　سب مل گئیں جو ایک میں زنجیر ہوگئی
آباد کر لے آئی عنادل کو پھر بہار　　پھر اجڑے آشیانوں کی تعمیر ہوگئی　　آنسو تھمے نہ آہ رکی جوش عشق میں　　آخر کسی کے راز کی تشہیر ہوگئی
دیکھا جو آئینے میں حقیقت کیے غور سے　　خود اپنی شکل یار کی تصویر ہوگئی

زیر تربت بھی ہے مرد دلکو جلانے کیلئے　　آگئی باد صبا شمع بجھانے کیلئے　　لطف کیا عمر جاودانی سے　　جو مماثل ہے دار فانی سے
قصر دل تاکتی رہتی ہے بڑی رغبت سے　　نگہ ہوش ربا اور بھی ڈھانے کیلئے　　فصل گل کا ہے یہ شگوفہ نیا　　مے کو ارزاں کیا ہے پانی سے
وادی عشق و محبت میں خدا حافظ ہے　　مثل دل کوئی نہیں راہ بتانے کیلئے　　مرنا بہتر ہے عشق میں اے شیخ　　کیا حصول ایسی زندگانی سے
رند اور شیخ کو ساقی کی نگاہ بد مست　　دیتی ہے جام پہ جام اور پلانے کیلئے　　خم و مینا کی طرح میں ساقی　　مست ہوں جام ارغوانی سے
بلبلوں کے جگر و دل میں ہے پتہ کیلئے　　آگئی باد خزاں آگ لگانے کیلئے　　کھپ گئی دل میں صورت جاناں　　کھنچ سکی جو نہ [illegible] مانی سے

تو انکے فیصلہ کو ایک وار باقی ہے ۔ تڑپ رہے ہیں ترے نیم بسمل اے قاتل ۔ ابھی شراب ہے خم میں بہا باقی ہے ۔ صدائے قلقل و صوت ہزار باقی ہے

ابھی تو گردش لیل و نہار باقی ہے ۔ فلک کے دور میں کیا ہو قرار کی صورت ۔ یہی تڑپ جو دل بیقرار باقی ہے ۔ نہ بعد مرگ بھی سوئینگے چین سے دم بھر

کہ بعد مرگ بھی شمع مزار باقی ہے ۔ نسیم صبح چلے کیوں نہ رشک سے عثماں ۔ نشہ اتر چکا لیکن خمار باقی ہے ۔ مئے شبینہ کی تاثیر کیا کہوں ساقی

مطلب اس بات کا سمجھے خم شمشیر سے ہم ۔ خون ناحق سے ہمارے ہے پشیماں قاتل ۔ روبرو انکے پہنچتے کسی تدبیر سے ہم ۔ آئنہ ہوتے اگر خوبی تقدیر سے ہم

تنگ آئے ہیں بہت نالہ شبگیر سے ہم ۔ فتنے اٹھ اٹھ کے یہ کہتے ہیں قد آفت جاں ۔ پوچھتے ملتے اگر کاتب تقدیر سے ہم ۔ یار کا وصل مقدر میں لکھا ہے کہ نہیں

دل کو بہلاتے ہیں کیا کیا تری تصویر سے ہم ۔ شب غم میں ہے یہ حالت کہ سحر تک ظالم ۔ رشتہ رکھتے ہیں تری زلف گرہ گیر سے ہم ۔ منحصر سود و زیاں پر نہیں سودا تیرا

ایک طومار ہے افسانہ کاکل عثماں ۔ باز آئے تری اس پیچ کی تقریر سے ہم

مذہبی شاعری ۔ اعلیحضرت ظل سبحانی کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت مذہب و معتقدات کی جھلک اور ایمان و ایقان کے سعادت ریز تخیلات ہیں دنیا میں انسان کیلئے سب سے زیادہ اہم مذہب ہے ۔ جب تک یہ درست نہیں انسان کا کوئی کام درست نہیں ہوتا ۔ یہ اعلیحضرت خسرو دکن کی عظیم الشان شخصیت کی دلیل ہے کہ آپ کی شاعری عشق مجازی سے گزر کر عشق حقیقی کی طرف مائل ہوگئی اور آپ جہاں علم و فضل اور شعر و سخن کی دنیا میں انقلاب کا باعث ہوئے، مذہب و اعتقاد کے استحکام اور اخلاق و معاشرت کی اصلاح کی طرف بھی مائل ہیں ۔ سب سے پہلے آپکے کلام میں حضرت سرور عالمؐ کے نعتیہ اشعار نظر آتے ہیں ۔ حمد اور نعت لکھنا آسان کام نہیں ہے ۔ حضرت رسول خداؐ کی محبت اور تعظیم اور مذہبی اصول و نظریات کا فطری طور پر مسلط ہونا اور ان تاثرات کا شاعری میں پرجوش اور عقیدت مندانہ اظہار عظمت انسانی کی اعلیٰ صفات کی روشن مثالوں کو پیش کرنا ہے جس سے ہر انسان کو سبق لینا چاہیئے ۔ حضرت بندگان عالی نے فارسی نعت میں بڑے اچھے اچھے شعر لکھے ہیں لیکن یہ جذبہ اردو میں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ فرماتے ہیں ۔

حشر میں جس سمت تائید خدا ہوتی نہ ہو ۔ امتی حضرت کا ہو عثماں یہ ممکن ہی نہیں ۔ قسمت سے اپنی کاش رسائی اگر ہوئی ۔ خاک مدینہ آنکھ میں عثماں لگائیے

قدم جو رکھنا وہاں پہلے سجدہ کر لینا ۔ در حرم پہ رسائی ہو جب بھی عثماں ۔ چلا جاتا ہوں گرد کارواں میں ۔ رہ طیبہ میں گرتے پڑتے عثماں

نہ ہے ثانی نہ ہی ہمسر نہ ہے کوئی تمثیل ۔ قد بے سایہ ہے شاہد کہ شہ طیبہ کا ۔ جیسے قرآں پس توریت و زبور و انجیل ۔ سب رسولوں پہ ہوئی یوں ہی ختم رسل کو تفضیل

ایک سچا مسلمان محمدؐ اور آل محمدؐ کی مدح کو عقیدتاً جزو ایمان سمجھتا ہے اظہار محبت کا یہی طریقہ ہے کہ جس سے انسان کو محبت ہے اس کی خوشی میں خوش ہو اور اس کی مصیبت پر متالم۔ حضرت جہاں پناہی اگرچہ وسیع مملکت کے بادشاہ ہیں لیکن باوجود اس جاہ و جلال کے پیغمبر اسلام کے امتی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ جذبات عقیدت کا اظہار ایک سچے مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ دل میں جب حقیقی تاثرات کا جوش ہوتا ہے تو زبان اظہار حقیقت پر مجبور ہوتی ہے۔ بندگان عالی رعیت کیلئے ظل اللہ ہیں اور خود کیلئے دامان نبی کا سایہ ڈھونڈتے ہیں۔

میں عثماں زیر دامان نبی ہوں   مرے کام آئے کیا سایہ ہما کا

عید غدیر کے موقع پر سلطان العلوم کی ایک غزل نکلتی ہے۔ اشعار کی شرح خود حضرت فرماتے ہیں۔ حدیث خم کے مطالب و معانی اشعار کے ذریعہ جس خوبی کے ساتھ واضح کئے گئے ہیں اسکو کچھ اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس غزل کا مقطع معہ شرح سرکار پیش کیا جاتا ہے۔   نقش اول علیؓ کا اے عثماں   صاف ظاہر ہے کلک مانی سے

شرح: سبحان اللہ کہ اس کا معنی امثل آفتاب کے روشن ہے یعنے رسول خدا نے حدیث بالا سے جو رفعت علی کی چہار دانگ عالم میں بڑھائی تھی تو وہ نقش اول سے تعبیر کی گئی ہے جو کہ خود اس امر پر دال ہے کہ ایسی نعمت عظمیٰ حاصل کرنے میں یہ شخص صف دیگراں میں اولین تھا اور کلک مانی کا اشارہ رسالت مآب کی طرف ہے بایں وجہ کہ ایسا نقش بجز ایسے مہتم بالشان قلم کے کوئی دوسرا بزہ پھونی نہیں کھینچ سکتا تھا۔ لاشک فیہ"

حدیث نور کے مطالب بھی ایک غزل کے ذریعہ واضح فرمائے گئے ہیں۔ جسکے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

ہیں مصطفےٰؐ و علیؓ ایک نور اطہر سے   عجیب نقش کھنچا کلک صنع داور سے
حسن حسینؓ کا باطن تو واسطے ظہور   نسیم گل کا ہے معدن گل صنوبر سے
یہ کیسے فضل و شرف میں قلم بھی ہے حیران   یہ نقش کھینچا آساں نہیں سخنور سے
ہے خاص شنہ جو تسبیح کو امام سا تھے   بھری وہ جاتی ہے عثماں ید مطہر سے

مقطع کا مضمون جس قدر بلیغ ہے وہ ظاہر ہے۔ سلطان العلوم کی تشریح نے اسکی شان اور دوبالا کردی :-

"یعنے یہ تسبیح ایسی مقدس ہے جس کے بارہ میں آیہ تطہیر نازل ہوئی تھی اور امام تسبیح کا رشتہ امام اولین بنایا گیا ہے اور ید مطہر کا اشارہ رسالت مآب کی طرف ہے سچ ہے لا یمسہ الا المطہرون"۔

بتقریب عید امیر (۱۳ رجب - روز ولادت جناب امیرؑ) جو غزل ارشاد فرمائی گئی وہ اس قدر جوشِ عقیدت سے معمور ہے کہ پڑھنے والا بھی اس جوش کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور سلطان العلوم کے مسلم الثبوت قدرت کلام کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

احمد شہ رسل تھی علیؑ تجھے وزیر سے   مانگا تھا ابن عم کو خدائے قدیر سے
ہے یہ کرشمہ ساقی کوثر کی چشم کا   مے آج جو ٹپکتی ہے خم غدیر سے

ایام گل میں زاہد و واعظ کا ہو وہ رنگ   آتے نظر ہیں پیر مغاں کے منیر سے
رتبہ سمجھ تو اپنا بھی عثماں اسی سے آج   بن ہی گیا جسے ہوئی نسبت امیر سے

اس مقطع کی نسبت کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک جلیل القدر بادشاہ کے قلم سے نکل رہا ہے۔ یہ ہے ایک سچے مسلمان کی شان جو اظہار صداقت میں کبھی پس و پیش نہیں کرتا خواہ وہ عقیدتاً اپنے ہی سے متعلق کیوں نہ ہو۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اعلیحضرت سلطان العلوم خسرو دکن کی چند مذہبی نظموں کے منتخب اشعار پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

بیزار ہو کے بلبل سینہ فگار سے   گل سارے ہو گئے تھے جدا مرغزار سے
کہتا جگر ہے جو میں اٹھائی ہیں اسقدر   گننی محال دست دل و اغدار سے

لا علم ہے جنا بھی شہیدوں کے خوں سے آج   پوچھو ذرا یہ لالہ و گل سے ہزار سے
خم غدیر کہتا ہے یہ ہے مئے ولا   جاتی ہے جو چھلک قدح زرنگار سے

عثماں نسیم چلتی ہے بیت الحرم سے آج   ٹکرا کے اپنے سر کو بھی سنگ مزار سے

ایک سجاد تجھے جن پہ ہوئیں تعزیریں دو   پائے نازک میں پہنائی گئیں زنجیریں دو
شمر کہتا تھا علم لے لو بہادو پانی   قتل عباس کی ہیں بس یہی تدبیریں دو

نسخۂ عفو گنہ شمع مزار تاریک   خاک قبر شہ والا کی ہیں اکسیریں دو
روئے ہم صورت احمد پہ ہیں گیسو دوتا   یا کہ ہیں سورۂ واللیل کی تفسیریں دو

مہ و خورشید فلک پر جو نظر آتے ہیں   رخ ہم شکل نبی کی ہیں یہ تنویریں دو
ابروئے سبط پیمبر کا جو رہتا ہے خیال   دمبدم چلتی ہیں دل پر مرے شمشیریں دو

وصف کیا شبر و شبیر کا عثماں ہو رقم   ہو بہو حیدر صفدر کی ہیں تصویریں دو

سلام

ہے گلا سرور کا اور قاتل کا خنجر تیز ہے   کربلا کا سانحہ بھی کیا قیامت خیز ہے
ہے علی اللہ کا ہمنام نام ایسا تو ہو   خانہ زاد حق ہوا ذو الاحترام ایسا تو ہو

سرگزشت کربلا سنیے کلیجہ تھام کر   حرف حرف اس داستان غم کا درد انگیز ہے
انس و جن و وحش و طیر و قدسی و غلمان و حور   سب کے سب بیعت کریں جس کی امام ایسا تو ہو

رنج و غم کھاتے ہیں عابد فرقت شبیر میں   نعمت کونین سے بیمار کو پرہیز ہے
کہہ رہی تھی خود شجاعت حضرت عباس کی   مرد میدان شیر دل صاحب حسام ایسا تو ہو

بس گئی ہے عطر میں مقتل کی ساری سر زمیں   اکبر ذیجاہ کی کیا زلف عنبر بیز ہے
اکبر و اصغر کا جلوہ دیکھکر کہتا تھا چرخ   ماہ نو ایسا تو ہو ماہ تمام ایسا تو ہو

نشہ اسکا حشر تک عثماں اتر سکتا نہیں   بادۂ حب علی سے دل مرا لبریز ہے
رنگ بیدار کردہ عثماں شاہ دکن کی مدح میں   سب کہیں صد آفریں حسن کلام ایسا تو ہو

اب چشم عنایت سے پیاس اسکی بجھا دیجئے — بیتاب بہت عثماں یا ساقی کوثر ہے

کھل گیا پایۂ علی عثماں — دفتر حکمت و معانی سے

مصحف پاک بھی گویا ہے زباں سے عثماں — کہ مجھے چھو گئے ہیں دست مطہر کیسے

خود کو مٹا دیا جو در بوتراب پر — عثماں ہماری خاک بھی اکسیر ہو گئی

مختلف تقریبوں کے موقعوں پر بھی اعلیحضرت کی مذہبی و اصلاحی نظمیں اخبارات و رسائل کیلئے باعث زینت ہوتی ہیں۔ ایک نظم "تحفۂ شب برات" کے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

زمانہ آج نہ پوچھو کس انقلاب میں ہے — کہ لطف پیری میں باقی نہ کچھ شباب میں ہے

نتیجہ گردش گردوں کا جو ہے ظاہر ہے — کہ شان سابقہ باقی نہیں حجاب میں ہے

الٰہی خیر ہو خرمن کی آج برق طپاں — یہ پھرتی کوندتی کیوں دامن سحاب میں ہے

نہیں قرار تموج کو ایک لمحہ بھی — یہ رنگ زیست بھی تو صورت حباب میں ہے

بتا دے تو ہی ذرا ساقیا مجھے اتنا — کہ تلخی آج یہ کیسی تری شراب میں ہے

بتاؤں کیا تجھے عثماں کہ تو نہیں واقف — جو سر بلندی و رفعت کہ بوتراب میں ہے

اعلیحضرت خسرو دکن کو اپنی سلطنت کی زبان اردو کا اتنا خیال ہے کہ فارسی میں ایک ترانہ لکھنے کے بعد اردو میں بھی ایک ترانہ لکھکر اہل ملک کو سرفراز فرمایا یہ ترانہ اتنا مقبول ہوا کہ مملکت آصفی کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے اور ہم بھی اسی کو نقل کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے — تجھ کو عثماں بصد اجلال سلامت رکھے — جیسے تو فخر سلاطیں ہے بفضل یزداں — یوں ہی ممتاز تر اور حکومت رکھے

آل و اولاد کو اللہ دے عمر خضری — ان سے آباد ترا خانۂ دولت رکھے — جود حاتم رہے شرمندۂ احساں تیرا — عدل کسریٰ کو خجل تیری عدالت رکھے

خندہ زن صورت گل تیرے ہوا خواہ رہیں — آگے قدموں کے عدو فرق اطاعت رکھے — سب رعایا کو تری سالگرہ کی تقریب — با نشاط و طرب و عیش و مسرت رکھے

بن کے ساقی ترا اقبال نظام سابع — تجھ کو صہبا کش خمخانۂ عشرت رکھے

نواب محمد لطف الدین خان لطافت جنگ لطف الدولہ لطف مرحوم

حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

لطف

نواب محمد لطف الدین خاں لطافت جنگ لطف الدولہ مرحوم

سنہ ۱۳۰۰ ہجری — سنہ ۱۳۵۶ ہ

از مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب متعلم ایم۔ اے (عثمانیہ)

نواب لطف الدولہ بہادر حیدرآباد کے اس مشہور و معروف خاندان کے قابل فخر سپوت تھے جس نے ڈیڑھ صدی سے ملک و مالک کی خدمت کو اپنا فریضۂ اولین بنا رکھا ہے۔ انکے والد نواب محمد حفیظ الدین خاں ظفر جنگ شمس الدولہ شمس الملک نواب افضل الدولہ بہادر کے چہیتے نواسے تھے اور اپنی وفات سنہ ۱۳۲۴ھ تک امیر پائیگاہ کی خدمت کے علاوہ معین المہامی فوج وغیرہ کے جلیل القدر خدمات بھی انجام دیں اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ جوانمرگ نہوتے تو مدار المہامی کے جلیل القدر عہدہ پر بھی فائز ہوتے۔

نواب لطف الدولہ بہادر کے دادا نواب محمد محی الدین خاں تیغ جنگ خورشید الدولہ خورشید الملک امیر کبیر سر خورشید جاہ شمس الامرا خامس حیدرآباد کے بڑے صاحب اقتدار اور باثروت امیر تھے۔ انکے رعب و داب، تدبر و فراست اور اولیا اللہ کے ساتھ حسن اعتقاد کی ہندوستان بھر میں شہرت تھی۔ اکثر درگاہوں میں انکی تعمیر کردہ جالیاں، گنبد اور دیگر آثار ابتک موجود ہیں جن پر ان کے نام کے کتبے بھی نصب ہیں۔ نواب سر خورشید جاہ کے والد نواب محمد رشید الدین خاں شمس الدولہ شمس الامرا رابع امیر کبیر ثالث وقار الامرا تھے جنھوں نے اعلیحضرت غفران مکان آصفجاہ سادس کے زمانہ صغر سنی میں نائب حضوری کے فرائض انجام دیے تھے۔ انکے والد نواب محمد فخر الدین شمس الامرا ثانی امیر کبیر اول اس خاندان پائیگاہ کے بانی ہیں جنکی ہستی محتاج تعارف نہیں اس خاندان کے جملہ ارکین کے متعلق کتابوں اور

تذکروں میں تفصیلی معلومات شائع ہو چکی ہیں اور مرقع سخن کی پہلی جلد میں اسی خاندان کے ایک رکن نواب محمد ظہیر الدین خان بہادر
نے نواب محمد بدر الدین خان معظم الملک تمیز کے تذکرہ میں بھی اس خاندان کی علم دوستی و معارف پروری پر روشنی ڈالی ہے
اور خاندان شمس الامراء کی علمی خدمات پر ایک بسیط کتاب قلمبند کر رہے ہیں۔ یہاں صرف اس امر کا اظہار کافی ہے کہ
خانوادۂ شاہی کے بعد حیدرآباد میں پائیگاہ ہی کے خانوادوں کو خاص مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل رہی ہے۔ خاندان آصفی
کی شہزادیاں بھی اکثر و بیشتر اسی خاندان پائیگاہ میں بیاہی گئی ہیں اور صاحبان سیف ہونے کے علاوہ پائیگاہ کے متعدد
امرا صاحب قلم اور معارف پرور بھی گذرے ہیں خود نواب لطف الدولہ بہادر کے والد نواب ظفر جنگ بہادر بھی بزرگوں اور
اولیاء کے بڑے معتقد تھے اور آخر عمر میں خود بھی صاحب دلی کے مرتبہ تک پہنچ چکے تھے۔

نواب لطف الدولہ بہادر رمضان ۱۳۰۰ھ میں تولد ہوئے علوم متداولہ میں کافی استعداد حاصل کی، خوشنویسی
سے خاص شغف تھا۔ اوائل عمر ہی سے شعر و سخن میں دلچسپی لینی شروع کی تھی اور تاریخ گوئی میں تو خاص ملکہ تھا۔
باوجود ان خوبیوں کے نہایت سادہ مزاج تھے اور طبیعت میں انکسار تھا کبھی خود کو شاعر یا عالم و فاضل نہیں سمجھتے تھے
ملک و مالک کی بہی خواہی کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ ۱۳۲۶ف میں صیغہ عدالت کی معین المہامی آپ کے تفویض کی گئی
تھی لیکن ایک سال بعد ہی جب پائیگاہ واگذاشت ہوئی تو معین المہامی جیسی خدمت جلیلہ کو چھوڑ کر اپنے اسٹیٹ
کے انتظام میں منہمک ہو گئے اور چند سال ہی کے عرصہ میں قرضوں وغیرہ کو ادا کر کے اپنی پائیگاہ کی مالی و انتظامی حالت
کو مستحکم کر لیا۔ لیکن ۱۳۳۷ف میں ان کو پھر باب حکومت کی رکنیت قبول کرنی پڑی جس پر وہ آخر دم تک فائض رہے
اور ساتھ ہی پائیگاہ کا کام بھی حسب سابق اسی خوبی سے انجام دیتے رہے۔

نواب لطف الدولہ بہادر کی ذات سے ملک کی بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں مہاراجہ یمین السلطنت بہادر
کے صدر اعظمی سے سبکدوش ہونے کے بعد باب حکومت میں طبقۂ امراء میں سے کوئی باقی نہ رہا تھا تمام ملک کی نظریں
امرائے عظام میں سے انہیں کی طرف لگی ہوئی تھیں اور توقع تھی کہ وہ اپنے آباء و اجداد کی طرح ملک کی گراں قدر خدمات
انجام دیتے۔ انکی طبیعت میں استقامت، اور اخلاقی جرأت حد درجہ تھی جس بات کو ملک کیلئے مفید سمجھتے سختی سے

مخالفتوں کے باوجود بھی اُس پر اڑے رہتے۔

معاملہ فہمی اور سخن شناسی سے بھی بہرہ ور تھے بیجا تکلفات اور خوشامد کو ناپسند کرتے تھے انکی شاعری داد طلبی یا شہرت کیلئے نہیں بلکہ محض فطری لگاؤ اور ذوق سلیم کا نتیجہ تھی۔

دیوان مرتب ہوچکا تھا لیکن کلام کے شائع کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ مرقع سخن کیلئے جب ان سے نمونہ کلام دینے کی خواہش کی گئی تو انہوں نے اول اول اپنے شاعر ہونے ہی سے انکار کر دیا' کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن عروض اور زبان کے نکات سے اچھی طرح واقف تھے۔ ایک عظیم الشان رئیس اور مشغول حاکم کیلئے آسان نہیں ہے کہ وہ دیگر شعراء کی طرح جملہ لوازم شعری کا اپنے کلام میں التزام رکھے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ نواب لطف الدولہ مرحوم نے باوجود قسم قسم کی مصروفیتوں کے اردو زبان کے شعراء میں بھی ایک خاص مرتبہ حاصل کر لیا تھا اور اپنے بعد اپنے محامد اخلاق اور دیگر کارناموں کے ساتھ اپنے کلام کو بھی اپنی یادگار میں چھوڑ گئے جو آئندہ نسلوں پر یہ واضح کرتا رہیگا کہ ہمارے ملک کے امراء عظام بھی باوجود مصروفیتوں اور دیگر دلچسپیوں کے اردو زبان کی خدمت میں منہمک رہتے تھے علم و فضل و شعر و سخن کی سرپرستی کو انہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔

نواب لطف الدولہ بہادر کثرت کار کی وجہ سے مضمحل ہو گئے تھے لیکن خرابی صحت کے باوجود برابر کام کرتے رہے جب تکلیف بڑھ گئی تو ڈاکٹروں کے مشورہ پر علاج کی خاطر یورپ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں صحت حاصل ہوچکی تھی اور اپنے عزیز وطن کو واپس ہو رہے تھے کہ راستہ میں جدہ کے قریب جہاز میں ان پر نمونیا کا حملہ ہوا اور ۱۶ محرم ۱۳۵۶ھ کو جہاز ہی میں وفات پائی۔ انکی لاش جمعہ کو حیدرآباد لائی گئی اور مکہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی گئی جنازہ کے ساتھ تیس ہزار سے زائد آدمیوں کا مجمع تھا کہا جاتا ہے کہ گذشتہ تیس سال میں کسی جنازہ کے ساتھ خلق اللہ کا اتنا اژدحام نہ ہوا تھا۔

اب ہم انکے نمونہ کلام پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں اور سب سے پہلے انکی نعتیہ غزلیں پیش کی جاتی ہیں جنکے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب مرحوم کے سینہ میں کیسا درد آشنا اور عقیدت مند دل تھا۔ انکے ہاں تکلف اور آورد نام کو نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ جو شاعر کے دل میں تھا وہی زبان پر آ گیا۔

نعت

یہ وہ شب ہے ہوا ہے اس میں وہ خیر البشر پیدا
ہوا ہے اور نہ ہوگا کوئی ایسا عمر بھر پیدا

تمہارے ظلِ گیسو سے شبِ یلدا ہوئی ظاہر
تمہارے عکسِ عارض سے ہوئے شمس و قمر پیدا

تمہاری ذاتِ اقدس سے ہیں سب کونین کے جلوے
نہ ہوتا کوئی بھی پیدا نہ ہوتے تم اگر پیدا

سمایا ہے مری آنکھوں میں نورِ مصطفےٰ جب سے
ہوئے ہیں اور شہبازِ نظر کو بال و پر پیدا

کہاں نورِ الٰہی اور کہاں یہ چشمِ انسانی
تمہارا دیکھنے والا کرے پہلے نظر پیدا

خدا کے نور سے تم ہو تمہارے نور سے سارے
حجر پیدا۔ شجر پیدا ملک پیدا البشر پیدا

خدا کے علمِ لامحدود کے تم شکلِ اول ہو
تم ہی آخر ہوئے پیدا تم ہی ہو پیشتر پیدا

مسلم بات ہے علمِ الٰہی غیر فانی ہے
حقیقت موت کی یہ ہے ادہر پنہاں ادہر پیدا

مئے وحدت شرابِ معرفت وہ چیز ہے اے لطف
پیئے جاؤ نہیں ہوتا ہے اس سے دردِ سر پیدا

یا رسولِ عربی حاملِ قرآن ہیں آپ
بات ایمان کی یہ ہے میرا ایمان ہیں آپ

نورِ مطلق کی کوئی شان جو پوچھے مجھ سے
میں یہ بولونگا کہ الآن کما کان ہیں آپ

آپ فرمائیے اے برزخِ کبریٰ کیا ہے
یہ جو قرآن میں آیا ہے کہ انسان ہیں آپ

کون ہیں آپ یہ ہر ایک بشر جانتا ہے
خلق آدم فی صورتِ رحمٰن ہیں آپ

مظہرِ ذاتِ احد نامِ مبارک احمد
فقط اک میم کے آجانے سے انسان ہیں آپ

خوفِ ایمان یہ کہتا ہے رہے پاسِ ادب
عشق کہتا ہے پکارو کہ مری جان ہیں آپ

کبھی کہتا ہوں کہ ہیں عفوِ معاصی کے کفیل
کبھی کہتا ہوں مرے حسرت و ارمان ہیں آپ

لطف کو فخرِ غلامی ہے بہ اُمّی و ابی
میرے آقا میرے مالک میرے سلطان ہیں آپ

جشنِ میلاد کا ہے آج کی رات   لب پہ صلِّ علیٰ ہے آج کی رات   شغلِ حمد و ثنا ہے آج کی رات   ذکرِ یا مصطفےٰ ہے آج کی رات

حضرتِ آمنہ کی گودی میں   کیا ہی نورِ خدا ہے آج کی رات   نور سے جس کے کائنات بنی   خود وہ جلوہ فزا ہے آج کی رات

دیکھ لو جلوہ گر ہے مظہرِ ذات   پوچھتے کیا ہو کیا ہے آج کی رات   قابلِ حبّذا ہے آج کا دن   لائقِ مرحبا ہے آج کی رات

لطفؔ دولہ غلام کمتر بھی   شہ کا مدحت سرا ہے آج کی رات

ظہورِ نورِ مطلق مظہرِ ذاتِ خدا تم ہو   خدا کے بعد جو کچھ ہو محمد مصطفےٰ تم ہو   گنہگارانِ امت ڈرتے ہیں کب روزِ محشر سے   انہیں پورا یقیں ہے شافعِ روزِ جزا تم ہو

سمجھ کر دل کو کعبہ میں نے پہلو میں جگہ دی تھی   خدا کی شان ہی اس میں تو اب نامِ خدا تم ہو   تمہارے روئے روشن سے ظہورِ نورِ خالق ہے   خدائی شان سے کونین میں جلوہ نما تم ہو

نہ ترساؤ خدا کے واسطے اے برزخِ کبریٰ   اٹھاؤ پردۂ وحدت دکھا دو مجھکو کیا تم ہو   نظر اللہ کی اب لطف پر ہو یا رسول اللہ   غریبوں کا وسیلہ بیکسوں کا آسرا تم ہو

غزلیات

وصل کی رات وہ صحبت مجھے یاد آتی ہے   بیٹھے بیٹھے کوئی صورت مجھے یاد آتی ہے

نام سنتا ہوں کسی سے جو محبت کا کبھی   دل لگانے کی مصیبت مجھے یاد آتی ہے

جب انہیں جانے سے روکا تو وہ پھر ٹھہر گئے   ہائے وہ انکی مروت مجھے یاد آتی ہے

لطفؔ کا آپ نے جس لطف سے دل ہاتھ لیا   بندہ پرور وہ عنایت مجھے یاد آتی ہے

ملی اتنے سے دلکو کیسی سمائی   کہ اس میں ہے ساری خدا کی خدائی   اگر کفر ہے یا ہے اسلام سچ ہے   کہ انّی انا اللہ لیس سوائی

پھر ملکِ دل میں آئی نہ کیونکر   بتوں کی ڈھنڈوری تھی کی دہائی   وہ اب پوچھتے بھی نہیں مجھکو برسوں   گوارا نہ تھی جنکو دم بھر جدائی

چھلکنے لگا دو ہی ساغر میں ساقی   پرانی کہاں کی یہ ایسی پلائی   تمنا ہے اسکو بھی دیکھوں کسی دن   مجھے جسنے صورت تمہاری دکھائی

نہیں مانتا لطفؔ کہنا کسی کا   خدا جانے کیا اسکے جی میں سمائی

چال فتنہ نہیں تو پھر کیا ہے   حشر پیدا نہیں تو پھر کیا ہے   دل کے اندر کھٹک رہا ہے کچھ   تیر انکا نہیں تو پھر کیا ہے

سامنے میرے غیر سے ہنسنا   یہ رلانا نہیں تو پھر کیا ہے   دل کو دیکر ہے درد سر لینا   عشق جھگڑا نہیں تو پھر کیا ہے

غیر کے ہاتھ مجھکو خط بھیجا   یہ جلانا نہیں تو پھر کیا ہے   مجھکو بھیجی ہے غیر کی تصویر   یہ تماشا نہیں تو پھر کیا ہے

آپ کا روز غیر سے ملنا یہ لڑانا نہیں تو پھر کیا ہے پوچھتا ہوں عدو سے انکا حال مجھکو سودا نہیں تو پھر کیا ہے

لطفؔ سے لطف زندگی سمجھو جب یہ بندہ نہیں تو پھر کیا ہے

نہیں اک ہمیں مبتلا ہونے والے بہت سے ہیں تم پر فدا ہونے والے

ترے گیسوؤں پر فدا ہونے والے ہمیں ہیں اسیر بلا ہونے والے

ہمارے سر آنکھوں پہ غصہ تمھارا سلامت رہو تم خفا ہونے والے

قسم آپ کھاتے ہیں کہتی ہے چتون یہ وعدے نہیں ہیں وفا ہونے والے

مری آہ دیکھی رقیبوں کو دیکھو ٹھہرتے کہاں ہیں ہوا ہونے والے

تو کیا جانے ان کی حقیقت کو زاہد یہی بت ہیں آخر خدا ہونے والے

زمانہ ہو یا آسماں ہو ستم میں نہیں تجھ سے ظالم سوا ہونے والے

خبر کیا تھی قاتل کہ پیکاں ہیں تیرے مرے درد دل کی دوا ہونے والے

مجھے کیوں نہ تڑپائیں وہ جانتے ہیں یہ نالے نہیں ہیں رسا ہونے والے

شب وصل جتنا وہ چاہیں ستالیں بھلا لطفؔ ہیں بے مزا ہونے والے

ہوئیں بت پرستی میں نادانیاں خدا سے بہت ہیں پشیمانیاں

اٹھائی ہیں زلفوں کی الجھن سے ہم نے پریشانیوں پر پریشانیاں

ہوئی ہیں زمانہ پہ آئینہ کیا کیا مرے دیدۂ و دل کی حیرانیاں

دیا درد الفت زمانہ کو اپنا بتوں نے سکھائیں خدا دانیاں

بنا سنگ در تیرا کس کس کا کعبہ گھسیں ہائے کن کن کی پیشانیاں

جو قسمت میں لکھا ہی ہوتا ہے پورا وہ پیش آتی ہیں جو ہیں پیش آنیاں

مجھے رات دن لطفؔ ناصح سے اپنے سخن سنجیاں ہیں سخن دانیاں

PHOTO: RAJA DEEN DAYAL.

ہز اکسلنسی نواب محمد معین الدین خاں اعانت جنگ
معین الدولہ بہادر معین

معینؔ

نواب محمد معین الدینخاں اعانت جنگ معین الدولہ بہادر

از۔ سید ابوالفضل صاحب ؒ (۱۳۰۸ھ) ام اے

عہد قطب شاہیہ کے بعد دکن میں جسطرح سلاطین آصفیہ کی علمی سرپرستی ابتداء سے آج تک ضرب المثل رہی ہے، اسی طرح امرائے پائیگاہ کے مساعی جمیلہ بھی دکن کی ادبی تاریخ کو حیات جاوید عطا کرنے میں کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ امیر کبیر نواب محمد فخرالدینخاں شمس الامرا، نواب محمد رفیع الدینخاں عمدۃ الملک۔ نواب بدرالدینخاں معظم الملک تمیزؔ اور نواب امیر اکبر محمد مظہر الدین خاں آسمانجاہ جیسے مشاہیر اس خاندان کے نام نیک کو عمر جاوداں عطا کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔

نواب محمد معین الدینخاں اعانت جنگ معین الدولہ بہادر معینؔ بھی اسی عظیم الشان خانوادہ کے ایک رفیع المرتبت فرد ہیں۔ جنکی ذات میں شعر و سخن، مکارم اخلاق، اور اعلی سپہ گری کی جملہ خصوصیتیں لبطرز اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ نواب محمد مظہر الدینخاں رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک اعظم الامرا امیر اکبر سر آسمانجاہ بہادر سی۔آئی۔ای کے اکلوتے فرزند ہیں اور بتاریخ ۷ ، ذیقعدہ ۱۳۰۸ھ بروز دوشنبہ بمقام سرورنگر پیدا ہوئے۔ انکے اجداد کا سلسلہ حضرت بابا شیخ فرید گنج شکرؒ سے ملتا ہے۔ دیگر خاندانی حالات انکے فرزند اکبر نواب محمد ظہیر الدینخاں بہادر بی۔ اے کے مضمون "معظم الملک بدرالدینخاں تمیزؔ" (مطبوعہ مرقع سخن جلد اول) میں نہایت خوبی سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ آٹھ سال کی عمر میں حضرت معینؔ کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا اسلئے ابتدائی تعلیم حضرت غفراں مکاںؒ نے خود اپنے ذمہ لی اور فقید النظیر و عدیم المثال اساتذہ کا تقرر فرمایا۔ علوم متعارفہ و متداولہ معقول و منقول کے علاوہ تحصیل السنہ نیز سخن فہمی اور سخن سنجی کیلئے ضروری تھا کہ دیگر قابل اساتذہ سے بھی استفادہ کریں چنانچہ حضرت معینؔ نے یہی کیا اور نتیجتہً اردو، ہندی، فارسی عربی اور انگریزی میں کافی مہارت حاصل کرلی۔

۱۶ رجب ۱۳۳۶ھ میں نواب اعانت جنگ بہادر کا اور ۲۵ رجمادی الثانی ۱۳۴۱ھ میں معین الدولہ کا خطاب سرفراز ہوا پھر ۱۳۴۲ھ میں محکمہ صنعت و حرفت کے صدر المہام اور باب حکومت کے رکن بنائے گئے۔ اسکے ایک سال بعد یعنی ۱۳۴۳ھ میں محکمہ افواج کی صدر المہامی تفویض کیگئی۔ ۱۳۴۵ھ میں جب پائیگاہ واگذاشت ہوئی تو متذکرہ بالا عہدوں سے سبکدوشی حاصل کر کے خود اپنے اسٹیٹ یعنی پائیگاہ سر آسمانجاہ بہادر کے انتظام و انصرام کی طرف بذات خود متوجہ ہو گئے۔

سرکاری خدمات سے عہدہ برآ ہونے کے بعد علوم و فنون اور شعر و سخن کے ذوق کی ترقی کا موقع ملنے لگا۔ چنانچہ اب دلچسپی اور بڑھ گئی ہے لیکن اس ادبی شغف کے قطع نظر بھی وہ بہمہ وجوہ ایک قابل تقلید ہستی کی مثال پیش کرتے ہیں۔

فنون سپہ گری میں آج سرزمین دکن میں انکا ہمسر مشکل سے نظر آتا ہے۔ نشانہ بازی میں شاید ہی معدودے چند انکے پایہ کے نشانہ انداز نکل سکیں۔ شکار کے معلومات اور تجربے جتنے انہیں حاصل ہوئے ہیں شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوں۔ سیر و شکار کے اس طویل زمانے میں وہ اپنا روزنامچہ برابر لکھتے رہے ہیں۔ چنانچہ ان روزنامچوں میں اتنے دلچسپ واقعات اور ایسے جرأت آزما تجربے پیش ہو گئے ہیں کہ شکار سے متعلق کوئی مستند کتاب بھی بمشکل ان کا جواب پیش کر سکیگی۔

نواب معین الدولہ بہادر نے بعض نہایت خوفناک اور سنسنی خیز شکار کئے ہیں جنکی وجہ سے دنیائے شکار میں انکی دلیری اور جوانمردی اور نشانہ بازی کی دھاک بیٹھ گئی۔ سفر کشمیر میں انہوں نے ایک عظیم الجثہ اژدھے کا مقابلہ کر کے اسکو مار ڈالا اور دہلی کے سفر میں ایک خونخوار گھڑیال کا خاتمہ کیا۔ اس قسم کے اتنے واقعات ہیں کہ اگر انہی کی تفصیل لکھی جائے تو ایک جدا کتاب بن جائے۔ حضرت معین کا اسلحہ خانہ بھی قابل دید ہے اور انکے شوق کا نمایاں ثبوت ہے۔ انھوں نے اتنک چوراسی [۸۴] شیروں کا شکار کیا ہے جو ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انکے "چڑیا گھر" (zoo) کو نہ صرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان میں بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایک با کمال شہسوار ہیں اور پولو کے زبردست کھلاڑی رہ چکے ہیں۔

تفریحی مشاغل کے سلسلے میں انہیں آجکل کرکٹ سے بیحد دلچسپی ہے اور چند سال پیشتر سے اسکی ترقی میں سب سے نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ انکے اپنے صرفے پر دنیا کی بعض مشہور کرکٹ ٹیمیں حیدر آباد آئیں جہاں انکی ٹیم نے انکے شاندار مقابلے کئے۔ آل انڈیا گولڈ کپ کرکٹ ٹورنمنٹ انکا سب سے زیادہ شاندار کارنامہ ہے۔ اہل دکن میں کرکٹ سے روز بروز دلچسپی پیدا ہونے کا بڑا سبب انکے مساعی ہیں۔

ہندوستان کی جن مشہور ہستیوں نے اس کھیل کو بام ترقی پر پہنچانے میں کافی حصہ لیا ان میں نواب معین الدولہ بہادر کے نام کو بھی حیات ابدی نصیب ہو چکی ہے۔

حضرت معینؔ نہایت خلیق، بامروت اور منکسر مزاج رئیس ہیں۔ کریم النفسی، رحمدلی، فیاضی اور سخاوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ نہایت ہی ضابطہ اور حلیم الطبع ہیں متوسلین و منظورین کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرنے اور ان پر ہمیشہ نظر عنایت رکھنے میں اپنی آپ نظیر ہیں اور خود اپنے دیوان میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ؎

معینؔ بڑھا کے گھٹانے کی خو نہیں اپنی　　　جسے عروج دیا، با وقار ہی رکھا!!

اسلئے ماتحتین کی غفلتوں سے ہمیشہ چشم پوشی کیا کرتے ہیں نہایت ہی زندہ دل، ظریف اور ہنس مکھ بھی ہیں۔ "مرنجان و مرنج" ان کے فلسفۂ زندگی کا اہم نظریہ ہے۔

نواب صاحب داد و دہش میں نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان میں بھی مشہور ہیں چنانچہ ۱۳۲۹ھ میں علی گڈہ یونیورسٹی کو ازراہ علم دوستی دو لاکھ روپیہ کا طغیانی رود موسیٰ کے سلسلہ میں پچاس ہزار کا اور انگلستان کی مسجد (ووکنگ) کو ایک لاکھ کا نقد چندہ عطا کیا متعدد دیگر ادارے بھی انکی بیش بہا امداد سے مستفید ہوتے ہیں۔ بہت سے غریب طالب علم اور شعرا، وغیرہ ان سے امداد پاتے ہیں۔ علمی و ادبی رسائل کی مالی امداد کے علاوہ قلمی اعانت (شعر و سخن) سے بھی نہیں چوکتے۔

مشق سخن کے ابتدائی زمانے میں مولوی میر لیاقت علی صاحب سیفؔ (جو دکن کے ایک باکمال اور ممتاز شاعر گذرے ہیں) سے مشورہ کیا اسکے بعد استاذ السلطان نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ کو دکھلانا شروع کیا۔

حضرت معینؔ کا کلام صحیح ذوق و اعلیٰ وجدان کا آئینہ ہے۔ خاص رنگ تغزل کی وجہ سے انکا کلام خاص طور پر مقبول ہے انکے اکثر اشعار زبان زد خلائق ہیں کیا بلحاظ صفائی زبان و اسلوب تحریر اور کیا بلحاظ علو تخیل و چستی بندش کلام معینؔ خاص اہمیت رکھتا ہے انکے کلام پر تفصیلی تبصرہ کیلئے ایک علحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ دکن میں جب پہلی مرتبہ طاعون کی قیامت آسا بلا نمودار ہوئی اور روزانہ سیکڑوں آدمی اسکے شکار ہونے لگے انکا حساس دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس ہولناک حادثے کی دردناک تصویر ایک مسدس میں پیش کی ہے جسکا نام "بلائے آسمانی" ہے۔ یہ مسدس اسی زمانے میں طبع ہوا اور تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ کل بائیس ۲۲ بند ہیں۔ بعض اشعار نہایت پر اثر ہیں اور اس زمانے کے شہر حیدرآباد کی خزاں رسیدہ حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ابتدا یوں کی گئی ہے ؎

بربادیوں پہ ہے چمنِ روزگار حیف!! — لٹتا ہے کاروانِ نسیمِ بہار حیف!!

پامال ہو رہے ہیں گلِ تر ہزار حیف!! — قمری کو سرو بھی نظر آتا ہے دار حیف!!

آمد خزاں کی رخصتِ فصلِ بہار ہے!

جو پھول ہے نگاہ میں بلبل کے خار ہے!

اپنے وطن کی محبت اور وہاں کی حالت کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

گل سے جدا ہے رنگ تو گل ہے چمن سے دور — ضو ہے چراغ سے تو چراغ انجمن سے دور — وہ ابر وہ بہار وہ لطفِ چمن کہاں — وہ گل وہ عندلیب وہ غنچہ دہن کہاں

ہم سے جدا دکن ہے تو ہم ہیں دکن سے دور — غربت کی شام جیسے ہو صبحِ وطن سے دور — وہ حسن نونہالوں کا وہ بانکپن کہاں — وہ شوخیاں صبا کی وہ دلکش چلن کہاں

ہوش و حواس و عقل و خرد دور ہو گئے — صحنِ چمن میں باغِ عدم کی بہار ہے

پروانے شمعِ بزم سے کافور ہو گئے — ہر پھول پر گمانِ چراغِ مزار ہے

شہر حیدرآباد کے بعض خوش منظر اور پرفضا مقامات پر طاعون سے وحشت خیز سماں چھا جانے کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

مچھلی کمان ماہی بے آب بن گئی! — موسٰی بھی سحر نگر کا گرداب بن گئی

ہے چوک میں، نہ چوک کی مسجد میں شور و غل — جملہ مصلّیوں کا ہوا ایک ساتھ قل!!!

چشم پر آبِ حوض نبی تشکلِ جام مل — بازار موت چار طرف اب گیا ہے کھل

جو گھر ہے بند ہے، جو دوکان ہے وہ بند ہے

خواہش ہے سود کی، نہ خیالِ گزند ہے

اور اس دعا پر اپنی اس دل سوز نظم کو ختم کیا ہے :-

بس اے شعین دعا کے لئے ہاتھ اٹھاؤ اب — رو رو کے خود نہ ایک جہاں رلاؤ اب

غم جس سے دور ہو وہ فسانہ سناؤ اب! — قابو میں اپنے اپنی طبیعت کو لاؤ اب!

درگاہِ حق میں دل سے کرو التجائے رحم — آخر قبول ہو گی نہ کب تک دعائے رحم

نواب معین الدولہ بہادر معین کے کلام کے مطالعہ سے یہ یک نظریہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ دنیا کی اہم سے اہم مصروفیات میں بھی "شاعر" کی عبادت کا کچھ نہ کچھ وقت نکل ہی آتا ہے جیسا کہ خود انہوں نے کہا ہے ؎

اے معین تھوڑی سی کر لیتا ہوں کچھ فکرِ سخن فکرِ دنیا سے ذرا ملتی ہے جب فرصت مجھے

حضرت معین کی شاعری موجودہ زمانے کے قدیم شعراء کی بہترین مثال کہی جا سکتی ہے نہ یہ کسی انقلاب کے حامی ہیں اور نہ عہد رفتہ کی پرشکوہ عظمت کا مرثیہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ انکی شاعری سکونِ قلب اور آزاد منشری کی بیّن دلیل ہے۔ داخلی شاعری کی جتنی اہم خصوصیات ہیں ان پر انکا کلام پوری طرح حاوی ہو سکتا ہے۔ رندانہ طرز بیان اور عشقیہ مضامین کی کثرت کے باوجود انکے پاس حکیمانہ خیالات اور فلسفیانہ موضوعات کی بھی کمی نہیں۔

غالباً حضرت معین پر ابتداءً عہد رفتہ کے شعر و سخن اور شعراء کے نقوش اثر انداز ہوئے ہوں لیکن دھندلے چنانچہ استادان سخن کے فیضانِ صحبت کے متعلق وہ ایک شعر میں لطیف اشارہ بھی کرتے ہیں ؎

نہ کیوں کر اے معین ہو پاک عیبوں سے کلام اپنا کہ آخر ہم نے کی ہے خدمتِ اہلِ ہنر برسوں

لیکن یہ زمانہ بھی جلد ختم ہو گیا اور اسکے ساتھ ہی وہ بجا طور پر یہ کہنے کے قابل بن گئے کہ ؎

قابلِ داد ہو کیونکر نہ معین اپنا کلام بندشِ چستی و شیریں سخنی کے باعث

مرور ایام اور مشقِ سخن کے ساتھ وہ اِس سے بھی تجاوز کرتے ہیں اور خود اعتمادی کے اس درجے پر پہونچ جاتے ہیں کہ ان کے قلم سے بے محابا یہ شعر نکلتے ہیں ؎

معین چھپتی نہیں اہلِ نظر سے صفائی میرے اندازِ بیاں کی!
شہرت ہے اے معین ترے زورِ کلام کی تجھ سا جہاں میں کوئی جادو بیاں نہیں

شعرائے سلف کی وقعت بھی اُن کے دل میں کچھ کم نہیں بلکہ ان عظیم ہستیوں کی درد انگیز یاد جب کبھی اِن کے قلب میں چٹکیاں لینے لگتی ہے تو وہ تحریر کرتے ہیں ؎

دارِ فانی کی طرف بزمِ سخن سے اے معین داغ صاحب کیا گئے بس شاعری کا فن گیا

وہ زمانہ آ گیا اے معین کوئی قدر دانِ سخن نہیں!! کسے جوہر اپنے دکھائیں ہم کہ جہاں سے اہلِ نظر گئے!!

نواب معین الدولہ بہادر کی شاعری کا تجزیہ کرنے کیلئے ہمیں کسی خاص وقت سے دو چار ہونا نہیں پڑتا ہم نے پہلے بھی کہا ہے وہ موجودہ دور کے قدیم شعرا میں شمار کئے جاسکتے ہیں غزل انکی جولانی طبیعت کا خاص میدان ہے وہ غزل کے علاوہ مخمس، مسدس، سلام اور تضمین وغیرہ کے تحریر کرنے پر بھی خاص قدرت رکھتے ہیں۔ اسکے علاوہ انہوں نے ہندی زبان میں بھی بہت سی اعلےٰ پایہ ٹھمریاں لکھی ہیں۔

معین بہت پُر گو شاعر ہیں۔ اس قلیل فرصت کے باوجود جو انہیں پائیگاہ کے امورِ انتظامی اور دیگر مصروفیات کے بعد بچ رہتی ہے۔ انہوں نے کئی سو غزلیں، مخمس، مسدس، تضمین اور نفیس ٹھمریوں کا ایک ضخیم دیوان تیار کرلیا ہے۔ انکا کلام سادہ اور پیچیدہ تعقید سے بالکل مبرا ہے۔ عشق کی غارتگری کے دلسوز مضامین اور پند و نصائح و حکم و تصوف کے ادق مسائل کو سادہ اور سلیس الفاظ میں ادا کرنے پر انہیں خاص قدرت حاصل ہے۔ ایک تو فطری شاعری اور دوسرے طویل مشق سخن نے انکے کلام میں ایک خاص رنگ پیدا کردیا ہے انہوں نے اپنا زیادہ وقت صنائع و بدائع پر صرف نہیں کیا۔ انکے کلام میں آمد ہے آورد نہیں۔ اسی لئے وہ صنائع بدائع کا خاص لحاظ نہیں رکھ سکتے۔ البتہ جہاں کہیں اظہار مطالب کیلئے انکی ضرورت ہوئی انہوں نے نفیس پیرایہ میں انہیں استعمال بھی کیا ہے جہاں تک زبان کا تعلق ہے وہ کسی خاص دبستان یا اسکول کے پابند نہیں، انکی زبان سادہ، بے عیب، بے تکلف اور اردو روزمرہ کی زبان ہے مثلاً

اک گھڑی بھر کو وہ ہم سے مل گیا اور قابو سے ہمارا دل گیا!! کسی پہلو کسی کروٹ ملے آرام کیا جب ہو دل بیمار میں حسرت، دل بیمار پہلو میں

معین کے دل کی منہ مانگی مرادیں خدا کے گھر سے دلوادو تو کیا ہو دوست بنجاؤ اگر معشوق بن سکتے نہیں یا تو دو دلکو سکوں یا خود سکون دل بنو

وطن کی محبت ایک لمحے بھر کیلئے انکے قلب سے جدا نہیں ہوسکتی۔ حب الوطنی کا حقیقی جذبہ جو ہر انسان کیلئے مقدس ترین فریضہ سے بڑھکر اہمیت رکھتا ہے۔ انکی رگ رگ میں کوٹ کر بھرا ہے۔ گھر کی الفت کے اس والہانہ جوش کو وہ جگہ جگہ بیان کرتے ہیں

پردیس اپنے وقت میں فردوس ہی سہی ناقدر دانیوں پہ فدا ہیں وطن میں ہم

یاد کے ساتھ ہی نقشہ اتر آیا دل میں! ہم نے غربت میں تماشائے وطن دیکھ لیا

حضرت غفراں مکاں آصفجاہ سادس کی وفات حسرت آیات پر وہ اپنے دلی ملال کا اظہار کرتے ہیں ؎

کیا دکھائیگا بس اب اس سے زیادہ اے چرخ آنکھ سے ماتم محبوبِ دکن (غفراں مکاں) دیکھ لیا

غزلیات کے بعد انکی ہندی ٹھمریوں کی باری آتی ہے۔ اور حقیقتاً ان ہی سر ور آگیں اور پرترنم ٹھمریوں کی وجہ سے

ان کے دیوان کا یہ حصہ مایۂ ناز کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

بادۂ دوشینہ وصہبائے پُرکیف کیلئے خوشنما اور حسین بلوریں پیمانوں اور ساغروں کی ضرورت نہیں بلکہ اسکا وجود ہی بہت ہے!! ـــــــ ایکبارتبہ پی چکنے کے بعد اسے اس بات کے جاننے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی کہ اس نے کس چیز سے پی........ وہ ہر شئے سے بے نیاز ہو جاتا ہے حتیٰ کہ خود سرور افزا خمر سے بھی!!!

بسنت کی فتنہ سامانی کسی خاص گلستاں اور کسی مخصوص لالہ زار کیلئے وقف نہیں ہے۔ ہر جگہ اسکی رعنائیاں اور ہر مقام پر اسکی سحرانیاں موجود ہوتی ہیں ـــــــ نظرباز کیلئے وسعت حد نظر کی ضرورت ہے! مقام، ماحول یا طبیعت کی نہیں اور اگر یہ ہو تو دنیا کا گوشہ گوشہ اور چپّہ چپّہ اسکے لئے ایک رنگین خواب اور ایک دائے جانستاں بن سکتا ہے!!!

انکی ان ہندی نظموں کا مطالعہ یہ ثابت کر دیگا کہ اپنے حقیقی جذبات اور نازک خیالات کے اظہار پر وہ کتنی قدرت رکھتے ہیں کہتے ہیں

رین کٹت ہے گن گن تارے! (۱) دکھوا بہت ہوں بِنا تمہارے

جان بھی موری ہوئی پرائی!! سَرسوں پھولی آنکھن ہیں!

جیوا رچین نہ پاوت سجنی (۲) سونی سیجریا نہ بھاوت سجنی

مورا پیا کب آوت سجنی!!

راہ باٹ تکت ہوں کب سے! کاہے کھبریا نہ لاوت سجنی

مورا پیا کب آوت سجنی!!

بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ سے انکو سچی عقیدت ہے۔ چنانچہ متعدد غزلیں حضرت خواجہ اجمیریؒ کی شان میں لکھی ہیں۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی مدحت میں بھی غزلیں لکھی ہیں۔ مقدس درگاہوں اور تقدس مآب صوفیوں کی زیارت سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔

انکی تضمینیں بھی نہایت عمدہ ہیں شہر کراچی کے مشہور شاعر قیصر کی ایک غزل کی تضمین کی ہے جسکا ایک بند ہے۔

لحد میں بھی نہ مجھے بیقرار رہنے دے! بجھا نہ دے مری شمع مزار رہنے دے

رہینِ منتِ گرد و غبار رہنے دے !! کچھ اپنے ظلم کی بھی یادگار رہنے دے!

مٹے ہوؤں کا مٹاتا ہے کیوں نشاں صیّاد

غالب کی معرکتہ الآرا غزل کی بھی خوب تضمین کی ہے مثالاً پیش ہے!

وہ میرا خواب ہے جسکی ہر اک تعبیر اُلٹی ہے
مری تدبیر سیدھی ہے مری تقدیر اُلٹی ہے

مری بزمِ تمنّا کی ہر ایک تصویر اُلٹی ہے
خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

حضرت معینؔ کے کلام کی شہرت صرف دکن تک ہی محدود نہیں ہندوستان کے ان مرکزوں میں جہاں شعر و سخن کی مائیہ ناز مجلسیں ہوا کرتی ہیں، اور ان مقامات میں جہاں اعلیٰ پایہ کے سخن سنج و سخن فہم حضرات موجود ہیں انکا کلام خاص قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں تو انکا کلام مقبولِ عوام و خواص ہے۔ دکن اور شمالی ہند کے متعدد معیاری، بلند پایہ اور کثیر الاشاعت علمی و ادبی رسائل، اخبارات اور مجلّے انکی غزلیات کو شایع کرنا اپنے لئے باعث فخر و امتیاز سمجھتے ہیں حسب ذیل ہفتہ وار اخبارات اور ماہنامے اس خصوص میں سب سے پیش پیش رہتے ہیں۔ الاعظم، منشور، خلیق، عالمگیر، عصمت، شہاب، علی گڑھ میگزین، رسالہ تحفہ، سفینۂ النسوان، رہبر دکن، صبح دکن، سالار (بمبئی)، ملّت (کراچی) وغیرہ اب ہم حضرت معینؔ کے کلام کا انتخاب پیش کریں گے۔

حمد

میں دیکھتا ہوں جلوہ ہر صبح و شام تیرا ظاہر ہیں گو نظر ہے زلف و رخِ بتاں پر گویا وہی زباں ہے جس پہ ہو نام تیرا بینا وہی ہیں آنکھیں جو تجھکو دیکھتی ہیں

رحمت کے امیدوار ہیں ہم! ہر جرم سے شرم سار ہیں ہم !!! ہو گئی کاتبِ اعمال کی تحریر عبث دھو دیا دفترِ عصیاں کو تری رحمت نے

جو ذرا اپنی خطاؤں پر پشیماں ہو گیا کچھ اٹھا نا ہی وہی شانِ کریمی مرے پاتا ہوں ہر جگہ تجھے ہیں تو کہاں نہیں شرمندہ ہو کے تجھ سے الٰہی کہاں چھپوں

میری جو خطا ہے وہ با امیدِ عطا ہے تیرا جو کرم ہے بہ تقاضائے ترحم از انفعال ہو روبرو خدا کے مجھے ہیں اشکِ شرم سے دھوتا ہوں نامۂ عصیاں

نعت :-

آزاد ہے ہر اک سے اُس رہنما کا عاشق محبوب تک رسائی جس رہنمانے کی ہے

تمہاری ذاتِ اقدس مظہرِ شانِ خدائی ہے ظہورِ عالمِ ایجاد کے باعث تمہیں ٹھہرے نسیمِ صبح شاید گلشنِ طیبہ سے آئی ہے شگفتہ ہو چلا ہے یک بیک کیوں غنچۂ خاطر

مدح حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

اے معینؔ بادۂ عرفاں سے ہوں سرشار مدام　　مہرباں مجھ پہ ہیں اجمیر کے سرکار بہت !

نصائح، حکم، فلسفہ، تصوّف اور انسان کی مجبوری سے متعلق یہ اشعار حقیقت سے کسقدر قریب ہیں اور اندازِ بیان کتنا سادہ اور دلنشین ہے

راہِ تسلیم و رضا دشوار سے دشوار ہے　　جان بھی دینے سے یہ مشکل نہ آساں ہو تو کیا

مرے نفس نے بچایا مجھے لاکھ رنج و غم سے　　اے فلک نہ چین دیتا جو میں ذی کمال ہوتا

ہر اوج کو جہان میں پستی ہے ایک دن　　لازم ہے جب زوال تو فخرِ کمال کیا

کس نے الست کہہ کے آج ہوش اڑائے سر بسر　　جامِ شرابِ بیخودی کس نے ہمیں پلا دیا

ہنسنے والے تو بہت ملتے ہیں دنیا میں معینؔ　　دوست وہ ہے جو سنے غم کی طرح غم اپنا

اگر یہ بحرِ فنا ہی دنیا ہماری ہستی کا کچھ نہ پوچھو　　قیام موجوں کی طرح پایا ثبات مثلِ حباب دیکھا

ایک لفظِ کن سے دنیا کا گھروندا بن گیا　　کھیلنے کو آپِ واحد میں کھلونا بن گیا

کارگاہِ دہر میں کوئی نہیں با اختیار　　دستِ قدرت نے جسے جیسا بنایا بن گیا

غمِ طوفاں نہ رہا جب یہ سمجھ میں آیا !!!　　موج اپنی ہے حباب اپنا ہے دریا اپنا

کعبہ تک پہونچ کر بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ دلی تمنا پوری نہیں ہوئی اور منتہا کہیں اور ہی ہے !

پہنچے تھے مشکلوں سے درِ کعبہ تک مگر　　کوسوں یہاں سے کوچۂ مقصود دور تھا

نہ رکھے خضر سے امید کوئی رہنمائی کی　　پتہ منزل کا کب گم گشتۂ منزل سے نکلیگا

مزا کیا ہے اگر ہووے اثر بات !　　کرے انساں سمجھ کر سوچ کر بات

ہوئے نہ آپ سے باہر کبھی ترے بیخود　　ہمیشہ عالمِ مستی میں ہوشیار رہے

ارے ناداں گوہرِ مقصد !　　کہیں کم ہمتی سے ملتا ہے !!!

پہنچا دے وہیں بیخودیٔ شوق مجھے بھی　　رہبر کا جہاں نام نہ منزل کا پتہ ہے

فکرِ دنیا ہے سعیٔ لاحاصل　　غمِ روزِ جزا کرے کوئی

دی یہ کہہ کہہ کے تسلّی شبِ ہجراں دلکو　　چاک اب صبحِ قیامت کا گریباں ہوگا

جو بات ہے اسمیں وہ بھلا اُسمیں کہاں ہے　　ہے شامِ فراق اور قیامت کی سحر اور

فراقِ یار میں اللہ ری بیتابیاں اُسکی　　کبھی سینے کے اندر تھا کبھی سینے کے باہر دل

فقط تسکینِ خاطر کو یہ منہ دیکھے کی باتیں ہیں　　وہاں تک ایک بھی ہمدم مرا جانا نہ آتا ہے !

مدد اے ضبطِ غم رازِ نہاں افشا نہ ہو جائے　　فراقِ یار میں رونا نہیں ہے جگ ہنسائی ہے

شگفتگیٔ اسلوب، حسنِ بیان اور جدتِ تخیّل کے انوکھے اشعار، علوِ تخیّل کے ساتھ ساتھ مراۃ النظیر، حسنِ تعلیل اور دیگر صنعتیں بے اختیار قلم سے ٹپک پڑی ہیں اور ساتھ ہی محاورے بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتے۔ اندازِ بیان کی خوبی قابلِ داد ہے ؎

خیالِ نرگسِ مخمور میں ترے قرباں　　نہ مست ہی نہ مجھے ہوشیار ہی رکھا

شبِ وصل ذکرِ دشمن جو نہ آیا خیر گذری　　انہیں کچھ خیال ہوتا مجھے کچھ خیال ہوتا

تجھے پاس مدعی کا مجھے وصل کی تمنا   وہ ترا جواب ہوتا یہ میرا سوال ہوتا   عمر بھر گھر میں کٹی چین نہ پایا دم بھر   مرے نالوں کا اثر چرخِ کہن دیکھ لیا

ہیں وہ بسمل ہوں کہ پیکاں کو نہ پیکاں سمجھا   تیر کو دل خلشِ تیر کو ارماں سمجھا   چشمِ گریاں کو دلِ زار نے سونے نہ دیا   رات بیمار کو بیمار نے سونے نہ دیا!!!

تصورِ چشمِ مستِ ساقی گیا نہ دل سے کبھی نکلکر   خدا کے گھر میں نظر سے اپنی مدام دورِ شراب دیکھا

دل نشیں جب سے خیالِ روئے جاناں ہو گیا   داغ سینے کا چراغِ زیرِ داماں ہو گیا

عبث برہم ہو تم ذکرِ عدو پر   نکل آتی ہے اکثر بات پر بات   بڑھا دے کچھ تو یارب وصل کی شب   رہی جاتی ہے دل کی دل میں بات

تم نے کل غیر کو محفل سے کیا تھا باہر   آج ہم آپے سے باہر ہیں خوشی کے باعث

خود اڑے جاتے ہیں وہ آگ بگولہ بنکر   گرمئ حسن پہ ہے آتشِ پندار کی آنچ!!

آئینہ دیکھ کے حیران ہوئے کیا باعث!   کیا لپسند آگئی کچھ مدِ مقابل کی طرح

روح بیتاب ہے پھر جسم میں آنے کے لئے   لبِ جاں بخش ہیں مصروفِ دعا میرے بعد

چشمِ ساقی کا بندھا دل میں تصورِ دمِ ذبح   پی لیا ساغرِ مے جامِ شہادت کے عوض

میکشوں پر بھی فضلِ باری ہے   سر پہ رحمت کی ہے گھٹا واعظ   دل ہو کس طرح ترے ناز و ادا سے محفوظ   غنچے گلشن میں نہیں رہنے صبا سے محفوظ

ہیں یہاں دل میں تمنائیں وہاں بزم میں غیر   اور داماںِ اثر دستِ دعا سے محفوظ!!

دل میں رہنے دو معین تم رخِ روشن کا خیال   شمع کو رکھتی ہے فانوس ہوا سے محفوظ

اشک جاری ہیں مرے جاتے ہیں آپ   ایسی بارش میں سفر اچھا نہیں!!   حشر میں ہو گی جو پرسش تو کہیں گے معین   سالہا سال کی ہے بات مجھے یاد نہیں

دل تو کیا ہے لوگ اپنی جان دین ایمان دیں   ہاں مگر اتنی گذارش ہے کہ اس قابل بنو

کدورت پائمالوں سے ابھی تک یار باقی ہے   ملا کر خاک میں بھی شوخئ رفتار باقی ہے

حیف چشمِ یار میں شامِ وصال   شوخیوں سے پہلے ہی شرم آگئی   ارم میں ہوں گی سید ہی سادی حوریں   بتانِ شوخ آئینگے کہاں سے!

رندانہ مضامین محبوب کے جور و جفا کی کہانیاں جس میں شاعر کے لب پر ہمیشہ "ھل من مزید" ہی رہتا ہے۔ اہمیتِ عشق

استغنا، خودداری، مایوسی اور معاملہ کے حسین ترین خیالات اور وارداتِ قلب کے رنگین شہپاروں کو اہلِ ذوق ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔

جو نیچی نظروں سے لیتے ہو چٹکیاں دل میں نہاں ہے شرم کے پردے میں بھی شرارت کیا

کیا کبھی کھل کے ملیگا وہ ستمگر یارب کیا مرا عقدۂ مشکل کبھی آساں ہوگا

میں بھی تھا شمعِ سحر گویا کہ محفل سے تری چشم گریاں، سینہ بریاں، قلب سوزاں لے چلا

آتے ہیں فاتحہ کو وہ تو نے ستم کیا صبا!! میرے چراغِ گور کو شام ہی سے بجھا دیا!

آنکھ سے آنکھ ملتے ہی آج تو ہم نے اے معین عشق نہیں جتا دیا قصۂ غم سنا دیا!

ستم وہ کرتے ہیں جاتا نہیں گلہ دل کا ہوا ہے قابلِ حیرت معاملہ دل کا ذرا جو چین سے وہ مستِ ناز رہنے دے نہ جانے یہ دلِ پُر درد کیا ستم ڈھائے

سحرِ وصل وہ شرما کے کسی کا کہنا! آج تو آپ کے اصرار نے سونے نہ دیا خشک لب ہم تو رہے دامنِ ساحل کی طرح چشمۂ فیض اگر آپ ہوئے بھی تو کیا

اُس ستم کیش نے کی ترک جفا میرے بعد للہ الحمد کہ اتنا تو ہوا میرے بعد

یہ بت پسند ہوں کیا تیرے انتخاب کے بعد نظر فضول ہے ذرّوں پہ آفتاب کے بعد

تاثیرِ ہوس اور ہے الفت کا اثر اور ہے میری نگہ اور رقیبوں کی نظر اور دل اور مزاج اور خیال اور نظر اور! یہ بھی ہے ستم گر کوئی الفت کا قرینہ

قاتل کے تیر ہیں دلِ مضطر کے آس پاس لاکھوں گدا ہیں ایک تونگر کے آس پاس مصیبت ہے بلا ہے اور میں ہوں! جدائی کا الم ہے زلف کا عشق

بے عشق زندگی ہمیں بدتر ہے موت سے! سر رکھ کے کیا کریں گے وہ سودا نہیں رہا

دنیا میں بت تو خلد میں حوریں ملیں مجھے! شکرِ خدا کبھی میں اکیلا نہیں رہا

پہلے تو کرم کرتے پھر بعد وہ سے دیتے! یہ ہوش ربا ہوتی وہ ہوش فزا ہوتا

وہ دل بھی نہیں لیتے بوسہ بھی نہیں دیتے! کچھ ہم سے لیا ہوتا کچھ ہم کو دیا ہوتا

تجھکو تری جفا سے ندامت شعار نے محشر میں شرمسار کیا ہائے کیا کیا دونوں طرف پڑی ہے برابر نظر کی چوٹ پوچھو انہیں کے دل سے ہمارے جگر کی چوٹ

رشکِ رقیب، عشقِ بتاں، جورِ آسماں حیرت میں ہوں الٰہی بچاؤں کدھر کی چوٹ اٹھائی ہم نے گویا لذتِ ذوقِ نظر برسوں رہا ہے سامنے آنکھوں کے وہ بیدادگر برسوں

نظر پُر کیف، دل بدمست اور آنکھیں خمار آگیں مجھے دیکھو کہ سرتا پا ہوں میں تصویرِ میخانہ

خطا اپنی بصیرت کی گلہ کیا کیجئے اُن سے جمالِ بے حجابانہ جو پہلے تھا وہ اب بھی ہے

شبِ غم جاں کا دینا بہت آسان ہے لیکن معینؔ ہر دم خیالِ ہمّتِ مردانہ آتا ہے

وہی فتنے وہی آفت وہی ہنگامہ آرائی قیامت نے اڑائی طرز شاید تیری محفل کی

لگا رکھوں نہ دل سے کیوں ترے داغِ محبت کو یہی اک چیز ہے جو زندگی بھر کی کمائی ہے

وفورِ گریہ سے کچھ اور بھی بھڑکی لگی دل کی! خدا کی شان تو دیکھو کہ بارش میں جلی ہولی"

لیا گر بوسۂ عارض تو اِتنا کیوں بگڑتے ہو چلو جانے دو صاحب بات ہونگی جو تھی ہولی

سادگی ۔ حضرت معینؔ کا سارا دیوان دیکھ ڈالئے تو سب سے نمایاں خصوصیت جو نظر آئیگی وہ سادگی ہی ہوگی یوں تو سادگی کے نمونے علٰحدہ پیش کرنا کچھ ضروری نہ تھا تاہم جو اشعار اب نیچے آئینگے انکے اندر ایک خاص جاذبیت اور دلکشی پنہاں ہے اگر انہیں سہل ممتنع بھی کہیں تو بیجا نہ ہوگا :-

گزرتی ہے خیالِ زلف و رخ میں غمِ صبح و مسا ہے اور میں ہوں

معینؔ کے دل کی منہ مانگی مرادیں خدا کے گھر سے دلوا دو تو کیا ہو

اچھی صورت دل مرا تڑپا گئی ! آنے والی تھی قیامت آگئی عشق کے ہاتھوں مرے دل کی کلی پھولنے سے پیشتر مرجھا گئی

تم پہ جس وقت مرا دل آیا !!! تھی خدا جانے وہ گھڑی کیسی ہائے وہ پوچھنا سرِ بالیں !! اب طبیعت ہے آپ کی کیسی

دل سے نکلے نہ آئے جو لب تک وہ تمنّا نہیں تو پھر کیا ہے ہزاروں فتنہ گر کرتی ہے پیدا زمیں کچھ کم نہیں ہے آسماں سے

ایک پابندِ دوستی میں ہوں اور اک عالم آشنا تو ہے دیکھنے کی ادائیں ہوتی ہیں جب وہ بُت سادگی سے ملتا ہے

راجہ نرسنگ راج بہادر عالی

عالی

راجہ نرسنگھ راج بہادر

۱۳۰۴ف

از۔ محمد عبدالرشید صاحب قریشی

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی بتاریخ ۲۰ ردے ۱۳۰۴ف حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ راجہ گردھاری پرشاد متبنی راجہ محبوب نواز ونت باقی کے پانچویں فرزند ہیں۔ باقی کا تذکرہ مرقع سخن کی جلد اول میں شایع ہوچکا ہے۔ زندگی کی ابتدائی منزلیں اُن پر بہت کڑی گزریں۔ والد کا سایہ عاطفت صغیر سنی ہی میں سر سے اٹھ گیا تین سال کی عمر ہو گی کہ چیچک کے تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہوئے۔ اپنے والد کے دوران سفر کٹک اور پوری میں بعارضۂ ہیضہ سخت علیل ہوئے۔ انکے بڑے بھائی راجہ شیام راج نے اسی مرض مہلک سے انتقال کیا اور انکو موت اور زیست کی درمیانی حالت میں کشمکش کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔ زندگی باقی تھی، اور دوسرے ایک خدارسیدہ بزرگ نے بھی دعا اور صحت کی پیشنگوئی کی تھی بچ گئے انہیں سوامی جی کی مرضی سے انکی رسم مکتب خوانی اور شادی بنارس ہی میں انکے مقدس اور بابرکت ہاتھوں عمل میں آئی۔

اُنکی شادی رائے کنہیا لال ساکن بھوپال کی دختر نیک اختر سے ہوئی جس میں راجہ کاشی نریش مہاراجہ سندھیہ اور دیگر معززین مدعو تھے۔ شادی نہایت کمسنی میں ہوئی اور ایسی دھوم سے کہ راجاؤں کے شایان شان ہو۔ لیکن یہ شادی ایک دلدوز المیہ کا پہلا سین ثابت ہوئی کیونکہ شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انکے والد نے بعارضہ وجع مفاصل ۲۴ صفر ۱۳۱۴ھ کو انتقال کیا۔ اعلیحضرت غفران مکاں کو اس پرالم سانحہ سے افسوس ہوا اور انہوں نے بمراحم خسروانہ انکو رسم پرسہ میں سفید دوشالہ سے سرفراز فرمایا۔ و نیز بلحاظ تعلق اسٹیٹ پر کورٹ آف وارڈ علاقہ صرفخاص کی نگرانی مقرر فرمائی اور بہ الطاف شاہانہ تمام خدمات دیوانی و علاقہ صرفخاص مبارک بحال فرمادیئے۔

انہوں نے میٹرک تک مدرسۂ عالیہ میں اور دیگر السنہ فارسی، ہندی و مرہٹی کی خانگی طور پر باضابطہ تعلیم پائی اور بہت جلد اس پر عبور حاصل کر لیا۔

انکو بموقع دربار جشن جوبلی حضرت غفراں مکاں ۱۳۲۳ھ بہ پیشگاہ خسروی سے راجہ بہادر کا خطاب عطا ہوا اور اس عزت افزائی نے اس جاں نثار اور وفادار خاندان کی عظمت اور عزت کو دوبالا کر دیا۔

۱۳۳۰ھ میں اُنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی رائے محبوب راج محبوبؔ کی شادی رائے ٹھاکر پرشاد نظم کی لڑکی سے نہایت تزک و احتشام سے رچائی اور اپنی دلی محبت اور اخلاص کا مظاہرہ کیا۔ محبوب نے ۱۳۴۰ف میں انتقال کیا اور اپنے بھائی کے دل پر ایک ایسا گھاؤ ڈالا جو تمام عمر مندمل نہ ہو سکے گا جس کا ثبوت اُنکی تصنیف "ارمغانِ محبوب" ہے جسمیں اُنہوں نے اپنے دلی حزن و ملال کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن سے اُنکے خلوص اور محبّت کا پتہ چلتا ہے۔ مرثیہ کے دو بند یہ ہیں ؎

مرے دوست احباب سن لیں کہ کیا ہے — یہ عالیؔ کے مجروح دل کی صدا ہے
یہ محبوبؔ کا ماتمی مرثیہ ہے — مرے پیارے بھائی مرے پیارے بھائی

میں کس سے کروں تیری فریاد بھائی — سناؤں کسے تیری بیداد بھائی
تری یاد کر دے گی برباد بھائی — مرے پیارے بھائی مرے پیارے بھائی

۱۳۳۲ف میں اُن کی شریک زندگی نے داغِ مفارقت دیا اور داعیٔ اجل کو لبیک کہا یہ سانحہ جانگداز بھی اُن کے ہاتھوں سے عنانِ صبر نہ چھڑا سکا اور اُنہوں نے نہایت استقلال کے ساتھ اِس غم کو برداشت کیا اسی زمانے میں اُنہوں نے دو کتابیں "درد باقی و درد ساقی" شائع کیں جن میں اُن کے والد راجہ محبوب نواز ونت باقیؔ کے رباعیات اور تراجم وغیرہ شامل ہیں۔ اور اپنی اولاد کی بہتری کی خاطر باوجود اصرار کے، دوسری شادی سے انکار کر دیا۔

راجہ نرسنگھ راج بہادر ۱۳۲۶ف میں دفتر معتمدی افواج سرکار عالی میں لطور مددگار اعزازی کام کرتے رہے اور پھر بلحاظ حقوقِ خاندانی مددگار محلات کے عہدۂ جلیلہ پر فایز رہے۔ اور بعد میں بموجب فرمانِ خسروی رکن کمیشن تعاریف مذہبی

کی خدمت پر متعین ہوئے اور ڈیڑھ سال تک اِس خدمت کو انجام دیا۔ ۱۹۲۹ء میں مہتمم سیونگ بنک نظامت پٹنہ کی خدمت پر فایز رہے غرض یہ کہ ریل اور دیگر محکمہ جات کے معزز عہدوں پر آپ فایز رہے اور ہر محکمہ میں نہایت نیکنامی حاصل کی

اخلاق اور شاعری۔ عالیؔ مہمان نواز اور زندادست پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی اور خوش خلقی سے ملتے ہیں۔ غریب امیر سب سے یکساں برتاؤ ہے۔ کسی کی سفارش میں لیت و لعل نہیں کرتے۔ اپنے والد کے شناساؤں سے نہایت ادب سے ملتے اور اپنے بھی پرانے ملاقاتیوں کے ملنے کے مشتاق رہتے ہیں۔ مذہبی عقائد کی نہایت سختی سے پابندی کرتے ہیں اور کسی کا دل دُکھانا کبھی روا نہیں رکھتے۔

شاعری سے بچپن ہی سے لگاؤ ہے۔ زیادہ تر غزل اور رباعیات کہتے ہیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے خاص مشاعروں میں شریک رہے ہیں اور ان سے خاص تعلقات ہیں۔ طبیعت میں روانی پائی جاتی ہے اشعار کی نزاکت اور خیالات کی بلند پروازی ایک بہترین شاعر ہونے پر دال ہے اُن کی اکثر غزلیں زیب و زینت رسایل ہوا کرتی ہیں حضرت جلیلؔ سے تلمذ حاصل ہے۔ رباعیات اور دیگر کلام میں معرفت کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ جس کا اندازہ ذیل میں دئے ہوئے نمونہ کلام سے بخوبی ہوسکتا ہے ؎

رُباعی

پوشیدہ ہے گو جلوہ عیاں تیرا ہے — کثرت ہو کہ وحدت ہو نشاں تیرا ہے
کس کے دل میں نہیں ہے تیرا مسکن — کس کے لب پر نہیں بیاں تیرا ہے

یارب جو کہوں منہ سے سخن تیرا ہے — سب جسم ترا اور دہن تیرا ہے
اِس دہر کے رنگ اور ہم گلہائے عجیب — یارب ترے ہیں سب چمن تیرا ہے

دوسری رباعیات جو اپنے مرحوم بھائی کی یاد میں لکھی ہیں وہ بھی نہایت مرصع ہیں۔

رُباعی

کس کے لئے ہائے اب میں دنیا میں رہوں — دنیا کے مصائب کو سہوں صبر کروں
عالیؔ جینا تھا صرف جینے سے ترے — اب دونوں برابر ہیں جیوں یا کہ مروں

تم یاد سے اپنی ستایا نہ کرو — غمگین ہوں میں غضب یہ ڈھایا نہ کرو

عالی کو دیا خواب جہاں میں دھوکا — بہتر ہے کہ خواب میں آیا نہ کرو!

غزلیات میں بعض بعض جگہ حضرت داغ کا رنگ نمایاں ہے۔ اِس غزل پر غور کیجئے۔ زبان کی شوخی اور مضمون کی ندرت داد طلب کرتی ہے۔

غزل

کون ہمدرد ہو پھر جب نہ ہوا اپنا اپنا — غیر ممکن ہے کہ ہو جائے پرایا اپنا

سر بھی سودائے محبت میں دیا جان بھی دی — کس گرانی سے ہوا دیکھئے سودا اپنا

اُسنے ٹھکرا کے مری لاش کو نخوت سے کہا — کیا ہوا اک نہ رہا چاہنے والا اپنا

وہ گھڑی کیسی مبارک تھی خدا پھر لائے — روٹھنا انکا شبِ وصل منانا اپنا

یاد میں کس کی ہوا حال یہ تیرا عالی! — گم ہوا یوں کہ پتہ آپ نہ پایا اپنا

نہیں بھاتی ہیں دور کی باتیں — سنو موسیٰ سے طور کی باتیں

زاہد خشک کچھ سنا پی کر — ہم سنیں گے سُرور کی باتیں

سنئے سب کچھ ہی واعظوں سے مگر — کون جانے قبور کی باتیں

تجھ کو زیبا ہے اور معاف بھی ہیں — اے جوانی قصور کی باتیں

رند مدہوش ہیں مگر کیسی — کر رہے ہیں شعور کی باتیں

بت خدا بن گئے معاذ اللہ — نہیں اچھی غرور کی باتیں

یار کی باتیں کرنے والوں سے — ایسی ہیں جیسے حور کی باتیں

تلملانا۔ تڑپنا۔ جان دینا — ہیں دل ناصبور کی باتیں

تشنہ لب کے لئے ہیں آب حیات — عالی اپنے حضور کی باتیں

ایک دیوانہ تھا جو آپ کے گھر سے نکلا
کچھ خبر بھی ہے کہ تھا کون کدھر سے نکلا

میں نہا دھو کے ہوا پاک ہر اک عصیاں سے
رشک خجلت جو مرے دیدۂ تر سے نکلا

جسکا ہوتا ہے خدا اُس کے سبھی ہوتے ہیں
یہہ نہ سمجھو کہ کوئی کام بشر سے نکلا

تیری بخشش کے ہیں محتاج سبھی شاہ و گدا
وہ کہیں کا نہ رہا جو ترے در سے نکلا

اِس رقابت کے ہیں قربان کہ مرتے دم تک
تیر قاتل کا نہ دل سے نہ جگر سے نکلا

سب گنہ بھول گیا اک اِسی امید پہ میں
کوئی مایوس نہ اللہ کے گھر سے نکلا

خاکساری سے ہوا کام وہ اپنا عالؔی
اہل دنیا کا نہ جو سیم سے زر سے نکلا

دوسری غزلیات بھی مرصع اور پایہ کی ہیں لیکن اس مختصر سے مضمون میں ان کا پورا پورا اندراج نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اِس مضمون سے قارئین کو صرف شاعر کے حالات زندگی اور کلام کی خصوصیات سے روشناس کرانا مقصود ہے۔
اِس لئے چیدہ چیدہ اشعار ہی درج کئے جاتے ہیں جس سے عالؔی کی طبیعت کی روانی اور شاعرانہ کمال کا اندازہ ہو سکتا ہے

درد ہے آرام جاں اور موت بھی اک نیند ہے
کب تڑپتا ہے مریض عشق درماں کے لئے

کون کہتا ہے کہ تو خوگر بیداد نہیں
مجھ میں پہلی سی گر طاقت فریاد نہیں

لطف گل کیا ہو گلستاں کا مزہ کیا آئے
آج بلبل کو یہ شکوہ ہے کہ صیاد نہیں

ہائے کیا کیا نہ جوانی کے مزے تھے لیکن
یاد اتنا ہی رہا مجھکو کہ کچھ یاد نہیں

زمیں پر رہ کے تم خود کو نہ بھولو
ابھی سر پر تمہارے آسماں ہے

تیر نظر جو چلتے ہیں تیغ ادا کے بعد
کیا لوگے امتحانِ وفا پھر جفا کے بعد

سر دیا الفت میں ہم نے خوب سودا نگیا
اور کیا بنتا تھا آخر کام جو تھا بن گیا

رفتہ رفتہ باعثِ تسکیں ہوئیں بیتابیاں!
دردِ دل اتنا بڑھا بڑھکر مداوا ہو گیا

بے رخی، بیوفائی، بدعہدی
تو نے سیکھی ہے کیا جوانی سے

اک تجھ پہ دل کے آنے سے یہ حال ہو گیا
اپنی چیز کوئی دو جہاں نہیں!

قہر ہے نظارۂ خوباں بشر کے واسطے!
ہاں کلیجا چاہئے تیر نظر کے واسطے!

عالی اس بت کو بھلا چھوڑینگے کیونکر دیکے دل
جسکے اب ہم ہو چکے ہیں عمر بھر کے واسطے!

عالی کو اپنے بادشاہ اور وزیر سلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر سے دلی عقیدت ہے۔ جسکو انہوں نے اپنے کئی ایک اشعار میں بیان کیا ہے مثالاً چند درج ہیں ؎

مالک ہیں آصفِ سابع زہے نصیب
صد شکر ہے کہ عالی بھی ان پر نثار ہے

ہے وہی مالک مرا آقا وہی فخر شہاں
کیوں دعا عالی نہ نکلے شاہ عثماں کیلئے

شاد کی نیک دلی کا یہ اثر دیکھا ہے
جو بھی خواہ نہیں شاد کا وہ شاد نہیں

شاد کے حق میں دعا کر عالی
تیرے محسن ہیں سو جتا کیا ہے

ایک مدحیہ غزل کے چند اشعار درج ہیں ؎

جشنِ شمسہ ہے خمار میں ہیں ہم
آج ساقی بہار میں ہیں ہم

کس کے دیوانے ہیں نہیں معلوم
کس کے اب اختیار میں ہیں ہم

ہیں تو مشہور اس کے دیوانے
کیا کہیں کس شمار میں ہیں ہم

آصف سابع ایک ہیں عالی!!
کیسے اچھے دیار میں ہیں ہم

اور آخر میں عالی کے اس شعر کے ساتھ ہم بھی ہم آہنگ ہو کر کہتے ہیں ؎

ہزار شکر کہ زندہ ہیں ہم ابھی عالی
یہ جشن جوبلی آصفی منانے کو

مولوی سیّد علی نواز صاحب رضوی امانت خانی تصوّرؔ

تصوّر

مولوی سیّد علی نواز امانت خانی

سنہ ۱۳۱۱ھ

از۔ محمد عبدالرشید صاحب قریشی

مولوی سید علی نواز صاحب رضوی سنہ ۱۳۱۱ھ میں پیدا ہوئے انکے اجداد کا سلسلۂ نسب والدین کی طرف سے ایک ذی رتبہ اور وسیع خاندان کے بانی میرک معین الدین احمد امانت خانی وزیر دربار عالمگیری تک پہنچتا ہے جن کے دادا میرک کمال خانی خواجہ شمس الدین محمد خانی وزیر دربار اکبری کے ہمشیر زادے اور میر محی حاکم خراسان و کلید بردار حرم اقدس حضرت امام علی الرضا علیہ السّلام کی اولاد سے تھے۔

امانت خاں مذکور کی آل و اولاد کی کثرت نے اورنگ آباد میں کوٹلہ میرک جیو آباد کرلیا اور آپس کی شادی بیاہ نے اس خاندان کے ننھیال اور ددھیال کو ایک کردیا۔ انکے سات فرزند تھے جنمیں سے میر کاظم (امیر دربار میسور و حیدرآباد) سید عبدالرحمٰن وزارت خاں سید عبدالقادر منتظم الدولہ دیانت خاں اور میر حسین امانت خاں وزرائے عالمگیری بہت مشہور ہیں۔

عہد اکبری سے اس زمانہ تک اس خاندان کے افراد خدمات جلیلہ اور جاگیرات اور مناصب سے سرفراز رہے۔

میر عبدالرزاق صمصام الدولہ شہنواز خاں (مولف ماثرالامرا) اور نواب حسام الملک خانخانان بہادر بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تصوّر کے دادا سید زین العابدین جاگیردار و منصبدار میر عبدالسلام قوام الدّولہ فرزند صمصام الدولہ شہنواز خاں کے نواسے تھے۔ انکے والد میر کاظم علی خیالؔ دکن کے ممتاز اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ علم نجوم، خوشنویسی، نقّاشی، مصوّری اور خطوط ناخن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انکے بھتیجے اور شاگرد سید زین العابدین منصبدار و جاگیردار بقید حیات ہیں اور سوائے علوم نجوم کے بقیہ تمام فنون میں جواب نہیں رکھتے۔

انکے والد کے سر سے والدین کا سایہ ایام طفولیت ہی میں اٹھ گیا اور وہ چچا کی نگرانی اور سرپرستی میں پروان چڑھے

چچا کی وفات نے ان کو محروم الورث کر دیا اور سوائے منصب کے ان کے پاس کچھ نہ رہا۔

ولادت، تعلیم و شاعری

تصور کی جائے پیدائش محلہ اندرون دریچہ ماما حیدرآباد دکن ہے۔ بمشکل دو برس کی عمر ہو گی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ تعلیم گھر پر ہوئی۔ قابل اساتذہ کی توجہ اور فطری ذکاوت کی وجہ سے تصور نے فارسی میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ بچپن ہی سے طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف تھا۔ ۱۰، ۱۱ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اپنے استاد مرزا غلام علی جوشش مدراسی کو اپنی ایک غزل اور ایک نوحہ سنایا جس پر انہوں نے تکمیل تعلیم تک شعر نہ لکھنے کی تاکید کی۔ ترک تعلیم کے بعد نوحہ گوئی شروع کی اور ہلال تخلص رکھ لیا..... یہ نوحے زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے اور تلف ہو گئے۔ بزمانہ منصرمی مدار المہامی سر مہاراجہ بہادر شاد اپنے ایک دوست یازغ کی تحریک پر انہوں نے عبداللہ خانصاحب ضیغم کے مشاعرے کے لئے ایک غزل لکھی اور حضرت ضیا دہلوی سے اصلاح لی جس کا مطلع یہ ہے:-

مستعد وہ دلربا بیٹھا ہے جانے کیلئے دل میں یاس و حسرت و حرماں ہیں آنے کیلئے

غزل تاباں تخلص کے ساتھ درج گلدستہ ہو گئی۔ لیکن دوسری غزل کی اصلاح مرزا علی مہدی صاحب سید سے لی اور تقریباً ڈیڑھ دو سال تک انہی کی شاگردی میں شوقِ سخن بڑھائی طبیعت نہایت مضمون آفرین پائی ہے اسی نے حضرت حبیب کنتوری تک رہنمائی کی اور یہ انکے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہو گئے۔ ایک عرصہ تک تصور نے حبیب کنتوری سے صلاح لی ذیل میں ایک شعر درج کیا جاتا ہے جس میں استاد نے صلاح دی ہے:-

کرے گا کام جب دستِ جنوں شمشیرِ براں کا بنے گا زخم دامن دار چاک اپنے گریباں کا

(اصلاح) ملا ہے ناخنِ وحشت کو دم شمشیرِ براں کا بنے گا زخم دامن دار چاک اپنے گریباں کا

حضرت حبیب کنتوری کی وفات کے بعد انکے فرزند ضامن کنتوری سے مشورۂ سخن رہا اور یہیں فن نے ارتقائی منازل طے کیں

ذوقِ سخن اور مشاعرے

لنگر کوٹ بارہ دری اور مختلف مقامات پر ایک مدت مدید تک مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے جس میں تمام اساتذہ اور خوش فکر شعرا جمع رہتے۔ اساتذہ داد دینے میں بڑی فیاضی دکھاتے اور اس ہمت افزائی سے کئی ایک مبتدیوں نے متقدمین کی جگہ تک راستہ نکال لیا۔ تصور نے ان مشاعروں میں خوب دادِ سخن حاصل کی۔

اپنے ایک دوست وفا صاحب کی شادی میں تصور اور رعد نے متحد قوافی میں سہرے کہے اور دراندازوں کی لگائی بجھائی نے دونوں میں چشمک پیدا کر دی جو بہت دنوں کے بعد صلح پر ختم ہوئی۔ یہ سہرے اور تاریخیں وفا صاحب نے ایک گلدستہ کی شکل میں ہر شاعر کے فوٹو کے ساتھ طبع کرا کے تقسیم کیا اسکا تاریخی نام "تہنیت نامہ نشاط" ہے جو تصور ہی کا مجوزہ ہے۔

تصور نے تقریباً ہر مشاعرہ کے لئے غزل کہی اور اپنی خاص طرز کیوجہ سے ہر جگہ مقبول رہے۔ تصور کی زبان میں لکنت ہے اور جناب کیفی کے تمسخر نے انکو موجودہ طرز سکھائی گو انہوں نے اسکا اثر لیا جسکا اس شعر میں اظہار کیا گیا ہے ؎

کیوں تصور جائیے ایسوں کے گھر جو کہ ذلت دے بلا کر جا بہ جا

مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد کے خاص مشاعروں میں شریک ہونے کا شرف بھی تصور کو حاصل ہے۔ تصور نے ہر جگہ اپنے مداح پیدا کر لیئے جناب فصاحت لکھنوی، شفیقہ کنتوری، رشید وغیرہ اور دیگر شعراء نے انکے کلام کو بہت پسندیدہ نگاہ سے دیکھا ہے۔

جولانگاہِ سخن تصور غزل، قصیدہ، مخمس، ترجیع بند غرض تمام اصنافِ سخن میں مشاق ہیں مگر غزل بہت کم کہتے ہیں۔ مدح ائمہ کو وسیلہ نجات سمجھے ہوئے ہیں اور قصیدے کہتے ہیں اور قصیدے کہنے میں بھی ایک جدید ڈھنگ کے مالک ہیں قصائد کی تمہید میں ساقی نامہ، مبارک باد بہاریہ اشعار کا اضافہ بھی انکی خاص اختراع ہے اس التزام سے قصیدہ میں ایک نیا روپ پیدا ہو جاتا ہے مذہبی مجالس میں شہید اور جناب فاضل جیسے قصیدہ گو حضرات بھی اس جدت کو نہایت پسند کرتے ہیں۔

سعدیؒ کی طرح تصور کو بھی امراء کی مدح سرائی سے نفرت ہے اپنے بادشاہ ظل اللہ کی شان میں صرف دو قصیدے کہے اور بقیہ قصائد مدح ائمہ میں شعر گوئی کے دور وسطی میں ناسخ اور حضرت غالب کی ترکیبیں مطبوع تھیں لیکن اس عہد کا کلام باقی نہیں جس کے متعلق اس شعر میں اشارہ ہے ؎

برباد کیا تو نے کلام اپنا تصور کیوں صاحب دیواں نہوا پھر ابتک

تصور کے کلام میں مضمون آفرینی بہت ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بندشیں چست اور نہایت صاف ہیں۔

ترتیبِ دیوان حضرت حبیب کنتوری کی شاگردی اور آخری زمانہ کا جس قدر بھی کلام مل سکا مدون کر لیا گیا ہے۔

غزلوں کی مجموعی تعداد ۸۶۴ اور قصائد ۸۴ ہیں۔ دیوان کا نام "عمارت خیال" (۱۳۵۶ھ) ہے - دیوان میں سہرے، نظمیں، مخمس، تاریخیں اور مختلف کلام بھی درج ہے۔ اب ہم تصور کے کلام کے چند منتخبات پیش کرینگے جن کے مطالعہ سے انکی شاعری کا ایک ہلکا سا تصور قایم ہوسکتا ہے۔ سب سے پہلے ہم سلام کا نمونہ پیش کرینگے جسمیں تصور نے دلی عقیدت اور حمیت کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے

سلام

جہاز مغفرت میں مجلس سبط پیمبر کی — ہیں دریائے کرم دو چار بوندیں دیدۂ تر کی

نماز پر خلوص عارفاں ہے دید حیدر کی — نفس جتنے کھنچ آئی صدا اللہ اکبر کی

کھلا جب دل کا دروازہ تصور ہو گیا روشن — کلید قفل جنت ہے ثنا آل پیمبر کی!

سفینہ نوح کا ہیں آل احمد بحر ہستی ہیں — جو اس کشتی میں رہتے ہیں وہ ہو کر پار رہتے ہیں

اور جس شعر نے تصور کو دوسرے سال ہی سنہ ۱۳۵۲ھ میں مقامات مقدسہ کی زیارت کروائی وہ شعر یہ ہے ؎

گزرتی ہے جو شوق کربلا میں کہہ نہیں سکتا — دل بیتاب نے مر مر کے میری بات مانی ہے

اب غزلیات کے چند اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے جاتے ہیں جن سے تصور کی قوت مضمون آفرینی اور کلام کی روانی زبان کی صفائی ظاہر ہوسکتی ہے ؎

کوئی گر یادگار رنگ حسرت دل سے نکلیگا — فقط ایک خون کا قطرہ بڑی مشکل سے نکلیگا

زمانے میں کنار عافیت مشکل سے نکلیگا! — جو ہے تقدیر میں بچکر بھنور ساحل سے نکلیگا

سرایت کر گیا ہے سوز دل رگ رگ میں بسمل کی — دھواں بدلے لہو کے خنجر قاتل سے نکلیگا

خاک پر کھینچ کے تصویر شادی دل کی — اِس کو کہتے ہیں سلیقہ ستم آرائی کا

جاتی ہے جان اگر تو جائے پاس رہے نہ جائے دل — آتی ہے اگر موت تو آئے پر نہ کسی پر آئے دل

روح کی لہر کی طرح دوڑے جو سارے جسم میں — ایسی نگاہ شوخ سے اپنے کو کیا بچائے دل

تار سے اسکی یاد کے ساز نفس درست کر! — تا نہ تجھے سنائی دے سوئی ہوئی صدائے دل

تصوّر کے کلام کو پوری طرح جاننے کے لئے اُنکے دیوان کا غایر مطالعہ چاہئیے لیکن ہم انکے چند منتخب اشعار درج کر دینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں جملہ چیزوں کا آنا مشکل ہے۔ یہی چند اشعار صاحب ذوق کیلئے تصور کی شاعری کا پورا پورا خاکہ پیش کرسکتے ہیں ؎

کچھ تو ہے ہوتی ہے جو سرگوشی — زلف دلبر کے کان کے ہے قریب

سمجھتا ہے مجھے سوز دروں کا راز داں ہوکر — لہ شعلہ کیا کہے گا شمع کے منہ میں زباں ہوکر

خدا کی شان ہزاروں اُسی نے دل توڑے — نہ جس نے توڑے تھے دو پھول بھی گلستاں میں

ستم کے واسطے ڈھونڈھا کرو نئی چالیں — اپنی یہ نقش قدم ہی سے گل کھلاکے چلو

انگڑائیاں نہیں ہیں بت مست خواب کی — سانچے میں ڈھل رہی ہے ادائیں شباب کی

مٹی خراب کرنے کے محاورہ کو کس اچھے انداز سے استعمال کیا ہے ؎

میں تنگ زندگی تھا مجھے دفن کیوں کیا — بیفائدہ زمین کی مٹی خراب کی

مشاعرہ حضرت شاؔد میں لکھی ہوئی ایک غزل نہایت مرصع ہے جسکے چند اشعار درج ہیں ؎

رہِ الفت میں گردِ کارواں سے — زمیں اونچی ہوئی ہے آسماں سے

مری آنکھیں ہی سجدہ کررہی ہیں — نظر اٹھتی نہیں ہے آستاں سے

نگاہِ لطف قاتل پھر رہی ہے! — برسنے کو ہیں چھرّیاں آسماں سے

یہ برقِ طور بھی حیلہ ہے موسیٰ — اٹھا دو سارے پردے درمیاں سے

انتخاب قصائد

حضرت امام حسین علیہ السّلام کی ولادت باسعادت کے قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار

شہید عشق نے پائی مراد من مانی — لہ روز قتل تھی عید اسکی خود تھا قربانی

بنا کہ آئینہ جسکی بنی تھی ذات شہید — حیات دیکھ رہی تھی جسے بحیرانی

امید و بیم کے برزخ میں تھی ثباتِ شہید — جو دو جہان میں تھی باعثِ پریشانی
تھی دھار تیغ کی بس سرحدِ حیاتِ شہید — حیات ختم تھی جس جا تھا تیغ کا پانی
بہی جو خون کی ندی بنی فراتِ شہید — کیا تھا ایک اسی واسطے لہو پانی
نہ کیوں ہو حسنِ عمل مظہرِ صفاتِ شہید — تھا قتل گاہ میں اندازۂ سلمانی
تھا دینِ عشق میں وہ رتبۂ ثباتِ شہید — کہ دل جو ہو گیا قائم تھا رکنِ ایمانی
رقم تھی خون کی سرخی سے وارداتِ شہید — زبانِ تیغ پہ تھی جس کی شرح طولانی

حضرت صاحب الامر علیہ السلام کی ولادت کے قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار

جو ہو ذات مجسمت کو ہی کہتے ہیں صفا — جو ہے دو عالم کے دو حیرت کدے ہیں آئنا
حسن تصویر تصوّر ہے جمالِ آئینہ — عالمِ صورت میں ہوں اک میں بھی حیرت آئینا
عکس ابرو آئنے میں ہے ہلالِ آئینہ — چاند نکلا عید کا تو صاف مطلع ہو گیا
آئینہ ہے زیرِ دامانِ خیالِ آئینہ — کس سلیقہ سے ہے آئنے پہ آئینہ دھرا
عشق ہے مشکل ہی تجھ سے جدالِ آئینہ — خیر ہو یا رب کہ دل آئنے سے نازک سوا
ہے کدورت ہی فقط گرد ملالِ آئینہ — دھو گیا گر دل تو پھر کچھ بھی نہیں غمازِ صفا
دل ہے اک معمورۂ ضو ہی مثالِ آئینہ — اس طرح روشنگرِ ہستی نے روشن کر دیا
ہے صفائے باطنی تصویرِ حالِ آئینہ — آئینہ ہے اصل میں عاشق کا قلبِ پُر صفا
ہے اسی آئنے میں ضو بار صورت یار کی — یار کی صورت کا قلب پر صفا ہے آئنا
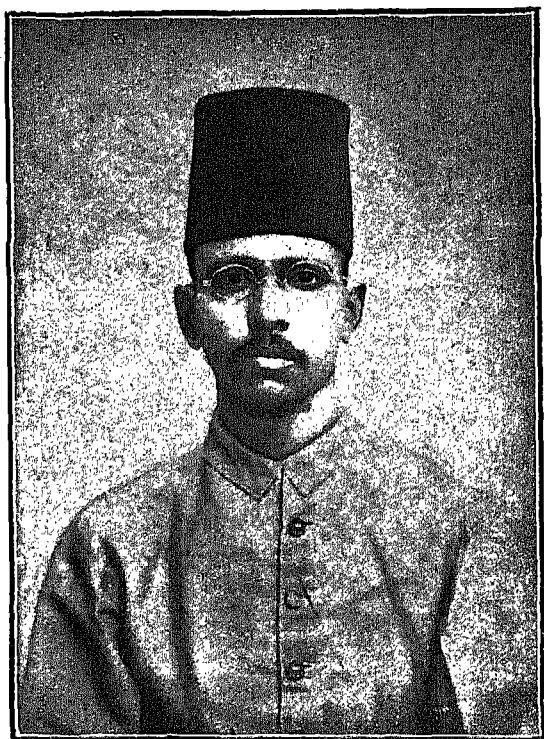
سید غلام مصطفی ذہین مرحوم

ذہینؔ

سید غلام مصطفیٰ

۱۲۹۹ھ ہجری تا ۱۳۷۹ھ ہجری

از۔ محمد عبد العزیز صاحب رضا غوثی

مولوی سید غلام مصطفیٰ ذہینؔ جو دفتر صدر محاسبی میں نائب منتظم منشی تھے ۱۲۹۹ھ میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے
انکے والد مولوی سید ابراہیم عدالت العالیہ کے سررشتہ دار تھے۔ ذہینؔ حیدرآباد کے ایک مشہور و معروف، شریف، علمی اور مذہبی
گھرانے کے چشم و چراغ تھے جس کی زندہ یادگار انکے بڑے بھائی مولانا سید غلام نبی صاحب فہیمؔ سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ ہیں
جن کی علمیت پر ذہینؔ کو ناز تھا چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

عالم و فاضل دوراں ہیں مرے بھائی فہیمؔ — شکر کی جا ہے ذہینؔ اپنا ہے ایسا بھائی

مشہور شیخ طریقت حضرت مسکین شاہ صاحب قدس سرہ العزیز انکے خالو تھے۔ سند الملک آقا سید علی شوستری اور علامہ ابوبکر
بن شہاب اور حیدر یار جنگ علامہ علی حیدر طباطبائی سے انکو شرف تلمذ حاصل تھا۔

ذہینؔ پر ابھی دو تین ہی بہاریں گذری تھیں کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ماں کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی
حیدرآباد کی مشہور درسگاہ دار العلوم میں عربی، فارسی اور اردو کی تحصیل کی تھی۔ مقتضائے زمانہ نے انہیں انگریزی سیکھنے پر مجبور کیا
یہ شوق مرنے کے کچھ دن پہلے تک رہا۔

طریق زندگی بالکل سیدھا سادہ تھا۔ لباس صاف اور سادہ زیب تن کیا کرتے تھے غذا میں احتیاط ملحوظ
رکھتے تھے۔ دال چپاتی مرغوب غذا تھی۔

حافظہ قوی تھا۔ اساتذۂ سخن کے ہزاروں اشعار ازبر تھے۔ فطرتاً ذہین واقع ہوئے تھے۔ اپنی خداداد ذہانت

کی یاد تازہ رکھنے کے لئے انہوں نے اپنا تخلّص ذہین رکھا۔ دس بارہ سال کے سن ہی سے عربی۔ فارسی اور اردو میں طبع آزمائی شروع کی۔

بقول محمد حسین آزاد حیدرآبادی "تحقیق انکی گھٹی میں پڑی تھی" ایک ایک لفظ کے لئے کئی کئی کتابیں دیکھ ڈالتے اور جب تک کسی لفظ کی صحت کا انہیں کامل یقین نہ ہوتا اسکا استعمال جائز نہ رکھتے تھے الفاظ کا انتخاب تحریر و تقریر نظم و نثر میں بڑی جانکدستی سے کرتے تھے۔ اسی تحقیق اور صحت زبان کے خیال کا نتیجہ ہے کہ انکی نظم و نثر زبان کی غلطیوں اور لغزشوں سے یکسر پاک ہے چنانچہ تاثیر الفاظ کے تحت فرماتے ہیں۔

"میرے خیال میں اکثر الفاظ کی تذلیل انکا بے موقع استعمال اور بے جا اختیار ہے" جیسا کہ انکے کلام سے ظاہر ہے وہ مجسّمۂ صدق و صفا۔ پیکر محبّت و خلوص اور ہیکل حسن اخلاق تھے۔ ہر شخص کی داستان مصیبت اور عسرت پر ایک مستقل اضطرار اور مستحکم ہمدرد بن جاتے اور جب تک اپنی بساط بھر اور کبھی استطاعت سے بڑھکر امداد نہ کرتے انہیں چین نہ آتا اپنی طبیعت کے اس رجحان اور اپنے افلاس کا یوں خاکہ کھینچتے ہیں ؎

مفلس ہوں ذہین اسیر ہے خواہش ہمدردی　　　بے چارہ و بے زر سے کیا چارہ گری ہوگی

گو قلیل المعاش تھے مگر صبر و شکر اور شانِ خودداری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا خوشامد کو عین ذلت جانتے تھے فرماتے ہیں

چاپلوسی خلق کی کرنی ہی ذلت ہے ذہین　　　جس سے عزت ہو وہ خالق کی عبادت ہے ذہین

جو مانگنے اللہ سے مانگتے ؎ وہی رازق وہی منعم وہی مغنی ہے ذہین　　　مانگو اللہ سے قدرت بڑی اللہ میں ہے

اپنے فرائض کے شدّت سے پابند تھے۔ چنانچہ عہدہ داران متعلقہ انکی فرض شناسی اور کاردانی کے مداح تھے کبر و نخوت کا انکی ذات سے تو کیا تعلق ہوتا وہ کبر و نخوت کے مالک کو دائرۂ انسانیت ہی سے خارج کر دیتے ہیں

؎ وہ نہیں انسان جسمیں کبر و نخوت ہو ذہین　　　ہے تو زیبا آدمی کو آدمیت ہے ذہین

نیک نامی اُن کا مطمح نظر تھی ؎　　　ہے یہی اپنا عقیدہ اے ذہین　　　نیک نامی ہے جمال زندگی

نام و نمود و شہرت کی مطلق پروا نہ تھی۔ کبھی مشاعروں میں شریک ہو کر غزل نہیں پڑھی حد درجہ منکسر المزاج

جس سے ملتے خلوص وانکسار سے ملتے۔ احسان کرتے مگر نہ جتاتے ؎

خلق کے ساتھ لو خلوص سے احسان کرو — یہہ عبادت ہے ذہین

غرض ذہین کی شخصیت اخلاق بلکہ مکارم اخلاق کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی جسکا اثر

ذہین قدرتی طور پر لاغر و نحیف تھے گو تبخیر کی دیرینہ شکایت سے گھل گھل کر مشت استخواں رہ گئے

انکا یہہ مصرعہ بالکل اُن کے حسب حال تھا۔ ع "ذہین خستہ مشت استخواں ہے"

مگر تبخیر کا یہہ بڑھتا ہوا سیلاب انکے ذوق علمی و شاعری دماغی کاوش تصنیفاتی انہماک خدمت زبان وادب اور شغف تحقیق

میں مانع نہ تھا ان کے گل ریز قلم کے حسب ذیل تصانیف ہیں ۔

(۱) خدائق الاخلاق ۱۵۲ صفحات کا مجموعہ جسمیں مختلف عنوانوں کے تحت ۲۲ نثری مضامین اور ۲۶ نظمیں ہیں۔

ملک نے اسکو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور سررشتہ تعلیمات سرکار عالی نے اسکو اسکول فائنل کے نصاب میں شریک اور

سررشتہ تعلیم ممالک متحدہ نے انعام طلبہ اور کتب خانوں کیلئے منظور فرمایا تھا۔

(۲) تہذیب الاطفال۔ ۶۰ صفحوں کی کتاب ہے جس میں مختلف عنوانوں کے تحت سبق آموز اور دلنشین منظوم حکایات ہیں

اس کتاب کو صدر مجلس انتخاب کتب سرکار عالی نے مدارس وسطانیہ کے کتب خانوں میں رکھنے اور مدارس تحتانیہ میں بطور انعام

دینے کے لئے منظور فرمایا تھا۔

(۳) زن بدخو۔ ایک ناخواندہ اور بدتہذیب بیوی کی وجہ گھر کی تباہی کا اظہار دردناک مگر دلچسپ نظم میں کیا گیا ہے۔

(۴) زن نیک خو۔ بدخصلت عورت کے مقابلہ میں ایک نیک سیرت اور تعلیم یافتہ بیوی کے قدم کی برکت سے جن برکات کا نزول

ہوتا ہے۔ اسکو نہایت ہی لطیف پیرایہ میں نظم کیا گیا ہے

(۵) گلشن اطفال۔ یہہ رسالہ نوآموز بچوں کیلئے لکھا گیا ہے اِس میں جدید طرز کی ۳۴ نظمیں ہیں۔

(۶) سیرت خیر البشر۔ یہہ ۸ صفحوں کا مختصر رسالہ ہے اسمیں اِن بعض مشہور احادیث کو نظم کیا گیا ہے جن کا تعلق سیرت نبوی سے ہے

(۷) نیک بیٹی۔ ۷۷ اشعار کی ایک اخلاقی نظم ہے جو بچیوں کیلئے بے حد مفید ہے۔

(۸) سوغات صالحات۔ ۶۰ صفحوں کی ایک مختصر کتاب ہے جسمیں عورتوں اور لڑکیوں کیلئے مختلف قسم کے عنوانات پر بیش بہا نظمیں ہیں۔

(۹) سیرتِ مبارک۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری۔

(۱۰) چھوٹا شیطان۔ شیطان اور ایک بیوقوف شخص کا نہایت مزیدار اور پُر لطف منظوم قصّہ۔

(۱۱) بالک باغ۔ حصہ اوّل و دوم۔ عالم طفلی کے مشرقی و مغربی طرز ادب کا مکمل نمونہ یعنے بچوں کے درس و تدریس کے لایق بے حد دل کش اور پاکیزہ اخلاقی نظمیں۔

جب ذہین نے میدانِ شاعری میں قدم رکھا تو ان کا دل و دماغ حسن و عشق ہی کی طرف مائل ہو گیا۔ چنانچہ کچھ دنوں انکے اشہب قلم نے اسی بے کیف اور پامال مرغزار کی سیر کی اگرچہ گھر کی فضا مذہبی اور اخلاقی تھی مگر شاعری کا ماحول عشق و عاشقی مبالغہ اور اغراق سے معمور تھا۔ یہ شاعر پیدا ہوئے تھے اور شدت سے طبیعت کا لگاؤ شعر گوئی کی طرف تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں تک تغزل کے رنگ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نمونۃً چند اشعار ملاحظہ ہوں جو غیر مطبوعہ ہیں ؎

سن کے عرض مدعا کچھ نہ آپ نے کہا — بت سے بن گئے ہیں کیوں لا نہیں نعم نہیں

دے کے دیتے ہیں ہے کیوں ساقیا نا اہل اب — کچھ میں متقی نہیں شیخ محترم نہیں

یوں مجھے نہ چھوڑ جاو ار اور اک لگا — تیری تیغ میں تو ہے گرچہ مجھ میں دم نہیں

ادہر ہو ناز ادہر شیوۂ نیاز رہے — بڑا ستم ہے ستم سے اگر وہ باز رہے

میں خوش اسی میں ہوں کب آرزوئے درماں ہے — دوائے دل ہے یہی درد جاں گداز رہے

وہ تمام ابتدائی غزلیات جن میں حسن و عشق کی جگہ جگہ جھلک پائی جاتی ہے۔ ذہین نے قصداً شائع نہیں کیں کیونکہ انکی طبیعت اخلاقی شاعری کی طرف زیادہ مائل تھی۔ سید شعار احمد صاحب شعار ذہین کے داماد نے غیر مطبوعہ کلام کو طبع کروانے کا تہیّہ کر لیا ہے۔ امید ہے کہ قریب میں یہ مجموعہ غزلیات بھی شائع ہو جائے گا۔

ذہین اہل ملک کو مہذب اور با اخلاق دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انکے عیوب کھول کھول کر انکے سامنے رکھدئے ہیں

تعجب ہے کہ انسان ہو کے تم حیوان سے بزدل ہو — کرو ہمت تو بن سکتے ہو سہراب و نریمان سے

ہر حال میں حق کہنا راضی برضا رہنا ۔۔۔ آفت جو پڑے سہنا ان سب میں بھلائی ہے

خود کامیوں کے بندے کیوں ایسے بنگئے ہو ۔۔۔ خود غرضیوں کے دھندے چھوڑو کہیں خدا را

شرم و حیا نہیں ہے آنکھیں ہیں یا ہیں ڈھیلے ۔۔۔ مہر و وفا نہیں ہے دل ہے کہ سنگ خارا

حضرت ذہین نے صنف نازک کے لئے سوغات صالحات ۔ نیک بی بی وغیرہ کتابیں تصنیف کیں جن میں اخلاق آموز قصے نرم شیریں اور دلنشیں طرز اور زبان میں منظوم کئے ۔ صنف نازک کو اپنے فرائض سے آگاہ کیا ۔ نیک بی بی اور اچھی ماں بننے کی تلقین کی ۔ حیا ۔ پردہ اور تعلیم نسواں کی اہمیت بتلائی ۔ مغرب کی اندھی تقلید کو سم قاتل قرار دیا ۔

آویزۂ نصیحت کے تحت فرماتے ہیں :۔

ہو جس میں حیا وہی ہے عورت ۔۔۔ عورت نہیں جس میں ہو نہ غیرت

سمجھو کہ حیا ہے جزو ایماں ۔۔۔ ایمان اسی سے ہے سلامت

عصمت سے شرف ہے عورتوں کو ۔۔۔ عصمت ہی نہ ہو تو کیا شرافت

دوزخ سے بھی وہ مکاں ہے بدتر ۔۔۔ جس گھر میں نہ ہو شریف عورت

عورت میں نہ ہو زباں درازی ۔۔۔ ہوتی ہے ہر اک کو اس سے نفرت

پردہ کی اہمیت جتانے کیلئے سلمیٰ اور لیلیٰ کا مناظرہ پیش کرتے ہیں ۔ اول سلمیٰ کی زبان سے جواز بے پردگی کیلئے حجت اور پھر لیلیٰ کی زبان سے پردہ کی خوبیاں بیان کرواکر پردہ کو بے پردگی پر ترجیح دیتے ہیں ؎

سلمیٰ

گھر میں بیٹھی رہو تو ظاہر ہے ۔۔۔ بند گویا قفس میں طائر ہے

رہے سیپی میں گر نہاں موتی ۔۔۔ قدر اس کی کبھی نہیں ہوتی !!

ہم نے دنیا کا کیا قصور کیا ۔۔۔ کس لئے ہم ہیں قید کیا ہے خطا

کیوں ہیں ہم سیر باغ سے محروم ۔۔۔ کیوں ہیں مجبور ہم نہیں معلوم

خانہ داری کا بار ہے ہم پر ۔۔۔ بار بھی ناگوار ہے ہم پر

ہم ہیں علم و ہنر سے بھی عاری — کوئی دیکھے ہماری یہ خواری

جواب لیلی

حوریں جنت کی ہیں نظر سے نہاں — پر ہے مشتاق انکا ایک جہاں

تو کہے دیتی ہوں یہ نکتہ ہیں — اچھی چیزیں چھپا کے رکھتے ہیں

ہم یہ مردوں کا ہے بڑا احساں — کہ وہ حق کے ہیں تابع و فرماں

نوکری کا اگر ہمیں ہو خیال — ننھے بچوں کی کسطرح ہو سنبھال

عورتوں کا ہے شیوہ شرم و حیا — اور فطرت کا ہے یہی منشا

اس لئے چاہئے ہمیں پردہ — ہم کو بے پردگی نہیں زیبا

غرض ذہین ہمدرد اور مصلح نسواں تھے اگرچہ انکی نظمیں تخیل کی بلند پروازی الفاظ کی شان و شوکت اور شعریت کے لحاظ سے بلند پایہ نہیں مگر اپنے مقصد میں کامیاب اور سادگی اور عام فہمی کا نمونہ ضرور ہیں یہ حقیقت ہے کہ بچوں کے ننھے ننھے دل و دماغ میں علمی، فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل کو سمجھنے کی استعداد نہیں ہوتی۔ بچے ہر معمولی قابل فہم مگر غیر دلچسپ چیز کے سمجھنے سے بھی بھاگتے پھرتے ہیں۔ جیسی محویت اور دلچسپی انکو کھیلنے میں ہوتی ہے پڑھنے میں نہیں ہوتی۔ ذہین نے طفلی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا اور تہذیب الاطفال و گلشن اطفال تصنیف کیا۔ جن میں وہی مزیدار قصے اور دلچسپ کہانیاں جن کو ہم بچپن میں اپنی نانا اور دادی سے سنا کرتے تھے خاطر نشین اور لطیف پیرایہ میں نظم کئے۔ چونکہ ان سے ذہین کا مقصد اولین بچوں میں اخلاق کا بیج بونا ہے۔ اسلئے انہوں نے ہر نظم کو کسی نہ کسی پند و موعظت پر ختم کیا ہے۔ بچوں پر نظمیں پڑھنے کا شوق تو شیطان کی طرح سوار رہتا ہے۔ یہی نظمیں آہستہ آہستہ انکی اخلاقی تعمیر شروع کر دینگی حتی کہ ایک وہ دن آئیگا کہ وہی تعلیم اور درسگاہ سے بھگوڑا بچہ مجسمہ اخلاق اور تعلیم کا شیدائی ہوگا ان نظموں میں مقناطیسی اثر ہوتا ہے جو اپنی طرف لوہے کو نہیں بچوں کو کھینچتا ہے ورنہ بقول عظمت اللہ خاں صاحب بی۔ اے "استاد جی زبان سے کہلوائیں "کریما بہ بخشا" مگر دلچسپی کے فقدان اور تخیل کے جادو سے بچے کا دل اپنی گلی میں لٹو کے ساتھ پھرتا رہیگا۔ یا کبڈی کبڈی کا ورد کرتا رہیگا۔"

غرض اردو زبان میں ادب طفولیت کا فقدان تھا۔ اگر کسی شاعر نے بچوں کی نفسیات کے مطالعہ کے بعد ان کی

من بھاتی نظمیں لکھیں تو وہ ذہین ہی ہیں۔

بچوں کیلئے کچھ لکھنا اور وہ بھی اس طرح کہ وہ انکی اخلاقی تعمیر کی ذمہ دار ہو فولاد کے چنے چبانا ہے۔ اس صنف میں اکثر جادو نگار شعرا بھی ہار مان جاتے ہیں۔ یہہ ذہین ہی کی قدرتِ قلم تھی جس نے اس مشکل کو آسان بنالیا۔ نظمیں چھوٹی چھوٹی سلیس۔ موثر اور دلنشیں ہیں نمونتہً دو ذہین نظمیں پیش ہیں۔

حرص

گوشت کچھ منہ میں لیکے اک کتا ۔۔۔ کر رہا تھا عبور ندی کو
عکس اپنا جب اسکو آیا نظر ۔۔۔ دوسرا کتا اس کو وہ سمجھا
حرص اس پر جو آگئی غالب ۔۔۔ کیا جلدی سے عکس پر حملہ
گر پڑا اسکے منہ سے چھٹ کر گوشت ۔۔۔ حرص کا ہے ذہین یہہ ثمرہ

لکڑی کا گھوڑا

میرا لکڑی کا گھوڑا ۔۔۔ کیسی تیزی سے دوڑا
بس بس اب ٹھیرو گھوڑے ۔۔۔ ورنہ ماروں گا کوڑے
اب جو دوڑے جاؤ گے ۔۔۔ دیکھو کوڑے کھاؤ گے
مان اے گھوڑے میری بات ۔۔۔ کتے کو کیوں ماری لات
ہاں نہ کھینچا اب دُم کو ۔۔۔ کاٹ نہ کھائے وہ تم کو
میں کرنے جاتا ہوں جنگ ۔۔۔ جو دیکھے گا ہوگا دنگ
میری لکڑی کی تلوار ۔۔۔ کرتی ہے کیا اچھا وار
لکڑی ہو یا ہو کھیرے ۔۔۔ کردیتی ہے دو ٹکڑے

ذہین کو چہ غزل میں بھی اپنی ناصحانہ شان ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ خاکساری کا سبق یوں دیتے ہیں

سرکش نہ ہو کہ شیوۂ آتش ہے سرکشی ۔۔۔ ہو سرنگوں نہال ثمردار کی طرح

جب تک رہے نیام ذہن میں ملیگا امن — ہے یہہ زبان خنجر خونخوار کی طرح

زخم سناں سے زخم لساں ہے بڑھا ہوا — قابو میں وقت غیض بشر کی زباں ہے

دیکھو جہاں عروج تو سمجھو وہاں زوال — وہ کونسی بہار ہے جسکو خزاں نہیں

بیتا نہ ہو جو دل تو حقیقت مجاز ہے — ورنہ مجاز میں بھی حقیقت کا راز ہے

ہر قلب میں ہے سرّ حقیقت چھپا ہوا — ہر غنچہ باغ دہر کا سربستہ راز ہے

الفت جو ہوگئی تو کہاں مرتبہ کی قید — محمود ہے نہ شاہ نہ بندہ ایاز ہے

دنیا کے غم سے موت ہی دیگی ہمیں نجات — تا زندگی ہی شمع کو سوز و گداز ہے

وہ دنیا کیا اگر دیتے ہوئے کوئی مکدر ہو — لہ جو ہنستا ہوا دے وہ ہے اچھا ابر گریاں سے

جو راز تھا چٹکنے سے غنچہ کے کھل گیا — اب کیا کوئی کلام کسی کے دہن میں ہے

اولین نور کا ہوں میں پرتو — ذرۂ آفتاب تاباں ہوں

کون مسجود تھا فرشتوں کا — آدمی بنکے کیوں پشیماں ہوں

ہو اگر چاک چاک غم کیا ہے — یوسف مصر کا میں داماں ہوں

ذہین گو لفظی اور معنوی صنعتوں کے دلدادہ نہیں۔ مگر روانی کلام میں اکثر جگہ لفظی اور معنوی صنعتیں آکر کلام کو بامزہ کردیتی ہیں۔

ذہین نے تقریباً ہر صنف سخن میں فکر سخن کی اور ہر صنف میں اپنی ناصحانہ شان ہی کو نبھایا ہے۔ ہر صنف کے کلام کے نمونوں کو پیش کرنے کا یہاں موقع نہیں ورنہ ذہین حیدرآباد کے ایک ایسے باکمال اور پرگو شاعر ہیں کہ ان پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے ذہین کے مضامین نثر سیل ہوسنی میں بہہ گئے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

بہہ گیا ساتھ ان کے میرا غیر مطبوعہ کلام — ان مضامین و تراجم کی نہ ایک کاپی رہی

ذہین نے پچاس سال کی عمر میں ۱۲ شعبان ۱۳۴۹ھ کو انتقال کیا اور تکیہ شاہ میرالدین میں مدفون ہوئے۔

رائے گورسرن بلی صاحب آزاد

آزاد

گورسرن بلی متوکّل باللہ

۱۳۰۰ ہجری
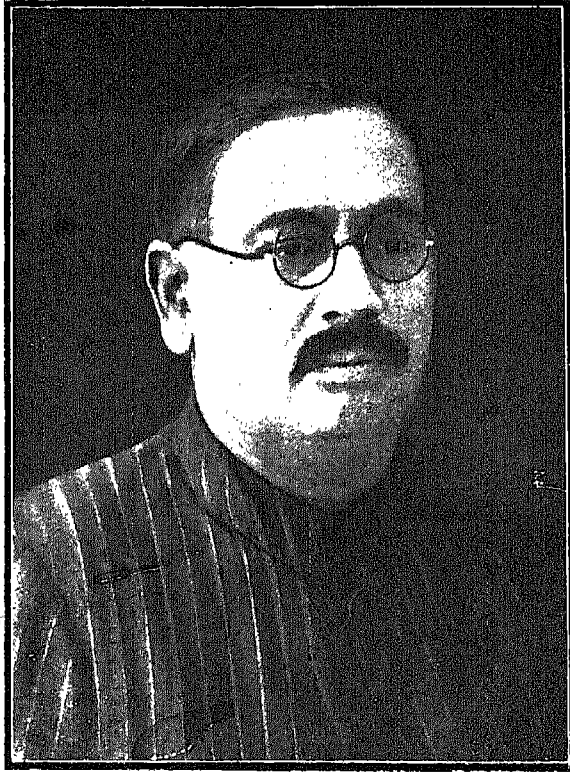
از محمد عبدالسّلام صاحب اختر

گورسرن بلی نام۔ متوکّل باللہ کنیّت۔ آزاد تخلّص۔ یہ فرقہ کالیست کے رکن ہیں۔ چونکہ قوم کالیست کے چورانّی لقب خاندانی ہیں سے ایک لقب توکل بھی ہے۔ اسلئے آزاد نے اپنی کنیّت متوکل باللہ رکھی ہے۔ یہ ایک ایسے خاندان کے رکن ہیں جس کا تعلق قدیم سے شاہانِ اودھ سے رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد راجہ شیوراج بہادر کے پدر بزرگوار مہاراجہ اندرجیت نے آزاد کے جد امجد کو لکھنو سے حیدرآباد طلب فرمایا۔ یہاں آنے کے بعد راجہ شیوراج بہادر اور ان کے بھائی راجہ مرلی منوہر کی شادی آزاد کی دونوں پھوپیوں کے ساتھ ہوگئی اور مہاراجہ اندرجیت نے آزاد کے والد رائے راج بلی اوج کو اپنی صاحبزادی بیاہ دی۔ اس طرح آزاد مہاراجہ اندرجیت کے نواسے اور راجہ شیوراج بہادر کے ہمشیر زادہ ہوتے ہیں۔

رائے راج بلی اوج کا علمی مذاق بہت اچھا تھا۔ نظام کالج کے پہلے دور کے تعلیم یافتہ اور فارسی و سنسکرت کے اچھے عالم تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مذاق کے تحت آزاد کی تعلیم میں بھی کافی دلچسپی لی۔ اور نہایت قابل اساتذہ سے تعلیم دلوائی۔ آزاد نے مولوی محمد اکبر صاحب مولوی محمد وزیر علی صاحب اور غلام غوث صاحب وغیرہ سے اردو فارسی کی نیز مدرسہ عالیہ (نظام کالج) میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے۔ جب یہ پندرہ سال کے تھے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا جس کی وجہ سے آئندہ کالج کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

آزاد کے دادا کا تخلّص توکل تھا۔ اور والد اوج تخلّص کرتے تھے۔ انکے چچا رائے مہابلی انور بہت اچھے شاعر گزرے ہیں جن کا مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ اس طرح آزاد نے گویا شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ اپنے باپ دادا کے کلام کو دیکھکر انہیں بھی

شعر کہنے کا شوق ہوا۔ قدرتاً انکی طبیعت شعر و شاعری کیلئے بہت موزوں ہے۔ کم عمری سے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتداءً انکے کلام کی اصلاح انکی برادری کے ایک بہت مشہور شاعر ڈاکٹر کرپا شنکر حشمؔ کیا کرتے تھے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر ہی میں آزادؔ اردو و فارسی میں صاف غزلیں کہنے لگے۔ انیس ۱۹ سال کی عمر تک انہوں نے دو سو غزلیات اور کئی نظمیں لکھ ڈالیں انکا کلام اس دور کے ماہانہ رسائل جلوۂ محبوب، محبوب الکلام، پیام یار وغیرہ میں اکثر چھپتا رہا ہے۔

افسوس ہے کہ آزادؔ کا سارا پچھلا کلام اور انکے والد اوجؔ کا مکمل دیوان مکان کی چھت گر پڑنے کی وجہ سے برباد و ضائع ہو گیا۔ آزادؔ کو اپنے کلام کے ضائع ہونے کا زیادہ ملال نہیں۔ اپنے والد کے کلام کا انہیں بیحد رنج ہے۔

آزادؔ کا بیان ہے کہ وہ اپنے اس آخری عمر کے کلام کیلئے مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شادؔ کے عطوفاتِ خاص کے مشکور اور رہینِ منت ہیں۔ کیونکہ مہاراجہ موصوف آزادؔ کے والد اوجؔ کے عہد طفولیت کے عنایت فرما دوست رہے ہیں انہی کے ارشاد اور قدر افزائی کی بدولت آزادؔ کا کلام پایۂ تکمیل کو پہونچا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

سرکار شادؔ کی ہیں یہ ذرّہ نوازیاں　　　آزادؔ ورنہ کوئی فصیح البیاں نہ تھا

مہاراجہ بہادر کے خاص مشاعروں میں آزادؔ کو اکثر و بیشتر شرکت کا شرف حاصل رہا ہے لکھا ہے ؎

دکن میں تم ہو بزم شادؔ کے رکن　　　غزل آزادؔ کیوں کر ہو نہ بانکی

حیدرآباد کے اکثر بڑے بڑے شعراء نے آزادؔ کے کلام کو پسند فرمایا ہے۔ اور دہلی اور لکھنؤ کے اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہو کر وہ دادِ کلام پا چکے ہیں۔ حبیب کنتوری کے فرزند جناب ضامن کنتوری سے آزادؔ کو شرف تلمذ حاصل ہے۔

انکا جملہ کلام قصائد، مثنوی، نظم، غزل، رباعیات، سہرے اور قطعات تاریخ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ انہوں نے عمر خیام کی مشہور ترین رباعیات کا سلیس اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا ہے، جو عنقریب طبع ہو گا۔

آزادؔ گو ہندو ہیں لیکن کسی خاص مذہب کے پابند نہیں۔ توحید کے قائل ہیں۔ چنانچہ انکے متعلق انکے استاد ضامن کنتوری کی حسب ذیل رائے ہے۔

”آزادؔ آزاد ہے، آزادؔ کا کلام آزادوں کے دل کی آواز ہے۔ عارض نہیں، خال نہیں، گیسو نہیں، کاکل نہیں، لفظی گورکھ دھندا نہیں،

بیان کا ایچ پیچ نہیں، حقائق کا گنجینہ ہے، تعلیم و ہدایت کا آئینہ ہے، تعلیم قرآن کی ہو یا گیتا کی، انجیل کی ہو یا زبور کی، راہیں الگ الگ ہیں منزل ایک ہے۔ مقصد سب کا خدا شناسی اور معرفت ذات ہے۔ آزاد کا دل باینہمہ آزادی عشق ذات کا پابند ہے۔ اور انکے کلام میں اس عشق کی جھلک نمایاں ہے"

راجہ شیو راج بہادر کے خاندان کے ایک فرد ہونیکی حیثیت سے آزاد فکر معیشت سے بڑی حد تک فارغ البال ہیں۔ تاہم ملازمت شاہی کے شوق میں تقریباً تین سال تک دارالطبع سرکار عالی میں گورنمنٹ گزٹ پریس پر ملازم رہے۔ بعد میں انہوں نے خود ہی اس ملازمت کو ترک کر دیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد ہی اپنے ماموں زاد بھائی راجہ اندر کرن سابق صوبہ دار و ناظم کروڑگری کے اصرار پر انہیں دوبارہ سرکاری ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ چنانچہ ضلع بیدر، عثمان آباد اور دھرم آباد وغیرہ پر پیشکار و تحصیلدار کی حیثیت سے پانچ سال تک اپنی خدمت کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اسی زمانے میں انکی محبوب رفیقۂ حیات نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اسکا ان پر ایسا زبردست اثر ہوا کہ ملازمت کو خیرباد کہکر خانہ نشینی اختیار کی۔

اس جانکاہ صدمہ کی وجہہ سے آزاد کا طبعی رجحان فن شعر کی طرف کم ہوتا گیا۔ تاہم کبھی کبھی مشاعروں میں غزلیات یا شادی بیاہ کے مواقع پر سہرے اور قطعات کہہ لیا کرتے ہیں۔

اسوقت آزاد کا سن پچپن سال ہوگا۔ یہہ ایک خدا شناس، راستباز اور قدیم وضع کے پابند انسان ہیں شگفتہ خاطری طرۂ امتیاز ہے لیکن اسکے باوجود حالات خانگی نے انہیں تاثرات کی دنیا میں پہونچا دیا ہے۔ اور یہی وجہہ ہے کہ واردات قلبی اور کیفیات ذہنی کے نکتہ ہائے خرد فزا جوان کے کلام میں پائے جاتے ہیں وہ قابل التفات ضرور ہیں۔

نمونہ کلام آزاد

ہر ذرۂ کونین ہے گھر ذات خدا کا　　قبلہ ہے مگر نام فقط قبلہ نما کا
اس ذات میں وسعت کا ٹھکانا نہیں جسمیں　　اک نقطہ ہی موہوم فقط ارض و سما کا
حرکت میں سکوں مل گیا جس قلب کو آزاد　　حق دار وہی دہر میں ہے ظلِ ہما کا

پھر نہ پلٹی وہ صدا اس گنبدِ دوار سے　　نعرۂ منصور کا یہ ہمت مردانہ تھا
زندگی سیلِ حوادث کا ہے بھنور آزاد　　سازِ ہستی ہے فقط خواب پریشاں اپنا
دعوے جنہیں آزاد تھے یاں نام و نشاں کے　　عالم میں نظر آتے ہیں بے نام و نشاں آج

نہ ممکن نیست سے ہستی نہ ہستی نیست سے ممکن
یہ عالم ہست مطلق ہی چھپا معلول و علت میں

قصور فہم ہے عصیاں مجھے عصیاں سے کیا نسبت
خود اپنا آپ شاہد ہوں میں اپنی آپ عصمت میں

تعلق دو جہاں سے اٹھ گیا ہو   دم آخر لگی ہو لو خدا سے
نبائے انتہا کیوں کر وہ اپنی   نہ واقف ہو جو اپنی ابتدا سے

پابندئ صفات سے بواسطہ ہے ذات   ہاں چند عنصروں کا فقط اتصال ہے
دیتی ہے خبر موت کی آزاد زندگی   اور موت اپنی زندگی تو کی فال ہے

ہو الاول ہو الآخر نہ ہم تم سے نہ تم ہم سے   وہی آدم ہے اک باقی کہ جو پہلے تھا آدم سے
ہوئی منظور جب ہستی کی ہمکو خانہ آرائی   ہیولیٰ بن گیا میرا مرے اجزائے باہم سے

نہ تھا میں جب تو پھر کیا تھا مرا ہونا نہ ہو کیونکر
تعلق غیر فانی ہے مؤخر کا مقدم سے

کسی سے کیا ہو شکایت ہمیں تو ہیں مختار
عمل کے دور ہیں دنیا کے کارخانے میں

زباں زد ہے سب کے فسانہ ہمارا   وہاں ذکر ہے غائبانہ ہمارا
کہاں تاب پرواز روح الامیں ہیں   ہے عرش بریں آشیانہ ہمارا

فریب نظر یہ مکان و زماں ہے
طلسمات ہے کارخانہ ہمارا

فرشتے تھے کبھی ہیں آج انساں   بتائیں کیا ہوئے ہم کیا ہیں کیا ہے
ہوں خاک تو بہتر ہے ہم اس ناشکم سے   کیوں ملنے کو جائیں کہیں ارباب ہمم سے

یہ بھی پھرا ادھر کو جدھر کو نگاہ پھری
دل کو نگاہ یار نے چوگاں بنا دیا

ممکن نہ تھا کہ چیر کے دکھلائیں دل تمہیں   قطرہ لہو کا اک سر مژگاں بنا دیا
کس ناوک نگاہ کا نکلا ہوا ہے تیر   عالم کو جس نے گنج شہیداں بنا دیا

پڑتی نہیں ہے یار تجھے کیوں چین کسی طرح   ڈر ہے کہ نہ ظاہر ہو مرا درد نہاں آج
پہونچا ہی ہے نکہت ترے کوچے کی صبا نے   اڑتا سا نظر آتا ہے کچھ رنگ جناں آج

راضی کسی طرح یہ کرینگے ہم اپنا دل   وعدہ ملے جو چین کا ہمکو قضا کے بعد
کیوں دور اٹھ کے جائیں ستاتے ہیں گر ستائیں   آخر کریں گے کیا ستم ناروا کے بعد

پتلیاں آنکھوں میں ٹھریں ہو کے محو حسن یار
نقش حیرت ہو گئیں تصویر جاناں دیکھکر

حشر میں حشر بپا ہوگا نیا اک آزاد
بے نقاب آج وہ محشر میں چلے آتے ہیں

واعظا الجھ نہ مجھ سے کدھر کو خیال ہے
رندوں کی بات تجھکو سمجھنی محال ہے

تیرا کدھر کو بلبل ناداں خیال ہے
داماں گل پہ دست رسی ہو محال ہے

آئے ہیں تیرے در پہ کریں کیا سوال ہم
ہم آپ عرض حال ہیں صورت سوال ہے

دکن کی محبت اور شاہانِ دکن سے انکی عقیدت جذبۂ پرستاری تک پہونچ چکی ہے۔ آزاد اہل دکن کے ان عمیق تاثرات اور حقیقی جذبات کے مفسر ہیں جو سلاطین دکن، ریاست کے امراء عظام اور خود وطن مالوف کے لئے بچہ بچہ کے قلب میں مستور ہیں شاہ جمجاہ کی سالگرہ کے موقع پر عرض کرتے ہیں۔

شاہ کی سالگرہ کی ہے مسرت دل میں　　گوہر ذرہ سے ہے آراستہ گل گلشن میں　　یا تجھےخان علیخاں کی وہ عظمت دیکھیں　　کاش جیتے ہوئے دارا و سکندر ہوتے

صدق دل سے ہے یہ آزاد کی حسرت دل میں　　یا علیؑ آپکی برکت سے برار آجائے　　اور گن گاتے ہیں سرکار کے پنڈت دل میں　　مولوی وقف دعا سجدہ میں ہیں صبح و مسا

ایک سالگرہ کے موقع پر عرض کرتے ہیں :-

مثل کتاں عدو کا جگر تار تار ہے　　اقبال و جاہ حضرت سلطاں کو دیکھکر　　ساقی پلا کہ فکر شکست خمار ہے　　مدحِ حضور پہ مائل ہے دل مرا

ہر اک خوشی سے مست اطاعت گذار ہو　　ہے آج شہ کی سالگرہ شہر میں دھوم　　ملک دکن ہر ایک طرح کامگار ہو　　جمجاہ شاہ آصف سابع کے فیض سے

آزاد اپنے شہ کو مبارک ہو سال نو　　دل سے دعا یہ اپنی ہزار ہزار ہے

ایک شعر میں وہ ظل اللہ اور مہاراجہ بہادر کی تعریف کرتے ہیں :-

یہ دعا شاد رہیں شاد جہاں ہے جب تک　　شہ سلامت رہیں اور ملک بھی آباد رہے

علوم و فنون کے مربیٔ اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کی مدح میں تحریر کرتے ہیں :-

مثل معدن جوہر اگلے کیوں نہ کان آفتاب　　پیش کرتے ہیں جواہر بارگاہ شاہ میں　　مدح خوانِ آفتاب مدح پیرا ہو رہا ہوں　　باعث انوار عالم داستانِ آفتاب

سنئے آئے تھے بہت اونچی دوکانِ آفتاب　　لذتیں پھیکی پڑیں جو دکشن پرشاد سے　　بن گیا دست کرم ابر جہان آفتاب　　چھا گیا روئے فلک پر ابر نیساں کی طرح

رشک سے آتش بجاں ہے دودمانِ آفتاب　　نور پاشی اس طرح کی نسل جید علاں نے　　اُسے دل معنی سرشت رازدانِ آفتاب　　شوخ شرقی نے کہا ہو دیکھ کیا انگار چرخ

طبع روشن ہے مری ہم داستانِ آفتاب　　مخزن انوار علمی سینۂ تاباں مرا　　تسمنوں سے اب ملا ہے آستانِ آفتاب　　آپ نے یہ سایہ سالِ تحقیقاتِ معلوم

مطلع انوار معنی نظم ہے آزاد کی　　نور افزائے نظر ہے یہ بیان آفتاب

اعلیحضرت بندگانعالی متعالی کی شیوراج بہادر کے غریب خانہ پر تشریف آوری کے موقع پر آزاد نے قطعہ کہا ہے :-

شیوراج کے گھر آج نظام آتے ہیں　　کیونکر نہ بڑھے فلک سے اسکا رتبہ　　وہ منبع و مرجع انام آتے ہیں　　وہ سایۂ رب ذو الکرام آتے ہیں

آزاد نے رباعیاں بھی لکھی ہیں ان میں سے چند بطور نمونہ پیش ہیں:۔

مشہور ہوں بادہ خوار کہنے دو انہیں
مستوں میں ہوں ہوشیار کہنے دو انہیں
باطن سے تو پاک و صاف پہلے ہی سے ہوں
ظاہر میں خراب خوار کہنے دو انہیں

کچھ رہتے ہیں دنیا میں زر و مال میں خوش
بعضوں کا ہے دل حسن خط و خال میں خوش
دونوں کو ہی رنج ایک نہ ایک اے آزاد
اچھے ہیں بہت وہ جو ہیں ہر حال میں خوش

آزاد نے حکیم عمر خیام نیشاپوری کی شہرۂ آفاق رباعیات کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ بادۂ ایران سے ساغرِ ریختہ کو جس خوبی سے انہوں نے پُر کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ شرابِ کہنہ جدید قالب میں بھی دیکھ لیجئے!!

رباعی عمر خیّام		ترجمۂ آزاد
آں بہ کہ دریں زمانہ کم گیری دوست		دنیا میں جو یار کم ہوں احسن ہے وہی
با اہلِ زمانہ صحبت از دور نکوست		دامن کشِ دوستی کا مامن ہے وہی
آں کس کہ بجملگی ترا تکیہ بدوست	(۱)	جس پر کہ کرو گے تم بھروسہ پورا
چوں چشمِ خرد باز کنی دشمنت اوست		دیکھو جو بچشمِ عقل دشمن ہے وہی
کس را پسِ پردۂ قضا راہ نشد		کوئی پسِ پردۂ قضا جا نہ سکا
وز سرِّ خدا ہیچ کس آگاہ نشد		اسرارِ خدا کو کوئی بتلا نہ سکا
ہر کس ز سرِ قیاس چیزے گفتہ	(۲)	ہر اک نے کئے خیال ظاہر اپنے
معلوم نہ گشت و قصّہ کوتاہ نشد		انسان کے ادراک میں خاک آ نہ سکا
آغاز رواں گشتنِ ایں زریں طاس		انجام روانئ مہ و خور کیا ہے
و انجام خرابئ چنیں نیک اساس		بربادئ کائنات کا گر کیا ہے
دانستہ نمی شود بمعیارِ عقول	(۳)	آتی نہیں کچھ عقل میں اپنے یہ بات
سنجیدہ نمی شود بمقیاسِ قیاس		جچتا نہیں ساز پر جو یہ سر کیا ہے

مرزا علی جعفر جعفر مرحوم

جعفر

مرزا علی جعفر مرحوم

سنہ ۱۳۰۰ھ تا سنہ ۱۳۴۴ھ

از سیّد محمّد تقی رضوی

مرزا علی جعفر حضرت اشہر کے چوتھے بیٹے تھے۔ سنہ ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ مولدان کا کوہ مولیٰ علی ہے۔ نسبی سلسلہ امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی فوج کے مشہور سردار مالک اشتر تک پہنچتا ہے انکی تعلیم و تربیت شرفاء عہد کے دستور پر انکے والد کی نگرانی میں گھر ہی پر ہوئی علوم متداولہ میں انہیں خاصا دخل تھا۔

وجاہت کے اعتبار سے بھی جعفر اپنے عہد کے وضعدار اشخاص میں شمار کئے جاتے تھے۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، بلند بینی، بڑی بڑی سیاہ مونچھیں گھنی مگر خشخاشی ڈاڑھی، متوسط قد اور گٹھیلا جسم تھا چہرے سے شرافت اور کلام سے لطافت نمایاں تھی۔

بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ مذاق شاعری انکو ورثہ میں ملا تھا۔ تاریخ سے بھی باخبر تھے۔ فطرتاً ذہین و طبّاع تھے شاعر کے گھر میں پیدا ہوئے تھے ان کا شاعر ہونا ایک فطری امر تھا۔

سرمایہ شاعری، محبت اور درد کی انکے پاس کمی نہیں تھی۔ یہہ دونوں چیزیں انہیں مذہب سے ملی تھیں۔ یہی وجہہ ہے کہ انکے کلام میں نوحہ، سلام، قصائد، رباعی اور مراثی کے سوائے دیگر اصناف سخن مثلاً غزل ہزل ہجو اور واسوخت وغیرہ نہیں ملتے۔ یہہ معلوم ہوتا ہے کہ انکی شاعری نوحہ و سلام سے شروع ہوئی اور مرثیوں پر ختم ہو گئی۔ قصائد جو انہوں نے لکھے کسی امیر یا وزیر کی شان میں نہیں لکھے اہل بیت رسالت کی مدح و ثنا میں لکھے۔ یہی وہ قصائد ہیں جو ولادت ائمۂ اہل بیت کی مخصوص تاریخوں میں جشن کے مواقع پر انہوں نے پڑھے۔ زندگی بھر آیہ مودۃ کا ورد کرتے رہے مرنے سے پہلے وصیّت کی کہ

مراثی وغیرہ کے مسودے انکی میت کے ساتھ دفن کردئے جائیں چنانچہ وصیت عمل میں لائی گئی۔

عام محفلوں میں وہ ایک خاموش اور سنجیدہ انسان تھے لیکن حلقہ احباب میں انکی خاموشی شگفتگی سے اور سنجیدگی بذلہ سنجی سے بدل جاتی تھی۔ انکے مزاج میں مزاح کا مادہ فطرتاً ودیعت کیا گیا تھا جس بات سے چاہتے مزاح کے پہلو نکال لیتے تھے بڑے نکتہ رس اور حاضر دماغ تھے۔ باتوں باتوں میں مصرعے کہہ جاتے تھے۔ انکی موزوں طبعی نے ان کی گفتگو میں بھی مذاق شاعری پیدا کردیا تھا مثلاً ہم صرف ایک واقعے کا ذکر کرینگے۔

محرم کے دن تھے خبر ملی کہ پرانی حویلی میں "معجزے کے علم" اٹھائے جائینگے۔ ایرانی گلی سے ایک دستہ عزاداروں کا شرکت مجلس کی غرض سے چلا۔ جعفر مرحوم بھی ساتھ تھے۔ چلتے چلتے انہوں نے حسب عادت ایک برمحل مصرع پڑھا ع معجزے کے علم کھلینگے آج۔ پارٹی میں سے کسی نے ساتھ ہی مصرع پہنچایا ع یاکتب ہائے غم کھلینگے آج جعفر نے کہا "ہائے" کا استعمال "کتب" کے ساتھ بے معنیٰ ہی سہی لیکن "غم" کے معنیٰ کی کیسی تشریح کررہا ہے۔ اس لطیف اصلاح و بامزہ تنقید پر سب کے سب ہنس پڑے اور وہ بھی بے مزہ نہ ہوئے جنہوں نے مصرع پہنچایا تھا۔

جعفر اصلاح سخن حضرت تاجی سے لیا کرتے تھے اور انکے تمام شاگردوں میں ارشد التلامذہ سمجھے جاتے تھے۔ انکی طبیعت پر باپ اور استاد کی مذہبیت کے گہرے اثرات تھے۔ مذہبی روایات کی سختی سے پابندی کیا کرتے تھے۔ مجالس کا بہت شوق تھا تعزیہ داری کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔

عیدالضحیٰ کے بعد سے روزانہ شب کو "مجلس ربط" منعقد کرکے محلے کے نوجوانوں کو جمع کرتے اور سینہ زنی کی مشق کراتے تھے۔ خود نوحہ بھی پڑھتے اور ماتم میں بھی شریک رہتے تھے مجلس کے بعد بالعموم چائے تقسیم ہوتی تھی اور محرم تک یہہ مشق برابر جاری رہتی تھی یہہ ماتم جسے "ایرانی گلی" سے خصوصیت حاصل ہے "حلقہ کا ماتم" کہلاتا ہے اور ایام عزا کے عشرہ اول میں محلے کے اکثر گھروں میں روزانہ صبح وشام بعد مجلس ہوا کرتا ہے۔ یہاں کوئی گروہ بندی نہیں ہوتی جو شخص حسن عقیدت کے ساتھ شریک ہونا چاہے ہوسکتا ہے امیر ہو یا فقیر جوان ہو یا بوڑھا کوئی بھی روکا نہیں جاتا۔ کچھہ فرق و امتیاز نہیں کیا جاتا۔

قابلیت کے ساتھ جعفر نے طبیعت بھی اچھی پائی تھی، مطالعہ وسیع تھا الفاظ اور محاورے کی تحقیق کا انہیں بہت شوق تھا اور انکے استعمال میں نہایت سلیقے سے کام لیتے تھے ہر سال محرم میں ایک نیا مرثیہ کہہ سناتے اور سامعین سے داد سخن پاتے تھے۔ حاضر دماغ ایسے تھے کہ بلا تکلف تاریخ کہہ لیتے تھے انتقال سے کچھ دیر قبل انہوں نے اپنی تاریخ وفات کہی۔ "جعفر نے قضا کی"

۱۳۴۴ھ

تاریخ گوئی کا کمال اس سے زیادہ کیا ہوگا واقعہ کا ذکر مکمل، جملہ پورا، الفاظ فصیح اور تاریخ بے کم وکاست انکے کلام کے مختلف نمونے انتخاباً درج ذیل کئے جاتے ہیں صرف نوحے طبع ہو چکے ہیں اور باقی کلام غیر مطبوعہ ہے۔

نمونہ کلام

ہڈیاں گر غم شبیر میں گھل جائینگی (قطعہ) زشتیاں نامۂ اعمال کی دھل جائینگی
قدر دنیا میں نہیں اشک غم سرور کی آنکھیں ہو جائینگی جب بند تو کھل جائینگی

آواز دے نہ ہجر کا رنج و ملال کھینچ (سلام) نزدیک اپنے اے اسد حق کے لال کھینچ
ہو شرم سار ابر دے اکبر کو دیکھ کر منہ کو حجاب چرخ میں لب اے ہلال کھینچ
ہوتا ہے درد کہتے تھے مسلم کے لاڈلے حارث ہمارے سر کے نہ اسطرح بال کھینچ
معمور ہو چکا ہے جہاں ظلم و جور سے اب ذوالفقار کو مرے مولا نکال کھینچ
جعفر خدا سے مانگ نہ کر غیر سے طلب درگاہ بے نیاز میں دست سوال کھینچ

گو کشور نظم میں ہوں حاکم کی طرح (رباعی) لیکن نہ زیادتی ہو ظالم کی طرح
ہے لطف سخن تب کہ ہو بندش پر لطف باندھیں کسی مضموں کو نہ مجرم کی طرح

ہر چند سبھی جرم و خطا کرتے ہیں (رباعی) لیکن نہیں یوں سب میں کہا کرتے ہیں
کیا حق نے معافی کا دیا ہے وعدہ اقبال خطا جو دست و پا کرتے ہیں

معرکہ صفین میں جناب امیر کے تیسرے صاحبزادے محمد حنیفہؓ کی جنگ کے حالات جعفر نے نہایت زور کے ساتھ لکھے ہیں۔ روایت یوں ہے کہ صفین میں ایک دن جناب امیر نے محمد حنیفہ کو سپاہ شام کے میمنہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

صاحبزادے نے بےخوف و خطر تن تنہا سینۂ فوج پر حملہ کیا صفیں توڑیں اور کتنے ہی بہادروں کو قتل کر کے باپ کی خدمت میں واپس آئے۔ جناب امیر نے دوبارہ میسرہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا اس دفعہ پھر صاحبزادہ نے بلا عذر میسرۂ سپاہ پر حملہ کیا اور ایسی جنگ کی کہ ارکان لشکر مخالف میں تزلزل ڈالدیا اور قتال شدید کے بعد مظفر و منصور امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے جعفر نے اس وقت کی تصویر یوں دکھلائی ہے:-

حالت یہہ تھی کہ کانپتا تھا جسم سر بسر — پشت فرس پہ ہانپتے تھے مثل شیر نر
مجروح خود بھی ہو گئے تھے سر سے تا کمر — بن کر لہو پسینہ ٹپکتا تھا خاک پر
تھا پیاس کا وفور بھی اور التہاب بھی — اُن اُن کے ساتھ کہہ رہے تھے آب آب بھی

جناب امیر نے نہایت شفقت کے ساتھ فرزند کو سیراب کیا اور جنگ کی تعریف و توصیف فرمائی۔

دیکھی جو یہہ توجہہ شاہ فلک وقار — اطراف جلد آ گئے سارے رفیق و یار
رومال سے ہوا کوئی دیتا با فتخار — موزوں کی گرد جھاڑتا تھا کوئی جاں نثار
قبضے سے تیغ لیتا تھا کوئی دلیر کے — پنجے کوئی دباتا تھا حیدر کے شیر کے

روایت یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ لکھا ہے کہ امیر المومنین نے تیسری دفعہ پھر صاحبزادے کو حکم دیا کہ قلب لشکر پر حملہ کرے شہزادے نے سر جھکا لیا اور آبدیدہ ہوئے۔ وجہہ پوچھی تو دبی زبان سے عرض کیا "بار بار خادم ہی کو حکم ہوتا ہے حالانکہ میرے دونوں بڑے بھائی حسن و حسین بھی موجود ہیں ان میں سے کسی کو ایک مرتبہ بھی جنگ کا حکم نہیں ہوتا"

اس پر جناب امیر نے فرمایا:-

زندہ جہاں میں ہوتے رسول خدا اگر — دیسکتے تجھے وہ حکم دیتا انکو اے پسر
کیا تجھکو اس حدیث کی اب تک نہیں خبر — فرماتے تھے یہہ اُن کے لئے سیّد البشر
مختار ہیں ازل سے گلستان خلد کے — سردار ہیں یہہ دونوں جوانان خلد کے
آنکھیں علی کی دونوں ہیں سبطین مصطفیٰ — اور تو پدر کا ہاتھ ہے اے میرے دلربا

ہوتا ہے آنکھ کو جو مصیبت کا سامنا
انسان دفع کرتا ہے ہاتھوں سے وہ بلا

ہے تیرا افتخار جوان کا فدائی ہو
واقع ہو تجھ پہ وہ جو بلا ان پہ آئی ہو

یہہ سن کے ہاتھ جوڑ کے غازی نے عرض کی
فرمائیے معاف کہ مجھ سے خطا ہوئی

اک بار پھر بڑھے طرف لشکر شقی
دل میں یہہ کہہ کے قلب سپہ میں دھنسا جری

شرم آتی ہے نہ سامنے حیدر کے جائینگے
یا فتح کر کے جنگ کو یا مر کے جائینگے

بجلی گری کہ تیغ چلی فوج شام پر
نازل خدا کا قہر ہوا خاص و عام پر

قرباں تھی برق ابن علی کی حسام پر
سکہ تھا جس کا قلب نریمان و سام پر

بے کار حربے ہو گئے حرب اسکو کہتے ہیں
تھے مدح خواں حریف بھی ضرب اسکو کہتے ہیں

مثل خیار گرز و تبر کاٹتی تھی وہ
بے خوف اہل ظلم کے سر کاٹتی تھی وہ

حلقوم و بطن و ظہر و کمر کاٹتی تھی وہ
صدر و جناح و قلب و جگر کاٹتی تھی وہ

چلتے تھے ہاتھ بھی نہ کسی نحس و زشت کے
بے کار عضو تن تھے ہر اک بد سرشت کے

اللہ ری جنگ لخت دل شیر کردگار
دو ہو گیا وہ جس پہ چلا اس سے ایک وار

نہ زخمیوں کا حصر نہ کشتوں کا تھا شمار
احباب سے یہہ کہتے تھے سلطان ذوالفقار

بے مثل فن ہے جنگ کا حاصل ہوا اسے
محفوظ چشم زخم سے رکھے خدا اسے

یوں تعریف کر کے امیر المومنین نے آواز دی تھی کہ بیٹا اگر پیاس کی شدت ہو تو کہو تاکہ ہم خود تمہارے لئے پانی لائیں سعادت مند بیٹے نے جواب دیا کہ حضور کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہہ کہہ کے اور جوش شجاعت ہوا سوا
پلٹا دلیر پھر طرف فوج اشقیا

دیکھا کہ بھاگے جاتے ہیں میدان سے بجا
تلوار رکھ کے میان میں جھپٹا وہ مہ لقا

نازل ہوا غضب سپہ نابکار پر
اک شیر تھا کہ جا پڑا ہرنوں کی ڈار پر

غیظ و غضب کے جوش میں غازی کا تھا یہ حال کف منہ میں تھا بھرا ہوا آنکھیں تھیں لال لال
سب جسم تھر تھراتا تھا خورشید کی مثال باہر لباس کے نکل آئے تھے تن کے بال
پیش نظر یہ غول کبھی تھا وہ صف کبھی
اِس سمت دیکھتے تھے کبھی اُس طرف کبھی

تھا بار بار ایک کا سب فوج پر یورش پروا نہ آب کی تھی نہ کچھ خواہش خورش
تھی ناخنوں میں پنجۂ ضرغام کی برش نعرہ تھا "یا علی" کا کبھی صورت غُرش
ہیبت دلوں کو شیروں کے پانی بناتی تھی
جنگل کے گونجنے کی صدا سب کو آتی تھی

ہوتا ہے بزدلوں کو کہاں جنگ کا شعور نزدیک جن کے ہوش تھے وہ تھے سب سے دور
آئے نظر جو ایک جگہ چند پر غرور دو دو کے سر کٹے وہیں ٹکرا کے چور چور
ہو ہو کے پاش پاش جو بھیجا نکل پڑا
پھٹ پھٹ کے ناظروں کا کلیجا نکل پڑا

اللہ رے جنگ شیر الٰہی کے لال کی تصویر تھی شباب علی کے جدال کی
پروا نہ تیغ کی نہ ضرورت تھی ڈھال کی ہاتھوں سے ساری فوج ستم پائمال کی
گردان روزگار نگاہوں میں ہیچ تھے
اس غول پہ کبھی کبھی اُس ل کے بیچ تھے

اسکو لیا سسکتا ہوا اس کو چھوڑ کے ناقص کسی کو کر دیا ہاتھوں کو توڑ کے
پھینکا کسی کو خاک پہ گردن مروڑ کے بے جان ہو گیا جسے چھوڑا جھنجھوڑ کے
مطلق نہ خوف تھا سپہ نابکار سے
بچہ اسد کا کھیل رہا تھا شکار سے

انتخاب مرثیہ امام علی رضا علیہ السلام

اوصاف رضا سارے زمانے پہ جلی ہیں فرزند پیمبر ہیں جگر بند علی ہیں
مخلوق کے والی ہیں تو خالق کے ولی ہیں مختار دو عالم ہیں امام ازلی ہیں
جس کام پہ آمادہ ہوں اس کام کو کر دیں
دن رات کو فرما دیں سحر شام کو کر دیں

بن جائے زر سرخ جو مٹی پہ نظر ہو مٹھی میں جو کنکر کو اٹھائیں تو گہر ہو
دیں داغ کو گر نور تو ہم شان قمر ہو نخل کہیں شجر خشک پہ تو تازہ و تر ہو
ذرّوں کو جو دیں اوج تو افلاک پہ ہوئیں
تاروں کو کریں پست تو سب خاک پہ ہوئیں

گردوں پئے تسلیم ہے خم سامنے انکے صف بستہ ملائک ہیں بہم سامنے انکے
خورشید ہے ذرّے سے بھی کم سامنے انکے روباہ ہیں شیران عجم سامنے انکے
جو فاتح خیبر ہے یہہ فرزند ہیں اس کے
جو حق کا غضنفر ہے یہہ فرزند ہیں اس کے

ناری ہے جو مر جائے عداوت میں رضا کی ناجی ہے جو دے جان محبت میں رضا کی
ایمان قوی ہوتا ہے مدحت میں رضا کی ملتا ہے بڑا اجر زیارت میں رضا کی
ارفع ہیں کہیں عرش سے تربت کے مراتب
سمجھا نہ کوئی ان کی زیارت کے مراتب

بین لکھنے میں جعفر مرحوم کو کمال حاصل تھا مگر رنگین بیانی کو وہاں بھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے ہندہ زوجہ یزید کے قید خانے میں آنے اور اسرا اہل بیت کو دیکھ جانے کے حالات اکثر شعرا نے نظم کئے ہیں لیکن جعفر کا رنگین بیان

سب سے جدا ہے اور غضب کا رقت خیز۔ یزید کی خورد سال لڑکی بھی ماں کے ساتھ قیدیوں کے معاینہ کو جاتی ہے۔
جعفر نے اس لڑکی سے جناب سکینہ بنت حسینؑ کی حالت کا تقابل کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

جب ہند قید خانے میں باچشم تر گئی　　اہل مدینہ آئے ہیں یہہ جان کر گئی
آل نبی کی پوچھنے ان سے خبر گئی　　بیٹی بھی اس کے ساتھ بصد کر و فر گئی
کم سن تھی وہ بھی دختر شاہ زمن کی طرح
پر زیور و لباس تھا تن میں دلہن کی طرح

زریں کلاہ پہنے تھی وہ یہہ تھی ننگے سر　　رنگیں لباس اس کا تھا اسکا لہو سے تر
شق اسکے دونوں کان تھے پہنے تھی وہ گہر　　سیراب وہ تھی پیاس سے جلتا تھا یاں جگر
راحت اسے نصیب تھی دکھ پا رہی تھی یہہ
وہ نعمتوں سے سیر تھی غم کھا رہی تھی یہہ

عیش و طرب اُسے اِسے رنج و ملال تھے　　چوٹی گندھی تھی اسکی کھلے اسکے بال تھے
عارض خوشی سے دختر حاکم کے لال تھے　　منہ پیٹنے سے سرخ سکینہ کے گال تھے
پہنے ہوئے طلائی کڑے تھی وہ شان سے
اس کی کلائیاں تھیں چھلی ریسمان سے

ہاتھوں کو باندھے واں تھی مسرت کھڑی ہوی　　یاں دل میں درد غم کی سناں تھی گڑی ہوی
واں ہنسلیاں تھیں اسکے گلے میں پڑی ہوی　　تھی تنگی رسن سے یہاں سانس اڑی ہوی
تھے اُس کے پائے زیب میں موتی جڑے ہوئے
تلووں میں تھے سکینہ کے چھالے پڑے ہوئے

مولوی غلام دستگیر صاحب اکبر

ابر

غلام دستگیر

۱۳۰۱ھ

از محمد عمر صاحب مہاجر

غلام دستگیر صاحب ابر ۲ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے ان کے اجداد کا وطن کلیانی ضلع گلبرگہ تھا۔ انکے والد نے حیدرآباد آنے کے بعد پہلے پہل فوج میں ملازمت کی لیکن اسکے بعد اپنا آبائی پیشہ تجارت اختیار کرلیا۔ انکی سنگ سیلو کی تجارت اور کارہائے محکمہ تعمیرات ودار الضرب کی ٹھیکہ داری نے انکو مدت العمر خوش حال رکھا۔ اسطرح ابر کو بچپن ہی سے ایک بے فکر گھرانا نصیب ہوا جو شعر وسخن کے ذوق کی پرورش کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوا۔

جناب ابر نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل ایک خانگی مدرسہ میں طے کئے اسکے بعد نامپلی کے نارمل اسکول میں تعلیم حاصل کی اور چودہ برس کے سن میں مدرسہ کو خیرباد کہا۔ نارمل اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں گلبرگہ شریف کے ایک مدرس ہدایت علی صاحب ہدایت ٹریننگ کے لئے اس مدرسہ میں آئے تھے۔ انہوں نے اپنے اکثر شاگردوں میں شعر وسخن کا ذوق پیدا کردیا۔ ابر صاحب نے بھی اسی زمانے میں شعر گوئی کی ابتدا کی آگے چل کر عبدالرحمن صاحب جمیل نے جو حبیب کنتوری کے شاگرد تھے انکو اپنے استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ پہلے ہی روز اپنے استاد بھائیوں کو دیکھ کر ابر نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا

مجھ کو تو یہاں کوئی نہ مجھ سا نظر آیا　　جو آیا نظر اپنے سے اچھا نظر آیا

شاگرد کے اس انکسار اور طباعی سے حبیب کنتوری بہت متاثر ہوئے اور اس پر اپنی خاص توجہات مبذول کیں۔ حبیب کے انتقال کے بعد ابر نے عدیل کنتوری اور انکے بعد ضامن کنتوری سے مشورہ کیا اور ان کے ہی

فیض صحبت سے فن شعر کی تکمیل کی۔

جناب ابر نے ابتداءً دارالضرب میں ملازمت اختیار کی پھر دیوانی بلدہ میں محاسب کی خدمات انجام دینے لگے
اور اس وقت بھی اسی خدمت پر مامور ہیں ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے اپنی علمی اور ادبی دلچسپیاں
برقرار رکھی ہیں۔ اوقات دفتر میں بھی کبھی کبھی سرکاری کام کے ساتھ ساتھ اشعار موزوں کر لیتے ہیں اور موقعہ ملے تو وہیں
شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دیا کرتے ہیں اس سے اُنکے غیر معمولی شغف اور انہماک کا پتہ چلتا ہے جو قدرتی طور پر ان کے
دل میں موجود ہے۔

جناب ابر نے شمالی ہند کے شعرا مثلاً رشید، فصاحت، فرید وغیرہ سے بارہا دادِ سخن پائی ہے۔ فصاحت کے
خیر مقدمی مشاعروں میں بطور خاص مدعو رہے ہیں اور ہر موقع پر خراج تحسین حاصل کرتے رہے چونکہ وہ فطرتاً ایک سنجیدہ اور
گوشہ نشین آدمی واقع ہوئے ہیں اس لئے عام مشاعروں کی شرکت سے احتراز کرتے ہیں لیکن خاص صحبتوں میں انکی بڑی
آؤ بھگت ہوتی ہے۔ شعر گوئی کے علاوہ نثر میں بھی ابر نے چند افسانے لکھے تھے جو بے توجہی کے ہاتھوں تلف ہو گئے۔۔۔۱۰۰
صفحے کا ایک ڈرامہ اور ایک طویل افسانہ ماں۔ "ماں کا عاشق" انکے نثری کارناموں میں قابل ذکر ہیں نظم میں علاوہ دیوان کے
ایک مثنوی "نقش قدم" بھی خاص توجہ کی مستحق ہے۔ انہوں نے ایک مختصر رسالہ عُروض سے متعلق بھی تالیف کیا ہے جس سے انکی
پختہ مشقی اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے اسی وسعت نظر کی بناء پر ابر نے بعض ایسی بحروں میں طبع آزمائی کی ہے جو عام طور
پر اردو شاعری میں مستعمل نہیں ہیں نمونے کے طور پر دو تین شعر درج کئے جاتے ہیں:۔

بحر بسیط مثمن سالم۔ اپنے جو ذمہ کا ہو کام وہ انجام دیجیے — مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن

بحر وافر مثمن سالم۔ جو حالت دل سنائی آنکھیا یہ تماشا آج ہوا — مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن

اس کے علاوہ ابر نے صنعت تعطیل (بے نقطہ) اور صنعت واسع الشفتین (جسکے پڑھنے سے لب نہ ہلیں)
میں بھی کلام موزوں کیا ہے جو ہر آئینہ ان کی قادر الکلامی اور پختہ مشقی پر دلالت کرتا ہے۔

ابر کی شاعری اسلوب اور خیال دونوں کے اعتبار سے توجہ جذب کر لیتی ہے کہیں تو ان کے کلام میں ایسی

مثالیں نظر آتی ہیں جن سے شاعر کی بلند پروازی اور رفعت تخیل کا اندازہ ہوتا ہے اور کہیں ایسے نمونے پائے جاتے ہیں جن میں "پرکار سادگی" نظر آتی ہے اس سادگی کے نمونے کے طور پر چند شعر درج کئے جاتے ہیں جن میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ عطف و اضافت سے پاک ہوں ۔

ایک وہ ہیں جو چاہے کرتے ہیں   ایک ہم ہیں وفا پہ مرتے ہیں   زندگانی حباب آسا ہے   لوگ پھر بھی غرور کرتے ہیں

اور اسے ستائیے روٹھا ہے اب منائیے   آ کے ناز اٹھائیے دل کو بھی ناز آ گیا   حضور وعدے کے سچے ہیں وعدہ سچا ہے   میں کیسے مانوں کہ جب زندگی وفا نہ کرے

آبر کی شاعری میں اخلاقی مضامین بھی پائے جاتے ہیں جنکا مقصد کسی حد تک اصلاحی ہوتا ہے چند شعر درج کئے جاتے ہیں جن سے ان کے اس رنگ سخن پر روشنی پڑتی ہے :-

ہوس کا میل مٹاتا ہے نیکیوں کا اثر   کسی کو کام جو کرنا ہے مخلصانہ کرے   عیب بھی ہے باعث نام و نمود   یعنی لالہ داغ سے روشن رہا

زمانہ سازیوں کا نام ہے ہنرمندی   ہے سو ہنر کا ہنر صاحب ریا ہونا   نہ اعتدال کو چھوڑو سبق یہ دیتا ہے   ہوائیں بڑھتے ہی امواج کا فنا ہونا

یہ فلسفہ کہ زندگی ایک ایسی جہد مسلسل ہے جس میں صرف فطرت ستیزہ کار ہی کو کامیابی و کامگاری نصیب ہو سکتی ہے علامہ اقبال کا خاص موضوع ہے چنانچہ فرماتے ہیں :-

بدریا غلط و با موجش درآویز   حیات جاوداں اندر ستیز است

آبر کے ہاں بھی ذیل کا شعر اسی تخیل پر مبنی ہے :-

بقا موج کو شور دریا میں ہے   کنارے پہ پہنچی فنا ہو گئی

متصوفین کا یہ خیال کہ کائنات ذات باری تعالیٰ کا پرتو ہے ۔ آبر کے ہاں ان الفاظ میں ملتا ہے :-

یہ ناز ہے، ہے ہستی مری ہستی ہے تیری   تو ہے تو ہوں گر تو نہیں میں چیز ہی کیا ہوں

بایں ہمہ آبر کی شاعری میں ہمکو بحیثیت مجموعی کوئی خاص پیام یا تحریک نہیں ملتی جس سے کوئی درس عمل حاصل کیا جائے یا فلسفہ زندگی سلجھایا جائے وہ ہر طریقے سے اردو کے قدیم دبستان شاعری کے ایک وفا شعار پیرو ہیں اور اس حیثیت سے انکی شاعرانہ کاوشیں قابل لحاظ ضرور ہیں۔ اب انکے کلام کا ایک مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے جس سے انکے عام رنگ سخن کا اندازہ ہو سکے گا۔

ٹوٹتا ہے سانس کا پھر نا نگاہِ یار کا   سہہ لے اس صدمہ کو اتنا دل کہاں بیمار کا
چاہیئے دستِ جنوں کے واسطے کچھ مشغلہ   اسلئے مشتاق ہوں میں زخم دامندار کا

جہل و نادانی کا دل مسکن رہا   یہ ہمیشہ عقل کا دشمن رہا
دید کے طالب کو سوجھی دور کی   بن کے خاک وادیٔ ایمن رہا

بس اسی کے ہو رہے دنیا میں ہم   اپنے دل کو جس سے حسنِ ظن رہا
کشمکش پھر زندگی کا کشمکش   کانٹوں میں الجھا ہوا دامن رہا

اس سے مل کر دل نے کی چالاکیاں   دوست کی صورت میں یہ دشمن رہا
کر تواضع بادہ کش اس کے رہے   شیشہ جب تک خم کئے گردن رہا

فتنے جو اٹھ رہے ہیں یہ اسکا راز پا گیا   وقت طلوع مہر ذرہ نواز آگیا
دل گیا میر اگیا کسلئے دوست ہیں خفا   پوچھیئے ان سے آپکا بندہ نواز کیا گیا

آئے تھے جب وہ سامنے کیوں قدم پڑا   کیونکر ادا ہو یہ قضا وقت نماز کا گیا

- - - - - - - - - -

ولولوں کے ہجوم میں دل کا رہا نہ کچھ خیال   لے اڑی کونسی ادا کو نسا ناز بھا گیا
دور میں دیر کسلئے پیاسوں کی تشنگی سمجھے   آہ فلک یہ ساقیٔ رند نواز چھپا گیا

حسن کی لن ترانیاں عشق کی جانستانیاں   ہائے وہ بے نیازیاں لطف نیاز آگیا
ترا ہی ذکر لبوں پہ تھا تری ہی یاد دل میں تھی   نامہ بر خجستہ پے عمر دراز آگیا

چمکا چمک کے رہ گیا جلوے سے ترے آئینہ   بند یہ کیوں زباں ہو شیشے میں راز آگیا
تھا سننے والا صفحۂ ہستی پہ ایک حرف   ہستی میری یہ تھی یہی میرا وجود تھا

بزمِ جہاں میں زیست تھی سب کی حباب دار   جو بود تھا پلک کے جھپکنے نبود تھا
ذرہ بیقدر وسے جیسے نشان آفتاب   وسے رہا ہی یوں ہی دل کچھ بھی سراغ حسن دوست

زباں وصفِ نشاں بے نیازی الاماں   مہر روشن بھی ہے ایک ادنیٰ سا داغ حسن دوست
لحد نور کرم ہی ابر داماں سیاہ   زلف عنبر رنگ ہے دو چراغ حسن دوست

خوش نہ ہوں نادان بہبودی کے سامان دیکھکر   کوندتی ہیں بجلیاں پھولوں کو خنداں دیکھکر
پھر گیا نظروں کے آگے اپنی ہستی کا ثبات   آنکھیں روشن ہو گئیں گورِ غریباں دیکھکر

آپ اس پر کر رہے ہیں بیوفائی کا گماں   جس کا دل بھر آئے دشمن کو بھی گریاں دیکھکر
گل کا موسم ہے نہ پوچھو دل بیکاری کا سبب   گر گیا کانٹوں پہ خود دامن ہی میداں دیکھکر

پرتو سے ترے نور کے آئینہ نما ہوں   ذرہ ہوں مگر ذرۂ خورشید نما ہوں
کشمکش میں ہوں مبتلا کہ یہ کام ایسے سے آپڑا   جو کسی طرح نہیں مانتا ہے خود خدا کا بھی نہیں

مہرے رو تے پر جو ہنسی اڑی وہ ہنسی ہنسی تھی بناوٹی
جو کسی کے دل کی کھلے کلی میری آہ بادِ سحر نہیں

یہ نفس کی آمد و شد ہے جو ہے مدار جس پہ حیات کا
فقط ایک پردے کا کھیل ہے کچھ ادھر نہیں کچھ ادھر نہیں

میرے در سے ہو کے جو وہ چلے میرے جذبِ دل نے صدا یہ دی
ادھر آئے ادھر آئیے میرے مہرباں ادھر نہیں

ہنگامہ خیز غلغلۂ کوشش کوش ہے   دنیا خمار تھا نہ ارباب ہوش ہے
دامن دریدگی پہ مری خندہ سحر   تعبیر خوابہائے پریشاں دوش ہے

پھیر اک نگاہ گو غلط انداز ہی سہی   ہاں سے نے حریف ہوش ابھی مجھکو ہوش ہے
حسن بس حجابِ نگاہ ہو نہیں غلط   محفوظ ہے وہ شمع جو فانوس پوش ہے

کیا پوچھتے ہو جلوہ گہ ناز کے اسرار   کیا جانئے کیا دیکھا ہے کچھ یاد نہیں ہے

مولوی محمد حبیب اللہ صاحب وفا

وفاؔ

محمد حبیب اللہ

سنہ ۱۳۰۱

از محمد عبدالقادر صاحب دبیر

"مولوی محمد حبیب اللہ وفاؔ حیدرآباد کے ایک صاحب علم و فضل اور شاعر خاندان کی یادگار ہیں" یہ محمد اسد اللہ کے بیٹے محمد حبیب اللہ ذکاؔ کے پوتے اور حافظ محمد میراں کے پرپوتے ہیں ان کے دادا ذکاؔ فارسی و اردو کے اچھے شاعر تھے انکی فارسی شاعری اور انشاپردازی کا اقصائے ہندوستان میں چرچا تھا۔ فارسی اور اردو کے بہت بڑے سخنور اور نکتہ سنج مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ جو اپنے معاصرین کی نسبت رائے ظاہر کرنے میں نہایت محتاط تھے ذکاؔ مرحوم کی تعریف میں غیر معمولی طور پر رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دکھنی دوست کے فارسی مجموعۂ نثر و نظم "خاش و خماش" کے متعلق اردو میں جو رائے لکھی ہے وہ اردو تنقید و تبصرہ نگاری کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے ایک ایسے زمانہ میں جبکہ اردو زبان محض شعر و سخن اور داستان گوئی و افسانہ نگاری کے لئے وقف تھی اور اردو شعر و شاعری سے متعلق اگر کوئی بحث کرنی ہوتی تو فارسی ہی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جاتا تھا اردو میں اس خوبی سے بےلاگ تبصرہ لکھنا مرزا غالبؔ ہی کا حق تھا اور اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ حضرت ذکاؔ کو کس پایہ کا سخن داں سمجھتے تھے مرزا غالبؔ لکھتے ہیں:۔

"یہ کلام کسی پادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں کسی شیخ شیاد کا نہیں یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر اپنے دوست کے کلام کو معرض اصلاح میں بنظر دشمن دیکھتا ہے۔ پس جب تعلق نہیں مدارا نہیں تو جو مجھکو نظر آیا ہے بے حیف و میل کہونگا۔ نثر میں نعمت خان عالی کی طرز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے۔ قصائد میں انوری کا چربہ اٹھایا ہے مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز۔ منشی حبیب اللہ ذکاؔ سخنور ہمہ دان

یکتا لفظ طراز معنی آفریں آفریں صد آفریں صد ہزار آفریں"۔ (مقدمۂ آصف نامہ جلد ہفتم از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

حضرت وفاؔ سنہ ۱۲۹۹ف میں بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل عم بزرگوار محمد میراں سہاؔ منتظم صدر محاسبی سرکار عالی سے طے ہوئے۔ وہ فارسی اور عربی کے جید عالم تھے اور ان دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے افسوس ہے کہ انکا کلام طبع نہ ہوسکا بعض عربی کتابوں کے بہترین ترجمے انکی یادگار ہیں چنانچہ جواہر الکلامیہ فی الفضاح عقاید الاسلامیہ کا ترجمہ اردو زبان میں شایع ہوچکا ہے یہہ عقاید اسلامی کی جامع کتاب ہے جس کی تعلیم مدارس مصر و شام میں رائج ہے اور ابن مسکویہ کی کتاب الحکمت کا ترجمہ بھی فرمایا ہے۔ یہہ وہ کتاب ہے جس کے مضامین سے علامہ دوانی محقق طوسی نے بھی خوشہ چینی کی ہے حضرت وفاؔ کو ان کے جد بزرگوار حضرت ذکاؔ کا ذوق فارسی جن کے کلام پر استاد غالبؔ کو بھی ناز تھا" ارثاً حاصل ہے۔ بنا بر علیہ ابتدا میں انکی طبیعت کا رجحان فارسی کی طرف زیادہ رہا اور فارسی کلام میں حضرت سہاؔ سے اصلاح سخن کا سلسلہ جاری تھا۔ چند فارسی غزلیں مولانا شمسیؔ اور مولانا نوریؔ کی نظر فیض اثر سے بھی گذری ہیں نواب ضیا یار جنگ بہادر سے بھی فخر تلمذ حاصل ہے خواجہ حافظ کی غزل ؎ با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد پر غزل لکھکر علامہ ضیاؔ کی خدمت میں پیش کیگئی تو ارشاد ہوا کہ اس کلام میں شیخ علی حزیںؔ کا رنگ ہے اور فارسی گوئی کے متعلق زیادہ تاکید فرمائی گئی تعلیم کی تکمیل مدرسہ دار العلوم میں ہوئی۔ منشی فاضل و مولوی فاضل کے امتحانات سے فارغ ہوکر انگریزی کی طرف توجہہ کی زمانہ کی ناساعدت کی وجہہ سے اسکی خاطر خواہ تکمیل نہ ہوسکی۔ مدرسہ طبیہ میں مولانا منصور علی سے عربی میں فن طب کی تعلیم پائی۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف فطری لگاؤ تھا۔ اور یہہ فن انکا موروثی بھی رہا ہے چنانچہ انکے خاندان کے اکثر افراد شاعر گزرے ہیں۔ ذکاؔ مرحوم کے برادر بزرگ حضرت رساؔ بھی بلند پایہ شاعر تھے اور ایک عزیز جن کا تخلص شہوارؔ تھا نہایت مشہور شاعر گزرے ہیں۔ نصیرؔ دہلوی کے خاص شاگرد تھے اور استاد کی طرح سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے تھے ان کا قلمی دیوان انتخاب جنگ بہادر کے خاندان میں موجود ہے۔

زمانہ کے انقلاب سے فارسی کا مذاق روز بروز کم ہونے لگا اور اردو کی عالمگیر طور پر مانگ بڑھنے لگی تو "مع الدھر کما تدور" پر کاربند ہونا ضروری ٹھیرا۔ چونکہ طبیعت میں روانی تھی اور شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔

اردو شاعری پر بھی بہت جلد قابو حاصل کرلیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اردو کے قادر الکلام شاعر ہیں۔ جملہ اصناف سخن میں انکا معتد بہ کلام موجود ہے۔ قطعات، رباعیات، مسدسات نعتیہ، سلام، مراثی، قومی نظمیں، ہزلیات و مطائبات، غزلیات، قصائد اور نظمیں حسب موقع رسائل اور اخبارات میں شایع ہو چکے ہیں لیکن مکمل طور پر کوئی کلیات قالب طبع میں نہ آسکا

جنگ ترکی و بلقان کے موقع پر ایک نظم "ترکی تلوار" ہزاروں کی تعداد میں شایع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہے جس کی جملہ قیمت چندہ ترکی میں بھیجی گئی۔

اسی طرح طغیانی رود موسیٰ کے متعلق ایک نظم "سیلاب موسیٰ" خاص و عام سے داد تحسین حاصل کر چکی ہے اس نظم کی نواب فخر الملک نے بے حد قدر فرمائی اور اپنے فرزند ارجمند نواب غازی جنگ کی اتالیقی کے لئے پیش قرار یا ہوا رسے ممتاز فرمایا۔ نظموں کے علاوہ انکے سلاموں کا ایک مجموعہ "جام شہادت" بھی شایع ہو چکا ہے۔ جسکے متعلق ملک کے مایہ ناز ادیبوں نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے حال ہی میں چند نظموں کا مجموعہ موسومہ شمیم وفا شایع ہوا ہے۔ نعتیہ کلام بھی مرتب ہے۔ انشاءاللہ عنقریب شایع ہو جائے گا۔

مجموعات نظم کے علاوہ نثر میں بھی ادبی مضامین کے مجموعے موجود ہیں چنانچہ "یک بام و دو ہوا" قدیم و جدید تعلیم کا ڈرامہ دو تین مرتبہ اسٹیج کیا جا چکا ہے اور ایک مضمون کتابی صورت میں "شاعری کی حقیقت" نہایت فاضلانہ طرز پر لکھا ہے

یہ امر خصوصیت کے ساتھ قابل تذکرہ ہے کہ حضرت وفا نے ۱۳۲۶ھ سے نعتیہ مسدسات کی تصنیف کی ابتدا کی ہر سال ماہ ربیع الاول کی رویت کے ساتھ ہی نعتیہ مسدس کی تصنیف شروع ہو جاتی اور اپنے گھر میں محفل میلاد منعقد کر کے نو تصنیف کلام پیش کیا جاتا تھا تقریباً آٹھ نو سو تک علم داں و سخن شناس حضرات کا مجمع رہتا۔ حیدر آباد کے نامی گرامی شاعر بھی تشریف لاتے۔ ایک مرتبہ حسن اتفاق سے یادگار انیس جناب پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے تھے جن کی حقیقی داد و تحسین شاعر کے لئے حوصلہ بخش و ہمت افزا ثابت ہوئی۔

پیارے صاحب نے بہاریہ اور رندانہ مضامین کی خاص طور پر داد دی اسلئے کہ یہ انکا خاص رنگ ہے۔ مسدسات نعتیہ کی تصنیف کا سلسلہ بلا انقطاع ۱۳۳۷ھ تک جاری رہا۔ اگر یہ مسدسات شایع ہو جائیں تو اردو میں بیش بہا

اضافہ ہوگا۔ حضرت شاد کی پیشگاہ میں حضرت وفا کو متعدد مرتبہ قصائد سنانے کا موقع ملا ہے جسکے صلہ میں ممدوح نے خلعت اور اشرفیوں سے سرفراز فرمایا ہے۔

۱۳۴۱ھ میں جس وقت سلطان العلوم اعلیحضرت خلد اللہ ملکہ کی سواری بیدر رونق افروز ہوئی تھی یہہ بھی باریاب ہوئے تھے۔ دو قصیدے بارگاہ جہاں پناہی میں پیش کرکے آصف نامہ کی تصنیف کے متعلق معروضہ پیش کیا تھا بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کتاب کا ساتواں حصہ اب چھپکر شایع ہوگیا ہے جو اعلیحضرت سلطان العلوم کے پچیس[۲۵] سالہ عہد حکومت کی منظوم تاریخ ہے یہہ ایک مثنوی ہے جو بحر ہزج غیر سالم متقارب میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی کی فضا میں انکی یہہ پہلی پرواز ہے۔ ریلوے کے متعلق اس طرح گل افشانی کرتے ہیں:۔

لہ اسٹیشن ہے میدان آسماں کا رواں انجن ہوا طبع رواں کا
زمیں شعر و سخن کی بھی ہلادی صریر کلک نے سیٹی بجادی
رعیت کی ہے آسایش کا ساماں تعال اللہ فیض دور ذیشاں
قطاریں ریل کی جاری ہیں گویا مضامیں کا تسلسل ہے کچھ ایسا
مبارک ہو یہہ دور کامگاری جدہر دیکھو ادھر ریلیں ہیں جاری

مولانا وفا بیدر کے مدرسہ فوقانیہ میں معلم ہیں انکے پیشے اور ملازمت کے متعلق خود انہی کی زبان سے سنئے

"خاکسار سررشتہ تعلیمات کا ملازم ہے تعلیم و تدریس پیشہ ہے۔ شاعری دماغ کاوی ہے مدرسی دماغ سوزی ہے۔ ۱۳۳۲ھ سے تا حال اضلاع گردی نصیب ہے ۔ جس جگہ میں پاؤں دھرتا ہوں فلک ہے ساتھ ساتھ وائے قسمت ہے بڑا چکر مری تقدیر میں

ہندوستان کے رسم و رواج کے لحاظ سے شاعری میں بھی استاد و شاگرد کا ساتھ چولی دامن کا سارہا ہے چنانچہ ابتدائے مشق سخن میں مولانا حبیب الرحمن بیدل سہارنپوری شاگرد غالب اور حضرت مائل دہلوی سے اصلاح کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد علامہ نظم طباطبائی سے فخر شاگردی حاصل رہا۔ حضرت جلیل سے بھی کئی مرتبہ راست طور پر اور خطوط کے ذریعہ اصلاح لی ہے۔ استاد جلیل نے انکی بہت تعریف کی ہے متعدد مرتبہ فرمایا کہ "کلام اصلاح سے مستغنی ہے فطرتاً بلند پایہ شاعر ہیں" چونکہ حضرت موصوف کو کثرت مشاغل سے فرصت نہیں تھی اور بعد مسافت کی وجہہ سے حضرت وفا کو اپنے استاد سے فیض حاصل کرنے کا پورا پورا موقع نہیں ملتا تھا اس لئے عرصہ دراز سے وہ الشعراء تلامذ الرحمن کے سراپا مصداق ہیں۔

حضرت وفاؔ بلا کا حافظہ رکھتے ہیں۔ بغیر یاد کئے سیکڑوں اشعار سنا دینا انکے نزدیک معمولی سی چیز ہے۔ راقم الحروف کو جناب وفاؔ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ "وہ آصف نامہ" کی تصنیف کے زمانے میں ایک مرتبہ ممدوح نے زیر تصنیف کتاب کے سیکڑوں شعر برزبان سنا دئے۔ لکھا ہے کہ استاد غالبؔ شب میں سوتے وقت فکر سخن کرتے اور ہر شعر کی یاد دہانی کے لئے کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے صبح میں اٹھکر گرہوں کی بناء پر اشعار یاد کر کے نوٹ کر لیتے۔ حضرت وفاؔ تو گرہ ڈالنے کے غم سے بھی آزاد ہیں۔ شعر موزوں ہو جاتا ہے تو لوح دل پر اس کی تحریر محفوظ رہتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے روزنامچہ میں تحریر فرمایا ہے "میں نے ہندوستان کا چپہ چپہ گشت کیا شاعر تو بہت نظر آئے لیکن وفاؔ سا حافظ شاعر کوئی نظر نہیں آیا۔ اُن کا خداداد حافظہ بلا کا ہے۔ ہزاروں شعر نوک زبان ہیں مسلسل سنائے جاتے ہیں"۔

حضرت وفاؔ ذہین ہونے کے علاوہ حاضر دماغ بھی ہیں وقت ضرورت ان گنت اشعار فی البدیہہ موزوں کر دینا ان کے نزدیک کوئی بات نہیں۔

شاعر و نثّار ہونے کے علاوہ فن تقریر میں بھی خداداد ملکہ رکھتے ہیں۔ بیدر میں میلادی مجالس اور شہادت کی مجلسوں میں مسلسل اور معرکتہ الآرا تقریریں ہوتی ہیں جن سے سامعین مستفیض ہوتے ہیں۔ کوئی علمی یا قومی جلسہ ایسا نہیں ہوتا جس میں حضرت وفاؔ کی تقریر یا نظم نہ ہوتی ہو۔ فطری اور موروثی شاعر ہیں دس بارہ سال کی عمر سے موزوں شعر بے ساختہ طبع خداداد سے نکلنے لگے ابتدا میں جب کہ وہ دار العلوم کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پاتے تھے تو ناسخؔ کی اس مشہور و معروف غزل پر غزل لکھ کر حضرت بیدلؔ سہارنپوری تلمیذ حضرت غالبؔ کو سنائی تھی جسکو سنکر بیدلؔ نے سینہ سے لگا لیا اور یہہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہہ قادر الکلام طبّاع شاعر ہونگے۔ اس کا ایک شعر یہہ ہے ؎

دکھاتا ہی نہ تھا منظور تجھکو جلوۂ وحدت
غشی نے رکھ لیا پردہ سوال ابن عمراں کا

جناب وفاؔ پندرہ سال ہی کی عمر سے بلدہ کے معرکتہ الآرا مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ چنانچہ اُن کی شرکت مشاعرہ کی ابتدا اس مشاعرہ سے ہے جس کے بانی مہانی بیکسؔ تھانوی ہیں۔ جناب وفاؔ کی غزل پر جناب بیکسؔ نے خاص طور پر داد دی جس سے انکی خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ مقطع مکرر سکرر پڑھایا۔

اوائل عمر کا ابتدائی کلام:—

میں نہیں وہ طالب دیدار جس کو ہو غشی ــــ بچھ جھلک روئے منور کی دکھاتے جائیے

سخت اس کا دل سہی آخر پسیجیگا کبھی ــــ درد اپنا اے وفا اس کو سناتے جائیے

۱۲ محرم ۱۳۲۸ھ مشاعرہ واحد منزل جنجل گوڑہ حیدر آباد بہ طرح دی گئی تھی ع ـ باغ رسول کے مرے دامن میں پھول ہیں۔ مشاعرے میں شعراء اور سامعین کی کثیر تعداد تھی نامی گرامی شعراء برتر ـ ناجی ـ واصل وغیرہ تھے۔ حضرت مائل جناب وفا کے اوستاد بھی موجود تھے ـ وفا صاحب نے اس سنگلاخ زمین میں سلام سنائے ۔ سامعین پر وجد کا عالم طاری رہا۔ حضرت مائل نے برسر مشاعرہ فرمایا کہ وفا نے آج امتحان شاعری میں ایم ـ اے کی ڈگری حاصل کرلی نمونہ ملاحظہ ہو:—

کیا داغ دل کے سینۂ روشن میں پھول ہیں ــــ نخل غم حسین کے گلشن میں پھول ہیں

رنگ بہار خون شہیداں ہے گل فشاں ــــ مجروح سر سناں ہے آہن میں پھول ہیں

دل بوئے عشق ساقی کوثر سے مست ہے ــــ اس مے کے قطرے ساغر روشن میں پھول ہیں

جنت میں گل کھلائینگے اعمال نیک ہی ــــ واعظ کہاں بہشت کے گلشن میں پھول ہیں

کیا چشم تر کی ہے غم شبیر میں بہار ــــ آنکھیں ہیں آنسوؤں کی غرض رو میں پھول ہیں

۲۸ محرم ۱۳۳۳ھ جناب سجاد حسین سجاد تلمیذ ظہیر دہلوی نے بھونگیر میں ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا معمولی طرح کے علاوہ ایک کڑا مصرع طبع آزمائی کی غرض سے دیا گیا تھا جس پر بانی مشاعرہ نے پانچ شعروں کی غزل سنائی ۔ باقی شعراء نے دوسری طرح میں طبع آزمائی کی تھی ۔ حضرت وفا نے معمولی طرح کے علاوہ اس سنگلاخ زمین میں اکتالیس شعر کی مرصع غزل سنائی مستعجبانہ دادِ سخن سے بزم مشاعرہ گونج اٹھی ۔ مصرع طرح ع ۔ غرور کرتے ہیں شیر و پلنگ ناخن پر۔

یہاں بطور نمونہ چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:—

غضب کے چلتے ہیں تیر و تفنگ ناخن پر　چٹکیوں میں اڑاتے ہیں دل جگر سینہ　وہ نقش مہر سلیماں کا رنگ ناخن پر　بلا کا حسن ہے پریاں ہیں دنگ ناخن پر

نظر پڑے جو ترے شوخ و شنگ ناخن پر　دہان زخم کی بھی رغبت ہے ہنسی رک جائے　کشاد عقد انامل ہے سنگ ناخن پر　ہوا نہ حل کوئی مطلب کبھی آقا رہے

قفس میں بند شکستہ ہے رنگ ناخن پر　کمند زلف میں اب مرغ دل کی خیر نہیں　گماں ہے پنبۂ مرہم کا تنگ ناخن پر　مزے خراش کے لیتے ہیں دل فگار الم

بجا ہے تیزی فکر سخن پہ ناز وفاؔ　غرور کرتے ہیں شیر و پلنگ ناخن پر

جناب وفاؔ کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ جملہ اصناف سخن پر قادر الکلام ہیں۔ انکے کلام میں قدما کا خاصہ رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن انکی خداداد طبیعت و دور حاضر کے لحاظ سے ہر شعر کو خواہ وہ کسی رنگ کا کیوں نہ ہو جدید قالب میں اس اسلوب سے ڈھالتی ہے کہ وہ نرالی شان کا نظر آتا ہے۔　نمونہ کلام

مکیں گھر میں ہی آتا ہی اگر گھر سے بھی باہر ہے　شریک بزم دشمن تو مرے دل میں اگر ہے　اسی غم سے نکلتا آج تک پتھر سے پانی ہے　غضب ہے کوہکن کا یاس کے عالم میں مر جانا

پڑے پتھر مقدر پر کہ کعبے میں بھی پتھر ہے　حرم کی راہ لی دیر بتاں چھوڑا برائے اہل　وہ خود آپے سے باہر ہے جو اس محفل کے اندر ہے　نکالو گے کہو کس کس کو بزم ناز سے اپنی

ذرا آئینہ دیکھو عکس نکلا کس کی صورت میں　نہ کھاؤ غیر پر دھوکا جو بدلے بھیس عاشق کا　لحد میں کون سنتا کون اٹھتا ہے قیامت میں　یہہ بیداری یہہ خواب اپنا ترے جلوے کی خاطر ہے

جلیگی شمع یہہ صبح قیامت تک مزاروں میں　یہ دن بھی اے عشق دیئے لیے نہیں مٹ سکتا　اے غم الفت تصدق تیری اس تدبیر پر　غم سے حالت غیر ہے دھوکا ہی انکو غیر کا

شمع محفل کی زباں پر بھی ہے افسانۂ عشق　نہیں یہ وجہہ یہہ جانباز یار پہ آنے کی　قیامت ہے امید و یاس کا حد سے گزر جانا　مزہ آتا ہے جینے کا نہ غم ہے موت آنے کا

دریا ہے جوش زن عرق انفعال کا　احساں نہ لینگے ابر کرم کا گناہگار　دل دشمن بھی آلٰہی نہ ہو بیگانۂ عشق　جذبۂ بیخودی عشق میں نکلی یہہ دعا

ہے نقش ترے پا مبارک کا زمیں پر　اٹھتا نہیں سر اسلئے سجدہ ہے فلک کا　ستانہ چشم کا نرمی ستانہ چال کا　ساغر یہہ جان دیتے ہیں ہم رنگ دیکھکر

پیمانہ بے خبر ہی رہا مے کے راز سے　اسرار عشق دل پہ ابھی تک کھلے نہیں　جو پیتے ہیں وہ خود ہی بیخبر ہو کر نکلتے ہیں　کہیں میخانے کے راز نہاں باہر نکلتے ہیں

کلام میں مزاح و ظرافت کی بھی جھلک پائی جاتی ہے مثلاً۔

دل پھانستے ہیں شیخ بھی معشوق کی طرح　ریش دراز کم نہیں زلف دراز سے

وہ ذکر خلد یوں کرتے ہیں گویا دیکھ آئے ہیں　بڑے استاد ہیں واعظ بھی بے پر کی اڑاتے ہیں

شیخ صاحب کے لئے آراستہ جنت ہوئی　نوجواں حوریں مرینگی آپ جیسے پیر پر

دستار شیخ پیچ کے بے باق کرنا   نکلے جو بادہ خانے میں کھا ادھار کے   واعظ کے مشورے سے ہو معشوق انتخاب   وہ انکو ناپسند ہے جس پر فدا ہیں ہم

یہ کیا سوجھی ہے واعظ کو کہ دن بھر چھیڑ حوروں کی   فرشتے بھی بگڑ جائیں جو ہوں حضرت کی صحبت میں

فرد عصیاں اے خدا قابل بھروسے کے نہیں   لکھنے والے کچھ بڑھا بھی دیتے ہیں تحریر میں

شوخی و پاس و لطف زباں ملاحظہ ہو:-

رکھ لوں بغل میں شوق سے جی بھر کے بوسے لوں   تقدیر ہو قبا کی تو قسمت نقاب کی   کیا کہوں پوچھتے ہیں قیس کا کیوں نام لیا   انس ہو جاتا ہے دیوانے سے دیوانے کو

اے مرگ ناامید تجھے رحم چاہئے   دیکھے جو میرا حال تو دشمن دعا کرے   گھس گھس کے رہ گئی ہے جبین نیاز بھی   کب تک کسی کے در پہ کوئی التجا کرے

تو مری ہمدم ہے میں ہمدم ترا اے بیکسی   تو مری تقدیر میں ہے میں تری تقدیر میں   صورتیں وہ ہی تو مرنے کی ہیں   آپ پر یا آپ کی تصویر پر

تصوّف و اخلاق کا رنگ ملاحظہ ہو:-

تھی صدائے کن سے بھی پیشتر مری ہستی پردۂ راز میں   ہے کمال قدرت سرمدی مرے نقش جلوہ طراز میں

ہے وضو مرا مری بیخودی ہے خیال یار مری نماز   ہے سلام دور سے کعبہ کو مری عاشقانہ نماز میں

ہو اللہ الاحد ذکر خفی ہے دمبدم میرا   ہر تار نفس ہے خامۂ وحدت رقم میرا   آئینۂ وحدت مظہر خدا ہوں   پھر عکس کی طرح سے جدا ہوں

دنیا کی کائنات حقیقت میں ہے سراب   پتلا ہے آدمی بھی طلسم خیال کا   آدمی آدمی بن جائے فرشتہ نہ سہی   وہ فرشتے ہیں جو انسانکو انساں کر دیں

کیمیا انکی ہے جو لوگ ہیں محنت کے دھنی   ریزۂ خاک کو بھی گوہر غلطاں کر دیں   نشتر کاری سے کیا کم ہے زبان منت   سمجھیں اک کوہ گراں اسکو جو احساں کر دیں

ساری خدائی قبضے میں آئے خدا ملے   ہمت سے سب ملیں بیٹھئے ہمت نہ ہار کے

ہزار نعمت ہے اک قناعت شگفتہ گلشن ہے عافیت کا   کشادہ دستی ہے تنگ دستی کھلا ہے غنچہ بھی تنگ ہو کر

صفائے ظاہری سے صفائے باطن ہو نہیں سکتا   ہر ریزہ وادکے اکثر نہ ساغر نکلتے ہیں   جو عالی خاندان ہیں حرج وہ لیت کر نہیں سکتے   رکا پانی اسی سطح زمین پر جس میں پستی ہے

حضور رسول اکرم صلعم کے سراپائے مبارک میں سرور کائنات کا سن شریف نئے اسلوب سے نکالا ہے انکے تخیّل کی یہ نزاکت قابل داد ہے

لب سے ہیں ہم عدو در دندانِ مصطفٰے   جنگ احد میں دانت جو اک شہ کا گر پڑا

پرتو ہے اسکے قلب زمیں کا ہے سرخ سا   اس قلب میں جو دانت تھا وہ لعل بن گیا

شصت و سی سالہ عمر میں شہ کی وفات ہے   اک دانت کی کمی میں یہ پوشیدہ بات ہے

نواب شہید یار جنگ بہادر شہید

شہید

نواب میر مہدی علی شہید یار جنگ بہادر

سنہ ۱۳۰۲ھ

از سیّد عبّاس حسین صاحب نقوی امید

میر مہدی علی شہید سنہ ولادت ۱۳۰۲ھ سادات طباطبائی سے ہیں۔ انکے جد سید زین العابدین ہمدم ایران کے شہر شیراز سے آئے تھے انہیں مہاراجہ چندو لال دیوان وقت کی استادی کا شرف حاصل تھا اور خزانہ عامرہ سے دو سو روپیہ منصب ملتا تھا۔ مرزا وصال اور حکیم قاآنی کے ہم عصر تھے۔ انکے بڑے فرزند ڈاکٹر مرزا علیخاں حکیم الممالک غفران مکان کے اسٹاف سرجن اور ریاست حیدرآباد کے ناظم طبابت تھے۔ دوسرے فرزند ڈاکٹر میر یوسف علیخاں شہید کے والد نواب مختار الملک کے اسٹاف سرجن اور اس وقت کے ڈاکٹروں میں سر برآوردہ ڈاکٹر تھے شہید کو اوائل عمر ہی سے شاعری کا ذوق ہے اور یہ وراثتاً ملا ہے۔ اول اول نوحہ اور سلام پر توجہ مبذول رہی پھر میدان تغزل میں قدم رکھا اور پیارے صاحب رشید لکھنوی سے تلمذ رہا۔

فارسی میں حیدر یار جنگ طباطبائی نظم سے مشورۂ سخن تھا اب پانچ چھے سال سے غزل گوئی ترک کر دی ہے قصائد مدحیہ، سلام، مرثیہ گوئی سے خاص دلچسپی اور شغف رکھتے ہیں۔ ابتداءً شہید کا خدمت مہتمی خزانہ ضلع پر تقرر ہوا۔ بعد ازاں برادر ولیعہد والاشان نواب معظم جاہ بہادر کے اسٹاف میں شامل ہوئے اور علیا شہزادی دلہن فرحت بیگم صاحبہ نیلوفر کے استاد مقرر کئے گئے۔ سنہ ۱۳۵۵ھ میں تقریب سالگرہ ہمایونی خطاب شہید یار جنگ سے مفتخر فرمائے گئے۔ شہید کی تین لڑکیاں اور پانچ فرزند ہیں۔ شاہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر کے سفر یورپ میں دو مرتبہ ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء سے بوجہ رخصت کرنل ڈینس اسکوئر حسب فرمان خسروی بہ حیثیت منصرم کنٹرولر والاشا[ن]

نواب معظم جاہ بہادر کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ان کا کلام رشید لکھنوی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے بہاریہ مضامین ساقی نامہ خوب لکھتے ہیں۔

خوش فہم اور مبصرین اہل لکھنو کا اتفاق ہے کہ یہہ اپنے استاد کے صحیح معنی میں مقلد اور متبع ہیں۔

ایک دفعہ نواب منظور جنگ کے بٹوے کی تعریف میں موصوف کی فرمائش پر حسب چند شعر کہے تھے جن میں سے ایک یہہ ہے

عیاں رنگ حسن ہے اور نہاں رنگ سینی ہے	چھپا رکھا ہے کافرنے مرا ایمان بٹوے میں

ان کے قصائد کے بہاریہ مضامین میں نہ صرف تنوع اور جدت پائی جاتی ہے بلکہ یہ معنی آفرینی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں

کیا ہے ابر نے چھڑکاؤ صحن گلشن میں	جو خاک چھانئے ملتا نہیں ذرا سا غبار
گلون کا رنگ جو کٹتا ہے سرخ ہے پانی	ہے نہر باغ کی گردن پہ آج خون بہار
ہوئی ہے صحن گلستاں میں آج طغیانی	بہا ہے پھوٹ کے نرگس کی آنکھ کا پانی
گلوں کی پتیوں پر قطرہ ہائے شبنم ہیں	خدا کی شان کہ ٹھیرا ہے آگ پر پانی
نمو کا جوش زلیخا کا ہاتھ بنکے رہا	کہ صحن باغ سے ظاہر ہے چاک دامانی
زمین پاؤں کے نیچے سے نکلی جاتی ہے	نمو کے جوش سے بڑھنے لگا ہے یوں پانی
کثرت گل کا اثر یاد رہے عمر بھر	ایک اٹھائیں اگر پھول اٹھ آتے ہیں چار

بہاریہ اشعار کے ضمن میں شہید نے درس عبرت بھی دیا ہے ان میں بھی کچھ عجیب طرح نئے پھول کھلائے ہیں۔

یہی سبزہ کا کہنا ہے خط رخسار عالم ہوں	حباب خضر مجھ سے حسن کھل جاتا ہے صورت کا
ہر اک پتہ کا دعویٰ ہے پتہ لے لو تو پتہ لے لو	جو ہو جویائے خالق راز سمجھو میری خلقت کا
ہر اک غنچہ یہہ کہتا ہے ادھر آؤ ادھر آؤ	میں ہوں اک غنچۂ سربستہ مشتاقو حقیقت کا
یہی ہر خار کا دعویٰ ہے لاموجود الا اللہ	ہر اک نخل چمن ہے مدعی کثرت میں وحدت کا
یہی نرگس کا دعویٰ ہے بد بینا بھلا کیا ہے؟	نمونہ ایک وہ تھا دوسرا میں اسکی صنعت کا

باب عرفاں کا ہر ورق پتّہ گل صد برگ ایک دفتر ہے

پتّہ پتّہ جو ہے حجاب اس کا ذرہ ذرہ ہر ایک مظہر ہے

ساقی نامو نکے چند شعر یہ ہیں:—

جام میں کچھ ملا پلا آج تو کچھ کھلا پلا جلد بس اب پلا پلا بادہ حب حیدری

دنیا ہے دیدے بے طلب رند نہیں ہے بے ادب مانگنے کا نہ آیا ڈھب لاکھ بتائے بے زری

پلا تو اتنا پیوں گا کہ ہونٹ ہل نہ سکیں پلا تو اتنا پیوں گا نہ کر سکوں گفتار

پلا تو اتنا پیوں گا کہ آنکھ کھل نہ سکے پلا تو اتنا پیوں گا کہ زیست ہو دشوار

پلا تو اتنا پیوں گا کہ تو بھی تھک جائے پلا تو اتنا پیوں گا کہ تو بھی جائے ہار

پلا تو اتنا پیوں گا کہ دم نکل جائے زہے نصیب کہ ہو میکدہ میں میرا مزار

یہہ شرط ہے نہ ہٹے سامنے سے تو ساقی شراب دے تو ملا کر دے شربت دیدار

مست الفت ہے سوئے میکدہ جاتا ہے شہید لڑکھڑاتے ہیں قدم ٹھوکریں کھاتا ہے شہید

دیکھیں کیا رنگ نیا آج جماتا ہے شہید ساقیا ہوش میں آ جوش میں آتا ہے شہید

خم سے آگاہ صراحی سے خبردار رہو میکشو مست ولا آتا ہے ہشیار رہو

دیکھ ساقی! تیرا وابستۂ داماں آیا آج پینے کا کئے خوب ہے ساماں آیا

جس کا مشتاق تھا لے اب وہ میری جاں آیا لئے اک ہاتھ میں جام ایک میں قرآں آیا

آنکھیں گلنار کئے قلب کو گرمائے ہوئے آج آیا ہے یہہ پینے کی قسم کھائے ہوئے

مست کا محضر عشاق میں ہاں نام بھی ہے دل بھی مملو مئی الفت سے ہے پر جام بھی ہے

در میخانہ پہ بستر سحر و شام بھی ہے اس کو پینے کے سوا اور کوئی کام بھی ہے

منحصر پینے پہ بس اسکا ہے جینا ساقی مئی کی بو دینے لگا اسکا پسینہ ساقی

ایک مرثیہ کے چند بہاریہ بند یہ ہیں :۔

یہہ نہ آئے گا کسی اور کے بہکانے میں
ہوش اتنے ہیں، ابھی ہاں ترے دیوانے میں
تو پلانا نہ کسی کو سرِ پیمانے میں
ندیاں خون کی بہہ جائیں گی میخانے میں
غیر بھی ہیں نہ بس اب دور خبردار چلے
میکدہ میں تری مرضی ہے کہ تلوار چلے

جوش خوں بڑھ گیا پھر زخم جگر کے آلے
میرے سینہ پہ ابھر آئے ہیں دل کے چھالے
مست ہیں جھومتے ہیں آج ترے متوالے
اودی اودی وہ گھٹا، ابر وہ کالے کالے
چار جانب سے صدا آتی ہے لا اور پلا
ہاں پلا، اور پلا، اور پلا، اور پلا

کہہ تو ساقی تجھے کیا دیر سے حاصل ہی بھلا
ہچکی آنے لگی ہے وقت جو پینے کا ملا
دم خفا ہوتا ہے، بس چھوڑ دے شیشہ کا گلا
دم اکھڑنے لگا اب دیکھ چلا میں تو چلا
مرگیا رند مری جان تو پچھتائے گا
بات رہ جائیگی اور وقت نکل جائیگا

تیرے مے خانہ کا عالم ہے نرالا ساقی
نور کا تیرا اہر اک سو ہے اجالا ساقی
دونوں عالم میں ترا نام دوبالا ساقی
ید بیضا ہے ترے جام کا چھالا ساقی
اک خرابات ہے وہ طور جسے کہتے ہیں
شعلۂ مے ہے وہی نور جسے کہتے ہیں
جتنے میکش ہیں ترے سب کو بچا دوں ساقی
مے کے چھینٹوں سے میں دوزخ کو بجھا دوں ساقی

شہید نے بلند پایہ غزلیں بھی کہی ہیں چند غزلوں کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں :۔

ہے بھول کر لکھا "کبھی لکھنا نہ مجھکو اب" عنوان ہے بنا میری خطا کی رسید کا
عالم ہے گیسو و رخ روشن پہ مبتلا ہے اختیار تم کو سیاہ و سفید کا
بجھا گیا ستم ایجاد شمع تربت بھی ہمارے غم میں کوئی اور اشکبار نہ تھا
بہت آج کل آئینہ دیکھتے ہو تمہیں ہو گی اپنی نظر دیکھ لینا
مدت کے بعد آج وہ آئے ہیں میرے گھر یارب شب وصال کہیں مختصر نہ ہو
بے تاب ہو نہ جائے کہیں کردگار وہ نکلے ہے آہ دل سے مگر کارگر نہ ہو
دل بے آرزو نہیں ملتا تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

نزع میں بھی اسطرف کھنچتے ہیں پاؤں — روز جاتے جاتے عادت ہوگئی

میں نے ناحق ہجر کے صدمے سہے — وہ سمجھتے ہیں شکایت ہوگئی

کوئی پوچھے اس دلِ ناشاد سے — فائدہ کیا ہے کسی کی یاد سے

صورت سے ٹپکتی ہے خود اُن کے پشیمانی — آنکھیں کہے دیتی ہے کچھ ہوگئی نادانی

اٹھتے تھے نہ بستر سے یا اٹھ گئے دنیا سے — اب دیکھیں دکھائیگا کیا ذوقِ تن آسانی

میں نور کہوں کیونکر وہ اسکا بھی خالق ہے — تشبیہ بھلا کیسی وہ جب کہ ہے لاثانی

چمن ہو کہ بستی بیاباں کہ صحرا — وہی چار جانب وہی چار سو ہے

ترے مست جلوے سے پیتے ہیں ساقی — نہ ساغر کی حاجت نہ جام و سبو ہے

نکلتا نہیں دم عجب کشمکش ہے — خدا جانے کیا دل میں اب آرزو ہے

صدائیں ہیں مے کی کسی کی زباں پر — کوئی کہہ رہا ہے کہ بس "تو ہی تو" ہے

زمانے نے سیکھی ہے رفتار ان سے — پلٹتے پلٹتے بدلتے بدلتے — نہ آئے وہ اور دم لبوں پر ہی اپنا — بہت دیر گذری نکلتے نکلتے

آلہی میرے دل کو کیا ہوگیا اب — یہ رکنے لگا کیوں مچلتے مچلتے — اگرچہ یہ گردش ہی قسمت کی ساری — پر اس میں ہے انکی شرارت زیادہ

جوانی بھی ہے ارماں بھی ہیں دم نکلیگا مشکل سے — سرک جائیں سرک جائیں تماشہ دیکھنے والے

کوئی اتنا نہیں کہتا کہ وہ بھی اک نظر دیکھیں — سرِ بالیں کھڑے ہیں یوں تو صدہا دیکھنے والے

جناب شہید کا ہر صنف سخن میں کلام موجود ہے۔ ہر صنف میں منتخبات کے پیش کرنے میں طوالت کا اندیشہ ہے۔ لہذا چند محبوب ترین اصناف میں سے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ذیل میں مخمسہ کے اشعار میں کیا تسلسل اور روانی ہے ملاحظہ ہو۔

دیکھ کیا حال ہے ستہ اشکوں سے دہوتے دہوتے — کچھ نہیں کھلتا کہ کیا ہوئے گا ہوتے ہوتے

چونک اٹھتا ہے کبھی رات کو سوتے سوتے — تڑکا ہو جاتا ہے ظالم تجھے روتے روتے

چیخ اٹھتا ہے ترے درد سے مرغِ سحری

بیٹھے بیٹھے ترا بے ساختہ گریاں ہونا　　کبھی کچھ سوچ کے ہنسنا کبھی حیراں ہونا

وحشت دل کے تقاضہ سے پریشاں ہونا　　وہ ترا اپنی محبّت سے پشیماں ہونا

دیکھیں دکھلاتی ہے کیا کیا یہ تری شوریدہ سری

جہاں حضرت شہید کی غزلوں میں حقیقت عرفان اور صداقت کا رنگ پایا جاتا ہے وہاں انکی رباعیات بھی ان ہی مضامین سے پیراستہ ہیں۔ مثال کے طور پر چند رباعیات پیش کئے جاتے ہیں۔ ذیل کی رباعیات کے عنوان طفلی و شباب ہیں۔

افسوس جوانی نے دئے ہیں دھوکے　　کیا فائدہ طفلی کے لئے اب روکے
پایا ہے اسے میں نے جوانی کھوکے　　کس طرح سے پیری کو نہ رکھوں میں عزیز

طفلی نہیں بہلائے وہ آرام نہیں　　ہے ختم شباب سے بھی کچھ کام نہیں
پیری آپہنچی سر پہ ہشیار شہید　　اس صبح کے بعد پھر کوئی شام نہیں

گذرا جو شباب آہ کب ملتا ہے　　پیری آئی ہے اور گل کھلتا ہے

ہلتے ہیں جو دانت لفظ کٹ جاتے ہیں　　جنبش ہے تمام تن کو دل ہلتا ہے

جناب شہید نے درس عرفان کس نفیس پیرایہ میں دیا ہے ؎

بیکار کی جستجو سے کیا ملتا ہے　　دل میں الفت ہو پھر تیا ملتا ہے

اقرار تو کرلے اپنی نادانی کا　　بندہ ہو جا تو پھر خدا ملتا ہے

دنیائے دوں کی محبّت سے دل لگانے کی کیفیت سنئے ؎

کب تک آخر یہ حبّ دنیا دل میں　　ہم جنسوں کی الفت نہیں اصلا دل میں

بندوں سے تو ملتا نہیں آتا تجھکو　　اللہ سے ملنے کی تمنّا دل میں

عرفانیات کی تعلیم بھلا اس سے اور کیا بلند پایہ ہو سکتی ہے فرماتے ہیں :-

پہلے کچھ ہو لے پھر سوا ہو لینا　　پہلے مل لے تو پھر خدا ہو لینا

او خاک کے پتلے تو ترا ہی ہو جا　　انسان ہو لے تو پھر خدا ہو لینا

صاحبزادہ میر آفتاب علی خان صاحب مہر

مہر

صاحبزادہ میر آفتاب علیخاں

سنہ ۱۳۰۳ھ

از

صاحبزادہ محمد علیخاں صاحب میکش

اے مہر ہیں خلاصۂ تفسیر دہر ہوں
وہ لفظ ہوں کہ حاصل معنی کہیں جسے

بدقسمتی سے حیدرآباد میں اب وہ پرانی محفلیں باقی نہیں رہیں جن کے تذکرے ہمارے لئے افسانوی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان برہم شدہ محفلوں کی بعض شمعیں اب بھی پورے شباب کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور ان ہی کی روشنی میں ہمیں ایک عجیب دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔ نوجوانوں کی علمی صحبت جہاں زندگی میں رنگینی پیدا کرتی ہے وہاں کسی بزرگ کا فیضِ صحبت ایک پُر تقدس اور روح افزا سکون زندگی بخشتا ہے۔

جدید اسلوبِ شاعری کے اس دور میں جب کبھی ہم کو ایسے شاعر سے ملنے یا اُس کا کلام سننے کا موقع ملتا ہے جس میں متقدمین کے نقشِ قدم پر چلنے کی پوری پوری صلاحیتیں پائی جاتی ہیں تو ہم اپنے آپ کو ایسی شعرستانی دنیا میں کھوئے ہوئے محسوس کرتے ہیں جہاں دل کی نگاہیں ادبیت سے زیادہ روحانیت کے موتی لوٹتی ہیں۔

حیدرآباد میں اب بھی بعض ایسی ہستیاں ہیں جن کا کلام قدیم روایات کو لئے ہوئے رفعتِ تخیل لطفِ زبان اور محاسنِ شاعری سے معمور نظر آتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک صاحبزادہ میر آفتاب علیخاں مہر ہیں جن کے والد کا نام میرزو الفقار علیخاں تھا اور جو نواب بسالت جنگ کے سلسلے سے متعلق ہیں۔ نواب بسالت جنگ مغفور حضرت آصفجاہ اول کے

چھوٹے صاحبزادے تھے۔

مہر حیدرآباد میں ۱۴ شعبان ۱۳۰۳ھ کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں پائی۔ چھ سال کی عمر تھی کہ مدرسۂ عالیہ
(نظام کالج) میں شریک اور اسی ادارے کے اقامت خانہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اس زمانے میں مدرسۂ عالیہ صرف ان طلبہ
کے لئے مختص تھا جنکی خاندانی نجابت و امارت مسلّم ہو۔ اسلئے اس میں ایسے ہی طالب علم زیر تعلیم تھے جن کے آبا و اجداد شرافت
اور امارت کے حامل ہوتے، اور جو خود بھی اعلیٰ کردار رکھتے۔ اس درسگاہ میں اساتذہ کو تعلیم کے ساتھ صحیح تربیت کا بہت
زیادہ خیال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسۂ عالیہ کے اس عہد کے فارغ التحصیل بہترین اخلاق و آداب کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں

مہر اپنی زندگی کی بہاریں بھی نہ آنے پائے تھے کہ انکے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا۔ یہ ایسا سانحہ ہمت شکن
تھا جس نے انکی زندگی میں ایک عظیم انقلاب رونما کر دیا۔ اور وہ اپنے ارادے کے خلاف بادل ناخواستہ ملازمت کے شکنجے
میں پھنس گئے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس مدرسہ میں یہ متعلم تھے اسی مدرسہ کے معلم ہو گئے۔ اور اب تک اپنے فرائض عمدگی
سے انجام دے رہے ہیں۔

مہر کو اپنی مادر علمی سے جسکے گہوارۂ تربیت میں پل کر انہوں نے زندگی کی کئی منزلیں طے کی ہیں اتنی محبت
ہے کہ وہ اسکے مفاد کی خاطر اپنے مفاد کی کوئی پروا نہیں کرتے اور ہر قدم پر اسکی روایات کا خیال رکھتے ہیں۔
وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ پدرانہ شفقت اور بزرگانہ محبت کا سلوک کرتے ہیں اسلئے انکے شاگرد ان سے
ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ انکے سیکڑوں شاگردوں میں سے اکثر ملک کے اعلیٰ اور ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں۔

انکی زندگی عبارت ہے پُرخلوص دوستی اور دوست پرستی سے وہ دوستوں سے خوش رہتے ہیں اور انکے دوست
ان سے خوش۔ انکی محفل احباب سے تہی نہیں رہی انکا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے اور وہ اپنے ہر دوست کی خوشی سے مسرور اور
رنج سے غمگین ہو جاتے ہیں۔

انکی طبیعت میں شاہانہ خودداری اور گدایانہ وضع داری پائی جاتی ہے۔ وہ خاکساروں کے ساتھ خاکساری کرتے ہیں
لیکن سربلندوں کے ساتھ انکسار گوارا نہیں کرتے۔ اسلئے انکے متعلق انکے ایک قریبی دوست کی رائے ہے کہ وہ بہترین دوست اور بدترین دشمن ہیں

مہرؔ کی جولانیٔ طبع بچپن ہی سے ادب اور شاعری کی طرف راغب تھی۔ کم عمری ہی سے موزوں طبع ہیں اور فطری ذوق کثرتِ مطالعہ ان کے رہبر رہے ہیں۔

پہلے وہ نظم طباطبائی نواب حیدر یار جنگ مرحوم کو جن کے وہ مدرسہ میں شاگرد خاص تھے اپنا کلام دکھاتے تھے اس زمانے میں ان کا تخلّص حسرتؔ تھا چنانچہ کہتے ہیں :-

حضرتِ نظمؔ وہ استاد جہاں ہیں حسرتؔ　　فیض پاتے ہیں جہاں آ کے سخن داں کتنے

اس کے بعد استاد داغؔ کو اپنا کلام دکھانے لگے اور نام کی رعایت سے انہوں نے مہرؔ تخلّص کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں :-

اے مہرؔ سب یہ فیض ہے استاد داغؔ کا　　کیوں کر ترا کلام نہ چمکے زمانے میں

نہ کیوں لطفِ زباں حسنِ بیاں ہو شعر میں اپنے　　کہ ہم بھی مہرؔ ہیں اک خوشہ چیں داغِ سخنور کے

شاید یہ شعر بھی اسی کی طرف لطیف اشارہ ہو۔

ہیں کیا مری بساط ہی کیا تھی سخن میں مہرؔ　　بندہ نواز نے مرے چمکا دیا مجھے !

اپنی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں۔

مرحبا ذوقِ سخن فکرِ معیشت پہ بھی　　شعر سانچے میں مری فکر کے ڈھلتے ہی رہے

باوجود اس کے کہ مہرؔ شعرائے حیدرآباد کی صفِ اوّل میں جگہ پانے کے مستحق ہیں انکو نام و نمود سے نفرت ہے۔ احباب کے اصرار پر کبھی کبھی مشاعروں میں اپنا کلام سنایا ہے اور طباعت کی صورت میں انکے بہت کم نتائجِ فکری محفوظ ہیں۔ یہ ایک قدیم مقولہ ہے کہ "شاعر کا کلام اس کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے" ہم مہرؔ کے اشعار پر نظر ڈالیں تو انکے کردار کی تصویر کے اکثر خط و خال نمایاں ہو جاتے ہیں ان اشعار میں آپ ایک خاموش پیغام بھی مستتر پائیں گے اور یہی پیغام دراصل ایک شاعر کا مطمحِ نظر ہوا کرتا ہے۔ شاعر، روح، عقل اور لطافتِ ادراک کی مدد سے ایک چیز کو کاوشِ فکر اور غائر نگاہی کا مرکز بناتا ہے۔ اس سے کچھ حاصل کرتا ہے اور جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کو دنیا کے آگے پیش کرتا ہے :-

وہ مضطرب ہوں کہ آیا کبھی جو پہلو سے — قرار بھی مرے پہلو میں بے قرار رہا

زلفِ رسا سے قسمتِ سرگشتہ کم نہیں — بن بن کے بگڑی اور بگڑ کر سنور گئی

آنکھیں ہوئیں جو بند تو آنکھیں کھلیں مری — نا آشنا دکھائی دیئے آشنا مجھے

محاورہ بندی کی یہ چند مثالیں ہیں۔

قیامت بھی بڑی مشکل سے جو فتنے اٹھاتی ہے — وہ فتنے پائمالِ شوخیِ رفتار رہتے ہیں

مزا ملتا ہے ایسا رال ٹپکی پڑتی ہے منہ سے — زباں خشک پر ساقی کا جب افسانہ آتا ہے

بے مانگے موتی ملتے ہیں مانگے ملے نہ بھیک — ملتا ہے وہ نصیب سے ملتا کہیں جسے

دینے والے نے دیا اور کس قدر کانٹے کی تول — ہر سخی کا دل بہ قدرِ ظرفِ ہر سائل بنا

ان اشعار میں خالص زبان کے چٹخارے دیکھئے۔

تھکے ہیں زندگی سے موت بھی مانگے نہیں ملتی — خضر کو یوں ملا بدلہ سکندر آبِ حیواں کا

حشر میں خاموش جانے سے بھلا کیا فائدہ — تم سناتے جاؤ ہم فریاد کرتے جائیں گے

نہیں معلوم کس کا ذکر ہے اور کس کا افسانہ — زباں پر جب کبھی آتا ہے بے تابانہ آتا ہے

ہونے کو ہے سب کچھ یہ اور پھر بھی نہیں کچھ بھی — دنیا جسے کہتے ہیں دھوکا نظر آتا ہے

اک دل کے لئے دینے میں تکرار کیا کریں — سودا یہ وہ نہیں ہے کہ سودا کہیں جسے

رفعتِ تخیّل کے لحاظ سے یہ اشعار کس قدر بلند پایہ ہیں۔

وہ کام کر گیا کہ بڑا نام کر گیا — مارا نگاہِ ناز کا بے موت مر گیا

ہمارے بعد زمانے میں کیوں نہ خاک اڑے — اب کارواں کے پیچھے غبار رہتا ہے

شاخ سے بھی گرا چکی خاک میں بھی ملا چکی — برگِ خزاں رسیدہ کو رنگ دے کے اٹھا رکھا

کیا پوچھتے ہو حال مری ہست و بود کا — جھونکا نسیم کا تھا کہ آیا گزر گیا

ہوئی طے منزلِ ہستی تو یوں شامِ اجل بولی ــ تھکے ماندے مسافر سو رہیں گے آج دن بھر کے

جس نے پایا مفلسی میں بھی نہ سیم و زر کا رنگ ــ داغ جو دل پر پڑا وہ صورتِ درہم نہ تھا

تھا یہی رنج و خوشی کی بے ثباتی کا ثبوت ــ خندہ گل پیہم نہ تھا تو گریہ بھی پیہم نہ تھا

کس کام کا ہے وہ جو کسی کے نہ کام آئے ــ کاسہ فقیر کا نہ ہوا جامِ جم ہوا

تو اگر چاہے تو ہر اک عیب ہو جائے ہنر ــ کعبہ کہتے ہیں جسے پہلے بڑا بت خانہ تھا

جب رنگِ گل کو چھوڑ کے اڑ جائے بوئے گل ــ دنیا ہے ساتھ کون کسی کا زمانے میں

حسد سے اہلِ حسد پاک رہ نہیں سکتے ــ کدورتوں سے جو خالی ہو وہ غبار نہیں

تیر کھا کر جو چھپائے وہ جگر پیدا کر ــ کٹ کے قدموں پہ جو گر جائے وہ سر پیدا کر

بعدِ فنا بھی بن کے رہا خاکِ کوئے یار ــ مٹی مری سرشت میں مہر و وفا کی ہے

نہیں دیوانگیٔ عشق میں تخصیص مجنوں کی ــ کہ اس منزل میں جو آتا ہے وہ دیوانہ آتا ہے

مجبورِ محض میں تھا تو مختارِ کائنات ــ پھر دل کے اختیار میں کیوں دے دیا مجھے

وہ روبرو بلاتے ہیں بہرِ سزا مجھے ــ اس واسطے پسند ہے اپنی خطا مجھے

مہر کے کلام میں شوکتِ الفاظ بھی موجود ہے چند شعر ملاحظہ ہوں :—

اے مہر میں خلاصۂ تفسیرِ دہر ہوں ــ وہ لفظ ہوں کہ حاصلِ معنی کہیں جسے

عام پیاسوں کی طرح ساقی نے پیاسا کیوں رکھا ــ میں تو پابندِ قیودِ ساغر و مینا نہ تھا

وہ موجِ ناتمام ہوں دریا کہیں جسے ــ وہ ناتواں غبار ہوں صحرا کہیں جسے

رونا یہ آنکھ کا کیا مجھ کو صرفِ اشک ــ دل کا گلہ کہ وقفِ تمنا کیا مجھے

گرفتارِ قیودِ سبحہ و زنار رہتے ہیں ــ بڑے نادان ہیں جکڑے ہوئے کافر و دیندار رہتے ہیں

پہلے تو ان کی تمام غزلیں دستیاب نہ ہو سکیں جو ملیں ان کے انتخاب میں کوئی خاص کاوش سے کام نہیں لیا گیا

بلکہ جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ سرسری نظر کا نتیجہ ہے۔

غزلوں کے ان اشعار میں جنہیں ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے آپ ایک خاص بات پائیں گے اور یہی بات مہر کے ہر شعر میں پائی جاتی ہے۔ مہر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بہت آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔ تخیّل الفاظ کو لئے ہوئے انکے ذہن میں آتا ہے نہ کہ الفاظ تخیّل کی تلاش میں گمراہ نظر آتے ہیں۔

اکثر شعرا لفظی بازی گری سے اشعار کو معمّہ بنا دیتے ہیں اور جب ان معموں کو حل کیا جاتا ہے تو صرف لفاظی کے سوا ان میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا لیکن مہر کے کلام کو دیکھ کر آپ اس نتیجہ پہ پہنچیں گے کہ اس میں تصنّع آمیز جوش و خروش نہیں ہے۔ مہر نے اپنے خیالات کو پیش کرتے وقت لطافتِ احساس کے ساتھ سادگیٔ بیان کا بہت خیال رکھا ہے

بہرحال ان کا ہر شعر جس استغراق اور کیف میں ڈوبا ہوا ہے وہ خود ایک کیفیتِ شعری طاری کر دیتا ہے اور اسکی رونق و تازگی میں ایسے دل آویز نقوش پوشیدہ ہیں جو ذہنِ سامع پر مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

مہر کے کلام میں مسدسوں کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ انکے مسدسوں میں شوکتِ الفاظ کے ساتھ تسلسل بھی پایا جاتا ہے اور تسلسل ہی دراصل مسدس کی جان ہے۔

ہمارے سامنے مہر کے پانچ مسدس ہیں۔ ان پر عمومی حیثیت سے نظر ڈالنے کے بعد ہمارا اپنا خیال ہے کہ انکی جولانیٔ طبع دیگر اصنافِ سخن کے مقابلہ میں مسدس گوئی کے لئے زیادہ موزوں اور کامیاب ثابت ہوئی ہے۔

ہم یہاں چند بند نمونتاً پیش کرتے ہیں جن میں محاسنِ افکار، قدرتِ کلام، بدیعہ انشا، اور جوشِ الفاظ کی پوری جھلک موجود ہے:۔

اہلِ خواہش کی ہے بس ایک تمنا دنیا — دنیا والوں نے بنا رکھی ہے کیا کیا دنیا
گو دکھاتی ہے بنا روز تماشا دنیا — پر نظر والوں کی نظروں میں ہے دنیا دنیا

اس کو دنیا نہ سمجھنا کبھی بازار ہے یہ
بیچ ڈالے جو زمانے کو وہ عیار ہے یہ

آج سودائے محبت سرِ بازار بکے — اس کے لینے کی جو خواہش ہو تو گھر بار بکے
پھر بکے جان بکے اور دلِ زار بکے — انتہا یہ ہے کہ خود آپ خریدار بکے

پھر بھی ممکن نہیں اس جنسِ گراں کی قیمت
کم ہے دی جائے اگر دونوں جہاں کی قیمت

آمد بہار کی مرے باغِ سخن میں ہے — اے عندلیبِ طبع چہک کس چمن میں ہے
خاموش کیوں ہے تو فکرِ گل یاسمن میں ہے — شاید کلام تجھ کو خود اپنے دہن میں ہے

تیرے ہی جلوہ کی گل و بلبل میں عید ہے
نغمہ ترا بہارِ سخن کی نوید ہے

ہیں کچھ جدا سے بڑھ کے تری گل فشانیاں — پھولوں کو رنگ دیتی ہیں رنگیں بیانیاں
بلبل نے تجھ سے سیکھی ہیں شیریں بیانیاں — ہم بھی سنیں گے آج وہی نغمہ خوانیاں

جھڑتے ہیں تیرے منہ سے سنا بار بار پھول
یوں جیسے بکھریں وقتِ نسیمِ بہار پھول

یہ اپنی اپنی عمر ہے اور اپنا اپنا سن — کس میں ہیں نوجوان کہاں اور کہاں مسن
سب مشغلے ہیں اس پہ ملک ہوں کہ انس و جن — رہتے نہیں ہیں سب کے زمانے میں ایک دن

جو کہہ رہا ہوں میں نہیں داخل جنون میں
بل ہے بڑا اثر کہ لہو ہے جو جوشِ خون میں

مشاطۂ عروسِ سخن بن رہی ہے طبع — یا خود ہی اب سنور کے دلہن بن رہی ہے طبع
شوقِ سخن میں غنچہ دہن بن رہی ہے طبع — جوشِ شگفتگی سے چمن بن رہی ہے طبع

پھر آ رہے ہیں گوہرِ مضمون خیال میں
موتی پروتا جاتا ہوں پھر بال بال میں

تو پھر کلیدِ قفلِ دہن ہے زباں مری
پھر گل فشانیوں سے چمن ہے زباں مری

پاکیزگی میں نہرِ لبن ہے زباں مری
تاثیر میں یگانۂ فن ہے زباں مری

تیغ زباں سے کاٹ کے رکھ دوں زبانِ تیغ
دعویٰ جو پھر کرے تو مٹا دوں نشانِ تیغ

خاموش! طبعِ تیز اِدھر اتنا مچل کے چل
چلنی ہے سیدھی راہ تجھے تو سنبھل کے چل

اتنا بھی اپنی حد سے نہ باہر نکل کے چل
ہاں صرف واقعات کے سانچے میں ڈھل کے چل

سچی جو بات ہے سو وہ مقبولِ عام ہے
خالی مبالغہ سے ہمارا کلام ہے

باغِ جہاں کا رنگ ہر اک بے ثبات ہے
ہے رات کا جو دن تو کبھی دن کی رات ہے

غافل یہ لاکھ بات کی بس ایک بات ہے
ہے بے بدل کوئی تو وہ خالق کی ذات ہے

ہوتا ہے انقلاب و تغیر زمانے میں
دنیا کا سلسلہ ہے اسی آنے جانے میں

جاتا اگر ہے ایک تو آتا ہے دوسرا
پہلے کے سارے نقش مٹاتا ہے دوسرا

اور آ کے اپنا رنگ جماتا ہے دوسرا
پھر تیسرے کے واسطے جاتا ہے دوسرا

یہ تیسرا بھی بھول سا جاتا ہے ایک دن
یہ دن سبھی کے واسطے آتا ہے ایک دن

روشنی اس کی ہے طلعت دہ ماہ و خورشید (علم) اس کا جلوہ ہے کہ ہے جلوۂ صبحِ امید

اس سے حاصل ہے زمانہ کو حیاتِ جاوید
ہے بجا کہئے جو اس کو درِ جنت کی کلید

[illegible] کشائی اس کی

مختصر یہ ہے کہ ہے ساری خدائی اس کی

آج رکتی ہی نہیں طبع روانِ خامہ　　دو جہاں سے بھی زیادہ ہے جہانِ خامہ
گڑ گیا صفحۂ کاغذ پہ نشانِ خامہ　　تیغ کی طرح سے چلتی ہے زبانِ خامہ

مملکت نظم کی تسخیر ہوئی جاتی ہے
خامہ رکتا نہیں تحریر ہوئی جاتی ہے

بے عمل علم ہے اک غنچۂ دل تنگ کی شکل　　جس میں خوشبو نہ ہو اس گل خوش رنگ کی شکل
لعل کی کان میں جس طرح سے ہو سنگ کی شکل　　جس کے پردوں میں نہ آواز ہو اس چنگ کی شکل

ایسی تلوار جو جوہر میں بسے اور نہ چلے
اپنے کس بل میں ہی خود آپ کسے اور نہ چلے

اس طرح کا ہے جسد جس میں کوئی جان نہیں　　ہوش وہ جس میں کہ جمعیتِ اوسان نہیں
وہ قلمرو ہے کہ جس کا کوئی سلطان نہیں　　شاہ وہ جس کا کوئی تابعِ فرمان نہیں

جو صدف میں ہو اسی گوہرِ شہوار کی طرح
ہے تو کہنے کو یہ غائب دہنِ یار کی طرح

علم ایسا ہو تو ہونے سے نہ ہونا اچھا　　جلسِ ناقص سے تو بچوں کا کھلونا اچھا
ہوشیاری میں جو غفلت ہو تو سونا اچھا　　خندۂ جبر سے تو پھوٹ کے رونا اچھا

آتشِ مردہ سے ہوتا ہے دھواں ہی بہتر
عشق میں ضبط سے ہے آہ و فغاں ہی بہتر

مولوی سید محمد حسین صاحب آزاد

آزاد

سیّد محمّد حسین

۱۳۰۵ھ

از محمّد عبدالکریم صاحب شمیم

سید محمد حسین نام اور آزاد تخلص ہے۔ حاجی سید عبداللہ حسینی صاحب آفسر کے فرزند ہیں جو موضع سرن پلی ضلع نظام آباد کے جاگیردار تھے جنکا ذکر آزاد کے بڑے بھائی سید اعظم اللہ حسینی صاحب اطہر کے تذکرہ میں گذر چکا ہے۔ جس وقت یہ ڈھائی سال کے ہوئے ان کے سر سے والد کا سایۂ عاطفت اٹھ گیا۔ پہلے پہل اُنکی والدہ نے انکے بھائی مولوی سیّد اعظم اللہ حسینی صاحب اطہر کے یہاں انکی پرورش کا انتظام کیا۔ لیکن بعد میں حاجی سیّد ابراہیم صاحب کے زیر نگرانی تربیت حاصل کی۔ یہ آزاد کے حقیقی چچا تھے۔ مگر انکی اصلی مربّی ان کی والدہ ہیں۔ دوراندیش بیوہ ماں نے خاص طور پر اُن کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہہ کی جب ابتدائی تعلیم ختم کرلی تو مدرسہ فخریہ میں جماعت منشی میں شریک ہوئے چونکہ طبیعت فطرتاً موزوں واقع ہوئی تھی احسن القواعد کے درس نے اس کو اور بھی چمکا دیا اولاً ان کے زبان سے جو شعر موزوں ہوا اتفاقاً وہ نعتیہ ہے اس حسنِ اتفاق کو انکی شاعری کے فروغ کا پیش خیمہ سمجھنا چاہئیے وہ شعر یہ ہے ؎

لام میم و شام گیسوئے رسول نون ہے واللہ ابروئے رسول

تعلیم کے ساتھ ساتھ شاعری کی مشق بھی جاری رہی۔ اس مدرسہ سے منشی کا امتحان کامیاب کر کے حیدرآباد کی مشہور درسگاہ دارالعلوم میں شریک ہوئے۔ اور یہاں بھی اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہہ سے ہردل عزیز رہے اور بارہا اساتذہ سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اساتذہ کے غیاب میں اپنے ساتھیوں کو سبق یاد کراتے۔ کھیل کود میں بھی

نمایاں حیثیت رکھتے تھے ظرافت اور شوخی بچپن ہی سے انکی طبیعت ثانیہ تھی جسکی جھلک انکے اشعار میں بھی کار فرما ہے۔
یہہ یہاں کے قدیم مشاعروں میں جو اکثر و بیشتر حضرت فیض رحمتہ اللہ علیہ کے عرس میں یا ضیغم صاحب کے
یہاں منعقد ہوا کرتے تھے حصہ لیا کرتے تھے۔ جن میں قدیم طرز کی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔
آزاد بھی شروع میں قدیم شاعری کے موافق تھے چنانچہ اپنی "آپ بیتی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں "طالب علمی کے زمانے ہی سے مجھے شاعری کا شوق تھا۔ اور میں بھی پرانی لکیر کا فقیر بن کر انٹ سنٹ لکھتا رہا۔ مگر ۱۹۰۵ء میں غفران مکاں اعلیحضرت مرحوم کی جوبلی میں مولوی حالی حیدرآباد آئے۔ اور نواب فیاض علیخاں بہادر کی کوٹھی میں انکے خیر مقدم کا عام جلسہ ہوا میں بھی گیا۔ مولوی شبلی نے حالی کا تعارف کراتے ہوئے ایک لانبی چوڑی تقریر کی جسمیں پرانی شاعری کی مذمت اور نیچرل شاعری کی تعریف کی۔ اس کے بعد حالی نے اپنی ایک نظم سنائی جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا ؎
"اے ماؤ بہنو بیٹیو دنیا کی زینت تم سے ہے" ایک تو شبلی کی تقریر نے پرانی شاعری کو دل سے اتار دیا اور دوسرے حالی کی نظم نے نیچرل شاعری کا چسکا دلایا۔ جو کچھ اب تک لکھا تھا گھر آکر اس کو نذر آتش کر دیا ؎

سوخت آزاد کلام خود را از کلام دروغ سوختہ بہ"

ہر شاعر اپنے آپکو دوسروں سے ممیز و ممتاز کرنے کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ آزاد نے بھی اپنی شاعری کے لئے ایک نیا میدان انتخاب کیا۔ قوم کے درد کو اپنا درد اس کی اصلاح کو اپنا فرض سمجھا۔ اور قوم کی اصلاح بغیر وعظ و نصیحت ناممکن ہے۔ لیکن اگر کسی جماعت کو سنجیدہ طور سے اوس کے معائب بتلاتے ہوئے نصیحت کی جائے تو اس کو بری معلوم ہوتی ہے۔ خواہ وہ اس کے حق میں کیسی ہی مفید کیوں نہ ہو لیکن اصلاح اگر ظرافت کے پردے میں کی جائے تو اتنی بری نہیں معلوم ہوتی۔ انہیں خیالات کے تحت انہوں نے اپنی نصیحتوں کو ظرافت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ تاکہ عقلمند اس سے فائدہ اٹھائیں اور جاہل تفریح طبع کی خاطر انکے کلام کا مطالعہ کریں۔
آزاد کو غلامی سے حد درجہ نفرت تھی ہمیشہ آزاد رہنا چاہتے تھے۔ مگر کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ ۲۴ بہمن ۱۳۱۷ف میں مجبوراً سر رشتہ تعلیمات میں ملازم ہونا پڑا جسکا ذکر چند ظریفانہ اشعار میں کیا ہے ؎

مفلسی نے کیا سمجھے نوکر ۔ نہ رہا ہائے تو مدام آزاد ۔ نوکری نے کیا ذلیل سمجھے ۔ کہ شرافت کو اب سلام آزاد

جیسے زنگی کا نام ہے کافور ۔ ہیں غلام آپ اور نام آزاد

ان کی مشہور تصانیف خیالات آزاد حصہ اوّل و حصہ دوم "بالک لوریاں" "مسدس آزاد" ہیں ۔ جو حمد نعت ۔ قصائد ۔ قطعات ۔ نظموں اور تراجم پر مشتمل ہیں ۔ لیکن چونکہ قدرت نے ظرافت اور شوخی انکی فطرت میں ودیعت کر دی ہے اس لئے وہ ہر جگہ ایک نہ ایک طرح سے نمایاں ہوتی رہتی ہے ۔ اگر انکے مجموعہ کلام کا مطالعہ کریں تو کوئی نظم، کوئی قصیدہ ایسا نہ ملیگا جو ظرافت سے خالی ہو ۔ مولانا امجد کی رائے ہے کہ "آزاد کے کلام میں شوخی اور جدّت کوٹ کوٹ کر بھری ہے ۔ ظرافت اُن کی فطرت ہے ۔ انکے کلام کی شوخی و ظرافت اکبر الٰہ آبادی مرحوم کے کلام سے ملتی جلتی ہے ۔ مگر یہ شوخی تقلیدی نہیں اگر اکبر کی شاعری وجود میں نہ بھی آتی تب بھی ہمارے آزاد اسی طرح آزاد و ظریفانہ شعر کہا کرتے" سفارش کے متعلق لکھا ہے ۔

یہاں سے اپنی گاڑی ہم بچا کر کیسے لیجائیں ۔ جدھر دیکھو اُدھر اٹکا ہے اک روڑا سفارش کا

لیاقت کا اگر چلتا نہیں ٹٹو تو اے حضرت ۔ لگا دو زور سے تم اُس کے اک کوڑا سفارش کا

ترقی کا نتیجہ قابلیت سے نہ نکلے گا ۔ لگا دو گے نہ تا وقتیکہ تم جوڑا سفارش کا

تقرر اس سے ہوتا ہے ترقی اس سے ملتی ہے ۔ سمجھتے ہو پھر اس پر تم اثر تھوڑا سفارش کا

لیاقت پوچھتا ہے کون کیوں سر پھوڑتے ہو تم ۔ زمانے میں نہیں ہے ان دنوں توڑا سفارش کا

سفارش نے تو اونچے اونچوں کو نیچا دکھایا ہے ۔ بڑا ہی سورما ہے جس نے منہ موڑا سفارش کا

شباب پر کئی نظمیں لکھی جا چکی ہیں لیکن آزاد نے جو نظم جامعہ عثمانیہ کے مشاعرہ کیلئے لکھی ہے انوکھی طرز کی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

جامعہ میں شباب کا مضمون ۔ بن گیا شیخ و شباب کا مضمون

چڑھ گیا ہے شباب کا نشہ ۔ یہ بھی ہے اک شراب کا مضمون

ہے کسی کے شباب کا عالم ۔ بت خانہ خراب کا مضمون

شب فرقت میں گریہ و زاری ۔ ہے یہ چشم پر آب کا مضمون

کون سنتا ہے وعظ واعظ کا ہے عذاب و ثواب کا مضمون

ان کی ایک نظم فیشن کا سراپا بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں آج کل کے فیشن کا پُر لطف طریقہ پر خاکہ اڑایا ہے۔ اور اس کے پردے میں سب کی خبر لی ہے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

گھنی مونچھیں ہیں وہ بھی دم بریدہ بنی ہیں ڈنک بچھو کی جو مڑ کر
ضرورت نائی کی اسکو نہیں ہے یہ اپنا بار بر ہے آپ اکثر
برائے رفع سوزش بعد شیونگ لگایا جاتا ہے گالوں پہ پوڈر
گرفتارانِ فیشن اپنے ہاتھوں برسوں میں ملتے ہیں ڈاڑھی منڈھا کر
شکنجہ تھا وہ گویا کوٹ پتلون! پھنسا مشکل میں بیچارہ پہن کر
آجکل کے فیشن کی گئی جگہ مذمت کی ہے کم خرچی کے اصول بنائے ہیں

عسرت کا ہے تقاضہ دبے تو گلے میں پھانسی فیشن کا ہے یہ آڈر کالر میں بل نہ آئے
ادب مشرق بھی کرتا ہے ادب مغرب بھی کرتا ہے وہاں ٹوپی اترتی ہے یہاں جوتا اترتا ہے

آزاد نے دوسری زبانوں سے بھی منظوم ترجمے کئے ہیں۔ اور یہ مشغلہ تیس سال قبل سے جاری ہے۔ انکی ایک نظم کو سر عبدالقادر مدیر مخزن نے اول قرار دیا تھا چنانچہ انہوں نے رسالہ مخزن بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۰۸ء جلد ۱۵ نمبر ۲ میں لکھا تھا کہ گلہائے رنگا رنگ کا یہہ گلدستہ جو ہمیں آج ہاتھ لگا ہے اسکے لئے ہمیں اور ناظرین مخزن کو اصل میں منشی عنایت اللہ دہلوی کے فرزند منشی محمد ذکا اللہ کا ممنون ہونا چاہیئے۔ خدا جانے انہوں نے کس قبول کی گھڑی میں لٹن کی دل پذیر نظم کا ترجمہ نثر میں کیا تھا جو فروری کے پرچے میں شائع ہو چکا ہے کہ بہت سے شعراء اسے پڑھکر بے چین ہو گئے اور "پھول والی کے گیت" کے متعدد منظوم ترجمے ہمارے پاس پہنچ گئے ان میں سے چار ترجمے (۱۔ سید محمد حسین صاحب آزاد ۲۔ منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی ۳۔ سید محمد ابراہیم صاحب اشک ۴۔ جناب اشک بلند شہری) چھپنے کیلئے انتخاب کئے گئے ہیں اپنی اپنی جگہ سب داد کے قابل ہیں مگر جس نظم کو ہم نے سب سے پہلے درج کیا ہے اسکی یہہ خوبی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اسمیں فاضل مترجم کے سادہ الفاظ قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آزاد کی یہہ نظم "خیالات آزاد" جلد اول میں چھپ چکی ہے۔

آزاد نے اپنے بچوں کی فرمائش پر چند لوریاں نئے طرز پر لکھی ہیں۔ بہت کم اردو شاعروں نے اس طرف توجہہ کی ہے کتاب "بالک لوریاں" مختلف لوریوں کا مجموعہ ہے۔ ہر لوری ایک خاص رنگ میں ہے بچے تو بچے بڑوں کا جی چاہتا ہے کہ انکو پڑھیں اور لطف اٹھائیں دو لوریوں کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

۱

راحت کے نشہ میں ہے مرا آنکھ کا تارا
سویا ہوا خاموش
گویا ہوا مدہوش
کیا نیند کا متوالا ہے ماں باپ کا پیارا
بھائی ترے چہرے پہ فدا ہوتی ہے ہمشیر
ہے نور کا ٹکڑا
ہے حور کا مکھڑا
شرمایا ہوا دیکھ کے یہ حسن کی تصویر
سونے میں ترے لب پہ ہنسی کھیلتی دیکھی
کھویا ہوا پایا
سویا ہوا جاگا
بیدار ترا بخت رہے اے مرے بھائی

۲

نیند کیا میٹھی ہے آ اِسکا مزا لے سوجا — خواب راحت کا ذرا لطف اٹھا لے سوجا
سو جا سو جا ادھر ناز کے پالے سوجا — رات ہے مجھ سے تجھے چھین نہ لے سوجا
اے مرے چاند مرے گھر کے اجالے سوجا
جھولے جھولے مرے پیارے مرے بالے سوجا

اکبر الہ آبادی کی طرح انہوں نے بھی کئی ظریفانہ غزلیں لکھیں ان میں سے صرف ایک غزل پیش کی جاتی ہے ؎

وہ شب پارسائی ہوا ہو گئی — اب ناروا بھی روا ہو گئی
مریضوں کو دینے لگے ہیں شراب — جو تھی سم قاتل دوا ہو گئی
ڈنر میں چھلکنے لگے اس کے جام — یہ ظالم ہماری غذا ہو گئی
اضافہ ہوئی ہم سے گندم میں مے — یہ پوتوں سے بھی کیا خطا ہو گئی

انکی ایک مشہور نظم "تصویر معشوق شعرا" ہے جس میں یہ دکھلایا ہے کہ شاعر اپنے خیالی معشوق کی تصویر جو اس کے لوح دماغ پر کندہ ہوتی ہے کسطرح سراہتا ہے۔ اس پردے میں قدیم شاعری کی مذمت کی ہے اس نظم کو اگر ہم واسوخت کہیں تو بیجا نہ ہوگا چند اشعار

شاعروں کا عجیب ہے معشوق — اس جہاں میں نہیں یہ مخلوق
اسکی رفتار ایک آفت ہے — وہ چلا اور بپا قیامت ہے
بال سر کے ہیں یا شب دیجور — نام کو بھی نہیں ہے اس میں نور
اسمیں لٹکے ہوئے ہزاروں دل — اسمیں بھٹکے ہوئے ہزاروں دل
اسکی مژگان و چشم و ابرو سے — جان کے پڑ گئے ہیں کیا لالے
لاکھوں دل ان سے کٹتے رہتے ہیں — خوں کے دریا بھی ان سے بہتے ہیں
اس کے رخسار جو ہیں حسن مآب — ایک ہے آفتاب اک مہتاب
یا تو دو پھول ہیں گلاب کے وہ — یا تو دو صفحے ہیں کتاب کے وہ
ہونٹھ اسکے ہیں برگہائے گل — اس پہ سو جان سے فدا بلبل
دانت اسکے ہیں دانہائے انار — ہے وہ شیریں بیان و خوش گفتار
بولتا ہے تو پھول جھڑتے ہیں — سوسن و گل زمیں میں گڑتے ہیں
اسکے جوبن کی ہے عجیب بہار — گویا نکلے ہوئے ہیں خام انار

مرقع سخن

جلد دوم

قاضی محمد منیرالدین فاروق منیر

حیدر آباد پرنٹنگ ورکس

منیرؔ

قاضی محمد منیر الدین فاروقی

۱۳۰۸ھ

از سید اشفاق حسین صاحب بی اے

قاضی منیر الدین صاحب منیرؔ ۱۳۰۸ھ میں بمقام ٹکال پیدا ہوئے۔ "قاضی فاروقی" تاریخ تولد ہے۔ اِن کے والد پرگنی کے موروثی قاضی اور لاتور کے منصف تھے مگر یہہ ابھی تین ہی سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا نانا کے دامنِ عاطفت میں پرورش ہوئی اور تعلیم ظاہری و باطنی کا درس لیا منشی فاضل کا امتحان دار العلوم سے کامیاب کیا۔ شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ دار العلوم کے اساتذہ کی صحبتوں نے اس شوق کو تیز کردیا۔ نانا کے انتقال کے بعد ماموں اور خسر سید نور اللہ حسینی صاحب مرحوم تعلقدار کے ساتھ بسر ہوئی پھر پوسہ کالج بنگال میں زرعی تعلیم کے لئے بھیجے گئے وہاں سے آکر تحصیلداری کی خدمت پر فائز ہوئے اور کچھ عرصہ بعد منصف بنادئے گئے مگر قاضی صاحب کا بچپن اور شباب کچھ ایسے ماحول اور حالات میں بسر ہوا کہ اُن کی طبیعت دنیا اور اس کے جھگڑوں سے ہمیشہ متنفر ہی رہی۔ اپنی منصفی کے زمانے میں ایک شعر کہا تھا۔

کم نہیں دوزخ سے یہہ نزل کا اہتمام باغ ۔۔۔ جلد دکھلا یا الٰہی صورت طیبہ مجھے

بچپن میں یتیم ہو گئے۔ جوانی اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ زندگی گذارنے کے بہت سے ارمانوں اور آرزوں کا طوفان لیکر آئی مگر موت نے اس ہمدم باصفا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کردیا۔ قاضی صاحب کا دل اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکتا تھا دل کا یہہ درد اس طرح زبان پر آتا ہے ؎

جانتا ہوں کہ غم ہے لاحاصل ۔۔۔ مانتا ہی نہیں دل رنجور

یاد آتے ہیں رفتگانِ عدم　بھول جاتا ہوں نامِ فرح و سرور　یاد میں رفتگانِ عقبیٰ کے　پھوٹ جاتے ہیں زخم کے انگور
حیف مجھ پر کہ جب شباب آیا　ساتھ لایا مصیبتوں کا ظہور　غم یتیمی کا تھا یسیر ہوا　مہرِ ابوین سے رہا مہجور
جب نظر زندگی پہ کرتا ہوں　نظر آتا ہے غم کا ایک گنجور　کوہِ غم مجھ پہ ٹوٹ پڑتا ہے　یاد آتے ہی سعیٔ ناشکور

قاضی صاحب کی شاعری انکے درد اور دکھ کی داستان ہے انہوں نے شاعری اور زندگی دونوں کی بناء غم ہی پر رکھی ہے گئیے ہیں

وفورِ غم سے ہے مضراب سازِ طبعِ موزوں کو　نہیں احسان تیرا اے نشاطِ دلکشا مجھ پر

غرض بچپن ہی سے غم انکی زندگی کا جزو ہو کر رہ گیا تھا اور جوانی میں ایک اور ضرب ایسی پڑی کہ انکے دل کے ساز کا ہر تار بکھر گیا۔ وہ بے تاب ہو گئے اور ابھی خرد کی گتھیوں میں پھنسنے بھی نہ پائے تھے کہ اُنکا دل آوارہ اور خانماں برباد ہوتا گیا۔ آخر انہوں نے دنیا سے گھبرا کر قلندرانہ طریق اختیار کیا اور مولانا عبدالقدیر صاحب حسرتؔ جیسے اہل دل بزرگ کے دامنِ طریقت میں پناہ لی اور آج کل راہِ سلوک کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ حضرت حسرتؔ کے کلام پر بھی اس کتاب میں ایک مضمون شریک ہے۔

قاضی صاحب کی جملہ شاعری انکی زندگی کی انہی تبدیلیوں کی حقیقی ترجمان ہے انہوں نے شاعری تعریف سننے یا تعریف کرنے کیلئے نہیں کی بلکہ مصائب و مشکلات اور علائق دنیوی سے تنگ آکر اُن کے جذبات نے الفاظ کا جامہ پہنا ہے قصیدہ ہو یا غزل ہر صنف میں انہوں نے اپنی ہی بپتا سنائی ہے۔ اُنکا مخاطب خدا کی ذات ہے یا آنحضرت صلعم کسی دنیوی شخصیت سے مدد مانگنا تو کجا اسکو وہ اپنی مصیبت سنانا بھی گوارا نہیں کرتے۔ انکی زندگی اور شاعری میں جو مطابقت ہے ان کے کلام سے ظاہر ہو گی۔ اسوقت انکی ہمدم کہو رفیق کہو صرف ایک شاعری رہ گئی ہے اور اب شعر ہی سے انہوں نے دل بہلانا شروع کیا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے انہوں نے اپنی عرضداشت خدا کے حضور میں بھیجنی شروع کی اور وہ اپنے ہی خاص مخاطب کے سوا ساری دنیا کو بھولتے گئے۔ اس دور کا ایک قصیدہ ہے

مضطرب ہو گیا دلِ رنجور　ہوا مغلوب شب جو لمعۂ نور　چھائی دنیا پہ شب کی تاریکی　بن گیا ہر چراغ شعلۂ طور
منکلم ہو گر کلیم صفت　پائے واللیل شرحِ گیسوئے حور　دل پہ ایک مبتلائے بیکس کے　شبِ تاریک مار بر گنجور

شب غربت ہو اور اماس کی رات / کیوں نہ دل پر ہو میرے غم کا وفور
قلب کا اختلاج بڑھتا چلا / جتنی بڑھتی چلی شب دیجور
فکر فردا و حسرت دیروز / قلق افزا ہیں صورت ناسور

غم اور اس کا مقابلہ مجھ سے / وہ ہے شہباز اور میں عصفور / سچ تو یہ ہے حکیم حاذق بھی / ہے مقدر کے سامنے مجبور
جانتا ہوں کہ غم ہے لا حاصل / مانتا ہی نہیں دل رنجور / کوہ غم مجھ پہ ٹوٹ پڑتا ہے / یاد آتے ہی سعئ ناشکور
میں نے ملک دکن میں چھانی خاک / نہ ملا کچھ بھی جز متاع غرور / نوجوانی ہے ہمدم پیری / اب نہیں لطف زندگی و سرور
غم کا طوفان جب اٹھا دل سے / یاد آئے تعینات تنور / اشک سیل رواں بہانے لگے / نہ رہا دل کو صبر کا مقدور
جوش کھاتی ہے رحمت باری / وقت زاری بندۂ مجبور / دل خدا کی طرف رجوع رہے / پائے نقد مراد قلب حضور
شان رب کریم کے قربان / ہر جگہ جس کے فضل کا ہے ظہور / چاہتا ہے وہ جس کو رحمت سے / اپنے دامن میں کھینچتا ہے ضرور
قطع کرتا ہے ہر تعلق کو / توڑ دیتا ہے رشتہ رب غیور / تا کہ تنہا کفیل ہو اس کا / اور نہ جائے وہ پھر کسی کے حضور
غم سے اصلاح حال ہوتی ہے / غم سے ملتے ہیں رتبہ ہائے صبور / غم سے ہوتا ہے نرم دل انساں / دور ہوتا ہے سر سے کبر و غرور
شان لا تقنطوا نوید وصال / ہے بشارت دہ دل مہجور / جل کے آتش میں تیغ بنتی ہے / جوہر دست غازی منصور
ختم کر دے کلام رات گئی / ہونے والا ہے پھر سحر کا ظہور / المدد والغیاث یا منّان / آبلہ پا ہوں اور منزل دور

مَالِكَ الْمُلْكِ لَا شَرِيكَ لَهُ / أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ رَبِّ غَفُور

اس کے بعد ان کے عزیزوں نے انہیں پوسہ کالج بھیجا۔ وہاں سے آکر وہ تحصیلداری کی خدمت پر فائز ہوئے مگر ان کی دل کی وسعتوں میں دنیوی عز و جاہ کو کہیں جگہ نہ ملی اور وہ ہر وقت اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں رہے۔ اس دور کی ایک مناجات ہے ؎

اے گل گلستان حسن خیال / تا بہ کے رنج دہر سے بے ملال / جمع دولت میں تو نہ بن طامع / سنگریزوں کے واسطے حمال
ہو چکا ہے جہاں میں آوارہ / جیسے دامن کشے شوق ہیں دلال / گنج عزلت نصیب جکا ہے / کار آمد نہیں ہے قیل و قال

بے نصیبی میں خوش نصیبی ہے ہو جو اس کلیہ پر استدلال پھر نہ ہوگی کبھی تجھے حاجت دل فزا ہوگا تیرا حسن و جمال
شبِ امید ہوگی نورانی تجھے چاہیں گے شب پان کمال کام وہ کر کہ جس سے دلکو رہے لطف و راحت بغیر حزن ملال
بن نہ آتی تھی کوئی بھی تدبیر لب پہ پیدا تھے لاکھ سوال

وہ اپنے دل سے اس طرح گفتگو کر رہے تھے کہ انہیں ایک پیر طریقت کی باتیں یاد آجاتی ہیں جو انہوں نے ایک مجلس میں سنی تھیں —— اور یہیں دنیاوی مصائب و مشکلات کا عقدہ حل ہو جاتا ہے :-

اِسی اثنا میں مجھکو یاد آیا ایک جلسہ کا لطف و شرفِ مقال جسمیں تھا ہمکلام گوہر ریز پیر مرد کہن شکستہ حال
وضع رندانہ تھی قلندر تھا گرم تھی گفتگو زباں سیال دل پر نور کی ضیاء بخشی چہرۂ صاف کی تھی شاہد حال
تھا بظاہر وہ لخت گرد آلود نظر آتا تھا گو پریشاں بال پر تھے اسباب مجتمع اس کے تھا وہ تسکین دل سے مالامال
دل پہ تھا اک سکون کا عالم بیم دنیا تھی اور نہ خوفِ زوال عرض کی میں نے صاحب تسکین تجھ سے رکھتا ہوں اک ضروری سوال
مجھے بتلا کہ کیا طریقہ ہے جس سے اچھی ہو صورت احوال دل محزوں طمانیت پائے نہ رہے اضطراب بیس الحال
اب تو حالت عجیب ہے میری فکر دنیا میں ہوں پریشاں حال علم و اسباب کے تلاش میں ہوں جس سے پورا ہو فرض اہل و عیال
میں تھا جبتک کہ علم کا طالب امتحانات کا تھا ایک جنجال جب ہوئی اس سے بھی سبکدوشی دوش پر ہے تمدن ایک وبال
ہنس کے فرمایا ناظرِ قرآں فہم معنی کا رکھ ہمیشہ خیال کہہ چکا ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ذُو الْاِفْضَال

قاضی صاحب تحصیلداری ہی سے بے نیازی برت رہے تھے کہ انہیں منصف بنا دیا گیا۔ ان کی قلندر صفتی پر ایک اور تازیانہ لگا۔ وہ جتنا آزاد ہونے کی کوشش کرتے اور پھنسائے جاتے مگر آخری بار انہوں نے ایک ایسا جھٹکا مارا کہ آزاد ہو کر رہے۔ اپنی اس خوش بختی پہ یوں زمزمہ سنج ہیں ؎

بعنایات قادر اکرم ہوں نہ قاضی نہ منصفِ کھم تم شکر کرتا ہوں اُس کریم کا میں جس سے قائم ہے میرا ناز و نعم
بارے اب مائل سکون ہوا سر شوریدہ خاطر برہم چند روزہ سکوں بھی مجھکو ہے غنیمت کہ تھا بہت ہی الم
جن پہ قرباں میں جان کرتا تھا ان سے پاتا تھا رنج و سب و ستم یاد ہے وہ زمانۂ تاریک دل پہ ہے نقش بادی اظلم

نعت میں ایک اور قصیدہ ہے جس میں قافیوں کا التزام ایسی خوبی سے کیا ہے کہ اس سے قاضی صاحب کے قدرتِ کلام کا پتہ چلتا ہے۔

سمتِ مغرب سے جب صبا آئی ۔ میں ہوا مست جامِ صہبائی
للہ الحمد اب ہے پیشِ نظر ۔ صورتِ مایۂ شکیبائی

میرا محبوب ہے جو رکھتا ہے ۔ بے نظیری و شانِ یکتائی
قصۂ ہجر ہو گیا آخر ۔ رات ہم نے وصال کی پائی

تجھ پہ قربان نقدِ جاں پیہم ۔ یا ملاذی میں تیری ملجائی
تیری آنکھوں میں گو لال ہو ۔ تیرے ہونٹوں پہ ہے مسیحائی

میٹھی باتوں سے تیری کرتا ہے ۔ طوطیٔ خوش گلو شکر خائی
جانتا ہوں صدا بہ صحرا ہے ۔ گریہ و نالہ ہائے ایذائی

ہے سزاوار تجھ کو مرمٹنا ۔ تجھ کو زیبا ہے خود آرائی
فلک کج خرام کے آگے ۔ نہ تو میری رہی نہ مرزائی

مایۂ ناز بادشاہ و گدا ۔ تیری دہلیز کی جبیں سائی
خاک پا ہے ترے سواروں کی ۔ سرمۂ دیدۂ تماشائی

ہم کو حاصل کبھی تو ہو جاتا ۔ شرفِ نامہ ہائے امضائی
تھا تعشق سے تیرے دنیا میں ۔ لحنِ داؤد و نالہ طائی

میں بھی رہتا ہوں نیک بخت کہیں ۔ جیسے رہتی ہے آب برکائی
نام لیوا ترے زمانہ میں ۔ ہیں مراکو سے تا بہ شنگھائی

قبر میں اور زندگی میں رہی ۔ تیرے دشمن کو قیدِ تنہائی
للہ الحمد ہو گیا حاصل ۔ گنجِ مخفی بہ کنجِ تنہائی

نعمتِ دو جہاں ہو لا حاصل ۔ گر کریں آپ دفعِ تنہائی
کلکِ قاضی لکھے گا کیا مدحت ۔ بند ہے جب زبانِ گویائی

ان قصائد کے علاوہ قاضی صاحب کے مجموعۂ سخن میں متعدد مناجاتیں اور مختلف نعتیہ نظمیں اور سلام وغیرہ شامل ہیں۔ ہر صنفِ سخن میں انہوں نے نعت ہی کے مضامین باندھے ہیں اور یہی انکی شاعری کا اصلی محور ہے۔

قاضی صاحب نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر انداز وہی صوفیانہ اور قلندرانہ ہے ماسوائے اللہ اور اس کے رسول کے وہ کسی سے مدد کے طالب ہیں نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ ان کی خود داری ان کے ہر شعر سے آشکار ہے انتہائی جذباتی انسان ہیں، درد اور دکھ پر تڑپ اٹھتے ہیں، غم نے انہیں ایثار اور ہمدردی کا مجسمہ بنا دیا ہے، وہ اب اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے جیتے ہیں۔ اور اپنے لئے وہ اس زندگی میں وہی چاہتے ہیں جو ایک عارف و صوفی چاہتا ہے۔ یہاں انکی غزلوں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

عکس خموش باش نے ہوش میرے اڑا دئیے
کھل نہ سکیگی تا ابد میری زبانِ آرزو

حرف غلط خیال ہے شام وصال یار کا
بیٹھ دیا ہے درد نے نام و نشانِ آرزو

غم نہ رہا جہان کا ٹوٹ چکا ہے بندِ غم
بہہ گیا میری آنکھ سے سیل روانِ آرزو

ایک صنمکدہ ہو بہو مجھ میں ہے نقشِ کائنات
میری بلا اٹھائے گی نازبتانِ آرزو

وہم و بود و زندگی نابود ہونا چاہئیے
طالب مولا کو بے مقصود ہونا چاہئیے

اس شہادت گاہ میں اہل فنا کیواسطے
اتّصال شاہد و مشہود ہونا چاہئیے

محرمئی راز الفت کے لئے انسان کو
پردہ دار ساجد و مسجود ہونا چاہئیے

دل لگانا ماسوا سے کام ہے بدراہ کا
عبد کو وابستۂ معبود ہونا چاہئیے

ہے فنا آباد دنیا مٹنے والوں کے لئے
فارغ از فکر زیان و سود ہونا چاہئیے

زندگی کیسی بھی گذری غم نہیں لیکن منیر
صرف اپنی عاقبت محمود ہونا چاہئیے

راگ گاتا ہے نغمہ خواں کوئی
یاد آتا ہے گلستاں کوئی

میرا چاہا ہوا ہے میرا غم
بے طلب کب ہے مہماں کوئی

ہے دماغ انکا عرش اعلیٰ پر
وہ بنائینگے آسماں کوئی

نہوئی دلپسند و خوش آیند
آپ بیتی سی داستاں کوئی

ایک خادم ہے سینکڑوں مخدوم
کھائے چکر کہاں کہاں کوئی
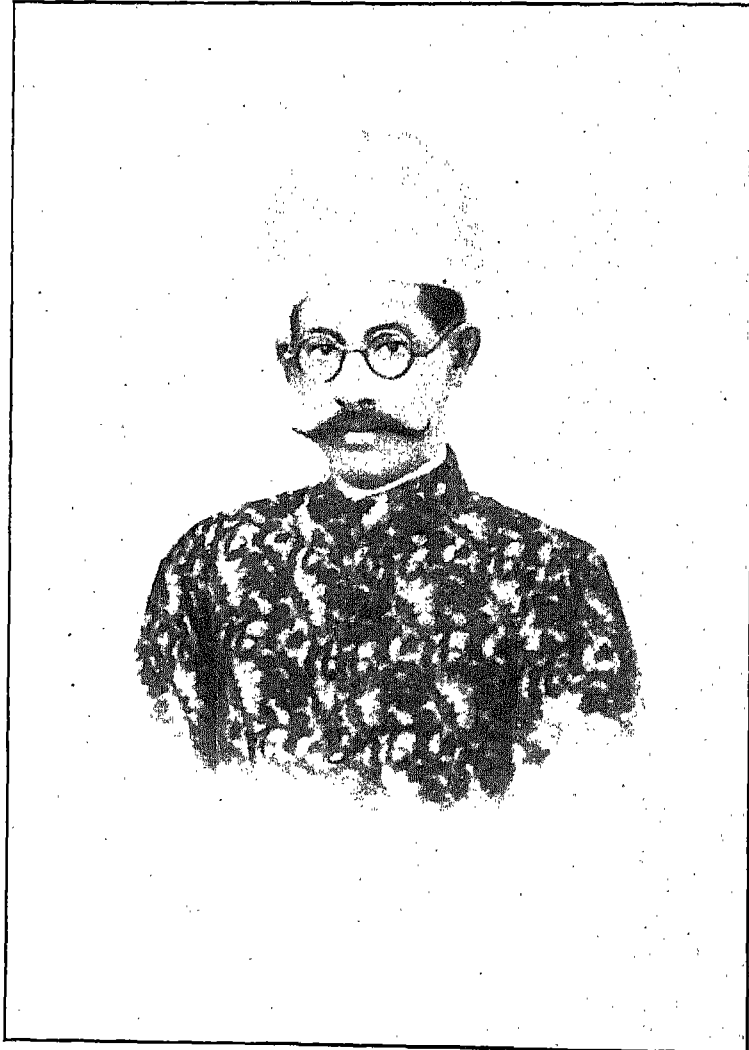
راجہ محبوب راج محبوب

محبوب

راجہ محبوب راج

۱۳۱۲ھ تا ۱۳۵۰ھ

از مہندر راج صاحب سکسینہ ام اس سی

رائے محبوب راج محبوب۔ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت کے سب سے چھوٹے فرزند اور راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی کے حقیقی بھائی ہیں۔ ان دونوں کا تذکرہ مرقع سخن میں شامل ہے۔ جس خاندان میں محبوب پیدا ہوئے اوس کو ابتدا سے خانوادہ آصفی کے مورد الطاف وعنایات رہنے کا امتیاز حاصل ہے۔ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقی نہ صرف مناصب جلیلہ پر تا دم مرگ سرفراز رہے بلکہ اونکا شمار اون خوش نصیب امراء ریاست سے ہوتا تھا جن کو اپنے مالک مجازی کے مراحم خاص اور اعتماد کلی کا طرہ فخر حاصل تھا چنانچہ ۱۳۱۲ھ میں جب محبوب تولد ہوئے تو حضرت غفران مکان کے ایما پر ہی اونکا نام محبوب راج رکھا گیا اور اسکے ایک سال بعد بھی ۱۳۱۳ھ میں جب شاہی سواری نہضت افروز کاشانہ باقی ہوئی تو بادشاہ نے بکمال الطاف خسروانہ محبوب راج کو گود میں اٹھالیا اور شفقت آمیز کلمات سے خاندان باقی کی عزت افزائی فرمائی

محبوب کی زندگی کا ابتدائی زمانہ نہایت ہی افسردگی میں بسر ہوا ابھی مشکل سے چار سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت بڑے بھائی راجہ نرسنگھ راج بہادر کی عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ مشکل سے ساتویں آٹھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ چنانچہ اسٹیٹ کے انصرام کاروبار کے لئے چند عزیزوں کو مقرر کیا گیا تھا انہوں نے دیانت اور وفاداری کو پیش نظر نہیں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انتظامات میں ابتریاں بڑھتی گئیں اور معاملات برابر الجھتے گئے نوبت بانیجا رسید کہ پیشگاہ خسروی سے اس قدیم خاندان کے مفاد کی خاطر اسٹیٹ کو کورٹ آف وارڈز میں خاص مبارک کی

نگرانی خاص میں لے لینے کا حکم صادر فرمایا گیا اس انتشار اور ابتری کے زمانے میں ان دونوں کمسن لڑکوں کی تعلیم و تربیت کا گراں بار رانی محبوب نواز ونت کے کندھوں پر پڑا۔ اور انہیں کے سایۂ شفقت میں دونوں نے وہ تربیت حاصل کی اور قابلیت کے وہ جوہر پیدا کئے کہ آئندہ جب اسٹیٹ واگذاشت ہوا تو کاروبار خانگی اور خدمات سرکاری کی بجا آوری کیلئے کسی غیر کی امداد کی قطعاً احتیاج نہ رہی اور اس طرح خزاں رسیدہ گلشن باقی اجڑتے ہوئے پھر سے شاداب ہوگیا

محبوب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ حیدرآباد میں ہوئی اور یہیں انہوں نے بڑے بھائی کے دوش بدوش

ثانوی تعلیم ختم کی وہ بچپن ہی سے ذہین و طباع تھے اسی لئے بہت جلد اپنے اساتذہ اور ہم مکتبوں میں ہر دلعزیز ہوگئے۔

ثانوی تعلیم ختم ہوئی تو دونوں بھائیوں نے پنجاب میٹرک کا ارادہ کیا اور اس امتحان کیلئے خانگی طور پر ایک قابل اتالیق کے زیر نگرانی تیاری شروع کردی اس زمانہ میں جامعہ پنجاب کے امتحانوں کا ایک مرکز شہر دہلی بھی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں جب دونوں نے شمالی ہند کا سفر کیا تو ملک کے کئی مشہور مقامات اور زیارت گاہیں دیکھ لیں شاید اسی ابتدائی سفر نے محبوب کے نوعمر قلب پر بہت گہرا اثر کیا اسی لئے کہ وہ آخر وقت تک سفر و سیاحت کے دلدادہ رہے۔ اور آئندہ انہوں نے اپنی زندگی میں اس بات کا خاص التزام رکھا کہ سال میں کچھ دن ملک کے مشہور مقامات کی سیاحت کیلئے ضرور نکال لئے جائیں چنانچہ جب الہ آباد کی مشہور نمائش منعقد ہوئی تو حیدرآباد کے اون معدودے چند نشرکا میں محبوب راج بھی ایک تھے جنکا یہہ ایقان تھا کہ ملکی صنعتوں کے فروغ اور ترقی کیلئے بیرونی صنعتوں کے مطالعہ اور واقفیت کی سخت ضرورت ہے

محبوب کو ابتداء سے ہی قوم کی زبوں حالی کا بیحد خیال تھا برادری میں صنعتی تعلیم کا فقدان تھا اور بلدہ کے اکثر کائستھ جو بعض نہایت ہی معزز اور قدیم گھرانوں کے نام لیوا تھے کسب معاش کیلئے صنعت و حرفت کو روایات خاندانی کے خلاف سمجھنے لگے تھے۔ اسکا فطری نتیجہ یہہ ہوا کہ قوم کی قابلیتیں مجبوراً چھوٹی بڑی ملازمتوں میں الجھ کر تباہ و برباد ہونے لگیں اور برادری میں افلاس و نکبت کا اضافہ ہوتا گیا محبوب جو اپنے سینہ میں ایک دردمند دل رکھتے تھے ہم قوموں کی یہہ حالت زار نہ دیکھ سکے اونہوں نے نوجوانوں میں صنعتی تعلیم کا رجحان بڑھانے اور تجارت اور بیوپار کا خیال پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے ایسی ایسی موثر تدبیریں نکالیں کہ طبیعت ذہین محبوب کی تیزی و رسائی کی

فطرتاً قائل ہو جاتی ہے ۔

ملک میں رہنماؤں کی کمی نہیں ہے لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ بہت کم لوگ انکی نصیحتوں پر کان دھرتے ہیں۔ ہمارے اسٹیج کی بیشتر چیخ پکار صدا بصحرا بنکر رہجاتی ہے۔ اسکی وجہہ ظاہر ہے۔ یہہ ہے کہ ہمارے لیڈروں کی پبلک اور خانگی زندگیوں میں زمین آسمان کا بُعد ہوتا ہے۔ عوام کو جن باتوں کی وہ تلقین کرتے ہیں ان پر وہ خود عمل کرنا نہیں چاہتے۔ انکی نصیحت اور مشورہ دوسروں کے لئے ہوتا ہے۔ وہ خود اپنی ذات کو ان علائق سے مستثنے سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ ایسے ہادی اپنے قول اور فعل میں ہم آہنگ نہیں اسلئے لوگ بھی انکی باتوں پر کوئی توجہہ نہیں کرتے۔ محبوب اس نکتہ سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ اس کام کی ابتداء میں انہوں نے اغیار کے طعن و تشنیع کی پرواہ کی اور نہ سوسائٹی کے رواج پر دھیان دیا اور سب سے پہلے اس راہ میں خود اپنا قدم بڑھایا حیدرآباد سے قریب اپنے مقطعہ توپرہ منسان پلی میں انہوں نے چھوٹے سے پیمانہ پر زراعت شروع کی اور کچھ ہی عرصہ میں شاقّہ محنت اور فطری رجحان کی بدولت یہہ ثابت کردیا کہ اگر نونہالانِ ملک ہمت بلند کے ساتھ اس جانب رجوع ہوں تو یہہ منزل جو بظاہر نہایت ہی کٹھن معلوم ہوتی ہے اتنی دشوار گذار نہیں۔ بلکہ ملک کی معاشی پستی کیلئے زراعت ہی دراصل ذریعہ نجات ہے مگر ناگزیر حالات سے مجبور ہو کر جب وہ زراعت کے ترک کرنے پر مائل ہو گئے تو انہوں نے اسکی تلافی اسطرح کردی کہ گھر آتے ہی اپنے ذاتی صرفہ سے ایک کارخانہ پارچہ بافی قائم کردیا جسکا نام کارخانہ صنایع دکن رکھا دور دور اضلاع سے ہوشیار کاریگر بلوائے۔ اپنے احباب کو متوجہ کیا اور ایسے مفید طریقے نکالے کہ بہت جلد اس کارخانہ کو خاطرخواہ فروغ حاصل ہو گیا۔ چونکہ کارخانہ صنایع دکن کے تمام امور راست محبوب کے زیر نگرانی تھے اسلئے یہاں وہ سخت پابندی کیساتھ روزانہ جملہ انتظامات خود کرتے تھے۔ یہیں انہوں نے صنعت پارچہ بافی میں طرح طرح کی نئی ایجادیں کیں اور اقسام کے خوب صورت نمونے وضع کئے۔

محبوب شاید سب سے پہلے اہل ذوق ہیں جنھوں نے حیدرآباد میں ایک نمایش مصنوعات ملکی کی بنیاد ڈالی۔ جاترا کیتوگری کے موقعہ پر ایک نمایش مصنوعات اپنی ذاتی نگرانی میں منعقد کی۔ اور اسمیں کارخانہ صنایع دکن کی بیشتر مصنوعات رکھیں۔ نیز دور دور سے صنعت کے بہتر نمونے بغرض نمایش منگوائے۔ بلدہ کے بہت سے معزز عہدہ دار اور شرفا کو

اس تقریب میں مدعو کیا۔ اور اپنی خوش سلیقگی کی خوب خوب داد لی۔ اس نمائش نے محبوب کی خداداد قابلیت اور قوت انتظام کے جوہروں کو چمکا دیا۔ چنانچہ اسکے کچھ عرصہ بعد جانتر ائے الوال کے موقعہ پر مہاراج سرکشن پرشاد بہادر نے بھی ایک نمائش مصنوعات مقرر کی تو نمائش کی تمام اہم ذمہ داریاں محبوب کے تفویض ہوئیں۔ اس موقعہ پر بھی محبوب نے مسلسل کوششوں اور ذاتی قابلیت سے نمائش کو غیر معمولی کامیاب بنایا اس سلسلہ میں امراء حیدرآباد کے علاوہ نہ صرف یورپین عہدہ داران سکندرآباد نے اونکے حسنِ انتظام کی تعریف کی بلکہ خود حضرت جہاں پناہی نے محبوب کے کام پر اظہار خوشنودی فرمایا صنعت و تجارت کیجانب محبوب کے اس غیر معمولی میلان کی شائد ایک یہ بھی وجہہ ہو کہ اونہیں ملازمت سے دلی نفرت تھی وہ فطرت سے ایک آزاد دماغ لیکر آئے تھے اور آزاد رہنا ہی پسند کرتے تھے طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی تھی اسلئے کسی کی بیجا خوشامد یا جی ہاں سے کوسوں بھاگتے تھے۔ عموماً نوکری کیلئے انسان کو اِن تمام جذبات کا ایثار کرنا ہوتا ہے۔ ماتحتی کا غلامانہ احساس ملازمت کا لازمی نتیجہ ہے خوشامد پسند حاکموں کی چاپلوسی اور بیجا تعریف ترقی کا اصلی سبب ہوتی ہے لیکن محبوب کو ہمیشہ ایسی زندگی سے اجتناب رہا بارہا اونکے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے اونکی طبیعت کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے کہتے ہیں ؎

عجب غیور طبیعت ہے تیری اے محبوب کسی کی تجھکو خوشامد ذرا نہیں آتی

یہی وجہہ ہوئی کہ محبوب احباب کی مسلسل کوششوں کے باوجود حصول ملازمت پر راضی نہ ہوتے کرم فرماؤں نے بہتیرا زور لگایا۔ عزیزوں نے بھی اپنی حد تک سمجھایا۔ مگر اونکی ایک نہیں چلی کہ برابر قائم رہی۔ حساس طبیعت بار ماتحتی کی حامل نہ ہوتی تھی اور آزاد قلب قید و بند کے تصور سے ہی گبھراتا تھا لیکن سوسائٹی کے قوانین بھی عجیب طرح کے ہیں کہ یہاں کے کاروبار میں ذاتی رجحان اور فطری مذاق کو کوئی دخل نہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو مجبوراً ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جو اوسکی منشاء و مزاج کے بالکل ضد ہیں۔ محبوب کی آزاد مزاجی بھی اونہیں حالات کا شکار ہوگئی۔ چنانچہ اونہوں نے اپنے بزرگ بھائی کے بیحد اصرار پر ۱۶ ارادی بہشت ۱۳۲۳ف میں اولاً باب حکومت اور پھر ۴ ارادی بہشت ۱۳۲۸ف میں سررشتہ کروڑگری میں ملازمت اختیار کرلی اور یہیں اونہوں نے مشکل سے دو سال گذارے تھے کہ پیام اجل نے اونکو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے علائق دنیوی سے پاک کر دیا دوران ملازمت میں بھی باتحتین اور عملہ سے ایسا شریفانہ اور اچھا برتاؤ کیا کہ چھوٹے بڑے سب گرویدہ ہوگئے اور فرائض سرکاری میں ایسی مستعدی اور ہوشیار باشی دکھلائی کہ حکام بالادست کی نظروں میں خاص وقار پیدا کرلیا۔

علاوہ ازیں محبوب اپنی آبائی خدمات کے سلسلہ میں سررشتہ دار جمعیت صرفخاص مبارک سررشتہ دار پیشکار اختشام قلعہ ظفر گڑھ ورنگل اور منصبدار تھے اونہیں اپنے بادشاہ ذیجاہ سے کمال عقیدت تھی چنانچہ اونکے کلام میں جابجا اس جذبہ بادشاہ پرستی کا اشارہ ملتا ہے۔

محبوب بہ حکمت بہ سیاست بہ فضیلت　　　زیباستہ عثمان علیخاں کے لئے ہے

قدرت سے محبوب ایک دردمند دل لائے تھے۔ قوم کی حالت زبوں انہیں مضطرب کردیتی۔ اور کاسیتوں کی روزافزوں تباہی سے وہ سخت متفکر ہو جاتے تاریخ آصفی میں اپنی روایاتی وفاشعاری اور قابلیت کی وجہہ سے کاسیتوں نے بہت نمایاں جگہ پائی تھی۔ چنانچہ جب حضرت آصفجاہ اوّل نے دکن کا رخ کیا تو اس برگزیدہ اور مردم شناس شخصیت کے ہمرکاب چند ایسے کالیستہ بھی آئے جو اپنی انتظامی سیول اور فوجی قابلیتوں کی وجہہ سے ممتاز تھے۔ ان پر آصفجاہ اوّل کو بڑا اعتماد تھا۔ اسی لئے ریاست کی اہم اور نازک خدمات اونکے سپرد کیں اور جاگیر و مناصب سے اونہیں سرفراز کیا اسکا نتیجہ یہہ ہوا کے ان لوگوں نے ملک و مالک کی خدمت میں جان لڑا دی۔ اور ہر موقعہ خاندان آصفی کی خیرسگالی کو عین سعادت سمجھا۔ ان لوگوں میں اکثر بلحاظ امارت و قابلیت خاصے ممتاز تھے اور شہر کے بڑے بڑے امیروں میں اونکا شمار تھا۔ لیکن کچھ دنوں سے اس قوم کی حالت کچھ ایسی دگرگوں ہونے لگی تھی کہ کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتی تھی افلاس اور نکبت کا گھن اوسے اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا اور اکثر معزز خاندان قرض کی تباہ کاریوں کے شکار ہونے لگے تھے۔ بہتوں نے اس کشتی کو گرداب سے بچانے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن کسی سے کچھ نہ ہوا۔ بلکہ آخر آخر تو یہہ کیفیت ہوئی کے کاسیتوں کو اپنی وضع سنبھالنی مشکل ہوگئی۔

محبوب نے بھی اس گرتی ہوئی عمارت کی ترمیم و تعمیر پر کمر ہمت باندھی اور بہت جلد اونکی تدبیریں بارآور ہونے لگیں۔ چنانچہ جب وہ کالیستہ سبھا حیدرآباد کے معتمد منتخب ہوئے تو اونکی خلوص نیت نے لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر بنالیا۔ یہاں اونہوں نے کئی اصلاحیں کیں اور اونکی ہمیشہ یہہ کوشش رہی کہ پرانی رسموں اور قدیم بدعتوں کا یک لخت استیصال کردیا جائے اس مقصد کو پیش نظر رکھکر اونہوں نے کالیستہ سبھا کو فروغ دیا اور قوم میں اتحاد اور اتفاق کو بڑھایا وہ ایک عرصہ تک مدرسہ کالیستہ پاٹشالہ کے بورڈ کے بھی رکن رہے۔ اور اس مدرسہ کے کاموں میں اونہیں اتنی دلچسپی رہی کہ

بعض دفعہ کسی استاد کی غیر موجودگی میں خود پڑھانے چلے جایا کرتے مزید براں وہ انجمن اتحاد باہمی کالستھ منصبداران کی مجلس انتظامی کے رکن تھے۔

محبوب کی زندگی کا سب سے روشن ترین پہلو وہ قابل تقلید جذبہ اخلاص و محبت ہے جو انہیں اپنے بزرگوں سے تادم زیست رہا اپنی والدہ محترمہ کی خدمت کو وہ سعادت دارین سمجھتے تھے اور آخر وقت تک اونھوں نے اسمیں کبھی کوتاہی یا کاہلی نہیں برتی۔ بڑے بھائی راجہ نرسنگھ راج عالی کی تعظیم و احترام کا بہت خیال تھا اور ان سے بیحد محبت کرتے تھے جس دور نفسا نفسی سے ہم گذر رہے ہیں اسمیں بھائیوں کی ایسی محبت بہت کم پائی ہے بلکہ شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں ہوں گی جہاں محبوب کی طرح ایک بھائی نے نہ صرف دوسرے بھائی کے رنج و مسرت میں برابر کا ساتھ دیا بلکہ اپنی تمام زندگی برادر بزرگ کی خدمت میں گذار دی ہو۔

محبوب کو اپنے اسلاف پر بجا ناز تھا اور اکثر انکے کارنامے اپنی اولاد کے آگے فخریہ بیان کرتے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں ان مثالوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اونکے اکثر اشعار ان جذبات سے مملو ہیں ؎

محبوب جس قدر بھی کرو ناز ہے بجا ۔ تم اونکی یادگار ہو جو نام کر گئے

علاوہ ازیں اونہیں بزرگان دین اور فقرا سے خاص عقیدت تھی اور انکی اطاعت اور خدمت کو باعث برکات دینی و دنیوی سمجھتے رہے۔ حضرت صوفی شاد کی فقیرانہ صحبت نے اس رنگ کو اور گہرا کر دیا تھا چنانچہ اونکے بعض سلام اور مختصر قصائد جو بیشتر خلد آرامیدہ بزرگوں کی شان میں لکھے گئے ہیں محبوب کی عقیدت دلی کے آئینہ دار ہیں۔

مہاراجہ صدر اعظم سرکشن پرشاد بہادر سے محبوب کو نہ صرف خلوص تھا بلکہ ایک قسم کی قلبی محبت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ دن اور رات کا بیشتر حصہ شاد کی قربت میں گذرتا خود مہاراجہ کو اون سے ایسا انس ہو گیا تھا کہ عموماً محبوب کو پاس سے ہٹنے نہ دیتے تھے۔

خوش مذاقی اور خوش طبعی محبوب کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور مزاج میں ایسی ظرافت تھی کہ ہر اپنا پرایا اونکے لطف صحبت سے گھنٹوں محظوظ ہوتا رہتا۔ طبیعت میں شوخی اتنی اور چھٹول اس قدر تھا کہ اپنے سے کم عمر اور

رشتہ داروں سے بھی بے تکلف ہو جاتے اور مذاق بھی اتنا شستہ کہ کسی کے جی پر نہیں ہوتا تھا۔ حضرت شاد کی صحبتیں اُنکی شوخ کلامیوں سے گرم رہتیں اور حلقۂ احباب اُنکی بذلہ سنجیوں سے زندہ ہو جاتا۔

طبیعت نہایت شگفتہ اور سادہ پائی تھی چنانچہ ہمیں اُنکی پیشانی پر شکن دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا اور نہ کبھی بیجا غصہ کرتے ہوئے اُنہیں دیکھا۔ جب کبھی کسی سے بات کرتے تو ایک عجیب مسکراہٹ لبوں پر کھیلتی رہتی بہت چھوٹے چھوٹے جملوں میں نہایت صاف گفتگو کرتے اور تلخ کلامی سے عموماً احتراز ہوتا۔

محبوب کا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا ایک مختصر سی علالت کے بعد جسمیں کسی کو شان گمان بھی نہ تھا کہ یہہ مرض الموت ہوگا العارضہ نمونیہ ۱۴ آبان ۱۳۴۵ف صبح صبح اُنہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دنیا سے بکمال سکون رخصت ہوگئے۔ اس سانحہ شدید کی خبر جب لوگوں نے سُنی تو سماعت پر یقین نہ آیا۔ محبوب کی جوان مرگی کا ایک کہرام تھا جو گھر اور باہر ہر شخص کی زبان پر تھا۔ اور اُنکی میت پر ایک ہجوم تھا جو آخری منزل تک برابر بڑھتا گیا محبوب کے انتقال پر جو نوحے اُنکے بڑے بھائی راجہ نرسنگھ راج نے لکھے ہیں وہ ایک کتابی صورت میں طبع ہوئے ہیں اور اُنمیں جن جذبات الم انگیز کا اظہار ہوا وہ بیان سے باہر ہے

یہہ ایک داستان ہے جس کو ایک بھائی نے اپنے عزیز اور چہیتے برادر کی بے وقت موت پر خون دل سے لکھا ہے اور اس میں مرحوم کی مختصر سی سوانح کے ساتھ وہ نظمیں اور تاریخیں بھی درج ہیں جو محبوب کے کرم فرماؤں اور عزیز و احباب نے کہی ہیں اُن میں نواب فصاحت جنگ اور سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کی تاریخیں قابل ذکر ہیں۔

استاد جلیل کی تاریخ منظوم ہے اور اس مصرعہ تاریخ سے وفات کا سنہ نکلتا ہے۔

کہ آج دل غم محبوب سے ہوا بسمل

۱۳۵۰ف

حضرت شاد مدظلہ کی تاریخ بھی منظوم ہے اور مندرجہ ذیل مصرعہ سے سال وفات نکلتا ہے۔

دیا آپ نے داغ محبوب راجہ

۱۳

محبوب نہایت خوش نصیب تھے کہ اُنہیں اپنی زندگی میں اولاد کا کوئی غم نہوا اُنکے کُل نو اولاد ہوئے جن میں ذکور سے گردھر راج سب سے بڑے ہیں اور اُنھوں نے جامعہ عثمانیہ سے اسی سال بی۔ اے کامیاب کیا ہے۔

کلام محبوب کو مذاق سخن ورثہ میں ملا تھا اور وہ خود بھی ایک فطری شاعر تھے اٹھارہ انیس سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے گو ابتداء میں یہہ شغل محض شوق کی حد تک ہی رہا اور کوئی باضابطہ مشق شروع نہیں کی لیکن مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی فیض اثر صحبتوں نے اونکے طبعی جوہر کو چمکا دیا۔ چنانچہ ابتداء اونہیں حضرت شادؔ ہی سے تلمذ حاصل تھا مگر بعد میں مہاراجہ موصوف ہی کے حسب ہدایت نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ کو اپنا کلام دکھلانے لگے۔

حیدرآباد میں مہاراجہ چندولال کے خاندان نے جو احسانات زبان اردو پر کئے ہیں وہ ہمیشہ یادگار رہینگے۔ اوس زمانہ میں جب شمالی ہند میں عام طور پر انتشار و اضطراب پھیلا ہوا تھا دکن میں شاداںؔ کی فیاضیوں سے اردو خوب پھل پھول رہی تھی۔ اس علم دوست ہستی نے اپنی قدر دانیوں سے شمال کے کئی بلند پایہ شعراء اردو کو اپنے گرد جمع کر لیا اور شعر و سخن کی وہ محفلیں آراستہ کیں کہ دکن شمع ادب کی ضیاء پاشیوں سے منور ہوگیا۔ مہاراجہ چندولال کے بعد اونکا خاندان زبان کی وسعت و آرائش میں برابر منہمک رہا اور ملک و بیرون ملک کے اکثر بڑے بڑے شاعر و ادیب اسی چشمہ سے فیضیاب ہوتے رہے چنانچہ اس گھرانے کے چشم و چراغ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی سرفرازیوں نے دکن میں وہ ادبی صحبتیں پیدا کردیں جنکی مثال کہیں اور نہیں ملتی شادؔ کی قدر افزائیوں نے نہ صرف دور و نزدیک سے صاحبان علم و فضل کو اپنے اطراف جمع کر لیا بلکہ اونکی ایسی سرپرستی کی کہ فکر معاش سے بالکل بے نیاز ہوکر ان لوگوں نے اپنی ساری قوتیں زبان کے سنوارنے میں صرف کردیں چنانچہ اب بھی قصر شادؔ میں ماہانہ مشاعرہ اور شعر و سخن کی محفلیں اوسی طرح منعقد ہوتی ہیں جیسے آج سے بیس پچیس سال قبل جاری تھیں اور ان میں تقریباً تمام نامور شعراء کے علاوہ خود شادؔ بہ نفس نفیس شریک ہوتے ہیں۔

محبوب بھی ان علمی جلسوں میں برابر شریک ہوتے اور ہر مشاعرہ میں نہایت پابندی سے غزل پڑھتے۔ ان صحبتوں نے اونکے مذاق پر بہت گہرا اثر کیا چنانچہ وہ خود اپنے مخصوص لہجہ میں اسکا اعتراف کرتے ہیں ؎

بات کرنے کا نہ تھا تجھکو سلیقہ محبوبؔ — صحبت شادؔ سے تو اب تو سخنداں نکلا

محبوبؔ نے زبان نہایت سادہ پائی ہے۔ وہ پیچیدہ بندشوں اور دور فہم ترکیبوں سے بالکل اجتناب کرتے ہیں کلام میں شوخی اور طرز بیان نہایت سلیس ہے مطلب کے بیان کرنے میں تکلفات سے کام نہیں لیتے اپنا منشاء دلی نہایت خوش اسلوبی

سے بیان کر جاتے ہیں اور جو بات کہتے ہیں صاف صاف چنانچہ محبوب کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت سادگی ہے۔ یہی وجہہ ہے کہ اُون کی زبان میں اثر اور بیان میں صداقت پائی جاتی ہے۔

گلے مل لو کر سوزِ غم کے ہاتوں   چراغِ زندگی بس دو گھڑی ہے   آنکھیں نہیں اشکبار غم سے   ساون بھادوں کی یہہ جھڑی ہے
قدم کیونکر اٹھیں کوچہ سے تیرے   یہاں تو حسن کی دولت گڑی ہے   اس بزم میں کون کسکو پوچھے   مطلب کی ہر ایک کو پڑی ہے
سنبھالو میکشو اب شیشہ و جام   گھٹا چھائی ہے ساون کی جھڑی ہے   اٹھ اٹھ کہیں شاد صدر اعظم   قسمت سوتی کہاں پڑی ہے

اپنے اعمال کی خرابی کو   ہم نے گردن جھکا کے دیکھ لیا

بیقراری کا گلہ سنکے وہ فرماتے ہیں   دل جو قابو سے ہوا باہر اُوسے روکا کرنا

سمجھ کے دل کو لگانا کسی حسیں سے تم   نہ مول بیٹھے بٹھائے یہہ درد سر لینا

محبوب یہہ سودا وہ نہیں ہے جو بلے صنعت   دل نذر کرے پہلے طلبگار محبت

بیزار ہیں خدا کی قسم زندگی سے ہم   جی کر جہاں میں کیا کریں اس بیکسی سے ہم

چلو اچھا ہوا جو کچھ ہوا ہونا تھا ہو گذرا   نہ چھیڑو ہجر کا قصہ نہ کھلواؤ زباں میری

کیا خاک ہو لطف زندگی کا   چسکا نہ ہو حسن کو عاشقی کا

بہار آئی ہے جیب سے نہر سینوں کی یہہ حالت ہے   پڑی ہے جان شیشہ میں لگی ہے آنکھ ساغر سے

دل جگر سامنے ہے تیغ ادا کے صدقہ   ایک ہی وار میں دونوں کا صفایا ہو جائے

آفت ہیں ادائیں فتنہ گر کی   کچھ خبر نہیں دل و جگر کی   لطف شب وصل کیا اٹھائیں   دہشت ہے لگی ہوئی سحر کی
تھا عشق کا مرحلہ نہ آساں   سر دے کے یہہ ہم نے سر کی   اللہ رے درازی شب ہجر   ملتی ہی نہیں خبر سحر کی

مضمون اور خیال کی بھی محبوب کے یہاں کمی نہیں بعض شعر تو ایسے نکالے ہیں کہ زبان کے ساتھ شاعر کی جدت طبع اور اُپج نے شعر کو آسمان سے ملا دیا ہے کلام میں وہ بلند پروازیاں دکھلائی ہیں کہ ذہن شاعر کی طبیعت کی رسائی پر بے اختیار وجد کرنے لگتا ہے چند شعر مضمون و شوخی بیان کے لحاظ سے درج کئے جاتے ہیں :-

محبوب کی نظروں میں ہے اک خواب سی دنیا — اس مرد خدا کو تو ہے کچھ مد نظر اور

یہاں اک ایک داغ دل میں ہے سوزش قیامت کی — نہیں کیا خوف ہوگا تابش خورشید محشر سے

میری ہستی کا بھی محبوب ہے کچھ حد و حساب — ابتدا کچھ بھی نہیں اور انتہا کچھ بھی نہیں

جاں بلب شوخ شہادت میں تھے ہم — تیغ قاتل کی مسیحا ہوگئی

توڑ کر تو اسے سمجھا کہ گیا آمت ادا — دل مرا آبلہ ہے خوشہ انگور نہیں

خواب میں آتے ہو پھرتے ہو نگاہ شوق میں — کیسا پردہ ہے کہ چھپتے ہو نکلکر سامنے

ڈھونڈا سارا جہاں مگر تجھکو — دل کا پردہ اٹھا کے دیکھ لیا — نہیں بوئے وفا کسی گل میں — ہر گلستاں میں جا کے دیکھ لیا

جگا کر مجھے سخت سویا کیا — شب غم تصور میں رویا کیا — دور روزہ حسن اور فکر دو عالم سخت مشکل — ادھر دنیا ادھر عقبی کریں ہم جہاں کہاں کیا

ستم کا دیکھکر انداز ہوتی ہے خوشی ہم کو — کہ ہم بھی چاہنے والوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں

مہندی میں رنگ مہ میں ضیا گل میں بو نہ ہو — پر ہے مجال دل ہو کوئی آرزو نہ ہو

سینہ پہ ہاتھ رکھ کے وہ کہتے ہیں مجھ سے یوں — جس درد کی تڑپ تھی بتا تو کہاں ہے اب

کوچہ عشق میں محبوب نے رکھا ہے قدم — بے خودی دیکھ کہیں اسکو نہ رسوا کرنا

ہے وصل یار میں محبوب بد ہوش — نہیں ہے کچھ اوسے اپنی خبر آج

مرض عشق میں نوبت یہہ ہوئی ہے اب تو — خوف آتا ہے مجھے دیکھ کے صورت اپنی

محبوب کے کلام میں حسن و عشق کے پُرگرم چرچوں کے ساتھ فلسفیانہ و صوفیانہ مضامین اور عارفانہ پند و موعظت کے بھی دفتر ہیں جن سے شاعر کی اصلی طبیعت اور مزاج کا پتہ چلتا ہے

جس پہ مرتے تھے اوسی سے اے محبوب — اپنی ہستی مٹا کے دیکھ لیا — ملے گا ثمر تب اسکو کہاں — جو تخم بدی روز بویا کیا

کیا کام دنیا و دیں کا نہ کچھ — عبث عمر محبوب کھویا کیا — محبوب راہ حق سے نہ ہٹنا کہ سخت ہے — دشواریاں ہجوم ہوں تو ہمت کیا کرو

جو وقت گذر رہے غنیمت ہے کیا خبر کل کی — جو کام کل تجھے کرنا ہو آج کر لینا

حسن اعمال سے اخلاق کریم سے محبوب یاد آتا ہے بشر بعد فنا یاد رہے جو کام کرتا ہے اہل جہاں نہیں کرتے لگاہ جا عمر رواں نہیں کرتے

جو با خبر ہیں زمانہ سے عاقبت بیں نہیں — کبھی وہ عمر کو یوں رائیگاں نہیں کرتے

سر استر جہل ہے آفت سے گر انسان پریشاں ہو — اوسے کیا فکر ہو جسکا الٰہی تو نگہباں ہو

اجل ٹالے نہیں ٹلتی جہاں مجبور ہے انساں — مسیحائے زماں ہو یا ارسطو ہو کہ لقماں ہو

زباں پر آگئی حق بات اے محبوب کیا کہنا — خدا اوسکی مدد کرتا ہے جو ہمدرد انساں ہو

نظر جو کرتے ہیں اعمال پر ہم اے محبوب — خراب سب سے ہیں تجھ کو کوئی خراب نہ تھا

کیا دیر و حرم میں پائیگا وہ — جس کو نہ خبر ہو اپنے گھر کی

اونکے یہاں ہر عبادت و طاعت میں خلوص قلب اور صداقت نیت ضروری ہے اور یہی اختصاراً روح مذہب بھی ہے

ہزار سال کی طاعت سے ہے کہیں بہتر — خلوص دل سے اگر سجدہ ایک بار کیا

ہر ایک چیز اوسی کے ہے نور سے روشن — غلط ہے قول کہ ذرہ میں آفتاب نہ تھا

چنانچہ اسی بنا پر وہ اختلاف شیخ و برہمن اور امتیاز کفر و دین میں کوئی وجہ نہیں پاتے کہتے ہیں ہے

قید یہہ مذہب و ملت کی عبث ہے اے شیخ — حق پہ ایمان جو لائیگا مسلماں ہوگا

اس امر سے اعتراف کرنا ہوگا کہ محبوب کے متاع سخن میں مشکل اور ٹیڑھی زمینیں کم یاب ہیں شاید اوسکی وجہہ یہہ بھی ہو کہ وہ فطرتاً دقت پسند واقع نہ ہوے تھے اسی لئے اونھوں نے سنگلاخ زمینوں میں بہت کم طبع آزمائی کی ہے لیکن جہاں کہیں بھی وہ اس میدان میں اترآئے ہیں انھوں نے اپنی پختہ مشقی اور قوت بیان کا ثبوت دیا ہے ذیل میں جو اشعار لکھے جاتے ہیں اونکے دیکھنے سے یہہ پتہ چلتا ہے کہ محبوب کو کلام پر کتنی قدرت حاصل تھی :-

حسرت و ارماں ہیں پہلو میں مرے دل کے قریب — جسطرح چلتے ہوئے ناوک ہوں بسمل کے قریب

اشتیاق دید سے دریا کا طوفاں بڑھ گیا — کشتی امید جا پہونچی جو ساحل کے قریب

سینکڑوں تیری جفائیں سینکڑوں تیرے ستم — یہہ بھی سوچا ہے کبھی ہے روز محشر سامنے

خواب میں آتے ہو پھرتے ہو نگاہِ شوق میں / کیا پردہ ہے کہ چھپتے ہو نکل کر سامنے

کچھ تو اب سن لیجئے بے التفاتی تابکے / رکھے بیٹھا ہوں میں ارمانوں کا دفتر سامنے

چاہتا ہے دل کہ تم نظروں سے اوجھل بھی نہ ہو / رات بھر آغوش میں ہو اور دن بھر سامنے

محبوب نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں اور دوسرے اصناف سخن اونکے یہاں خال خال نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ اونکے وقفہ زندگی کے لحاظ سے کافی زیادہ ہے۔ اگر عمر ایفا کرتی تو یہ جواں مرگ شاعر اپنے پیچھے ایک ایسا دفتر چھوڑ جاتا جس میں کسی موضوع سخن کی کمی نہ ہوتی۔

ہمیں امید ہے کہ محبوب کا کلام جو مختلف بیاضوں میں پھیلا ہوا ہے ایک جا کر کے طبع کر دیا جائیگا اس بارے میں ہمیں اونکے برادر بزرگ راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی سے توقعات ہیں کہ وہ دکن کے اس شاعر کو حتی المقدور جلد از جلد پبلک سے روشناس فرمائیں گے۔ ہم آخر میں محبوب کے کلام کے کچھ شعر نقل کرتے ہیں۔ امید ہے صاحبان ذوق ان میں سے خود انتخاب کر لینگے۔

سلسلہ وحشت کا لکھا تھا مری تقدیر میں / باندھ رکھا ہے جنوں نے زلف کی زنجیر میں

دیا ہے دل یہ سمجھ کے ہم نے کہ منہ نہ موڑینگے عاشقی سے / جفا کروگے سہا کرینگے بُرا کہوگے سنا کرینگے

سکھا رہا ہے ہمیں زمانہ کہ نیتوں کا نہیں ٹھکانا / کرینگے ہم اعتبار جن کا وہی تو آخر دغا کرینگے

بیزار ہیں خدا کی قسم زندگی سے ہم / جی کر جہاں میں کیا کریں اس بیکسی سے ہم

دنیا سرا سمجھ کے مسافر ٹھہر گئے / گزرے تھے چار دن کہ یہاں سے گزر گئے

کیا زادِ راہ ساتھ ہے انکی خبر نہیں / اتنا کہینگے جو گئے بے مال و زر گئے

محبوب تیرا دل بھی عجب شعبدہ گر ہے / کہنے کو ترے پاس ہے رہتا ہے کہیں اور

مجمع خوباں ہے میت پر مری / موت بھی گویا تماشہ ہو گئی

کون ہے جو اپنے مطلب کا نہیں / خود غرض محبوب دنیا ہو گئی

حساب کا مجھے ڈر روز حشر کیا ہوتا / کہ میرے جرم و گنہ کا کوئی شمار نہ تھا

نواب کمال یار جنگ بہادر

نواب تراب یار جنگ بہادر سعید

مولوی سید احمد حسین صاحب امجد
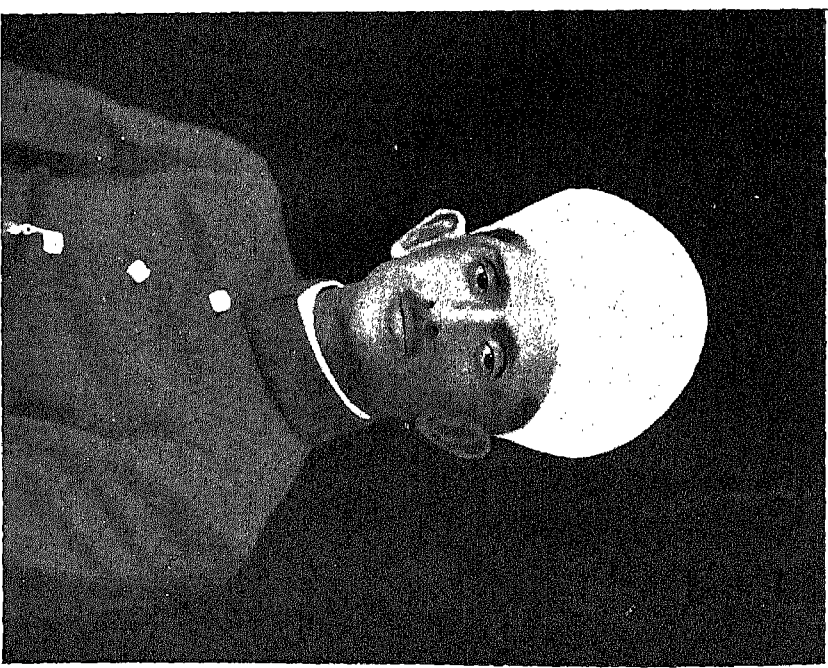
حیدرآباد پرنٹنگ ورکس
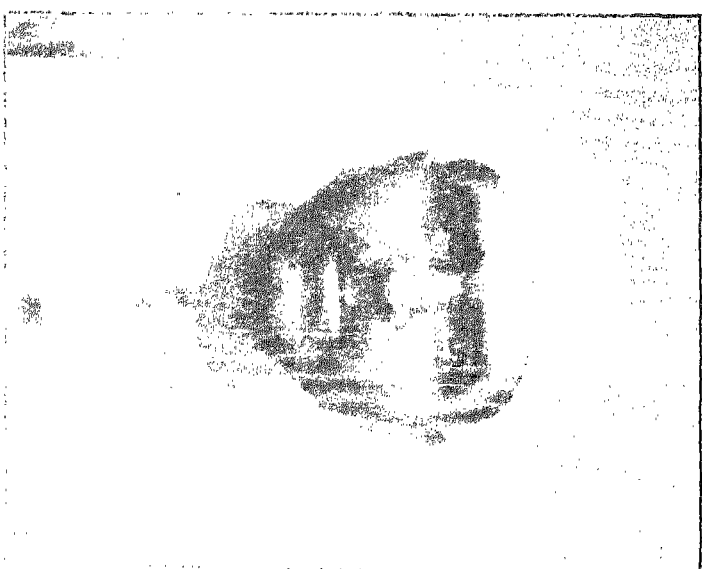
ہز ہائی نس والا شان جنرل نواب اعظم جاہ بہادر اعظم
شہزادہ برار و ولیعہد سلطنت آصفیہ

اعلیحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کے عہد میمنت مہد میں حیدرآباد میں علم و فضل اور شعر و سخن نے اس قدر نشو و نما حاصل کی ہے کہ اسکے اثرات سے نوجوانوں میں علم و عمل کا سچا ذوق پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ اس قدر ہمہ گیر ہے کہ خانوادۂ شاہی کے جملہ اراکین بھی اس سے بہرہ مند ہیں نیز ملک میں بیسیوں نوجوان شاعر پیدا ہو گئے ہیں جن کا کلام ابھی سے ظاہر کرتا ہے کہ وہ مستقبل میں اردو شعر و سخن کی تاریخ میں ایک اچھی جگہ حاصل کر لیں گے۔ اسلئے مرقع سخن کی اس جلد میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ولی عہد سلطنت ہز ہائنس والا شان جنرل نواب میر حمایت علیخاں اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار کو بھی شعر و سخن کا ذوق سلیم ورثہ میں ملا ہے چنانچہ آپ اعظم تخلص فرماتے ہیں اور ذیل میں آپکی ایک غزل درج کیجاتی ہے:-

مار ہی ڈالا مجھے ناز و ادا سے پہلے — جان دینا ہی پڑا مجھکو قضا سے پہلے

آمدِ فصل بہاری کی کرامت ہے نئی — گل کھلے جاتے ہیں گلشن میں صبا سے پہلے

نہیں امید کہ ہو دست مسیحا سے شفا — کام یاں ہو ہی گیا اپنا دوا سے پہلے

ہو گیا عشق میں اب خون جگر بھی اپنا — رنگ طرفہ ہوا پیدا یہ حنا سے پہلے

اے تقاضائے محبت میں تصدق تجھ پہ — اثر آہ نمایاں ہے قضا سے پہلے

ہائے اُس شوخ جفا جو کے ستم کا انداز — اُس نے دی مجھکو سزا بھی تو خطا سے پہلے

زمزم و کوثر و تسنیم سے تو اے اعظم — دھولے منھ اپنا ذرا حمد و ثنا سے پہلے

حضرت ولی عہد بہادر کے حقیقی بھائی شہزادہ والاشان نواب میر شجاعت علی خاں معظم جاہ بہادر شجیع بھی ایک صاحب ذوق شاعر اور سخن پرور ہیں۔ چنانچہ آپ کا ایک دیوان بھی مرتب ہو چکا ہے اور آپکے حالات اور نمونہ کلام ہی سے اس چھٹے دور کا آغاز کیا جاتا ہے۔

ان شہزادگان والاشان کے علاوہ دیگر شہزادگان والا تبار کا فارسی و اردو کلام اکثر رسائل و اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے جس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیحضرت ظل سبحانی کے زیر سایہ جملہ نونہالان آصفی علم و فضل اور شعر و سخن کے سرچشمے سے سیراب ہو رہے ہیں مثلاً نواب کاظم جاہ بہادر کاظم، نواب تقی جاہ بہادر تقی، نواب حشمت جاہ بہادر حشمت، نواب بشارت جاہ بہادر بشارت، نواب ہاشم جاہ بہادر ہاشم۔

مرقع سخن کی اس جلد میں شہزادہ شجیع کے علاوہ اور تین شاعروں نواب میر کاظم علی خاں کاظم، میر عباس حسین اقدس، اور میر عباس علیخاں لمعہ کے حالات اور نمونہ کلام شائع کئے جا رہے ہیں۔ انکے علاوہ ملک میں متعدد ایسے نوجوان شاعر موجود ہیں جن پر آئندہ لکھا جا سکتا ہے۔ نوجوان شاعروں کے کلام اور خصوصیات کے متعلق ابھی سے کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں غزل سے زیادہ نظموں پر زور دیا جائیگا اور ضروریات زمانہ کے مطابق نوجوان اپنی شاعرانہ قوتوں سے کام لیں گے۔ ان شعراء میں حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

عبد القیوم خاں باقی، سید علی منظور، جلال الدین اشک، ندیم الحسن تاثیر، تجی الحسن شمیم، محمد امیر امیر، ابو الکلام بدر الدین بدر، بدر الدین شکیب، سید محمد اکبر وفا فانی، عبد السلام ذکی، سعادت علی رضوی صادق، کاظم حسین واثق، رضا حسین خاں رشید، مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، میر علیخاں بیکس، عبد الصمد ساز، سلام اللہ سلام، ظہیر الدین بابر، نور اللہ محمد نوری وغیرہ۔

شہزادہ والا شان جنرل نواب معظم جاہ بہادر شجیع

شجیع

حضرت شہزادۂ والاشان نواب میر شجاعت علیخاں معظم جاہ بہادر دام اقبالہ

۱۳۲۵ھ

از مرزا علی حسین خانصاحب منعم بی۔اے

شہزادۂ والاشان نواب میر شجاعت علیخاں بہادر شجیع دام اقبالہ ۵ ذیقعدہ ۱۳۲۵ھ ہفتہ کے دن شب کے گیارہ بجے تولد ہوئے ولادت مسعود کی خوشخبری پر تمام شہر میں خوشیاں منائی گئیں۔ اور بذریعہ جریدۂ غیر معمولی مورخہ ۲ اسفندار ۱۳۱۷ف تمام ممالک محروسۂ سرکار عالی کو ایک یوم کی تعطیل دی گئی۔ آپ بندگان عالی سلطان العلوم اعلیحضرت نواب میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے چھوٹے صاحبزادے اور ولیعہد سلطنت شہزادہ اعظم جاہ نواب میر حمایت علیخاں بہادر پرنس آف برار کے حقیقی بھائی ہیں۔

سلطان العلوم نے اپنے صاحبزادگان بلند اقبال کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ مبذول فرمائی۔ چنانچہ مذہبی تعلیم کیلئے اپنے استاد خاص علامہ مولوی انوار اللہ خاں رحمتہ اللہ علیہ فضیلت جنگ۔ عربی و فارسی کیلئے مولوی علی حیدر حیدر یار جنگ نظم طباطبائی مرحوم اور ریاضی کیلئے مسٹر پنڈر گاسٹ کا انتخاب فرمایا۔

ایسے قابل اور یگانۂ روزگار اساتذہ کی نگرانی میں آپنے مختلف علوم و فنون میں کافی دستگاہ حاصل کرلی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی ملکی معاملات اور دفتری معلومات کا بھی کافی تجربہ حاصل فرمایا۔ آپ کی اس غیر معمولی قابلیت در کاروبار مملکت سے دلچسپی اور اعلیٰ ذوق کی بناء پر حضرت اقدس و اعلیٰ نے آرائش بلدہ کی صدارت کو آپ سے زینت بخشی۔ حیدرآباد کی آرائش اور زیب و زینت کیلئے آپنے ایسے متعدد نمایاں کام کئے ہیں جنکی نظیر نہیں۔ چنانچہ باغ عام کو اپنی حسن توجہ اور خاص ذوق سے

جنت الفردوس بنادیا۔ اور سنٹرل مارکٹ کی ضرورت کو محسوس فرماکر معظم جاہی مارکٹ کی تعمیر کروائی۔

۱۶ر مارچ ۱۹۳۱ء میں تعلیمی سیر و سیاحت کی غرض سے اپنے بڑے بھائی شہزادۂ اعظم جاہ بہادر کے ساتھ جہاز "رن پورہ" یورپ تشریف لیگئے۔ اور مختلف ممالک و جامعات کی سیر و سیاحت کی اور علمی و عملی تجربہ حاصل کیا۔

۱۲ر نومبر ۱۹۳۱ء مطابق یکم رجب المرجب ۱۳۵۰ھ پنجشنبہ کے دن بمقام نیس آپکا عقد مسعود سابق سلطان ترکی حضرت خلیفۂ عبدالمجید خاں کی بھانجی شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے ساتھ نہایت ہی تزک و احتشام اور تکلف کے ساتھ ہوا۔ عقد کے چند دن بعد ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو حیدرآباد واپس تشریف لائے۔ عقد مبارک کی مسرت میں ۱۲ر نومبر کو ممالک محروسہ کے لئے عام تعطیل قرار دیگئی۔ سفر یورپ اور عقد مسعود پر متعدد تاریخیں لکھی گئیں جن میں سے دو یہاں پیش کیجاتی ہیں۔ علامہ نظم طباطبائی۔ مہاراجہ سر یمین السلطنتہ اور حضرت جلیل کی تاریخیں بہت مشہور ہیں۔

دکن کے شاہزادے روم کی شہزادیاں لائے — زمین و آسماں روشن ہوا ان ماہ پاروں سے

معظم جاہ و نیلوفر دُرِ شہوار و اعظم جاہ — لگے اہل ادب چار چاند ان جاں نثاروں سے

۱۳۵۰ھ

مبارک باد شادا اہلِ دکن را — کہ با شانِ شہی نوشاہ آمد

زیورپ با عروس نیک صورت — بہادر دل معظم جاہ آمد

۱۳۵۰ھ

شجیع نہ صرف ایک بلند پایہ اور نازک خیال شاعر ہیں بلکہ شاعروں ادیبوں اور عالموں کے سرپرست بھی ہیں۔ دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ تاہم آپنے شعر و شاعری کیلئے ایک خاص وقت مقرر فرمادیا ہے جس میں باکمال شاعر اپنا کلام سناکر بارگاہِ شجاعت سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ بادشاہوں شہزادوں اور امیروں کی سرپرستی کے بغیر علم و ادب ترقی نہیں کرسکتا۔ اگرچہ اسکی ترقی کا بہت کچھ دار و مدار خود ادیبوں اور عالموں کی کوششوں پر منحصر ہے مگر پھر بھی شاہانہ سرپرستی کے بغیر اسکا پھولنا پھلنا اور پروان چڑھنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ یہ عجیب حسنِ اتفاق اور ملک کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے بادشاہ ذیجاہ اور شہزادۂ معظم جاہ بہادر اعلیٰ پایہ کے شاعر شعر و شاعری کے سرپرست اور محسن ہیں۔ یہی ایک بڑا سبب ہے کہ دکن اُردو ادب کا مرکز بنگیا ہے۔ ان دو جلیل القدر ہستیوں پر اہل ادب جس قدر فخر و ناز کریں کم ہے۔

آپکی فطرت میں خودداری نفاست پسندی علمی سرپرستی بردباری سخاوت شجاعت اور اخلاق بدرجۂ اتم موجود ہیں، جو شاہانِ آصفیہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ کھیلوں میں سب سے زیادہ ٹینس سے دلچسپی ہے۔ جس کسی کو بھی آپ کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو وہ آپکی خوش اخلاقی سادہ مزاجی اور حسنِ سلوک سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شاہزادۂ والاشان بہادر کو شاعری ورثہ میں عطا ہوئی ہے۔ بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف طبیعت مائل تھی یہانتک کہ شاعری آپکا محبوب مشغلہ بنگئی ہے چونکہ غزل اصناف شاعری کی روح رواں ہوتی ہے، اسلئے آپ کا کلام زیادہ تر غزل ہی پر مشتمل ہے۔ پیشگاہ خسروی سے اکثر دفعہ ملک کے سربرآوردہ اخبارات مثلاً رہبر دکن صبح دکن کو آپکا کلام فصاحت التیام بغرض طبع سرفراز ہوتا رہتا ہے۔ ہر غزل حسن و عشق اور فراق و وصال کی داستان کے ساتھ ساتھ حقیقت اور واقعیت کا پہلو لئے ہوتی ہے۔ خصوصاً مطلع اور مقطع اس قدر معنی آفریں اور جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے جسکی نظیر مشکل سے ملیگی۔ سلطان العلوم نے اکثر مقطعوں پر بے انتہا تعریف اور اظہار خوشنودی فرمایا ہے۔ جو حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہے۔ آپ کے کلام میں بے ساختہ پن، سلاست، سادگی، مضمون آفرینی اور جدت نگاری جابجا نظر آتی ہے غیر مانوس تشبیہات اور استعارات مطلق نہیں پائے جاتے۔ کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعر کے دل کی آواز ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور مشکل سے مشکل خیالات کو عام فہم انداز میں ادا کیا جاتا ہے جو کمال شاعری ہے۔ مختصر یہ کہ آپکی شاعری اپنی آپ نظیر ہے آپ کا ایک دیوان عرصہ ہوا مکمل ہوچکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقدس و اعلیٰ کے اس فرمان مبارک کو نقل کردیا جائے جس میں والاشان بہادر کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

> میرے دوسرے لڑکے کا اردو کا کلام (یعنے معظم جاہ والاشان کا) جو کہ کم و بیش سات سو غزلوں پر مشتمل ہے اس وقت فصاحت جنگ جلیل کے زیر اصلاح ہے اور جس وقت یہ کام مکمل ہوجائیگا تو زمانہ قریب میں یہ طبع ہوگا (دو حصہ میں) اس وقت میں استاد کی رائے کے ساتھ کہ کلام کس پایہ کا ہے چند سطری دیباچہ لکھنے کا قصد رکھتا ہوں۔ خلاصہ اس کہ یہ ذوق و شوق شاعری انکو ورثتاً حاصل ہے جو باوجود کم عمری کے مشق سخن بہت اعلیٰ و ارفع

واقع ہوا ہے انکا تخلص چار حرفی ہے یعنے شجیع جوان کے خاندانی نام کے مناسبت سے ہے
یعنے میر شجاعت علیخاں اور اس دیوان کا نام میں نے اسی وجہ سے "شمشیر شجاعت"
رکھا ہے۔ خدا اسکو صفِ اعدا کے حق میں صمصام بے نیام ثابت کرے اور صاحب قبضہ کو
دبدبۂ حیدری نصیب ہو آمین بجاہ آلِ یٰسین ـــ طغرائے دیوان یہ ہے ـ

شاہ مرداں شیر یزداں قوتِ پروردگار　　　لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار

الحق یہ اسکی شان میں ہے جو کہ ایک طرف رسولِ خدا صلعم کا بنی عم تھا تو دوسری طرف
وصی بنا ہوا تھا اور دونوں میں نسبت وہی تھی جو کہ مابین مفرد و مثنیٰ ہو بموجب حدیث صحاح
یعنے یا علی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ ـ اسکے سوا ایک منصب نبوت پر فائز
تھا تو دوسرا درجۂ ولایت پر ـ وکفیٰ باللہ شہیداً ـ"

یہ ایک امر مشکل ہے کہ آپکے پورے کلام پر روشنی ڈالی جائے البتہ بمصداق "مشتے نمونہ از خروارے"
آپ کے کلام کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس کو سرکار نے میری ناچیز استدعا پر ازراہ مراحم ملوکانہ سرفراز فرمایا۔ ایک غزل
کے چند شعر نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں جو جذبات کیفیات اور واقعات کو لئے ہوئے ہیں ـ

تغافل میں بھی ان کی ہشیاریاں ہیں　　　یہ وہ خواب ہے جس میں بیداریاں ہیں
کھلا دل پہ آزاد ہوکر یہ عقدہ　　　کہ یاں ہر قدم پر گرفتاریاں ہیں
گل و لالہ ڈوبے ہوئے ہیں جو خوں میں　　　یہ چشمِ عنادل کی گلکاریاں ہیں
اُدھر فضل و رحمت اِدھر پاس اپنے　　　خطاکاریاں ہیں گنہگاریاں ہیں
زمانے نے بدلے بہت رنگ لیکن　　　شجیع آجتک تجھ میں خودداریاں ہیں

مقطع کے متعلق ارشاد خسروی ہوتا ہے "بہت خوب کیوں نہیں خاندان کا اثر ہے" ـ

داغ کی مشہور غزل "ناز والے نیاز کیا جانیں" پر خامہ فرسائی کیگئی ہے ـ پوری غزل سلاست سادگی

اور مضمون آفرینی کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے ؎

صاف دل ساز باز کیا جانیں — آپ کے دل کا راز کیا جانیں
شمع سوزاں ہے عاشقوں کا جگر — آپ سوز و گداز کیا جانیں
بار الفت ہمیں اٹھائیں گے — ہاں فرشتے یہ راز کیا جانیں
عمر گذری ہے بت پرستی میں — دیر والے نماز کیا جانیں
نیر مستوں کی چال کہتی ہے — ہم نشیب و فراز کیا جانیں
لاکھ خوبی کا آدمی ہے شجیع — آپ اے دلنواز کیا جانیں

ایک چھوٹی سی بحر میں عشقیہ مضمون کو اس خوش اسلوبی اور بیساختہ پن سے ادا کیا ہے گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ابتدا تھی ابھی کہانی کی — پہروں آنکھوں نے خونفشانی کی
مرگ بلبل پہ اور قمری پہ — دیر تک گل نے نوحہ خوانی کی
قہر ڈھاتی ہے جان پر کیا کیا — یہ امنگیں تری جوانی کی
مرتبہ میرا پوچھ کچھ نہ شجیع — در مشہد پہ پاسبانی کی

مقطع کے متعلق سرکار کا ارشاد ہوتا ہے۔ "سبحان اللہ مقطع کیا کہا ہے کہ دربار امام ضامن ثامن علیہ السلام سے اپنی ضمانت کا پروانہ حاصل کیا ہے۔"

ذیل کے اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادہ شجیع کے خیالات جذبات اور جدت پسندی کا میدان کس قدر وسیع ہے

آہ کیا خاک ہم آغوش ہوتا تیر کے ساتھ — چال تدبیر کی چلتی نہیں تقدیر کے ساتھ
محرم عشق کے ارمان نرالے دیکھے — حوصلے بڑھتے گئے اور بھی تعزیر کے ساتھ
چاہتا ہوں کہ ترا تیر جو نکلے دل سے — دل کی حسرت بھی نکل جائے اسی تیر کے ساتھ

کلکِ مانی نے یہ صنعت نئی دکھلائی ہے — کھنچ گئے دل بھی ہزاروں ہی تصویر کے ساتھ

ہوں شہیدوں کا عزادار عجب کیا ہے شمیمؔ — روزِ محشر میں اٹھوں حضرتِ شبیر کے ساتھ

ارشاد خداوندی ہوتا ہے "سبحان اللہ مقطع کیا کہا ہے کہ دربارِ حسینی سے اپنی نجات کا وثیقہ حاصل کیا ہے"۔

واقعہ نگاری جو شاعری کا بہترین جوہر ہے آپکے کلام کی خاص خصوصیت ہے ؎

بالیں پہ دمِ نزع جو وہ آئے ہوئے ہیں — بے تاب ہیں بے چین ہیں گھبرائے ہوئے ہیں

منظور سرِ قبر جو تھا حشر اٹھانا — ساتھ اپنے رقیبوں کو بھی وہ لائے ہوئے ہیں

سنبل بھی شمیمؔ آج خبر پاکے خزاں کی — بالوں کو بھی گلزار میں بکھرائے ہوئے ہیں

پایا نہ شامِ غم کے اندھیرے میں آپ کو — ڈھونڈا کئے چراغ محبت لئے ہوئے

مارے ہوئے نگاہ کے محشر میں کیا کہیں — آنکھوں میں وہ کھڑے ہیں ندامت لئے ہوئے

لیکر گئے تھے دل میں شکایت کسی کی ہم — واپس ہوئے نظر میں شکایت لئے ہوئے

محشر میں دیدنی ہے ترے دل جلوں کی شان — پہلو میں آرہے ہیں قیامت لئے ہوئے

بیٹھا ہوں تری یاد میں اس شان سے خاموش — جیسے مجھے دنیا میں کوئی کام نہیں ہے

وہ بھی بالیں پہ تھے دمِ آخر — موت تھی موت کا بہانہ تھا

آپکے کلام میں تصوف کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ جسکے ثبوت میں یہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

صورت یہ ہے کہ آپ ہیں ہر سمت جلوہ گر — حیرت یہ ہے کہ آپکی صورت کہیں نہیں

دنیا ترا نقاب ہے عقبیٰ ترا حجاب — یعنی مری نظر کی ضرورت کہیں نہیں

جنت کی آرزو ہے طبیعت کا اک فریب — جب غم کہیں نہیں ہو تو جنت کہیں نہیں

اتنے قریب ہیں کہ مجالِ نظر نہیں — آنکھوں میں آکے بس گئے اچھا حجاب تھا

نکلی تری منزل حرم و دیر سے آگے — اب تو حرم و دیر کا جھگڑا نہ رہیگا

ملجائینگی اس وقت شجیع انسے نگاہیں — جب اپنی نگاہوں کا تقاضہ نہ رہیگا

اعتبار نظر نہیں ورنہ — ان کا جلوہ کہاں نہیں ملتا
یہ مری جستجو کا حاصل ہے — تو وہاں ہے جہاں نہیں ملتا

عشق کی دنیا میں رہتی ہے جنوں کی روشنی — عقل نے جب شمع روشن کی اندھیرا ہو گیا

اگر انسان غم کا خوگر ہو جائے تو پھر غم نہیں رہتا۔ اسی خیال کو اس خوش اسلوبی اور انوکھے پن سے ادا کیا گیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی

درد ہر تقدیر میں شامل نظر آیا مجھے — جس طرف نظریں اٹھائیں دل نظر آیا مجھے
غم برا ہو یا بھلا غم سے محبت ہو گئی — غم کسی کی یاد میں شامل نظر آیا مجھے

دنیا ایک دھوکا ہے اور اس کی ہر چیز فریب خیال ہے

میں اسی دھوکے میں منزل سے بھی آگے بڑھ گیا — جو قدم اٹھا وہ اک منزل نظر آیا مجھے
مرحلہ میں عشق کے رہبر فریب عشق تھا — جس قدر آساں ہوا مشکل نظر آیا مجھے
جب نظر کے واسطے سے سیر دنیا کی شجیع — ایک پردہ ہر جگہ حائل نظر آیا مجھے

غم نہیں تو راحت نہیں اور راحت اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک تکالیف اور مصائب کا سامنا نہ کیا جائے اور اگر کوئی غم سے بھاگتا ہے تو راحت بھی اس سے بھاگ جاتی ہے۔

یہ کیا کہا کہ درد محبت کہیں نہیں — جب غم کہیں نہیں ہے تو راحت کہیں نہیں

شاعر عوام کی نسبت زیادہ حساس اور نازک خیال ہوتا ہے اسکو ہر معمولی سے معمولی چیز کا احساس ہو جاتا ہے۔ شجیع یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہر شخص کے پہلو میں دل ہے لیکن اس میں درد نہیں پھر ایسا دل جس میں درد نہ ہو وہ کس کام کا۔

کون اپنے ساتھ لے کے گیا درد دل شجیع — دل ہر جگہ ہے اور محبت کہیں نہیں

لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد نل اور دمن کے ساتھ عشق بھی دنیا سے اٹھ گیا لیکن انکے قصے ابھی تک صفحۂ روزگار پر موجود ہیں

میرے ساتھ اٹھا جہاں سے درد عشق — میرے افسانہ میں لذت رہ گئی

انسان لذت دنیوی سے توبہ ہی کیوں نہ کرلے۔ لیکن پھر بھی اس کو دوبارہ کرنے کی حسرت رہجاتی ہے۔ اس مضمون کو

ایک شعر میں ادا کیا گیا ہے۔ "اٹھے" اور "رہ گئی" میں جو رعایت لفظی ہے اسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔

مے سے توبہ کر کے جب اٹھے شیخ — بادہ و ساغر میں نسبت رہ گئی

چونکہ سکندر کی قسمت میں آب حیات نہ تھا اسلئے وہ خضر جیسے رہنما کے ساتھ ظلمات جاکر تشنہ کام لوٹا۔ اشعار ذیل اسی مطلب کی توضیح کرتے ہیں ۔

اب آپ کے پہلو میں بھی راحت نہیں ملتی — شاید مری تقدیر میں آرام نہیں ہے

دل ٹوٹ گیا دیکھ کے ساقی کی نگاہیں — مے آگئی محفل میں تو اب جام نہیں ہے

ہر آغاز کا انجام ہوتا ہے۔ لیکن آغاز محبت کا انجام نہیں ۔

اب ختم نہ ہونا کبھی اے درد محبت — آغاز ترا قابل انجام نہیں ہے

قیامت کا ایک دن معین ہے لیکن راہ عشق میں عاشق کے لئے قدم قدم پر قیامت ہے ۔

دور نکلی منزل راہ وفا — ہر قدم پر اک قیامت چاہئے

ہستی سے تا عدم بھی بہت غم کی منزلیں — سو بار راستہ میں قیامت ملی ہیں

جب انسان کسی خیال میں محو ہو جاتا ہے تو پھر وہ دنیا و مافیہا کو بھول جاتا ہے ۔

فلک کے دور نہ جانے گذر گئے کتنے — ترے خیال میں بیٹھے تھے سر جھکائے ہوئے

یوں دیکھتے ہیں اسکے تصور کا خواب ہم — جیسے کہ ہر خیال سے فرصت ملی ہیں

عاشق کی نگاہ شوق زبان حال سے اپنی داستان سناتی ہے ۔

ہم انکی بزم میں جاکر خموش بیٹھ گئے — نگاہ شوق کو اک داستاں بنائے ہوئے

اشعار ذیل سے شان خودداری اور استغنا پایا جاتا ہے ۔

اضطراب دل اگر ہے بھی تو تجھکو کیا غرض — اب تمہیں سمجھاؤ دل کو دل تمھارا ہو گیا

بیمار ہی ہو دل تو ہے دل کی امید بھی وہی — اے نگاہیں پھیرنے والے تجھے کیا ہو گیا

نواب میر کاظم علی خان بہادر کاظم

کاظم

نواب میر کاظم علیخاں بی اے (عثمانیہ)

از - محمد عبدالعزیز صاحب غوثی متعلم بی اے (عثمانیہ)

نواب شوکت جنگ بہادر کے فرزند اکبر ہیں اور انکے جد اعلیٰ نواب محمد معین خاں بہادر اصفہان کے باشندے تھے مبارز خاں کے عہد میں معہ تین سو غلام زرین کمر بند وارد حیدرآباد ہوئے۔ یہاں انہیں خانی او بہادری کا خطاب اور ڈیڑھ سو منصب اور سات ہزار کی جاگیر گنی آبیتور عطا ہوئی۔

انکی اولاد میں نواب محمد جعفر علیخاں بہادر شوکت جنگ حسام الدولہ معین الملک ممتاز فرو گذرے ہیں جنہیں نواب آصفجاہ بہادر کے عہد میں سیکاکول اور راجمندری کی صوبہ داری دیگئی تھی۔ بعد میں نواب صلابت جنگ بہادر نے بھی انہیں اس عہدہ پر منتقل فرمایا۔ بارہا وہ لشکر کے ساتھ مرہٹوں اور فرانسیسیوں اور زمیندار باغیوں کی سرکوبی کیلئے بھیجے گئے۔ نہ صرف ان پر فتحیاب ہوتے رہے بلکہ انہیں ریاست کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ اسوقت انکو علاوہ سات ہزار کی جاگیر کے جو انکے پاس تھی پچھتر ہزار ذاتی اور سترہ لاکھ صفاتی جاگیرات عطا ہوئیں اور صلابت جنگ بہادر کے خانگی دیوانی کے عہدہ پر سرفراز تھے چند دنوں بعد وزیر اعظم کا عہدہ جلیلہ انکے سپرد ہوا اسکے ساتھ ہفت ہزاری منصب ہفت ہزار سوار علم و نقارہ ماہی مراتب پالکی جھالر دار اور معین الملک کا خطاب عطا ہوا۔ ایک وقت وہ موسیو لینی کو بھی شکست دینے میں کامیاب ہوئے اور اسکو ساحل سمندر مچھلی بندر تک بھگادیا اپنی زندگی کے آخری دنوں یعنے ۱۱۷۷ھ میں جنگ راکس بھون پر جبکہ وہ مرہٹوں کے مقابلہ میں بڑی بہادری سے سرگرم پیکار تھے گولی کا نشانہ بن کر میدان کارزار میں شہید ہوئے انکی سوانح عمری تواریخ دکن، تزک آصفیہ اور حدیقۃ العالم میں موجود ہے انکے فرزند نواب محمد ابوالحسن خاں ضرغام جنگ حسام الدولہ معین الملک اپنے والد بزرگوار کی جاگیرات و مناصب و اعزازات سے مفتخر

و ممتاز فرمائے گئے اسکے علاوہ منصب شش ہزاری شش ہزار سوار علم و نقارہ بھی عطا فرمایا گیا۔ انہوں نے اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی جس سے محمد جعفر علیخاں پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد محمد جعفر علیخاں کو شوکت جنگ حسام الدولہ معین الملک کے خطابات سے سرفراز فرمائے گئے۔ والد کا جملہ اسٹیٹ ان پر بحال ہوا اور حیدرآباد میں سب سے پہلے یہی کمشنر کروڑگری مقرر ہوئے نواب میر عالم کے زمانہ میں انہیں عرض بیگی کی خدمت دی گئی۔ انہوں نے اپنی پھوپھی کی لڑکی سے شادی کی جن سے نواب ابوالحسن خاں بے نظیر جنگ صمصام الدولہ معین الملک تولد ہوئے۔ نواب محمد ابوالحسن خاں کو ۱۲۰۸ھ میں نواب سکندر جاہ بہادر نے علاوہ خطابات بے نظیر جنگ و صمصام الدولہ کے قلعہ کھمم سے بھی سرفراز فرمایا اور ۱۲۳۵ھ میں نواب ناصر الدولہ بہادر نے معین الملک کا خطاب اور منصب ہفت ہزاری و چار ہزار سوار سے انکی عزت افزائی فرمائی۔ انہوں نے نواب رستم علیخاں فرزند سور اللہ خاں عسکر جنگ کی لڑکی سے بیاہ کیا جن کے بطن سے محمد کاظم علیخاں شوکت جنگ حسام الدولہ پیدا ہوئے۔ یہ علاوہ اسٹیٹ اور اعزاز پدری پانے کے محکمہ دیوالیہ برار و کوتھ جات کے عہدہ پیر مجلسی سے سرفراز فرمائے گئے۔ یہ فارسی اور عربی کے اچھے شاعر گذرے ہیں انکے فرزند اکبر نواب ابوالحسن خاں نے انکا دیوان مرتب کیا انکی شادی نواب رشید الملک مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی جن کے بطن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ نواب محمد ابوالحسن خاں شوکت جنگ حسام الدولہ فرزند اکبر اپنے والد کے انتقال کے بعد صاحب اسٹیٹ ہوئے اور الحمد للہ بقید حیات ہیں۔

غرض محمد سعید خاں سے لیکر آج تک یہ خاندان خانوادۂ آصفی کی روایتی نوازشوں اور عزت افزائیوں سے بہرہ اندوز ہوتا چلا آرہا ہے چنانچہ نواب کاظم علیخاں کاظم ورنگل کی دوم تعلقداری پر فائز ہیں۔

نواب شوکت جنگ کو جو خود فارسی اور عربی کے ادیب ہیں اپنے فرزندوں کو تعلیمی اعلیٰ منازل پر دیکھنے کا ابتداء ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ چھ برس کے سن میں کاظم علیخاں کو ایک انگریزی مدرسہ گورنمنٹ ہوسٹا ہولی روزری میں بہ ایماء نواب عماد الملک مرحوم شریک کرایا تعلیم کے ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد مدرسہ عالیہ میں شرکت کی جہاں سے اسکول فاینل کا امتحان کامیاب کیا۔ اسی زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ہند اور بیرون ہند کے کامل اساتذہ فراہم کئے جارہے تھے۔ اس عظیم الشان ادارہ علمیہ کے وجود میں آنے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ کاظم علیخاں جیسے حریص علم کسی اور کالج میں شرکت کرتے۔ فوراً ہی کالج کی ابتدائی جماعت میں شریک ہوگئے اور مسلسل کامیاب ہوکر بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے والد کی شخصی

دلچسپی ان کی تعلیمی ترقی کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

عہد طفولیت ہی سے طبیعت موزوں اور شعر گوئی کا ملکہ موجود تھا۔ چنانچہ ۱۳ سال کے سن میں جب استاد جلیل کا یہ شعر

غرورِ حسن تمھیں جس قدر ہو زیبا ہے　　　خدا کے فضل سے صورت بھی ہے شباب بھی ہے

انھوں نے سنا۔ بے ساختہ اسی زمین میں سلام کا ایک شعر ان کی زبان سے نکل پڑا ؎

نثار جاں سے اکبر پہ کیوں نہ ہوں حوریں　　　شبیہ احمد مرسل بھی ہیں شباب بھی ہے

اس شعر کی تعریف ہونے کے بعد ان کا ذوقِ سخن بڑھتا گیا۔ پہلے حکیم عابد علی صاحب غیور اس کے بعد مولانا علی حیدر طباطبائی مرحوم سے مشورہ لیا مولانا کے انتقال کے بعد سے اصلاح لینی چھوڑ دی۔ کاظم کو پروفیسر وحید الدین سلیم مرحوم سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا جن کا نام وہ اب بھی بڑے ادب سے لیا کرتے ہیں۔

وہ تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں مگر مرثیہ گوئی کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ ہر سال مخصوص طور پر ایک نیا مرثیہ کہہ کر محرم کی بارھویں تاریخ اپنے گھر میں ایک خاص رنگ سے پڑھا کرتے ہیں۔ اس مجلس نے اس قدر شہرت حاصل کی ہے کہ حیدرآباد کے اکثر و بیشتر ممتاز شعراء۔ نقادانِ سخن صاحبانِ فہم شریک ہو کر دلچسپی سے سماعت کرتے اور شاعر کا دل بڑھاتے رہتے ہیں۔

کاظم نے برخلاف دوسرے مرثیہ گو شعراء کے صحیح واقعات مستند تواریخ اور احادیث مصدقہ پر اپنے مراثی کی بناء رکھی ہے۔ گل و بلبل کی کہانیاں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دینے والی باتوں اور کمزور احادیث کو نظم کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ واقعہ نگاری کے پرتو میں حقائق بیان کرتے ہیں۔ ان کا کلام سلاست۔ روانی۔ شیرینی پر مملو ہے۔ ان کے کلام میں آمد ہے۔ جب تک دل سے مجبور نہیں ہوتے شعر نہیں کہتے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جس کی وجہ قلب انسانی پر سچے تاثرات کا نقش بیٹھ جاتا ہے۔

مرثیے میں چہرہ تشبیب۔ رجز۔ سراپا۔ رزم بزم۔ ساقی نامہ۔ گھوڑے کی تعریف۔ تلوار کی تعریف اور واقعات شہادت کا تقریباً سب اساتذہ نے التزام کیا ہے۔ چنانچہ میر انیس اور دیگر شعراء کے کلام میں متعدد جگہ یہ خصوصیات نظر آتی ہیں۔ اس سے کاظم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان خصوصیات کی جھلکیں ان کے کلام میں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ اصلی واقعات

کو ان کے مخفی محاسن کے ساتھ اجاگر کرنا ان کی شاعری کا اصلی مقصد ہے۔

ان کے اس مرثیہ میں جس کا مطلع (واللہ دو جہان کا سرتاج ہے حسین) ہے سید الشہدا لشکر اعداء کو مخاطب فرما کر نصیحت فرما رہے ہیں۔ طرز نصیحت اور روانی و سلاست ملاحظہ ہو

لازم ہے غور مرد خوش انجام کے لئے　　دیتے ہیں جان اہل خرد نام کے لئے
فکر مآل چاہیئے ہر کام کے لئے　　رکھتے ہیں درد صاحب آلام کے لئے
راحت نہ رات کو ہے نہ دن کو نہ چین ہے
اس کی خوشی تمہیں ہے کہ پیاسا حسین ہے

پھر کہہ رہا ہوں دیکھو نہ ظلم و ستم کرو　　باز آؤ اب خطاؤں سے تقصیر کم کرو
مارو نہ تیر اور نہ مشق الم کرو　　جو ہو چکا ہے تم سے نہ اُس کا الم کرو
کہہ دو کہ ہم سے ترک ہوئیں اب جفائیں سب
لو میں دعا کروں کہ بحل ہوں خطائیں سب

غفار ہے کریم ہے بخشے گا کردگار　　آثار اس کے لطف کے ہر جا ہیں آشکار
بندوں کا ہر بلا میں وہی تو ہے چارہ کار　　کر دے گا عفو ہو نگے جو عصیاں سے شرمسار
ستار صد عیوب ہے بندہ نواز ہے
اُس کی وہ ذات ہے جسے رحمت پہ ناز ہے

اس مرثیہ میں امام حسین کی بحیثیت امام اپنے عالی قدر فرزند سید سجاد کو وصیت رضا (حق) صبر و شکر رحم و کرم تحمل مصائب سے وابستہ دامن ہونے اور راست عہد کا خیال رکھنے کی ہدایت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

تم شیر کردگار کے پوتے ہو میری جاں　　دے عمر حق کہ نام خدا ہو گئے جوان
ایسا نہ ہو کہ کھینچ لو تلوار ناگہاں　　صبر و رضا سے کام رہے وقت امتحاں

غیظ و غضب کو راہ نہ دو حق کی راہ میں
بندہ ہو اور ہاتھ شوق سے راہ الٰہ میں

خیمہ کو دیں جو آگ ستمگر نہ طیش کھاؤ　　کھائے طمانچے ننھی سی خواہر نہ طیش کھاؤ
بے پردہ ہو جو زینب مضطر نہ طیش کھاؤ　　چھن جائے ماں کے سر سے جو چادر نہ طیش کھاؤ
لوٹیں جو گھر کسی کا نہ ہرگز گلہ کرو
مارے جو تازیانہ تو شکر خدا کرو

پہنانے لائیں طوق جو اعداء تو سر جھکاؤ　　خاروں پہ تا بہ شام یونہی پا برہنہ جاؤ
دربار میں یزید کے ماں بہنوں کو جو پاؤ　　جز شکر رب کچھ اور نہ اپنی زباں پہ لاؤ
آنا نہ غیظ میں ہے وصیت حسینؑ کی
بیٹا نہ رائیگاں ہو یہ محنت حسینؑ کی

رکو دنیوی فانی چیزوں سے تشبیہ نہ دیکر کیا بے لوث تعریف کی ہے :-

صورت بتا رہی ہے کہ بے حد شکیل ہے　　کس بل یہ کہہ رہا ہے کہ بے شک اصیل ہے
مخصوص ہے عطیۂ رب جلیل ہے　　دیں کی مدار رسول زمن کی کفیل ہے
حق کی طرف سے قبضۂ حیدرؑ میں آئی ہے
تلوار یہ حسینؑ نے ورثہ میں پائی ہے

اتری فلک سے دیں کے سرتاج کیلئے　　بھیجی گئی ہے کفر کے تاراج کے لئے
دھویا ہے فاطمہؑ نے اسے آج کیلئے　　پہونچی ہے دست شاہ میں معراج کے لئے
مونس رہی ہے فاطمہؑ کے نور عین کی
بھولے گی حشر تک نہ لڑائی حسین کی

گھوڑے کی تعریف کی ہے ؎

ذی جاہ بھی سعید بھی اور باوقار بھی
راکب ہے اس کا دوش نبی کا سوار بھی

طرفہ ہے افتخار پہ بے حد افتخار بھی
ہے پشت پر امانتِ پروردگار بھی

وعدہ کا دھیان ہے جو شہِ دیں پناہ کو
لے کر چلا ہے فدیہ راہ اِلٰہ کو

سراپا بھی انکے مرثیوں میں اصلیت کا جامہ پہنا ہوا ہے۔ گلو، سینہ و سر وغیرہ کو دنیوی اشیاء سے ملوث کرنا بے حرمتی اور عیب تو ہیں جانتے ہیں۔ بلکہ جس کام کیلئے وہ وضع کئے گئے اسکا سلیس اور ستھرے الفاظ میں بے ساختہ اظہار کرتے ہیں مثلاً سید الشہداء کا سراپا اسطرح بیان کرتے ہیں

سر زوں تھا فرق تاج شفاعت کے واسطے
شانے تھے دونوں بار امانت کے واسطے

سینہ بنا تھا علم امامت کے واسطے
حلقوم بوسہ گاہ رسالت کے واسطے

ڈوبے ہوئے تھے بخشش امت کی چاہ میں
وہ نفس پاک بک چکا تھا جو راہ اِلٰہ میں

ایک اور مرثیہ میں آنحضرت صلعم کا سراپا پروردگار عالم کی زبان سے یوں ظاہر کیا گیا ہے ؎

مگر یہ فکر تھی سب کچھ سہی پہ پہلے پہل
جو چیز خلق ہو سب سے ہو بہتر و افضل

ہمہ صفات و کمالات حق ہیں ہو اکمل
وہی ہو آخر و اوسط وہی رہے اول

وہ جسم دیں اُسے سایہ سے جو مبرا ہو
پہنائیں جامہ لولاک گر تو زیبا ہو

خدا کے جملہ کمالات کا نمونہ ہو
بنے جو مخزن اسرار حق وہ سینہ ہو

وہ دل علوم الٰہی کا جو خزینہ ہو
سبھی رسول بنیں جس سے وہ پسینہ ہو

دہن عیادت حق در پئے بہا برسے

یہہ وہ سحاب ہیں جن سے انبیاء برسے

لـ سے قبل عرب میں رجز خوانی لازمی تھی۔ ہر شجیع اپنے حسب و نسب اور آبائی قوت کو بصد افتخار و ناز ظاہر کرتا تھا
لَم نے بھی اپنے مرثیوں میں رجز پر شدت سے زور دیا ہے۔ چنانچہ سید الشہدا رجز میں اپنے نانا رسولؐ کریم کے متعلق فرماتے ہیں

یوں تو نبی زمانہ میں ذی مرتبت تھے سب ۔۔۔ حاصل انہیں یہہ رتبہ اعلیٰ ہوئے ہیں کب
پہلے انہیں عطا ہوا محبوب کا لقب ۔۔۔ پھر عرش پر ہوئی شب معراج کو طلب
ملحوظ پاس تھا جو اُسے اہتمام میں
سبقت خدا نے عرش پہ کی ہے سلام میں

حامد حمید احمد و محمود با صفات ۔۔۔ جس کا وجود باعث ایجاد کائنات
جس کے سبب زمانہ میں قائم ہوئی صلوٰۃ ۔۔۔ ہے منحصر انہی پہ گنہگار کی نجات
اوصاف کہہ رہے ہیں کہ خلق عظیم ہیں
محبوب ہیں رحیم کے خود بھی رحیم ہیں

طرح اپنے باپ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

انس و جن و ملک کا ہے سرتاج وہ علیؓ ۔۔۔ قائم نبیؐ کا جس سے ہوا راج وہ علیؓ
جس نے کیا ہے کفر کو تاراج وہ علیؓ ۔۔۔ دوش نبیؐ پہ پائی ہے معراج وہ علیؓ
بت توڑنے میں آپ کے رتبے سوا رہے
سر پر خدا تو تحت رسولؐ خدا رہے

برہیں مرحب کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی رجز اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

میں ہوں جہاں میں بازوئے پیغمبر انام ۔۔۔ بھیجی گئی ہے عرش سے میرے لئے حسام
میں شیر ہوں خدا کا زمانہ میں لاکلام ۔۔۔ حیدرؓ رکھا ہے کعبہ میں اماں نے میرا نام

غالب کوئی نہیں اسد کردگار پہ
ہر دم نظر یہہ رہتی ہے تجھ سے شکار پہ

میں ہوں دعا خلیل کی اس کا اثر بھی ہوں
میں رہنمائے خلق بھی ہوں راہبر بھی ہوں

داماد بھی برادر خیر البشر بھی ہوں !!
شیر خدا بھی بنت اسد کا پسر بھی ہوں

مشکل کشا ہوں ایک ہیں ساری خدائی کا
ان بازؤوں میں زور ہے خیبر کشائی کا

ایسے واقعات کی جنہیں بظاہر کسی نے نہ دیکھا ہو لیکن قرائن سے ان کا صادر ہونا پایا جاتا ہو سچی تصویر موثر اور دل نشین الفاظ و انداز میں پیش کرنا خاص انکا حصہ ہے ۔ مثلاً خلقت نور احمدیؐ کے ابتدائی منازل کا حال جب کائنات میں کسی کا وجود نہ تھا خدا اور نور محمدیؐ کے تعلقات اور جذبات محبت کا یوں اظہار کیا ہے :—

بہ اشتیاق نظر کر کے اپنے نور پہ رب
یہہ بار بار تھا ارشاد ائے میرے مطلب

تمام خلق کو پیدا کریں گے میرے سبب
حبیب خاص کا دیتے ہیں آج تجھ کو لقب

شرف یہہ کس کو ملا ہے جو تو نے پایا ہے
خدا کے بعد ترا سب سے بڑھ کے پایا ہے

سماں وہ نور کا وہ شان جلوۂ معبود
سر نیاز جھکائے وہ سامنے مقصود

اُدھر تھا بحر کرم جوش پر پئے محمود
ادھر جبین نبیؐ بے قرار بہر سجود

وہاں کا حکم یہہ تھا تو ہے افضل و اعلیٰ
یہاں زبان پہ سبحان ربی الاعلیٰ

حضرت اسمٰعیل سے لیکر آنحضرت صلعم تک تیس پشتیں گذری ہیں حضرت اسماعیل کے بعد آنحضرتؐ تک کوئی پیغمبر ہوا اس حقیقت کو کاظم کی زبان سے سنئے ؎

رہا ہے نور اسی سلسلہ میں جلوہ کناں — نبی نہیں نہ سہی سب تھے صاحبِ ایماں
گذر کے تیس منازل سے یہ مہ تاباں — ہوا سپہرِ عرب پر ہلالِ عید عیاں

طلوع مکہ میں جب نیرِ سعید ہوا
جہاں کے واسطے وہ یوم۔ یومِ عید ہوا

نور محمدی کی کیا وجدانی تعریف کی ہے:۔

وہ نور جو یدِ قدرت کی اولیں تحریر — وہ نور جس سے عیاں حسنِ خاص کی تنویر
وہ نور جو ۱۴ شبیہوں کی ایک ہی تصویر — وہ نورِ خوابِ خدیجہؓ کی جاگتی تعبیر

مقامِ عجز میں تاجِ سرِ نیاز کیا
وہ نورِ خلق جسے کرکے حق نے ناز کیا

وہ نور جس سے نظر آج تک ملا نہ سکا — کلیم جس کے نظارہ کی تاب لا نہ سکا
امیں وہ کہ امانت پہ حرف آ نہ سکا — وہاں گیا کہ جہاں اور کوئی جا نہ سکا

رموز پردہ سے واقف رہا علیم ایسا
کلامِ حق سے کیا عرش پر کلیم ایسا

وہ نور محرمِ اسرارِ ذاتِ لایزلی — وہ نور جس کے ہمراہ تھا [illegible] جلی
وہ نور جس کے سبب راہِ حق جہاں کو ملی — وہ نور نامِ محمد ہے جن کا اور علی

اگرچہ نور کا دو جا یہاں ظہور ہوا
پھر آ گئے مل کے وہی نور ایک نور ہوا

بنا ازل میں ابد تک وہ نور قائم ہے — خدا کے جملہ خلائق کا بس وہ حاکم ہے
نظامِ دنیوی و دیں کا وہ ناظم ہے — جنان و کوثر و تسنیم کا وہ قاسم ہے

کوئی مقام ہے ایسا جہاں نہیں رہتا
خدا کے نور سے خالی جہاں نہیں رہتا

خلقت کائنات کی وجہہ ملاحظہ ہو ؎

سوا خدا کے کسی اور شئے کا تھا نہ وجود
نہ عرش و فرش نہ کرسی نہ لوح کا تھا وجود
نہ بندگی نہ عبادت نہ تھا قیام و قعود
برائے سجدہ نہ تھا کوئی گرچہ تھا مسجود
ہوا خیال کہ دکھلائے کنز مخفی کو
لباس ہستی میں لائیں ضمیر مانی کو
کہ تاکہ عظمت و جبروت خالق دوجہاں
مثال آئینہ ہر جزو کل پہ ہوئے عیاں
نظر وہ آئیں کرشمے کہ عقل ہو حیراں
نہ چھو سکے جنہیں ادراک و عقل و فہم و گماں
جھکائیں سر در معبود پر عبادت کو
بس انکو دیکھ کے سمجھیں خدا کی قدرت کو

آتش نمرود میں نور محمدی کا کرشمہ کس مزے سے دکھاتے ہیں ؎

اسی کے نور سے ممتاز تھے خلیل ودود
جبین پاک سے یہہ نور کر رہا تھا صعود
دکھا رہا تھا اثر ان کا طالع مسعود
گزند دیتی بھلا خاک آتش نمرود
بجھا کے آتش کفر ذلیل کو نکلا
یہہ نور لے کے سلامت خلیل کو نکلا

غزل گوئی | کاظم کی غزلیں ان کے ذوق صحیح، بلندی نظر، جودت طبع کی آئینہ دار ہیں صنائع و بدائع کے التزام کو خیال کی رکاکت کا باعث سمجھتے ہیں۔ عاشق مزاج شاعر تھا۔ بزرگان دین سے عشق صادق کا غزلوں میں جگہ جگہ اظہار کیا ہے پریم کی بوالعجبی کس والہانہ انداز میں دکھائی ہے:-

نہ نکلی چاک دامانی پہ بھی اللہ ری الفت — زلیخا کی تمنا رہ گئی یوسف کے داماں میں

وفور شوق دید تو دیکھئے ؎

جو نیند آجاتی ہے شب کو تو شوق دید ہے ایسا — تلاش یار میں چھپ چھپ کر مرے ارماں نکلتے ہیں

اب تک تو حسن کو عالمگیر کہا کرتے تھے اب فلک گیر بھی کہنا پڑا ؎

ہوا ہے ماہ کامل بھی تو تیرے حسن کا شیدا — ہلال عید بن کر آ گیا چاک گریباں میں

چند سیدھے سادے لفظوں میں جوانی کی تعریف کیا کی ہے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہر طرف سے لگی ہوئی ہے نظر — چشم بد دور کیا جوانی ہے

یار حالِ دل پوچھتا ہے تو جواب دیتے ہیں ؎

حال دل کیا پوچھتا ہے دیکھ لے خود آنکھ سے — وہ نگاہیں جا رہی ہیں دل مرا لوٹے ہوئے

شعر بالا میں عشق کی "من تو شدم تو من شدی" والی منزل کا اظہار ہے۔ میری نگاہیں تیری نگاہیں ہیں۔ میری آنکھ سے جو شعاعِ نظر نکل رہی ہے وہ تیری ہی نگاہ ہے جو میرا سرمایہ دل لوٹ کر میری آنکھوں کی راہ بھاگے جا رہی ہے۔ کاظم کی چند غزلیں اور سلام بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:۔

غزل

نگہ ناز سہی وصل کا پیماں نہ سہی — تیر دلدوز سہی قتل کا ساماں نہ سہی

جان دینگے بھی تو جاناں کے قدم پر گر کر — کافر عشق سہی صاحبِ ایماں نہ سہی

مست آنکھیں تیری کافی ہیں تسلی کیلئے — نہ سہی دور میں جام مئے عرفاں نہ سہی

آخر اس بت کے بھی درشن کو چلو اے کاظم — دو گھڑی کیلئے تم آج مسلماں نہ سہی

مبارک اے جنوں ہم بے سر و ساماں نکلتے ہیں — گلوں کی طرح کپڑے پھاڑ کر عریاں نکلتے ہیں

شب وصل اور شب ہجراں میں تارے گن چکا ہوں میں — کبھی خنداں نکلتے ہیں کبھی گریاں نکلتے ہیں

کیا دنیا کو میں نے ترک تو سب لوگ کہتے ہیں — وہ آغوش زلیخا سے مہ کنعاں نکلتے ہیں

سلام

تشنہ لب جب احمد مختار کا جانی رہے ہائے پھر کس کام کا دنیا میں گر پانی رہے
مدحت شاہ شہیداں میں درافشانی رہے جب تلک زندہ رہوں شہ کی ثنا خوانی رہے
ماتم شبیر میں طوفاں اٹھا اے چشم تر قیمتی ہوتا ہے موتی جس قدر پانی رہے

کاظم کی چھوٹی بحر کی غزلوں میں غضب کا ترنم اور شعریت بھری ہوئی ہے

سر برہنہ جسم عریاں آبلے پھوٹے ہوئے آئے ہیں صحرا نوردی کا مزا لوٹے ہوئے
چل گئی ہے میکشی میں کیا کسی بدمست سے ساقیا ہیں آج کیوں ساغر ترے ٹوٹے ہوئے
تیرے آنے سے یہاں دل میں بہار آئی مرے داغہائے حسرت و غم کہہ کے گل بوٹے ہوئے

نالے بیکار ہیں تاثیر بگڑ جاتی ہے ہائے بنتی ہوئی تقدیر بگڑ جاتی ہے
نامۂ شوق تو لکھتے ہوئے گھبراتا ہوں مطلب وصل پہ تحریر بگڑ جاتی ہے
ناز اس میں بھی جھلکتے ہیں ترے اے قاتل چلتے چلتے تری شمشیر بگڑ جاتی ہے
چپ جو رہتا ہوں تو ارمان ڈھکے جاتے ہیں خواب کہتا ہوں تو تعبیر بگڑ جاتی ہے

کاظم نے تقریباً ڈیڑھ سو سلام کہے ہیں جن میں سے اکثر مقامی سوزخواں پڑھا کرتے ہیں ان کے علاوہ کثیر تعداد میں رباعیات و غزلیات کہی ہیں جو بہ شکل دیوان عنقریب شائع ہونگی نمونتہً دو رباعیاں پیش ہیں:۔

رباعی

ساجد ہے جہاں جسکا وہ مسجود ہے تو کیا شک ہے کہ عالم کا معبود ہے تو
وحدت سے تیری چلتا ہے کثرت کا پتہ دنیا کے ہر ایک فرد میں موجود ہے تو

کاظم کی رباعیوں میں سرمدی رنگ پایا جاتا ہے۔

رباعی

شبیر نے دنیا میں عجب نام کیا امت کی رہائی کا سرانجام کیا
سر بھی دیا گھر بھی دیا اولاد بھی دی جو ہو نہ سکا کسی سے وہ کام کیا

اقدسؔ

عبّاس حسین مرحوم

۱۳۲۱ھ تا ۱۳۴۸ھ

از۔ رشید احمد صاحب

اقدسؔ کی شاعری ایک ایسے زمانے میں شروع ہوئی جب ہر طرف جدید شاعری کا بول بالا تھا اور ہر شاعر اسی رنگ میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا چنانچہ انکا کلام بھی ایک حد تک جدید رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے جذبات کی تصویر کھینچنے میں انکو کمال حاصل ہے بعض جگہ انہوں نے عام خیالات کو بھی شعری سانچہ میں ڈھال دیا ہے مگر اس خاص انداز و نزاکت سے کہ پڑھنے والا اسلوب بیان کی خوبی و نفاست ہی میں گم ہو جاتا ہے۔ زبان، اسلوب بیان اور انتخاب الفاظ یہ ایسی چیزیں ہیں جو پامال سے پامال مضمون میں شعریت کی روح پھونک دیتے ہیں۔ جب کسی اچھے مضمون کو سیدھے سادھے مگر دلکش انداز میں، شستہ و صاف مگر برمحل الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے تو شعر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے اور ایسے ہی چند اشعار ہوتے ہیں جو کسی شاعر کی شہرت اور بقائے دوام کا باعث ہوتے ہیں۔ اقدسؔ کی شاعری اسی طرح کی خوبیوں سے مالامال ہے۔ انکے کلام کا غائر مطالعہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ انکی شاعری انکے دل کی آواز ہے۔ ہر شعر میں بلا کا درد و اثر بھرا ہوا ہے۔ تصنّع اور آورد نام کو نہیں، جس چیز کو بیان کیا اسکی پوری تصویر کھینچ دی۔ ایسے ہی باکمال شعراء ہیں جن پر دکن ہمیشہ بجا طور پر فخر کرتا رہا ہے۔

افسوس ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے ہمیں اقدسؔ مرحوم کے تفصیلی حالاتِ زندگی معلوم نہ ہوسکے اسمیں شک نہیں کہ یہ زمانۂ حال کے شعراء میں ہیں مگر انہیں شہرت اور ناموری کی خواہش نہ تھی۔ انکی شاعری انکے شوق کی تکمیل تھی اسی لئے وہ ہمیشہ علحدہ علحدہ رہے اور اسی طرح اپنی زندگی گزار دی ڈاکٹر زورؔ نے "کیفِ سخن" کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"بیچاسوں (شاعر) ایسے ہیں جن کے کارنامے موجود ہیں۔ مگر جن کے حالات (اور بعض دفعہ تو مصنف کے نام تک) سے دنیا آج ناواقف ہے۔ اور نہ معلوم ایسے کتنے ہونگے جنکے نام و نشاں اور کارنامے دونوں اسوقت ناپید ہیں"۔

اقدس اور انکے کلام کا بھی یہی حال ہوا۔ انہوں نے کچھ ایسی گمنامی اور عالم یاس میں اپنی زندگی گزار دی کہ بہت کم اصحاب انکے حالات سے واقف ہو سکے۔ یہاں تک کہ انکے رات دن کے ملنے والے احباب اور شعراء بھی انکے متعلق صرف سطحی باتیں جانتے ہیں۔ اسلئے مجبوراً ہم ان ہی حضرات کے بیان کا ایک خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ایسے اصحاب بھی ہوں جنہیں انکے تفصیلی حالات زندگی معلوم ہوں مگر افسوس ہے کہ ہم کو اُن کا پتہ نہیں چل سکا۔

عباس حسین اقدس تقریباً ۱۳۳۱ھ میں مضافات بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ والدین کی غربت کی وجہ سے انکی ابتدائی زندگی طرح طرح کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں بسر ہوئی۔ باوجود ان تمام دقتوں کے اقدس کی تعلیمی حالت نہایت درخشاں نظر آتی ہے۔ یہ محض انکا ذاتی شوق تھا ورنہ انکے لئے کوئی ایسی سہولتیں تو نہ تھیں کہ وہ آسانی سے تعلیم حاصل کر سکتے۔ مشہور ہے "شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں" لیکن اسکے پہلو بہ پہلو یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب تک فطری استعداد کو مناسب ماحول اور معقول تربیت نصیب نہ ہو اسکا اصلی رنگ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ اقدس بچپن ہی سے تعلیم کے دلدادہ رہے اردو فارسی میں اچھی استعداد حاصل کر لی۔ ذوق شعر ازل ہی سے یہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ انکی زندگی کا بیشتر حصہ اورنگ آباد میں گزرا۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں ہمیشہ سے شعر و شاعری کے چرچے رہے ہیں۔ اور جہاں کی خاک پاک سے سیکڑوں باکمال شعرا پیدا ہوئے اقدس اول اول زاہر صاحب ذوق دوست سے مشورہ سخن کیا کرتے مگر خاص طور پر پروفیسر وحید الدین سلیم مرحوم کو اپنا استاد مانتے تھے۔

اورنگ آباد میں ہر ماہ ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا جسکی منتخب غزلوں کا مجموعہ "گلدستہ" کے نام سے شائع کیا جاتا تھا اقدس ہمیشہ اس ماہواری مشاعرہ میں شریک رہتے۔ جلد ہی دن میں انہوں نے نہ صرف حلقہ احباب میں بلکہ دور دور تک خاصی شہرت حاصل کر لی۔ انکی زندگی تکالیف و آلام کا ایک لامتناہی سلسلہ تھی یہی وجہ ہے کہ انکا ہر شعر قنوطی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ خصوصاً انکی زندگی کا آخری زمانہ انکے لئے انتہائی مصیبت کا زمانہ تھا بے حد مفلس تھے۔ بیمار ہو گئے تھے ضعف اور ناتوانی اتنی بڑھ گئی تھی کہ دفتر تک بھی پیدل نہ جا سکتے تھے اتفاق سے اسی زمانہ میں طاعون کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اور اقدس اچانک طاعون

میں مبتلا ہوگئے۔ بالآخر ستائیس سال اس جہان فانی میں گزار کر ۱۳۴۸ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

اقدس کے انتقال سے کچھ دن قبل انکے ایک دوست مولوی ظہور الحسن قریشی صاحب نے محض اپنی کوشش سے انکے کلام کا ایک مجموعہ "ریاض افکار" کے نام سے چھپوایا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ بھی بہت ہی مختصر اور منتخب ہے۔ جہاں تک ہم نے معلوم کیا ہے انکا بہت کچھ غیر مطبوعہ کلام موجود ہے مگر یہ معلوم کس کے ہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔ اس مختصر سے مجموعہ میں جملہ تئیس ۲۳ غزلیں اور نو نظمیں ہیں۔ اسی مجموعہ میں مولوی غلام طیب صاحب بی اے بی ٹی استاد ادبیات اردو عثمانیہ کالج اورنگ آباد کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ اچھا ہوتا اگر مولوی صاحب موصوف اسی کے ساتھ "اقدس کے حالات زندگی" پر بھی تفصیل سے لکھتے تاکہ انکی شاعری کی عظمت کے ساتھ ساتھ انکی زندگی کے حالات معلوم کرنے میں بھی سہولت ہوتی۔ مگر کسے معلوم تھا کہ یہ مجموعہ کلام اقدس سب سے پہلا اور آخری مجموعہ ثابت ہوگا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا اقدس فطرتاً شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ اورنگ آباد کی زندگی اور وہاں کے علمی ماحول نے انکے ذوق کو چار چاند لگادئے۔ ساتھ ہی ساتھ شوق سخن بھی بڑھتی گئی۔ چند ہی دن میں انکے کلام میں استادانہ رنگ پیدا ہوگیا۔ "ریاض افکار" مجموعہ کلام اقدس کے مقدمہ میں پروفیسر غلام طیب صاحب لکھتے ہیں:-

"مولوی محمد عباس صاحب اقدس پرانے کہنے والوں میں ہیں۔ اور مقامی شعراء میں آپکا کلام امتیازی شان رکھتا ہے۔ آپکے اشعار کا موجودہ مجموعہ اس قدر مختصر ہے کہ شاید ہی لوگوں کو اس سے تشفی ہو۔ مگر اس سے جناب اقدس کی شاعری کے خصوصیات واضح ہوجاتے ہیں۔ اور اختصار کی وجہ سے کلام کے مطالعہ کی بھی ہمت ہوتی ہے۔ جناب اقدس کا کلام اکثر رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ میں ذاتی واقفیت کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ باوجود استادانہ شہرت کے آپ اپنے احباب سے اپنے کلام کے متعلق مشورہ کرتے ہیں جو بڑی اچھی بات ہے۔

اقدس صاحب کے کلام میں خاص جدت پائی جاتی ہے۔ اردو زبان اور شاعری کے مذاق میں جو تغیرات غیر محسوس طریقہ پر اس دس سال میں ہوئے انکا اثر ہر طبقہ کے شعراء پر پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقدس صاحب کی غزلوں میں گل و بلبل ہجر و فراق کے مبتذل مضامین پائے جاتے ہیں اور نہ ان میں مبالغہ آمیز جذبات کا ہجوم ہے۔ غالب اور اقبال کی تقلید

لفظی و معنوی کا عام شوق ان میں بھی نظر آتا ہے یہ کوئی بری بات نہیں اس سے شعراء اور عوام کے مذاق کی اصلاح ہوتی ہے۔

اقدس صاحب ابتذالیت اور پامال مضامین سے اجتناب کرتے ہیں۔ نئی نئی ترکیبوں عمدہ بندشوں اور نرالے خیالات سے باغ ادب کی چمن بندی کرتے ہیں، محاورات کے برمحل استعمال سے ان کے کلام میں خاص بات پیدا ہو گئی ہے نظموں میں بعض وقت ایسی تڑپ دکھاتے ہیں کہ طبیعت لوٹ جاتی ہے۔ غزلوں سے مشق کی پختگی کا پتہ چلتا ہے"۔

اقدس مرحوم کے کلام کی پہلی اور نمایاں خصوصیت قنوطیت ہے وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ انکی زندگی طرح طرح کی تکلیفوں اور افلاس ہی میں ختم ہو گئی جسکا اثر انکے کلام میں آنا لازمی تھا چونکہ شاعر نے ہر جگہ قلبی واردات اور آپ بیتی بیان کی ہیں۔ اس لئے کلام میں بلا کا درد و اثر بھرا ہوا ہے خصوصاً بعض بعض شعر تو داخلی حسرت و یاس کا مرقع اور انتہائی درد میں ڈوبے ہوئے ہیں

ہمیں تڑپا رہا ہے انتظار وعدۂ محشر ۔۔۔ یہی لے دے کے اک دن ہے ہماری شادمانی کا
خدا معلوم آخر کب چھٹیں گے قید ہستی سے ۔۔۔ مقرر ہی نہیں ہے وقت مرگ ناگہانی کا
بے مائگی غم کی شکایت بھی مٹ گئی ۔۔۔ قسمت نے مجھکو داغ تمنا دیا ہے اب
ترا دست ستم بھی باغباں شانے سے کٹ جائے ۔۔۔ غضب ہے چھانٹ کر چھانٹا مری شاخ نشیمن کو

سلاست و روانی | کلام اقدس کی دوسری خصوصیت سلاست و روانی ہے۔ اس اعتبار سے ان کے اکثر شعر امتیازی شان رکھتے ہیں۔ مثلاً ؎

دل ڈھلا وہ آنے والے ہیں الٰہی کیا کروں ۔۔۔ ہوش میں آنے نہیں دیتی ہے بیہوشی مجھے
فرقت نصیب تنگ ہیں ہیں دعا گو ۔۔۔ گھبرا گئے ہیں کشمکش انتظار سے
تم کیا بگڑ گئے کہ زمانہ بگڑ گیا ۔۔۔ تم کیا خفا ہوئے کہ زمانہ خفا ہے اب
وہ اٹھا پردہ لڑیں نظریں گئے ہوش و حواس ۔۔۔ اے دل حسرت زدہ یہ کیا تماشا ہو گیا
جو نہ کرنا تھا کیا حسن کی خاطر ہم نے ۔۔۔ جو نہ ہونا تھا ہوا عشق کی رسوائی میں
قیامت ان کا شباب برپا کریگا دنیا کی محفلوں میں ۔۔۔ ہر صورت حسن رفتہ رفتہ ادا کے سانچے میں ڈھل رہی ہے

کبھی ہم آرزو کرتے نہ پھر ملنے ملانے کی
اگر یہ جانتے ہوتے کہ تم آ ہی نہیں سکتے

کر چکا ہوں عشق میں کس لیے وفا سے مدتوں
یاد آتا ہے وہ آئین وفا کوشی مجھے

کیا دکھاتی ہے خدا معلوم اقدس دیکھنا
اسکی خودداری ہے اسیری ہوس کوشی مجھے

ناکام جا رہا ہے کوئی بزم یار سے
ہوش و حواس کھو کے دل بیقرار سے

نالہ برہم اشک مضطر آہ بینیا بانہ ہے
ہو گئے ساماں مری بربادئی تقدیر کے

اقدس ہے جس کا نام وہ عاشق مزاج ہے
خوش ہو گئے ملکے آپ بھی اس جانثار سے

ہزاروں بار پڑھ کر لوح قسمت میں نے دیکھی ہے
لکھی ہے لکھنے والے نے جفا اُن کی تو میری

اقدس کے کلام کی تیسری خصوصیت مضمون آفرینی ہے۔ عاشق انتہائی درد و کرب کی حالت میں فریاد کرنا چاہتا ہے۔ مگر اسکی زبان رکتی ہے وہ فریاد بھی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ شکایت میں زبان کھولنا آداب عاشقی کے خلاف سمجھتا ہے اس مضمون کو اقدس نے خاص جدت سے ادا کیا ہے ؎

کیوں ہوئے دامن فریاد کے ٹکڑے ٹکڑے
خار حسرت تو نہ تھا قلب تمنائی میں

دل پر تمنا کے داغ نہیں آسمان غم کے تارے ہیں خزاں کی باد سموم کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا

گل داغ تمنا آسمانِ غم کے تارے ہیں!
خزاں آئے اٹھے آندھی یہ مرجھا ہی نہیں سکتے

محبت میں شکایت و شکوہ سچے عاشق کا شیوہ نہیں۔

زباں ٹکڑے ہوئی جاتی ہے جرم داد خواہی پر
سزا اچھی ملی ہے شکوہ سنج درد الفت کو

جگر سے اتنا خون بہا کہ اس کی ہر موج دل کے لئے گہوارہ بن گئی اور وہ دل جو کشتۂ ناز ہے خون جگر کی موج کے آغوش ناز میں محو خواب ناز ہے۔ اس مضمون کی جدت ادا ملاحظہ کیجئے۔

دل محو خواب ناز ہے آغوش ناز میں
گہوارہ بن گئی مرے خون جگر کی موج

انتہائی یاس و اضطراب کے عالم میں عاشق خدا سے دعا کرتا ہے کہ اس مصیبت سے نجات ملے اس دعا کی تعریف اقدس نے جس انداز میں کی ہے وہ فن سے باہر ہے

کہیں ایسا نہ ہو یہ منزلِ تاثیر پر بھٹکے ہجومِ یاس سے گھبرا کے نکلی ہے دعا میری

محبوب کے ہونٹوں کی جنبش سے عاشق میں جان آجاتی ہے۔ اگر "لب معجز نما" بد دعا بھی کریں تو قبول نہ ہوگی۔

لب معجز نما سے کوسنے بیٹھے ہیں وہ مجھ کو قیامت تک نہ آئی ہے نہ آئے گی قضا میری

ذیل کے اشعار اقدس کی محاورہ بندی اور روزمرہ کا نمونہ ہیں ؎

نظر پھر پھر کے پڑتی ہے تجھی پر اب زمانے کی نکھر جانا قیامت ہو گیا رنگِ جوانی کا

آئے ہیں ہوش میں تو کیا دیکھ سکے نہ تجھکو ہم پڑ گئی کھلبلی سہی کچھ قوتِ امتیاز ہیں

خود کام آشنا ہیں غرض آشنا ہیں ہم پھرتے کہیں خدا کی قسم آپ کا ہیں ہم

جذبۂ دل سے مرے آپ جھجکتے کیوں ہیں آپ تو کہتے تھے اس میں کوئی تاثیر نہیں

جسے کہتے ہیں جانبازی وہی ہے چارہ سازی بھی جو اپنی جان پر کھیلیں وہی کچھ کر نکلتے ہیں

آسماں کوئی ستمگر ہے ستمگر تم ہو اس سے دو ہاتھ ہو بڑھ کر ستم آرائی ہیں

ہمیں سے کیوں چشم پھر آگئیں بشکل قسمت بدل رہی ہے ہمیں پہ کمبخت دشمن جاں یہ زہر کیا اگل رہی ہے

برا ہو اس گردشِ فلک کا کہیں کا رکھا نہ مجھ کو اقدس یہی وہ آفت ہے مدتوں سے جو مونگ چھاتی پہ دل رہی ہے

مریض غم کے تیور دیکھ کر تم کیوں جھجکتے ہو مرا ذمہ پہلے آئے جو ایسے ہیں قضا میری

دینے والے واہ تیری دین کے قربان ہیں دل مجھے تو نے دیا درد محبت کے لئے

تو اگر خوش ہے تو اقدس بھی اسی پر خوش ہے تیری خاطر سے گوارا تری بیداد بھی ہے

اقدس کے کلام کی پانچویں خصوصیت پند و موعظت ہے۔

جن کے دلوں میں "ترقی کی امنگیں" ہوتی ہیں جو بلند ارادے رکھتے ہیں وہ ضرور کسی نہ کسی دن اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اقدس مرحوم اسی "ہمت بلند دار" کے مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:-

ترقی کی امنگیں دل میں جو لیکر نکلتے ہیں وہ شاخِ زندگانی پر ثمر بن کر نکلتے ہیں

دولت حاصل کرنے کے لئے عزت کو ہاتھ سے دینا عقلمندی کا شیوہ نہیں۔ دولت ہر طرح سے ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے مگر عزت وہ انمول ہوتی ہے جو ایک بار ٹوٹنے سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بیکار ہو جاتا ہے یہی نہیں کسی سے کچھ مطلب برآری کی امید بھی ہو تو خوشامد کرنا اقدس کے نزدیک "شانِ بشریت" کے خلاف ہے۔

کیوں ملائیں خاک میں عزت کو دولت کے لئے　　کیوں خوشامد پر ہوں مائل عرض حاجت کے لئے

اقدس مصیبت زدہ ہیں۔ اور مصیبت زدگان جہاں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں:۔

اُٹھیں فتنے قیامت آئے ٹوٹے آسماں سر پر　　مصیبت کے جو خوگر ہیں وہ گھبرا ہی نہیں سکتے

خزاں و بہار کے باہم دست و گریباں ہونے کو یوں ظاہر کیا ہے:۔

یہ مدعا ہے کبھی یاد رنگ و بو نہ کریں　　خزاں کو ساتھ لگا لائی ہے بہار حیات

جسے کہتے ہیں جانبازی وہی ہے چارہ سازی بھی　　جو اپنی جان پر کھیلیں وہی کچھ کر نکلتے ہیں

جنہیں سچی لگن ہو صبح درویشی کے جلوؤں کی　　بجھا کر شمع دولت گھر سے وہ باہر نکلتے ہیں

اقدس کے کلام میں فلسفہ و تصوّف کا بھی عنصر ہے۔ ذیل میں اس قسم کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جس سے ان کے تخیلات کا اظہار ہوتا ہے

وہاں تھا ہم جلوہ ہے یہاں جلوہ بس جلوہ　　ہمارے دل سے کیا نسبت تجلی گاہ ایمن کو

نشۂ وحدت اس میں ہے کیف حقیقت اس میں ہے　　جام جو پی چکا ہوں میں خمکدۂ مجاز میں

تجھے پردے سے باہر آشنا لا ہی نہیں سکتے　　تری گمنامیوں کا راز سمجھا ہی نہیں سکتے

حقیقت میں نظر ہے دیر پر اپنی نہ کعبہ پر　　جسے ہم دیکھتے ہیں اسکو دکھلا ہی نہیں سکتے

دم سے اسی کے ہی یہ جہاں میں چہل پہل　　ہنگامہ عشق کا ہے بپا حسن یار سے　　کیوں ہر نفس بپا ہے یہ شور رواروی　　کیا مدعا ہے زندگیٔ مستعار سے

تیری چاہت کا کریں دعویٰ یہ ممکن ہی نہیں　　لاکھ اہل دل ہوں پیدا تری چاہت کیلئے　　تو اشارہ کر تو کر دیں دامن ہستی کو چاک　　منتظر ہیں تیرے وحشی جنبش زنجیر کے

اب ہم ذیل میں چند شعر مثالاً درج کرتے ہیں۔ جو نہ صرف دلکشی اور جدّت ادا کے حامل ہیں بلکہ اسلوب اور پیرایۂ بیان کے اعتبار سے بھی اقدس کی غیر معمولی شاعرانہ قابلیت کا مرقع ہیں۔

ایک ہی چھینٹے میں الفت کیسے تجھے کیا ہو گیا ایک طوفاں حسرتوں کا دل میں پیدا ہو گیا انگلیاں اٹھنے لگیں یہ کیا تماشا ہو گیا بیٹھے بیٹھے میں تری محفل میں رسوا ہو گیا

ایک ہی چٹکی ترے غمزے نے لی تھی قلب میں میری رگ رگ میں بلا کا درد پیدا ہو گیا کیا کروں اٹھتے تیر میں یہ لطف ناتمام ایک ارماں رہ گیا گر ایک پورا ہو گیا

ایک حرف درد تھا آیا تھا جو لب تک ابھی شہرۂ عالم مرے دل کا فسانہ ہو گیا

ہمارا دل پکڑ کر آہ کرنا تو قیامت تھا قیامت پر قیامت تھا ترا ہمدرد ہو جانا

پہلے ہلا چکی ہے فلک کو جو بار بار! کیوں ایسی نارسا مری آہ رسا ہوا کس کس کی روک تھام کروں بیکسی کے وقت تیری طرح سے جان بھی مجھ سے خفا ہوا

اللہ رے جوش گریۂ بے اختیار شوق سیلاب بن گئی ہے مری چشم تر کی موج

دل کے غبار کی ہیں یہ رنج آفرینیاں تم سے اگر خفا ہیں تو سب سے خفا ہیں ہم اے کاش آپ بھی کہیں کس سے وفا پہ لوٹ پھر دیکھنا دکھائیں گے کیسے ہیں کیا ہیں ہم

او جانے والے روٹھ کے بزم خیال سے چشم عتاب ہی سے ادھر دیکھ کیا ہیں ہم

لوٹ جاتی ہے نظر دیکھ کے جلوہ تیرا! کون سے ناز میں پنہاں تری رعنائی میں

پس چلمن چھپا دو گے کہاں تک روئے روشن کو بس اب برق تبسم سے لگا دو آگ چلمن کو سمجھ لیتی کہ چاک دامن عصمت ہے وہ تیرا زلیخا چاک کرتا تھا اگر یوسف کے دامن کو

مٹی ہوئی ہستیوں کا ماتم کرے گی اب آنے والی دنیا تغیرات جہاں کی صورت نظر کے سانچے میں ڈھل رہی ہے

مریض غم میں تو بے حسی تھی کہاں سے آئی یہ جان رفتہ لبوں کو جنبش جو ہو رہی ہے فغاں لبوں سے نکل رہی ہے

نہاں رگ رگ میں ہے جو کیف اسے کیونکر کریں ظاہر متاع درد وہ شے ہے کہ دکھلا ہی نہیں سکتے !!!

غلط انداز نظروں سے اگر دیکھا تو کیا دیکھا کلیجے کو تو ایسے تیر برما ہی نہیں سکتے

رہے ہیں مدتوں جو قید ہستی کی کشاکش میں ہم اس پاس وہ دل تجھ سے گھبرا ہی نہیں سکتے

میں خوش ہوں میری خرمن ہستی کو پھونک دو بجلی گراؤ حسن تبسم شعار سے

اف نہ کی ہم نے زباں سے دیکھ کر ان کے ستم دل ہی دل میں کچھ بھرے درد محبت کے لئے

مسکراتا آ رہا ہے پھر کوئی گیسو بدوش چارہ گر اب تھم چلے ہیں تا مری زنجیر کے قطرہ اشک ندامت سے ادھر جبیں تھی ہوا دھل گئے اقدس ادھر دفتر مری تقصیر کے

اے فلک مجھ کو گرایا نگہ یار سے کیوں! اس سے بڑھکر مری تقدیر میں افتاد بھی ہے

ایسی فریاد سے خاموش ہی رہنا اچھا　ہاں دکھائے کوئی تاثیر تو فریاد بھی ہے　تو اگر خوش ہے تو اقدس بھی اسی میں خوش ہے　تیری خاطر سے گوارا تری بیداد بھی ہے

نظمیں　اقدس نے جسطرح رنگ تغزل میں اپنا خاص کمال دکھایا ہے اسی طرح انکی نظموں میں ایک خاص جدت پائی جاتی ہے۔ اُن کی ایک نظم "تجلیات سحر" ہے جس کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

ذرے ہیں جگمگا رہے نور کا وقت ہو گیا　آتی ہے آبشار سے نغمہ عشق کی صدا
سبزے سے دشت پٹ گیا جوش نمو کا یہ اثر　رنگ فضا کو دیکھکر محو سرور ہے نظر
سرخ سپید پھولوں کا رنگ بھی شوخ و شنگ ہے　چشم حقیقت آشنا دیکھ کے حسن کو دنگ ہے
تند ہوا سے جھڑ گئے پتے جو زرد زرد تھے　ٹہنیاں سبز ہو گئیں تازہ شگوفے ہو گئے
تاب نظارہ ہے کہاں چشم نظارہ باز کو　کھوئے ہوئے ہیں اب تو ہم قوت امتیاز کو
زینت حسن میں ہی محو صبح کو در دے مہوشاں　آئینے میں سما گئیں حسن کی پھر تجلیاں

نرگس اگر ہے زرفشاں لالہ بھی شعلہ ریز ہے　پھولوں سے چھیڑ کرتی ہے موج ہوا تو تیز ہے　دیکھ تو چشم دید باز تجھ میں کہاں ہے تاب ہے　تیری ہی نالش نظر تیرے لئے حجاب ہے

بلبل بے نوا کے اب نالے شرر فشاں نہیں　آہ نہیں، بکا نہیں، یاس نہیں، فغاں نہیں
ظلمتیں شب کی چھٹ گئیں پھیل گئیں تجلیاں　جام جہاں نما ہے یہ کہئے اسے نہ آسماں
صدر نشیں بنا ہوا مجلس کائنات کا　جس نے کے ذمہ لیا تازگیٔ حیات کا

اُن کی اور ایک نظم "میرا بچپن" ہے :-

ہائے کیسی زندگی بچپن کی تھی جنت نما　میں شکار درد و غم کب تھا نصیب دشمناں　ماں کا ہنس دینا اچانک میری صورت دیکھکر　منہ پہ منہ رکھکر کبھی وہ چوسنا ننھی زباں
محو انداز تبسم تھے لب نازک مرے　بات کرنے کو ترستی تھی بہہ ننھی سی زباں
مطلع امید روشن تھا نظر کے سامنے　یوں تو محو خواب تھا میرا دل عبرت نشاں　طفل دل کے واسطے قوس قزح گہوارہ تھی　ننھے تارے دے رہے تھے خواب آور لوریاں
یاد آتے ہیں مجھے برسات کے برق و سحاب　تھیں مجھے گھیرے ہوئے ظلمت ربا تابانیاں
ہوش کے آتے ہی دروازے ستم کے کھل گئے　مدعا زندگی کیا ہے یہ میں سمجھا نہ تھا　سب کے سب تھے ہیچ اپنی خوبیٔ تقدیر کے　موج ہستی میں نہاں طوفان ہے یہ دیکھا نہ تھا

اے دلِ نا عاقبت اندیش تجھ سے کیا کہوں — اب ترستا ہوں میں جیسا یوں کبھی ترسا نہ تھا

اقدس کی نظم "طفلِ حیثیت" سلاست اور پیرایہ بیان میں لاجواب ہے۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں:-

کبھی جلوہ گر نہ ہوا اثر مری التجائے نیاز میں — ہیں غرور ناز کی جھلکیاں ترے حسن شعبدہ باز میں
یہی رنج ہے کہ نوا نہیں مرے دل کے پردۂ ساز میں — اُدھر ذرا تو ڈال دے کھل اُٹھی کبھی گل کی محفل ناز میں
کوئی کیا کہے کوئی کیا کرے وہ ہے محوِ شرم و حجاب میں — مجھے اس سے خوف ہے ہر گھڑی کہ بگڑ نہ جائے عتاب میں
مری التجا کو قبولیت ہو تو کیوں کر اسکی جناب میں — ہے نزاکت اسکے مزاج میں ہوں میں اس سے سخت عذاب میں
کہوں کس زباں سے کہ بے وفا مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں — مرے حق میں تو نے نہ کی ہو جو کوئی ایسی طرزِ جفا نہیں
نہیں رحم دل میں ترے ذرا تجھے کچھ بھی خوفِ خدا نہیں — مرے دیکھیں قدرِ جفا ہے پر ترے دیکھیں قدرِ وفا نہیں

علاوہ اس کے ان کی ایک نظم "ملک عنبر کے کھنڈر سے خطاب" ہے۔

یادگار عہدِ ماضی رہ گئے ہیں جو کھنڈر — اب بھی اپنی شوکتِ رفتہ پہ ہیں نوحہ گر
خفتہ ہنگامے ہیں ان کے منظر غمناک ہیں — دیکھنے کو ان کی ہستی مل گئی ہے خاک میں

نقشِ فانی جم گیا تصویر دھندلی ہو گئی — چھا گیا ادبار تجھ پر تیری قسمت سو گئی
غلغلہ ہے یاس و حرماں کا ترے آغوش میں — ہے نہاں افسانۂ رنگین لبِ خاموش میں
اب کہاں دامن میں وہ رنگینیاں گلزار کی — لوٹتی ہیں خاک پر بیلیں در و دیوار کی
جس محل کے رہنے والے عیش سے مانوس تھے — جس محل کے دائیں بائیں سیکڑوں فانوس تھے
انکی تربت کا نشاں اے دیدۂ عبرت نہ پوچھ — اب مجھے تو چھیڑ کر اسلاف کی عظمت نہ پوچھ
رہ گیا ہے جو نشاں وہ خاک سے ہمدوش ہے — ذرہ ذرہ اب یہاں کا حشر خاموش ہے

علاوہ اس کے "خوابِ طفلی" "غمزدہ کوئل" "ایک غمزدہ لڑکی ماں کی قبر پر" "یادِ رفتگاں" وغیرہ اقدس کی بہترین نظمیں ہیں اور ایک عرصہ پہلے مشہور اردو رسالوں میں چھپ کر مقبولِ عام ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر میر عباس علی خان صاحب لمعہ

از

سید عبد الرشید صاحب قریشی

محمد عباس علیخاں صاحب لمعہ اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو اپنی قدیم روایات اور جنگی خدمات کی وجہہ سے نہایت ہی ممتاز حیثیت کا مالک ہے ان کے جد امجد عباس علیخاں کو فوجی مہمات کے سر کرنے کے صلہ میں دربار دہلی سے منصب پنجہزاری و خطاب خانی و بہادری اور دیگر اعزازات عطا ہوئے تھے جن میں سے بعض تو انکی زندگی تک تھے اور بعض نسلاً بعد نسلاً چلے آرہے ہیں۔ لمعہ کے والد محمد ابراہیم علیخاں حیدرآباد میں مہتمم شکارگاہ سرکار عالی کے معزز عہدہ پر فایز تھے اور آخر میں چلکر نواب سر نظامت جنگ بہادر نے انکی خدمات کی قدر کرتے ہوئے موٹر خانہ سرکار عالی بھی انہیں کے تفویض کردیا تھا فن شکار میں انکو بڑی مہارت حاصل تھی جسکا اعتراف خود لارڈ فرانسس اسکاٹ اے۔ ڈی سی والیسرائے بہادر نے اپنے ایک خط میں جو انہوں نے سر فریدوں ملک بہادر کے نام لکھا تھا ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"میں نے انکو دیکھا کہ یہ سخت سے سخت محنت برداشت کرنے والے ہیں اور بہت ہی مستعد اور فن شکار سے خوب واقف ہیں"

اپنی زندگی کے ابتدائی چار سال جعفرآباد میں ایک شفیق استاد کے زیر نگرانی گزار کر لمعہ اپنے والد کے پاس حیدرآباد چلے آئے۔ حصول علم کی خاطر انسان کو کئی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اپنے عزیزوں کی جدائی سب سے زیادہ روح فرسا اور جانگداز ہوتی ہے لمعہ کو بھی آغوش مادری چھوڑنی پڑی اور حیدرآباد میں اپنی پھوپھی کے زیر نگرانی پروان چڑھنا شروع کیا۔ پھوپھی کی محبت اور شفقت نے مہر مادری کو انکے دل سے محو کردیا اور انہوں نے جعفرآباد اور حیدرآباد میں کوئی نمایاں فرق یا اجنبیت نہ محسوس کی۔

بچپن میں سب ہی کھلنڈرے اور شریر ہوتے ہیں لیکن لمعہ کا بچپن اپنے ہم عمروں سے الگ تھلگ مطالعہ کتب و فطرت میں کٹا...... بچہ کے پاؤں پالنے ہی میں معلوم ہو جاتے ہیں۔

حیدرآباد میں انکی ابتدائی تعلیم ایک خانگی استاد کی محنت و خلوص کی مرہون منت رہی اور انہوں نے اپنی خداداد ذکاوت و فراست سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مشفق استاد کی رہنمائی میں بہت جلد اردو فارسی اور انگریزی میں خاصی استعداد پیدا کرلی۔

سٹی ہائی اسکول اپنی علم پروری کے لئے بہت مشہور رہے یہی وہ مدرسہ ہے جہاں سے ایسے ایسے طلباء نکلتے ہیں جنہوں نے اپنی لیاقت کا لوہا یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں سے منوالیا ہے۔ لمعہ نے بھی اپنی فوقانی تعلیم کو یہیں پورا کیا اسکول کی زندگی میں انکا شمار ممتاز خاموش اور سنجیدہ طلباء میں تھا۔ فرصت کے اوقات اپنے مخصوص دوست احباب جن میں سید محمد کرمانی مرحوم اور غوث داد خاں صاحب قابل ذکر ہیں صرف کیا کرتے۔

کالج انٹرنس امتحان کے بعد ۱۹۲۹ء میں "کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز" کے ڈپلومے کیلئے میڈیکل کالج بمبئی میں شرکت کی اور بمبئی میں ان کو پانچ سال تک مقیم رہنا پڑا۔

بمبئی کے دوران قیام میں لمعہ کے محبوب مشاغل مطالعہ کتب اور سیر و سیاحت تھے دریائے تپتی کے کنارے ہی انکی شاعری کی کلی پھولی یہیں کے دلفریب نظاروں کے مناظر نے انکی شاعری کے خوابیدہ ساز کو ٹکور دیا اور انہوں نے اپنے دلی جذبات کو اشعار کی شکل میں ظاہر کرنا شروع کردیا۔ یوں تو لمعہ کی شاعری کی ابتداء تو دس برس کی عمر ہی سے ہوتی ہے لیکن گلشن شعر و شاعری میں دریائے تپتی کی آبیاری کے بعد ہی بہار آئی۔

میڈیکل کالج میں یہ ایک خوددار اور خوش مزاج طالب علم مانے جاتے تھے اپنے ایک شعر میں انہوں نے اپنی خودداری اور خودپرستی کو یوں ظاہر کیا ہے ؎

جانتا ہوں خدا ہے میرے پاس اس لئے مجھ میں خودپرستی ہے

ان کے ابتدائی تخیل کو دیکھکر انکی طبع رسا اور قوت شعر گوئی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ نو دس برس کے لڑکے کا یوں لکھنا کہ:

نگاہ لطف کو اکبار پھر دکھا دینا　　یہ سوز عشق کی کوئی دوا بتا دینا　　نہ اترے جسکا نشہ حشر تک رسول اللہ　　اسی شراب کا پیالہ ذرا پلا دینا

نہ تاب ہجر کی ہے اور نہ دید کی طاقت　　حجاب دید کا پردہ ذرا اٹھا دینا

یقیناً تعجب خیز اور قابل ستائش ہے۔ انکی دوسری ابتدائی کوششوں کو انکی طبعی غیر شہرت پسندی نے عوام تک پہنچنے دیا

فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور انکے اشعار انکی فارسی شاعری پر کافی روشنی ڈال سکتے ہیں :۔

مثال کے طور پر اس شعر ہی کو لے لیجئے ؎ ماسوی رنج و الم ہیچ نہ یابی لمعہ　　گر پرستار تو این دنیائے فانی ہستی!

لمعہ کے کلام کا بیشتر حصہ ستال نے ہین کے پر لطف مناظر کو دیکھ دیکھ کر اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تکمیل پایا نے ہین انکی شعر و شاعری کا گہوارہ تھی جہاں انکی شاعری پھولی پھلی۔ اسی کی یاد میں انکا یہہ شعر انکے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے ؎ میں تجھ سے دور ہوں اے نے ہین پر　　مرا ہر سانس ہے تیری ہوا کا

لمعہ نے ہین کی تعریف صرف نظم ہی میں نہیں بلکہ نثر میں بھی کی ہے۔ انکا ایک مقالہ نیرنگ خیال کے مشرق نمبر میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے یہہ ثابت کر دیا ہے کہ "مشرق شاعری کی آغوش تربیت ہے" اور مثالاً دریائے نے ہین کو پیش کیا ہے ان شعروں سے صداقت اور حقیقی جذبہ کی بو آتی ہے :۔

نے ہین ہے طور کا جلوہ ترے دل میں نہاں　　ایک ہی جلوہ سے تیرے ہیں ہوا آتش بجاں

حسن کی مئے نے تری بے ہوش رکھا ہے مجھے　　عشق کی آغوش میں مدہوش رکھا ہے مجھے

میں ترا ہوں اور تیرا ہی رہوں گا نے ہین　　سہرۂ شہرت ہے میرا تیرے سر اے جان من

لمعہ نے جتنے بھی اشعار لکھے ہیں انہیں تقریباً پورے زبانی یاد ہیں۔ شعر کا فوری لکھ لیا جانا انکے لئے ضروری نہیں۔ موسیقی کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ گاتے جاتے اور شعر صفحۂ دماغ پر نقش ہو جاتا۔

لمعہ کو بچپن ہی سے اقبال کے ساتھ ایک خاص عقیدت تھی ..... اقبال کے اکثر اشعار انکی نوک زباں پر ہیں اپنے اشعار کو نذر عقیدت کے طور پر اقبال کے پاس روانہ کیا کرتے۔ اقبال نے انکی خوب ہی ہمت افزائی کی اور انہوں نے زمین شعر و سخن میں کافی طبع آزمائی کی۔ اپنے اشعار میں اقبال کی تعریف و توصیف بہت کی ہے جس سے ان کے

خلوص اور خوش اعتقادی کا پتہ چلتا ہے نمونتاً چند شعر یہاں درج ہیں:۔

مجھے اقبال سے حسن عقیدت ہوگئی جس دن — طبق گردوں کے ہیں تے ایں اسی دن دیکھ ڈالے ہیں

اقبال تو سراپا اسرار ایزدی ہے — افسوس شرالکلم تو شعر کا دھنی ہے

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز سے بھی لمعہ کو عقیدت ہے بہت سے شعر آپکی مدح میں بھی انکی بیاض میں ملتے ہیں۔
لمعہ نے انگریزی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور رابندرناتھ ٹیگور کے پاس اپنے اشعار بطور تحفہ بھجوانے کا فخر حاصل کیا
رابندرناتھ نے انکی تعریف پرزور الفاظ میں کی ہے۔ رابندرناتھ ٹیگور کے علاوہ لمعہ نے اپنے اشعار نواب سر نظامت جنگ بہادر
کو بھی دکھائے ہیں نواب صاحب موصوف نے بھی لمعہ کی انگریزی شاعری کے سلسلہ میں ہمت افزائی کی ہے۔

لمعہ کسی کی فرمائش پر بھی شعر موزوں نہیں کرتے نہ اپنے آپکو بحیثیت شاعر متعارف کرتے ہیں۔ انہوں نے
اپنے کلام کو حتی الامکان چھپایا۔ اور یہ سب کچھ اس وجہہ سے تھا کہ انکا ضمیر گوارا نہ کرتا تھا کہ شہرت حاصل کی جائے۔
وہ فطری طور پر نہایت خوش مزاج واقع ہوئے ہیں ہنسی روک نہیں سکتے کسی کو سنجیدہ دیکھکر بہت رنجیدہ ہوتے ہیں طبیعت
بے حد حساس ہے راست گوئی اور خود داری طبیعت ثانیہ ہے چنانچہ اپنے ایک شعر میں اسکا اس طرح اظہار کیا ہے ؎

اس بن زندگی کی ہے نہیں ہے — کھونا نہ خودی کا اپنے جوہر

بیماریوں سے لمعہ کا کبھی پیچھا نہ چھوٹا۔ بچپن ہی سے بیماریاں انکا ساتھ دے رہی ہیں۔ کئی کئی بیماریوں میں مبتلا ہوئے
اور کئی کئی مرتبہ جان کے لالے پڑگئے لیکن خدا کے فضل و کرم سے ہر دفعہ صحت یاب ہوئے۔

انکی شاعری پر ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں نے اپنا اظہار خیال کیا ہے چند اصحاب کی رائے لکھی جاتی ہے

علامہ عمادی۔ "یہ جذبات نہایت مقدس ہیں۔ آفریں بر حضرت عباس معنی آفریں"

علی احسن مارہروی۔ "ماشاءاللہ آپکی طبیعت ذہین اور خاص جوش رکھنے والی معلوم ہوتی ہے"

آپ کی قلمی بیاض سے چند اشعار نمونتاً درج ذیل کئے جاتے ہیں ؎

پیری میں شباب یاد آیا — زاہد کو خضاب یاد آیا

دنیا نے بھلا دیا تھا سب کچھ محشر میں حساب یاد آیا
وہ چلتے بنے سنا کے لاکھوں تب ہم کو جواب یاد آیا
جی بھر کے میں رو لیا اسی وقت جب انکا عتاب یاد آیا
رحمت کا خیال کر کے مجھکو دوزخ کا عذاب یاد آیا
اللہ رے وسعت تخیل
دریا کو حباب یاد آیا

غزل

عشق مذہب ہے مرا سوز ہے فطرت میری
شمع ہے حسن تو پروانہ ہے حسرت میری
حسن ایماں ہے مرا درد ہے راحت مجھکو
غم مری روح ہے نالے ہیں عبادت میری
آتش حسن تو اتنا نہ بھڑک بہر خدا
سو رہی ہے ترے پہلو میں محبت میری
مر کے مٹتے ہیں کہیں لمعہ محبت کے اسیر!
مٹ کے چمکیگی در سیم پہ عظمت میری

بے اختیار ہوں میں با اختیار ہوں میں
کچھ بیخودی ہے ایسی خود پر نثار ہوں میں
دنیا کی وسعتوں سے ہے دور میرا مسکن
ویرانیوں کا اپنی اک شاہکار ہوں میں
گہرائیوں میں دل کی رہتے ہیں جو ہمیشہ
نظر کرم کا انکی امیدوار ہوں میں
ہستی پرے ہے میری دنیا کی سرحدوں سے
اقلیم دلکا اپنی اک تاجدار ہوں میں
خلوت میں آہ و زاری جلوت میں چپ ہوں لمعہ
یعنے کہ آپ اپنی اک یادگار ہوں میں!

رباعی

سیماب کی طرح تم پگھل کر دیکھو
اس عشق کے اسرار کو حل کر دیکھو
خاک در محبوب کی تاثیر کبھی
اپنے دل کی جبیں پہ مل کر دیکھو

اشاریہ

الف ممدودہ

الف مقصورہ

ح

خ

د

ز

س

ع

ک

گ

ل

م

ن

و

ھ

ی

ادارۂ ادبیات اردو
کی
مطبوعات پر اردو کے موقر جرائد اور ممتاز مبصرین
کی رائیں اور تبصرے

تالیف

ادارۂ ادبیاتِ اردو

کا عظیم الشان کارنامہ جو تین سال کی پیہم سرگرمیوں اور تیس سے زیادہ صاحب ذوق انشا پردازوں کی متفقہ مساعی کا نتیجہ ہے جسکی دو جلدوں میں ان پچھتر ممتاز شعرائے اردو کا تفصیلی تذکرہ پیش کیا گیا ہے جنہوں نے دورِ آصفیہ میں حیدرآباد کو اردو شعر و سخن کا گہوارہ بنا رکھا۔ یہ عظیم الشان تذکرہ جن فاضل مضمون نگاروں کا نتیجۂ قلم ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

۱ ۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ام ۔ اے پی ۔ ایچ ۔ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ

مصنف { اردو شہ پارے ۔ اردو کے اسالیب بیان ۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ۔ روح تنقید ۔ تنقیدی مقالات ۔ ہندوستانی لسانیات ۔ ہندوستانی صوتیات ۔ سیر گولکنڈہ وغیرہ ۔

۲ ۔ مولوی عبد القادر صاحب سروری ام ۔ اے ال ال بی لکچرار ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ

مصنف { جدید اردو شاعری ۔ دنیائے افسانہ ۔ کردار اور افسانہ ۔ سراج سخن ۔ حیدرآباد میں تعلیمی ترقی ۔ سابق مدیر مجلہ مکتبہ حیدرآباد ۔

۳ ۔ مولوی سید محمد صاحب ام ۔ اے (عثمانیہ) لکچرار اردو و فارسی کلیہ بلدہ حیدرآباد

مصنف ۔ ارباب نثر اردو ۔ مرتب گلشن گفتار ۔ مثنویات میر ۔ ایجاز سخن وغیرہ

۴ ۔ مولوی وحید اللہ خاں صاحب ام ۔ اے ال ال بی ۔ لکچرار ٹکنیکل اسکول حیدرآباد

۵ مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی صادق ام ۔ اے ۔ سابق مدیر مجلہ عثمانیہ

۶ مولوی مرزا محمد علی صاحب ام ۔ اے ۔ مصنف ۔ دکن میں مرثیہ نگاری

۷ مولوی سید ابو الفضل العباس صاحب ام ۔ اے ۔ معتمد دائرہ علمیہ جامعہ عثمانیہ

۸ مولوی سید اشفاق حسین صاحب بی ۔ اے ۔ مدیر مجلہ عثمانیہ

۹ مولوی حسن محی الدین صاحب صدیقی ام ۔ اے صدر بزم دینیات جامعہ عثمانیہ

۱۰ مہندر راج صاحب سکسینہ ام اس سی نائب صدر بزم سائنس رکن دائرہ علمیہ جامعہ عثمانیہ

۱۱ نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب بی۔اے سابق صدر بزم اردو
مصنف۔ سیاحت نامہ یورپ و امریکہ۔ شمس الامرا کی علمی خدمات

۱۲ مولوی محمد اکبر الدین صاحب صدیقی سابق مدیر المُوسی مصنف مشاہیر قندھار دکن وغیرہ

۱۳ مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب بی۔اے

۱۴ مولوی مرزا سرفراز علی صاحب بی۔اے سابق مدیر المُوسی و مجلہ عثمانیہ مصنف ادبی تفریح

۱۵ صاحبزادہ مولوی میر محمد علیخاں صاحب میکش (عثمانیہ) معتمد صاحبزادہ اسوسی ایشن

یہہ تذکرہ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ آٹھ سو سے زیادہ صفحات۔ اور تقریباً سنو تصاویر ہر جلد مجلد ہے۔ فی جلد ۵ر
مرقع سخن کی پہلی جلد کے متعلق جو تنقیدیں شائع ہوتی رہی ہیں ان میں سے بعض کے اقتباسات یہہ ہیں:۔

(۱) رسالہ معارف اعظم گڈھ۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ بابتہ مارچ ۱۹۳۷ء

سلسلہ ادبیات اردو کو جاری ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا لیکن اس قلیل مدت میں وہ متعدد مفید کتابیں شائع کرچکا ہے۔ حال میں اس نے اعلیحضرت خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے جشن سیمین کی یادگار میں مرقع سخن کے نام سے دکن کے پچیس ۲۵ مشاہیر شعراء کا تذکرہ شائع کیا ہے اس کی تالیف میں جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ، طلبہ، فارغین اور دوسرے اہل قلم کی کوششیں شریک ہیں۔ یہہ تذکرہ پانچ دوروں پر تقسیم ہے۔ ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس دور کی ادبی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اس عہد کے چند مشاہیر شعراء کے حالات، ان کے کلام کا نمونہ، اور اس پر تبصرہ ہے۔ اور شعراء کے تذکرہ کے ساتھ اون کے اور ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے وہ ہم عصر شعراء جو اُس عہد میں دکن گئے یا جن کی شہرت شمالی ہند میں تھی نام دیدئے گئے ہیں۔ اسطرح یہہ تذکرہ گویا دکن کی شاعری اور اس کی تدریجی ترقی کی پوری تاریخ ہے۔ . . . .

حالات کے ساتھ اُن (شعراء) کے اور اُن کے اکثر ہم عصر دکنی شعراء، فرمانروایانِ دکن، اور متعدد ادب و شعر کے قدردانوں کی تصاویر بھی دیدی گئی ہیں جن سے معنوی خوبیوں کے ساتھ یہ تذکرہ حسن ظاہر کا بھی مرقع بن گیا ہے۔

(۲) رسالہ المُوسی حیدرآباد۔ مرتبہ مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ام۔اے و مولوی سید محمد صاحب ام۔اے
بابتہ شہریور ۱۳۴۵ فصلی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب نے جو سلسلہ ادبیات اردو کے سرگرم بانی اور مدیر عمومی ہیں . . . .

دورِ آصفیہ کے پچیس[۵] ممتاز اور عہد آفریں شاعروں کے حالات و مقالات کا یہہ شاندار تذکرہ اپنے بہت سے ہونہار طلبہ کی امداد سے مرتب کر کے شائع کیا ہے .... اس تذکرہ میں ہر دور کے شعراء کی خصوصیات اور اُنکے کارناموں کی عظمت و اہمیت پر تبصرہ کیا ہے۔ ہر دور کے ممتاز شاعروں کے قلمی دواوین نیز دیگر ذرائع تحقیق سے اُنکے حالات فراہم کر کے مع انتخاب کلام کے شائع کئے گئے ہیں۔ یہہ تذکرہ کسی ایک کی تالیف نہیں ہے۔ اسکے مختلف حصّے مختلف لوگوں نے لکھے ہیں جسکی وجہہ سے یہہ مشکل کام بہت آسان بھی ہو گیا اور اجتماعی مساعی سے دکنی شاعروں کا یہہ ایسا بڑا تذکرہ بہت ہی کم مدت میں تیار ہو گیا۔ اس میں مختلف شعراء کی تقریباً پچاس تصاویر بھی ہیں جو بہت تلاش اور محنت سے فراہم کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے جس خوبی سے اسکو شائع کیا ہے وہ یقیناً قابل ستائش اور لائق قدر ہے اپنے ملک کے ادب سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کو ضرور اسکا مطالعہ کرنا چاہئیے۔

(۴) جریدۂ رہبر دکن۔ حیدرآباد۔ مرتبہ مولوی سید احمد محی الدین صاحب

سلسلۂ ادبیات اُردو ایک ایسے قابل، کارداں، اور محنت کوش ادارہ کا کام ہے جو اُردو ادب کی خدمت گذاری کیلئے قائم ہوا ہے۔ اور جیکے ہی چیکے اچھی اچھی کتابوں کے ترجموں، تالیفوں، اور تصنیفوں کے ذریعہ اُردو میں (ملک کے اور ادبی ذوق رکھنے والوں کی امداد و اعانت سے) اضافہ کر رہا ہے۔ مرقع سخن جلد اول اسوقت تک کی اسکی ساری کوششوں میں بہت ممتاز کوشش ہے اور بے حد قابل قدر۔ .... اسکی اشاعت سے قبل تک باہر تو باہر خود ملک میں بھی بہت ہی کم کسی کو اس کا علم ہوگا کہ خاک دکن نے اُردو شعر کی کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اور کیسے کیسے شعر گو شاعر پیدا کئے ہیں گو یہہ سب جانتے ہیں کہ یہاں کوئی زمانہ اُردو شعر گوئی کے ذوق سے خالی نہیں رہا ہے۔

ہر شاعر کے حالات بڑی تحقیق سے آ گئے ہیں۔ اور اسکی وجہہ یہہ ہے کہ ہر شاعر کو ایک ایک صاحب ذوق کی تحقیق و تدوین کے سپرد کیا گیا ہے اور بطور نمونہ جو کلام دیا گیا ہے وہ اتنا کافی ہے کہ اس تذکرہ کا پڑھنے والا بطور خود ہی شاعر کے الہام، پیام، اور دنیائے شعر میں اسکے مرتبہ کی نسبت ایک رائے قائم کر سکتا ہے۔

یہہ چیز ایسی ضروری تھی کہ آج سے پہلے تک اسکی طرف کسی کا متوجہ نہ ہونا کچھ حیرت ناک سا معلوم ہوتا ہے۔ یہہ ایک مستقل ادبی کوشش ہے اور اس سے دکن کیا ہندوستان کے کسی اُردو کتبخانے اور اردو ادب کے کسی شیدائی کی الماری خالی نہیں رہنا چاہئیے۔

(۵) جریدۂ مشیر دکن حیدرآباد۔ بابتہ ۱۴ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء

بڑے سلیقہ اور عمدگی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اور ہزاروں روپیہ کے صرفہ سے شائع کیا گیا ہے ....

مرقع کے متذکرہ پانچ ادوار کی ترتیب بھی بہت اچھی ہے .... پانچوں تمہیدیں نہایت مفید اور دلچسپ ہیں۔

ان سے پڑھنے والے کو اُردو کے ان تمام شاعروں کے متعلق تاریخ وار علم حاصل ہوگا جو گذشتہ سوا دو سو سال میں پیدا ہوئے...... ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو شائع کر کے بجا طور پر ملکی ادب کی بہت بڑی اور لایق تحسین خدمت انجام دی ہے جس کے لئے وہ اہل ملک کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مرقع سخن حقیقتاً عہد آصفیہ کے ممتاز شاعروں کا ایک مرقع ہے۔ ہر صاحب ذوق کو اسکا ایک نسخہ اپنے پاس ضرور رکھنا چاہئیے........ بعض تصویریں تو پہلی دفع شائع ہوئی ہیں۔

ورڈز ورتھ اور اُس کی شاعری

از۔ مولوی میر حسن صاحب ایم۔اے مددگار سٹی کالج۔ سابق صدر انجمن اتحاد و مدیر مجلہ عثمانیہ

صفحات ۱۸۴ مع تصویر شاعر مجلد۔ قیمت عہر

(۱) رسالہ ہندوستانی۔ الہ آباد۔ مرتبہ مولانا اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی۔ بابت جولائی ۱۹۳۳ء

اِس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اسکے تجربات حیات نے جس جس طرح اُس کے شعری رجحانات کی تعمیر و تشکیل کی ہے انکو واضح کیا گیا ہے۔ سوانح نگاری کا یہ طرز عام روش سے علحدہ ہے اور چونکہ فطری اصول کے مطابق ہے اس لئے نہایت پسندیدہ ہے.......... انگریزی کے ذخیرہ ادب کو جلد سے جلد اردو میں منتقل کرلینا اردو کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس اعتبار سے مصنف نے ورڈز ورتھ کے حالات زندگی کے ساتھ اسکی نظموں کو اُردو زبان میں منتقل کر کے دراصل اردو کی ایک نہایت ضروری خدمت انجام دی ہے........ ہمارے جدید مطبوعات میں یہ ایک مفید اور دلچسپ اضافہ ہے۔

(۲) رسالہ شہاب۔ حیدرآباد۔ مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق صاحب بسمل۔ بابت بہمن ۱۳۴۲ف

نہایت دقت نظر سے مطالعہ کر کے اس (ورڈز ورتھ) کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسکے معاصرین اور عہد حاضر کے اردو شاعروں پر اسکے اثرات کا اظہار کیا گیا ہے بعض اردو شعراء کی نظمیں مقابلتہً پیش کی گئی ہیں..... کتاب صاحب ذوق کے مطالعے کے قابل ہے

(۳) جریدہ رہبر دکن۔ حیدرآباد۔ مرتبہ مولوی سید احمد محی الدین صاحب۔ بابت ۲۶ر فروری ۱۹۳۳ء

اس میں سب سے پہلے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا ایک دیباچہ عمومی ہے جو اس "سلسلۂ ادبیات اردو" کے مدیر عمومی ہیں جس کا یہ ایک حصہ ہے۔ اس کے بعد مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم۔اے ال ال بی مددگار پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ

کا مقدمہ، مولف کا دیباچہ ورڈز ورتھ کی ان نظموں کی فہرست جن کا اس کتاب میں مولف نے ترجمہ دیا ہے اردو شعراء
کی ان نظموں کی فہرست جو مقابلے یا توضیح کے لئے اصل کتاب میں نقل کی گئی ہیں اور پھر ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری
پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کے شروع ہونے سے قبل ورڈز ورتھ کی ایک تصویر بھی دی گئی ہے جس کو ملک کے فن کار
یم قیوم نے خاص اسی تصنیف کے لئے بنایا ہے۔ اصل کتاب حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے :-
(۱) پیدائش تعلیم (۲) ابتدائے شاعری (۳) سیر و سیاحت اور سائنٹ نویسی (۴) اسکاچستان کا پہلا سفر اور خاندان میں
اضافہ (۵) ملازمت اور سیر و سیاحت (۶) شہرت و وفات اور (۷) خاتمہ

ورڈز ورتھ انگریزی کے مشہور شعراء میں سے ایک ہے اور اس کی شاعری میں فطرت نگاری نے ایک خاص درجہ
حاصل کر لیا ہے جو کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوا اور اسی کا اثر آزاد و حالی کے عہد سے اردو شاعری پر بھی پڑنے لگا ہے
مولف نے اپنی تالیف میں ان تمام امور کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح اردو ادب لطیف پر اس شخص کے حالات
اور اسکی شاعری کا ارتقاء دکھا کر بڑا احسان کیا ہے جس کے زیر اثر وہ نامعلوم طور پر آچکا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے۔

(۴) رسالہ معارف۔ اعظم گڈھ۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی

ورڈس ورتھ انگریزی ادب کا معیاری شاعر ہے۔ جناب پرسین نے اسکو اردو داں طبقہ سے روشناس کیا ہے
اس رسالہ میں اس کے سوانح اور کلام کو پیش کیا ہے۔ لیکن یہہ حصے الگ الگ نہیں بلکہ اولاً ورڈس ورتھ کا ابتدائی تعارف
کرا کر خود اس کے کلام کی روشنی میں اُسے مختلف دور سے گذرانا شروع کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شاعر بن کر نمودار ہوا
اور اُس کی نظمیں سامنے آنے لگیں۔ پھر اسکی زندگی میں جو واقعات پیش آتے گئے اور نظموں کے جو اثرات پیدا ہوتے گئے
اور اُس کی طبیعت پر فلسفہ اور شعر کے جس مسلک و مشرب کے رجحانات رہے سب کو اسی سلسلہ میں بیان کیا ہے اور
پھر اسکی زندگی اور شاعری پر جو تنقیدیں ہوئیں اور خود مرتب کو اُس کی شاعری میں جو معیار اور اسکے فلسفہ میں جو رجحان
نظر آیا اُس کو اسی سلسلہ سوانح میں بیان کیا ہے اور جا بجا دوسرے شعراء سے اس کا موازنہ بھی کیا ہے۔ مولف نے
یہہ ایک اچھا طریق سوانح نگاری اختیار کیا ہے اگر اسی رنگ پر وہ دوسرے باکمال شعرائے یورپ کو روشناس کرنے میں
کامیاب ہو جائیں جیسا کہ اُن کا مقصد ہے تو اُردو کی ایک مفید خدمت انجام دینگے۔

(۵) جریدۂ مشیر دکن۔ حیدر آباد۔ ولیم ورڈس ورتھ نہایت مقبول انگریزی شاعر ہے اس نے خاص کام
یہہ کیا کہ دنیا کی معمولی چیزوں کو ایک فلسفی شاعر کی نظر سے دیکھا اور ان میں وہ باتیں پیدا کیں جو ہر شخص کو نہیں سوجھتیں

اُس کی بعض نظمیں انگریزی حال کی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں اس کتاب کے مصنف مولوی میر حسن صاحب مدیر مجلہ عثمانیہ ہیں۔ آپ نے اس کتاب میں نہایت خوبی و جامعیت کے ساتھ انگلستان کے اس مشہور شاعر کی حیات اور کلام اور اس کے معاصرین اور عہد حاضر کے انگریزی اور اردو شاعروں پر اس کے اثرات تنقیدی نقطہ نظر سے بیان کئے ہیں اس کی بہترین نظموں کا ترجمہ کیا گیا ہے اور اردو شاعروں کی بعض نظمیں مقابلتاً پیش کی گئی ہیں۔ نیز جدید اردو شاعری کے ارتقاء میں ورڈس ورتھ اور اُس کے کلام کے اثر نے جو حصّہ لیا ہے اس پر دیباچہ میں بحث کی گئی ہے اسلوب بیان اسقدر دلکش اور دلآویز ہے کہ بے اختیار مصنف کے حق میں دل سے دعا نکلتی ہے کہ "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" کتاب سلسلۂ ادبیات اردو میں طبع ہوئی ہے۔

(۶) مجلّہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ ہم میر حسن صاحب کے مشکور ہیں کہ انہوں نے اردو دانوں کے لئے انگریزی کے ایک باعظمت شاعر کے کلام کے بیشتر حصہ کا ترجمہ پیش کیا ہے جس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ میر حسن صاحب نے اس کام کو انجام دیا ہے اس پر ہم انہیں ہر قسم کی تحسین کا مستحق سمجھتے ہیں۔

(۷) رسالہ زمانہ۔ کانپور۔ مرتبہ پنڈت دیا نرائن صاحب نگم بی۔ اے

جامعہ عثمانیہ کی بدولت حیدرآباد اور اسکے متعلقات میں خوش فکر اور نوجوان انشا پردازوں کی ایک ایسی اولوالعزم جماعت پیدا ہو گئی ہے جو ہر وقت اردو ادب کی توسیع و ترقی کی فکر میں منہمک ہے اسی جماعت میں کتاب زیر نظر کے فاضل مصنف میر حسن صاحب بھی ہیں

انگریزی کی کورانہ تقلید فی زمانہ فیشن بنتی چلی جارہی ہے لیکن اس اندھا دھند سے اردو میں وہ لطافت و خوبی پیدا نہیں ہو سکتی جو انگریزی شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے اس بے راہ روی کو روکنے کیلئے بھی ضروری تھا کہ انگریزی شاعروں کے متعلق اردو زبان میں معلومات فراہم کی جائے اور اُن کے عمدہ کلام کا ترجمہ پیش کیا جائے۔

الحمد للہ کہ اس میدان میں میر حسن صاحب نے ایک مبارک قدم بڑھایا ہے کتاب زیر ریویو میں ورڈس ورتھ کے سوانح حیات کے علاوہ اس کی شاعری پر بھی ایک فاضلانہ نظر ڈالی گئی ہے اور ورڈس ورتھ کی ایک عمدہ تصویر بھی دی گئی ہے دیباچہ میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید اردو شاعری نے ورڈس ورتھ کے کیا کیا اثرات قبول کئے اور مقابلہ اور توضیح کے لئے بعض شعرائے اردو مثلاً اقبال۔ چکبست۔ جوش۔ تلوک چند محروم وغیرہ کی نظمیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ ورڈس ورتھ کی بہت سی نظموں کا اردو ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔ قابل مصنف نے نہایت محنت اور دماغ سوزی سے کام لیکر یہ کتاب مرتب کی ہے اردو داں پبلک خصوصاً شعراء حضرات کو اس کی قدر کرنی چاہئیے۔

(۸) رسالہ نگار۔ لکھنو۔ مرتبہ مولانا نیاز محمد خاں صاحب نیاز فتحپوری

میر حسن صاحب مدیر مجلہ عثمانیہ حیدرآباد نے یہہ کتاب تالیف کی ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے اور افادیت اسکی موضوع سے مترشح۔ وہ لوگ جو خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں اور مشرق و مغرب دونوں جگہ کی شاعری پر مقابلاً نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں اُن کے لئے یہہ کتاب خصوصیت کے ساتھ قابل قدر ہے ——— اسکی (ورڈس ورتھ کی) متعدد نظموں کا ترجمہ بھی نمونتاً پیش کیا گیا ہے۔

(۹) رسالۂ اُردو۔ اورنگ آباد۔ مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے

دوسری زبانوں کے ادبیات اور اسکے ممتاز مصنفین اور شعراء کا کلام اور حالات ہمیشہ بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ خاص کر اُردو زبان کو جو ابھی بن رہی ہے اس کی بڑی ضرورت ہے۔ میر حسن صاحب نے یہہ بہت قابل قدر کام کیا ہے کہ ورڈس ورتھ کے حالات اور اسکی شاعری کی خصوصیات کو اُردو زبان میں بیان کیا۔ ورڈس ورتھ کا پایہ انگریزی شاعری میں بہ حیثیت فطرت نگار بہت بلند ہے اور اُسکا منتخب کلام بے مثل ہے۔ قابل مولف نے جگہ جگہ اسکی منتخب اور عمدہ نظموں کے ترجمے بھی درج کئے ہیں۔ نظم کا ترجمہ بہت دشوار کام ہے لیکن مولف نے عموماً اس دشوار کام کو بھی خوبی سے انجام دیا ہے میر حسن صاحب کی محنت قابل شکر اور لائق قدر ہے اور اُردو شعراء کو یہہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔

(۱۰) ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ام۔اے پی۔اچ۔ڈی صدر شعبۂ مشرقی جامعہ الہ آباد

کتاب اچھی اور بہت اچھی ہے اور بہت سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ میں نے اسے خاص دلچسپی سے پڑھا۔ ورڈس ورتھ کی شاعری کے اثرات اردو شاعری کے نئے دور پر آپ نے بڑی کامیابی سے دکھائے ہیں اور جو بحث اس خصوص میں کی ہے اس سے یقیناً مفید نتائج مرتب ہوں گے۔ ہوش مند طبیعتیں ضرور ورڈس ورتھ کے کلام کا اب اُس نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں گی جس کی طرف آپ کی کتاب اشارہ کر رہی ہے۔

(۱۱) پروفیسر ای ای اسپیٹ۔ بی۔اے پروفیسر ادبیات انگریزی جامعہ عثمانیہ

یہہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا مطالعہ میں نے بڑی دلچسپی سے کیا۔ اور میں ذاتی طور پر واقف ہوں کہ اس کی تیاری میں مسٹر میر حسن نے بڑی محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے جن ماخذوں سے انہوں نے استفادہ کیا ہے وہ مستند اور کافی تعداد میں ہیں۔

ہوش کے ناخن

(از)

مولوی میر حسن صاحب ایم۔ اے سابق صدر انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ و مدیر مجلہ عثمانیہ

مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم۔ اے سابق مدیر مجلہ عثمانیہ و صدر بزم اردو۔

صفحات ۹۶ قیمت عمر

(۱) رسالہ نگار لکھنو۔ مرتبہ مولانا نیاز فتحپوری۔ بابت مارچ ۱۹۳۵ء

ڈرامہ ہے جسے حیدرآباد کے دو فاضل نوجوانوں نے اسٹیج کیلئے لکھا ہے۔ اور جسمیں حیدرآباد کی سماجی زندگی پیش کی گئی ہے

یوں تو یہہ ایک انگریزی ڈرامہ سے ماخوذ ہے لیکن پیش کیا گیا ہے ایسی صورت سے کہ بالکل اپنی چیز معلوم ہوتا ہے۔

یہہ دو بار حیدرآباد میں اسٹیج ہو کر لوگوں کی پسندیدگی بھی حاصل کر چکا ہے۔

(۲) رسالہ شہاب حیدرآباد۔ مرتبہ مولوی عبدالرزاق صاحب بسمل بابت اردی بہشت ۱۳۴۴ف

یہہ ڈرامہ یوم کلیہ کے وقت تمثیل کیا گیا تھا جسکو مہاراجہ صدر اعظم بہادر اور ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی معائنہ کیا تھا۔ اسکے بعد اکسلسیر تھیٹر میں بھی تمثیل کیا گیا اور کامیاب ثابت ہوا ...... ملک میں ایسے ڈراموں کی ضرورت ہے تاکہ (موجودہ پامال ڈراموں کی بہ نسبت ہیں جو آئے دن سینما کی بدولت ہمارا ذوق ستیاناس ہو رہا ہے) یہہ جگہ لے سکیں۔

(۳) مجلہ عثمانیہ حیدرآباد۔ مرتبہ مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ایم۔ اے۔ جلد ۸۔ شمارہ ۱

بڑی حد تک اچھی معلوم ہوتا ہے۔ اسکی تصنیف میں میر حسن اور مخدوم محی الدین صاحبان نے خاص ذوق اور سلیقہ سے کام لیا ہے ..... تقریب (یوم کلیہ) میں نہایت خوبی سے پیش بھی کیا گیا ..... اسکو اتنا پسند کیا گیا کہ کچھ عرصہ کے بعد انجمن طیلسانین عثمانیہ کی خواہش پر اسکو دوبارہ اسٹیج کیا گیا ...... توقع ہے کہ اگر یہی رفتار جاری رہی اور میر حسن و مخدوم محی الدین جیسے صاحبان ذوق اس میں برابر دلچسپی لیتے رہیں اور محنت جاری رکھیں تو اردو ڈرامہ یقیناً ترقی کرے گا۔

(۴) جریدۂ رہبر حیدرآباد دکن۔ مرتبہ سید احمد محی الدین صاحب۔ بابت جنوری ۱۹۳۵ء

یہہ وہی ڈرامہ ہے جو کچھ دنوں قبل حیدرآباد کے اسٹیج پر پیش ہوا اور بکثرت ناظرین سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے ......

اسمیں بلاشبہہ حیدرآباد کی سماجی زندگی کے بعض پہلو بڑی عمدگی سے آگئے ہیں۔ اور زبان سلیس اور مذاق لطیف ہے۔

یوسف ہندی قیدِ فرنگ میں

از۔ مولوی محسن بن شبیر صاحب بی۔ اے ال ال بی (عثمانیہ) صفحات ۸۰ قیمت ۴؍
رسالہ اردو۔ اورنگ آباد۔ مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ بابت اپریل ۱۹۳۳ء

اس رسالہ میں نہایت صحت سے غالب کی قید کے واقعے کی تحقیق کی گئی ہے .... اس زمانہ کے قیدیوں کی جو حالت ہوتی تھی اور جو سلوک انکے ساتھ روا رکھا جاتا تھا اسکی تصویر پیش کیگئی ہے .... آخر میں ترکیب بند اسیری پورا نقل کر دیا گیا ہے۔

ٹیگور اور اُن کی شاعری

(از)

مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۲؍
(۱) رسالہ اردو۔ اورنگ آباد۔ مرتبہ۔ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ بابت اکٹوبر ۱۹۳۵ء

ٹیگور کی مختلف تحریروں کے تراجم اُردو زبان میں کثرت سے شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن اب تک کوئی ایسی کتاب نہ لکھی گئی تھی جو اُن کی شخصیت کو واضح کرتی .... پیش نظر کتاب میں ٹیگور کی شخصیت، ان کی ادبی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور انکے فلسفہ زندگی پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے ٹیگور کا پیام، گیتانجلی اور ٹیگور اور رنگینی پر علحدہ ابواب میں تفصیلی بحث کی گئی ہے ....

اس کتاب میں انسان اور فلاسفر کی حیثیت سے ٹیگور پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت غنیمت ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اسکے لکھنے میں مخدوم صاحب نے محنت کی۔ اور بامذاقی و سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے۔

(۲) مجلہ عثمانیہ حیدرآباد۔ مرتبہ میر سعادت علی صاحب رضوی ایم۔ اے۔ جلد ۸۔ شمارہ ۳

اس کتاب میں .... ٹیگور کے حالات زندگی اور مختلف ادوار شاعری پر دلچسپ پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے ....
مخدوم محی الدین صاحب جامعہ عثمانیہ کے ہونہار شاعر ہیں اور انہوں نے اپنے اس مفوضہ فریضہ (تصنیف کتاب) کو بوجوہ احسن انجام دیا ہے اگرچہ کتاب میں .... ضرورت سے زیادہ اختصار کو کام میں لایا گیا ہے لیکن ہمیں مسرت ہے کہ انہوں نے اُردو ادب میں ایک ایسی چیز کا اضافہ ضرور کر دیا ہے جو کسی طرح رائگاں نہیں جا سکتی۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو

کے ایک شعبہ سلسلۂ انتخاباتِ شعرائے دکن کی مطبوعات

بادۂ سخن انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل حیدرآبادی

(حصہ تبصرہ)

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور مدیر عمومی۔ صفحات (۱۲۸) قیمت ۱۲؍

(۱) رسالہ ساقی۔ دہلی۔ مرتبہ مولوی شاہد احمد صاحب بی۔ اے نبیرہ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی۔ بابت فروری ۱۹۳۷ء

ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم کے کلام موزوں کا انتخاب ہے اور نہایت خوبصورت انتخاب ہے مائل مرحوم دکن میں پیدا ہوئے۔ دکن میں پرورش پائی لیکن زبان وہ پیدا کی کہ دہلی والوں کی محفلوں میں سراہے گئے۔ کلام میں جسقدر ریاض پیش نظر ہے آمد ہی آمد ہے .... یہہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فصیح الملک مرحوم کے صحبت یافتہ ہیں۔ انکے کلام میں جو بے تکلفی ہے وہ خداداد ہے۔ اور مقدمے میں دکن کی اردو شاعری پر جو مقدمہ لکھا گیا ہے وہ تو نہایت بصیرت افروز ہے اسلئے اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بادۂ سخن بہت ہی کار آمد چیز بن سکتی ہے

(۲) رسالہ المعلم حیدرآباد۔ مرتبہ مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے (کنٹب) بابت دی ۱۳۴۵ف

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ملک کے اُن نادر نوجوانوں میں سے ہیں جنکو کام کئے بغیر چین نہیں آتا۔ یہہ نہیں بلکہ وہ نگرانی میں ایک جماعت بھی تیار کر رہے ہیں جو .... جدید ترین اصول پر ادبی کام کرنا سیکھ رہی ہے۔

اسوقت ہمارے سامنے تین شعرائے دکن کے انتخابات ہیں .... جناب زور صاحب نے ایک زوردار مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو ہر انتخاب کے شروع میں دیا گیا ہے۔ اسکے بعد جس شاعر کے کلام کا انتخاب ہے اسکے مختصر احالات زندگی درج کردیئے گئے ہیں........ ہمکو توقع ہے کہ ان دیدہ زیب اور دلکش انتخابات کو جنکی قیمت صرف ۱۲؍ فی جلد ہے خرید کر ہر محب وطن اپنے ذوق سلیم کا ثبوت دے گا اور ہر مدرسہ اپنے کتب خانہ میں اس سلسلہ کے لئے جگہ نکالے گا۔

(۳) جریدہ رہبر دکن۔ حیدرآباد۔ مرتبہ مولوی سید احمد محی الدین صاحب۔ بابت ۴ صفر ۱۳۵۵ھ

مائل خالص دکن کی پیداوار تھے اور آپکا کلام بارہا داغ دامیر کے مقابل رکھکر پرکھا گیا ہے (اسواسطے کہ یہہ انکے ہم عصر بھی تھے) اور معیار پر پورا اترتا رہا ہے۔ آپکی نظر میں دقت اور طبیعت میں مشکل زمینوں کو سہل کرنے کی قدرت تھی .... مائل ہی وہ پہلے دکنی شاعر ہیں جنہوں نے اس مقصد کیلئے اپنے عہد میں سب سے زیادہ کیا ہے کہ اہل دکن اپنے آپکو دلی اور لکھنو کے آگے عجمی نہ سمجھیں۔

(۴) جریدہ مشیر دکن حیدرآباد ۔ مرتبہ واسدیو پرشاد صاحب ۔ بابت ۲ نومبر ۱۹۳۵ء

ڈاکٹر..... زور ... حیدرآباد کے وہ زبردست مصنف و انشا پرداز ہیں جنکی انشا پردازی کا لوہا ملک سے باہر بھی مانا گیا ہے آپ میں اردو ادب کی خدمت گذاری کا جذبہ لائق ستائش ہے...... بہت سے مفید و اہم عنوانات پر جامعہ عثمانیہ کے ہونہار انشا پرداز آپکی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ حال میں آپ نے ایک نہایت مفید جدید سلسلہ کا آغاز کیا ہے جسکا نام سلسلہ انتخابات شعرائے دکن ہے...... یہہ سلسلہ اس لئے مفید ہے کہ دکن میں ایسے اردو شاعر سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہوئے ہیں جنکی ادبی خدمت گذاریوں نے اردو زبان کو مالا مال کر دیا ہے۔ اور اسکے ادبی خزانہ میں ایسا مستقل سرمایہ فراہم کر دیا ہے کہ اردو بولنے والوں کی نسلیں ہمیشہ اس سے متمتع ہوتی رہیں گی ..... یہہ ادب کے جواہر پارے ہیں اور ان سے اردو ادب کے خزانہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

(۵) رسالہ جامعہ ۔ دہلی ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔ بابت جون ۱۹۳۷ء

حضرت مائل (صاحب بادہ سخن) ایک قادر الکلام اور پُرگو استاد ہیں۔ مشکل پسند واقع ہوئے ہیں؛ اور عموماً سنگلاخ اراضی شعر کو توڑا ہے۔ اور بعض قدیم مسلم الثبوت اساتذۂ اردو کے تتبع کی کامیاب و قابل داد کوششیں کی ہیں۔

کیفِ سخن ۔ انتخاب کلام مولوی سید رضی الدین حسن صاحب کیفی حیدرآبادی

مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی (لندن) مدیر عمومی

صفحات ۱۲۲ قیمت ۱۲ ؍

(۱) رسالہ ساقی ۔ دہلی ۔ مرتبہ ۔ مولوی شاہد احمد صاحب بی ۔ اے ۔ آنرز ۔ بابت فروری ۱۹۳۷ء

کیفِ سخن ان (کیفی مرحوم) کے پُرلطف کلام کا نہایت لطیف انتخاب ہے۔ ہر شعر انکے مذاق سلیم کا گواہ ہے۔ کلام میں اس قدر سادگی ہے کہ طبیعت پڑھنے سے تھکتی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت سیدھی سادی زبان میں سامنے کے مضامین لکھنے کی زیادہ عادی تھی... .... یہہ مجموعہ انتخاب بیان، تخیل، تشبیہ، روانی، اسلوب اور صفائی وغیرہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔

(۲) رسالہ المومن حیدرآباد ۔ مرتبہ مولوی ابوالظفر عبدالواحد صاحب ایم ۔ اے ۔ و مولوی سید محمد صاحب ایم ۔ اے ۔ بابت اسفندار ۱۳۴۵ف

..... تاریخ ادب اردو کے ہر دور میں اس (سرزمین دکن) نے اردو کی ترقی و توسیع میں غیر معمولی حصہ لیا ہے اور ہر عہد میں اسکے شاعروں اور انشا پردازوں کی ادبی خدمات نے اس (اردو) کو مالا مال کیا ہے۔ ایک عرصہ کی خاموشی اور فراموشی کے بعد اہل ملک میں ان محسنین اردو کی خدمات کا اعتراف کرنے کا احساس پیدا ہوا ہے...... یہہ سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن اس مستحسن احساس کی عملی صورت ہے۔ اس سلسلہ.. کے مدیر عمومی حیدرآباد کے مشہور انشا پرداز ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ہیں....... ہر ایک انتخاب ابتدائے دکن کی اردو شاعری

عنوان سے ایک موٹی مقدمہ ہے جسکے بعد دوسرا مقدمہ شاعر کے حالات اور اسکی شاعری کی خصوصیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ پھر مختلف اصناف سخن کے تقریباً ایک ہزار اشعار کا انتخاب ہے۔ ہر شاعر کی تصویر بھی بڑی تلاش اور کوشش سے فراہم کر کے شائع کی گئی ہے۔ کتابت اور طباعت دیدہ زیب اور سرورق بہت ہی جاذب نظر ہے۔

(۳) **جریدۂ رہبر دکن حیدرآباد۔ مرتبہ مولوی سید احمد محی الدین صاحب۔ بابت ۱۳ جون ۱۹۳۶ء**

ڈاکٹر صاحب جسقدر خاموشی اور خوبی کے ساتھ ملک میں اُردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ ان سے پہلے کسی سے ممکن نہیں ہوئی۔ آپ کی کوششوں سے دکن کے اردو ادب کا ایک بڑا حصہ منصۂ شہود پر آگیا ہے۔ اور ابھی بہت سی توقعات ہیں سید رضی الدین حسن کیفیؔ دکنی دور حاضر کے اُن بڑے شعرا میں داخل ہیں جنہوں نے اپنے کلام کے ذریعہ نہ صرف دکن کی اردو شاعری کو بلند کیا ہے بلکہ پورے اُردو ادب لطیف کے پُرشکوہ ایوان کی زینتوں میں اپنی فکر بلند و طبیعت کی نہایت نفیس گلکاریاں کیں اور کچھ مینار بنا گئے ہیں۔

(۴) **رسالہ جامعہ۔ دہلی۔ مرتبہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بابت جون ۱۹۳۷ء**

حضرت کیفیؔ (صاحب کیف سخن) ایک بوقلموں طبیعت کے سخن گو ہیں .... آزاد منشی و لطیفہ سنجی ان کے کلام پر بخط جلی لکھی ہوئی ہے۔ اور حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے جدید دور احیاء العلوم و نشاۃ ادب کے بلند بانگ و قومی آہنگ نقیب ہیں۔ کیفیؔ اک جامع قال و حال انسان تھے۔

سراج سخن۔ انتخاب کلام سید شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی

(مرتبہ)

فقیر عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی

۱۵۲ صفحات قیمت ۱۲/

(۱) **مجلہ عثمانیہ حیدرآباد۔ مرتبہ سید اشفاق حسین صاحب بی۔ اے جلد ۱۰ شمارہ ۱**

مولوی عبدالقادر سروری صاحب نے حضرت سراج اورنگ آبادی کے کلام کا نہایت دلچسپ اور معیاری انتخاب کیا ہے اور ساتھ ہی دکن کے اس عظیم الشان شاعر کے حالاتِ زندگی اور طرز سخنوری پر نہایت محققانہ اور پُراز معلومات مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ مولوی سروری صاحب کو شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق ہے۔ اور ہم جنہوں میں وہ اپنی سخن فہمی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب جدید اُردو شاعری تمام دنیائے اُردو سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے اور توقع ہے کہ ان کا

انتخاب کلام سراج بھی خاص دلچسپی سے پڑھا جائے گا...............

کتاب میں حضرت سراج کی تحریر کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔ یہہ سلسلۂ انتخابات کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو سراج کے اہم دیوان دستیاب ہو گئے جن میں سے ایک پر خود شاعر کے قلم سے چار جگہ حاشیہ پر غزلیں لکھی ہوئی مل گئیں۔

(۴) جریدۂ مشیر دکن حیدرآباد۔ بابت ۲۶ جون ۱۹۳۷ء

شاہ سراج اورنگ آبادی اُردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ اگرچہ ان کا زمانہ دو سو سال کا ہے لیکن کلام بہت صاف ہے قدیم طرز کے شاعروں میں ولی کے بعد انکے مقابلہ کا کوئی شاعر نہیں۔ یہہ ان کے کلام کا ایک پاکیزہ انتخاب ہے۔ غزلیات کے علاوہ دیگر اصناف کلام کا ضروری اور دلچسپ انتخاب بھی درج ہے۔

مرتب نے سراج کی شاعری اور حیات پر ایک پر از معلومات مقدمہ لکھا ہے............ اسی طرح دکن کے تمام مشہور شعراء کا کلام مرتب ہو کر شائع ہو جائے تو بہت بڑا کام ہوگا کیونکہ ضخیم دواوین کے مطالعہ کا اب زمانہ نہیں رہا ہے۔ نہ پہلی سی آسودگی ہے نہ فرصت۔ انتخابات کے مطالعہ سے ہر شخص آسانی کے ساتھ شعرا کے محاسن کلام پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ اور قیمت کے لحاظ سے بھی ضخیم و کمیاب دواوین کے مقابلہ میں یہہ معمولی آدمی کے دسترس سے باہر نہیں ہماری رائے میں اس سلسلہ کی وسیع اشاعت عمل میں آنی چاہیئے۔

متاعِ سخن۔ انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز حیدرآبادی

(مرتبہ)

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) مدیر عمومی سلسلہ

صفحات ۱۲۵ قیمت ۱۲

(۱) رسالہ ساقی۔ دہلی۔ مرتبہ مولوی شاہد احمد صاحب بی۔ اے آنرز نبیرۂ شمس العلماء نذیر احمد دہلوی۔ بابت فروری ۱۹۳۷ء

یہہ جناب عزیز کا انتخابی کلام ہے جو نہایت پاکیزہ جذبات سے لبریز اور شاعری کا پورا نمونہ..........

ان (عزیز حیدرآبادی) کا شاعرانہ ذوق دیکھکر یہہ سمجھ میں آیا کہ حضرت ذوق مرحوم کے دل میں دکن نے کیوں چٹکی لی تھی اور میر انیس مرحوم کس لئے حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ اگر میرے سامنے جناب عزیز کی صرف شاعری ہوتی اور انکے احوال سے بے خبر ہوتا تو میں بلا مبالغہ یہہ سمجھتا کہ مومن خاں مرحوم کا کوئی شاگرد ان کی بعض خصوصیات سے علحدہ ہو کر مرزا داغ کی زبان بول رہا ہے۔ زبان میں اُن کی لغزش نہیں۔ بیان میں اُن کے زور بندش اُن کی جیت غرض کہ شاعری کے لئے

جس کیفیت کی ضرورت ہے وہ .... اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کا احسان ماننا چاہئے کہ انہوں نے .... دکن کے تین قابل قدر شعراء کے کلام سے ہمیں روشناس کرایا۔

(۲) **جریدہ رہبر دکن۔ حیدرآباد۔** مرتبہ مولوی سید احمد محی الدین صاحب۔ بابت ۴ صفر ۱۳۵۵ھ

یہ نواب عزیز کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کا وہ انتخاب ہے جو شاعر بلند فکر کی خصوصیات شاعری اور انتخاب کنندہ کی نظر بالغ کا صحیح نقشہ پیش کر رہا ہے۔ نواب صاحب موصوف حسن و عشق کے .... حالات کو جس نزاکت نفاست اور لطف بیان کے ساتھ شعر کی بوتل شفاف میں بھرتے ہیں یہ سب جانتے ہیں کہ یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اگرچہ آپ حضرت داغ کے معتقد ہیں مگر آپ کی انفرادیت بھی اپنی جگہ بہت نمایاں طور پر قایم ہے .... آخر میں انتخاب کلام عزیز کے عنوان سے تقریباً ایک ہزار شعر ردیف دار دئیے ہیں۔ اشعار کی یہ تعداد حضرت عزیز کی بلند پروازی فکر، پختگی مشق سخن، و لطافت و پاکیزگی بیان کے اظہار کے لئے بہت کافی ہے۔

(۳) **جریدہ مشیر دکن۔ حیدرآباد۔** بابت ۲ نومبر ۱۹۳۵ء

.... طباعت کتابت کاغذ سب عمدہ نفیس اور دیدہ زیب ہیں۔ نوجوان طبقہ کو بھی اس سلسلہ کی طرف دست شوق دراز کرنا چاہئیے۔

(۴) **رسالہ جامعہ دہلی۔** مرتبہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب ام۔ اے۔ پی۔ اچ۔ ڈی۔ بابت جون ۱۹۳۷ء

.... ہر مجموعہ اک معیاری قامت و ضخامت پر مبنی ہے۔ اور مندرجہ ذیل عناصر و مراحل پر مشتمل۔

۱۔ دکن کی اردو شاعری ۲۔ تصویر شاعر متعلقہ ۳۔ شاعر اور اسکی شاعری ۴۔ انتخاب کلام شاعر۔

پہلی چیز پر از معلومات کاوش کا ثمرہ ہے جو نوجوان حوصلہ مند ڈاکٹر زور کا حصہ ہے۔ تیسری چیز عمیق آشنایانہ مطالعہ و جائزہ کا نتیجہ ہے۔ اور چوتھی کا حق ادا کرنے میں بھی پوری وسعت نظر اور ذوق اخذ کا ثبوت دیا گیا ہے

حضرت عزیز اک خوش ذوق، مستغنی المزاج، شگفتہ طبع اور مایہ دار شوکت زبان و بیان شاعر ہیں۔ وہ داغ کے فنا فی الشیخ قسم کے شاگرد ہیں۔ دہلوی لہجہ و محاورہ کا غیر متزلزل اتباع انکا ایک اور امتیاز ہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو

کی

زیرِ طبع یا زیرِ ترتیب کتابیں

۱۔ تاریخ ادبیاتِ انگریزی — مرتبہ — مولوی میر حسن صاحب ام۔اے

۲۔ تاریخ ادبیاتِ عربی — ” — مولوی سید ابو الفضل صاحب ام۔اے

۳۔ تاریخ ادبیاتِ اُردو — ” — ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے

۴۔ تاریخ ادبیات ہندی — ” — مولوی عبد القادر صاحب سروری ام اے

۵۔ فیضِ سخن۔ انتخاب کلام۔ میر شمس الدین محمد — مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ام۔اے

۶۔ گنجِ سخن ۔ ” ” میر احمد علی عصر ” مولوی سید محمد صاحب ام۔اے

۷۔ اُردو ادب میں ہندوستانی عنصر — از — مولوی میر محمد علیخاں صاحب میکش

۸۔ شمس الامراکی اُردو خدمات — ” — نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب بی۔اے

۹۔ اُردو مرثیہ نگاری — ” — مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ام۔اے

ادارۂ ادبیات کی جملہ مطبوعات کے ملنے کے پتے

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔ کتابستان الہ آباد۔ جامعہ ملیہ دہلی